

سوانح قاسمی

جلد دوم



خدمات و اصلاحات

ذاتی و ذہنی حالات، یا خانگی و عائلی تعلقات کے بعد مسیدنا الامام اکبر سے لینے والے لئے جو کام لئے، اور جن جہات کی سرانجامی کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا گیا۔ عقل ترتیب کے ساتھ ہم ان کو چند حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی ہندوستان کی اسلامی آبادی یا کہنے کو کہہ سکتے ہیں کہ خود اپنی ملت اور قوم کے لئے جو کچھ آپ نے کیا، ہم اس کی تعمیر و داخلی اصلاحات کے عنوان سے کوس گے، اور غیروں کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی جن خدمات کا ظہور آپ سے ہوا، ”خارجی اقدامات و تحفظات“ کے عنوان کے نیچے ان کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ پیش کی جائیگی۔

داخلی اصلاحات

یوں تو مسیدنا الامام اکبر کا وجود باوجود ہی جیسا کہ آپ دیکھ چکے مسلمانوں کے لئے بجائے خود مجسم اصلاحی نمونہ تھا، سوانح مخلوط کے مصنف نے اس عام قاعدے کا ذکر کرتے ہوئے کہ ”علماء ربانی کا وعظ تین قسم کا ہوتا ہے، قوی، فعلی، عالی۔ قوی ادنیٰ مرتبہ کا وعظ ہے اور فعلی متوسط، عالی اعلیٰ درجہ کا،“ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قوی وہ وعظ ہے جو محض زبان سے احکام خداوندی لوگوں کو سنا دیئے جائیں اور خود ان پر عمل نہ کرے،

اور فضلی رہ ہے کہ خود عمل کرے، بعد میں لوگوں کو ہدایت کرے، یعنی کر کے دکھائے، اور حالی رہ ہے کہ حال غالب ہو جائے، یعنی نیکی کا کرنا بدی کا چھوڑنا عادت ہو جائے، اور اس کے کرنے میں تکلف کی حاجت نہ ہو۔

پھر دہی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق اپنا یہ مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے اصول میں یہ تھا کہ جس فعل کو اول خود نہ کر لیتے تھے دوسروں کو اس کے کرنے کی نصیحت نہ کرتے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ گفتار کے ساتھ آپ کا وجود سراپا کردار تھا، اور یہی نہیں آگے دہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

”مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب تھا۔“

جو کچھ اب تک آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، بلاشبہ اس سے مصنف کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے، دین ہی سیدنا الامام الکبیر کی زندگی تھا، اور ان کی زندگی دین کے مواد و حقیقت اور کچھ باقی نہیں رہی تھی، اسی لئے ”مسلمانوں کی داخلی اصلاحات“ کے سلسلے میں تو گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ عمل کا پیغام بنا ہوا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس راہ میں ”گفت“ سے زیادہ آپ اپنی ”رفت“ اور ”ردش“ ہی سے کام لیتے رہے جس کا اندازہ ان لوگوں کے بیان سے بھی ہوتا ہے، جنہوں نے آپ کی تقریریں سنی تھیں، مواظف و خطبات کا بجا کچھ حصہ ہم تک جو پہنچا ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مولوؤں کی طرح مسلمانوں کی عملی کمزوریوں کا ذکر ان میں کم پایا جاتا ہے، بلکہ عموماً اسلام کی اصولی باتوں پر آپ کی تقریریں مشتمل ہوتی تھیں۔

گویا زبان سے تو ہمیشہ علم تقسیم فرماتے تھے اور عمل کا دغظ بجائے قول کے عمر بھر صرف اپنے عمل سے کہتے رہے۔ تاہم مسلمانوں کی عملی زندگی سے تعلق رکھنے والی بعض خاص اہم باتوں کے متعلق اس کا پتہ چلتا ہے کہ ”کردار“ کے ساتھ ساتھ ”گفتار“ سے بھی ان کی تبلیغ و اشاعت میں کام لیا جاتا تھا، اس سلسلے میں سوانح مخطوط کے مصنف نے مسلمانان ہند کے ان چند غیر دینی رسوم کا

تذکرہ کیا ہے، جن کی گرفت اب تو مجد اللہ بہت کچھ ڈھیلی پڑ چکی ہے، لیکن سیدنا امام الکبیر جس زمانہ میں ان رسوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے تھے، جاننے والے جانتے ہیں کہ اسلامی گھرانوں میں ان کی پابندی کن حدود تک پہنچی ہوئی تھی، خوشی، غمی، ولادت، شادی، موت کے مواقع پر اس ملک کے دوسرے باشندوں کی کچھ صحبت اور اس سے بھی زیادہ ثروت و دولت کی کثرت نے ان میں اتنی اہمیت پیدا کر دی تھی کہ اسلام کے قطعی مطالبات اور مکتوبات و فرائض سے بھی کہیں زیادہ ان کی پابندی پر سہ سائی نے ان کو مجبور کر دیا تھا، نکاح و نفاذ کی سرکہ آرائیوں میں دیوانوں کی طرح لوگوں مشغول و مشہک تھے۔ امیر ہویا غریب چونکہ ہر ایک اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ نتیجہ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے خوشی کی تقریروں کے متعلق لکھا ہے کہ ”عمر گزشتہ کا سارا سرمایہ صرف کر دین اور آئندہ عمر بھر کے واسطے قرض کر لیں۔“

اور موت کی غمی کے سلسلہ میں وہی لکھتے ہیں کہ مصارف کے لحاظ سے

”ایسی رسمیں مقرر تھیں جن سے نہ میت کو نفع، نہ اہل میت کو اور مثال یہ صادق

آتی تھی“ گھر ٹٹا اور سر پٹا۔“

خلاصہ یہ ہے کہ ریاء الناس (لوگوں کے دکھانے کے لئے) بیہودہ مصارف کے ایسے ابواب کھلے ہوئے تھے کہ

کمشل صفوان علیہ توابع فاصابہ	جیسے وہ صاف پتھر جس پر مٹی پڑ جائے پھر اس پر
وابل فتوکہ صلبا	بلش برے اوردہ صاف کا صاف ہی رہ گیا۔

کی مصداق مسلمانوں کی معاشی زندگی بنی ہوئی تھی، حکومت کا زور جب تک موجود تھا، تلافی کی شکلیں کسی نہ کسی طرح جائز و ناجائز ذرائع سے چونکہ نکل آتی تھیں اسلئے جیسا کہ چاہئے کاروبار کے ان بیہودہ طریقوں کے بڑے نتائج کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ لیکن حکومت کی یہ جھول بھی جب اتر گئی تو تنگی پشت سب کے سامنے آ گئی۔ رسی جل چکی تھی، غنیمتیں باقی تھیں۔ ان عام رسوم قدیمہ میں جس میں سچی بات یہی ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں دوسرے ممالک کے مسلمان بھی

مبتلا تھے۔ خاص کر اس ملک کو وطن بنالینے کی وجہ سے مصیبت کا جو پہاڑ مسلمانوں کے سر شریف گھرانوں کی غواہیں مخدرات عفاف پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ”وہ عقیدہ ہو گاں“ کا سلسلہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ نئی نوع انسانی میں شریک ہونے کے باوجود عام انسانی حقوق سے محروم کی غروی بنی آدم کی تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ لیکن عرب اپنی جاہلیت کے تاریک دور میں جیسا کہ کہا جاتا ہے ترکیبوں کو زندہ درگور کرتے تک کی بے رحمی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کی اس بے رحمی کا خدا ترسی کی غیر معمولی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ قیام قیامت کی نبایہوں اور برادریوں کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ آفتاب کی روشنی ڈھانک دی جائے گی، ستارے ماند پڑ جائیں گے، ہند بھجک انھیں گے، کائنات کے ان یا ملہ حوادث کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کے متعلق پوچھا جائے گا کہ کس قصہ میں ان کو قتل کیا گیا یعنی ”اذا الموات قاتلت باي ذنب قتلت“ کا جو ترجمہ ہے۔ بظاہر اس خاص ترتیب کے سلسلہ میں جنس نازک کی اس مظلومیت کا تذکرہ بنانا ہے کہ قرآنی نقطہ نظر سے یہ واقعہ بھی ایام قیامت کے جان گسل، روح فرسا حوادث کا ہم پلہ وہم وزن اہمیت میں ان ہی کے مساوی ہے، اللہ عزوجل جرائم اور گناہوں کے مقابلہ میں اس نوقہ پر عرب جاہلیت کے صرف اسی ظلم کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے اور ایک یہی کیا، عرب کی جاہلی زندگی میں جن فریب کاریوں سے مرد و عورتوں کے حقوق کو پامال کر رہے تھے ان کی فہرست یقیناً بہت طویل ہے۔

۱۵۔ خود قرآن میں بھی اس سلسلہ کی بعض چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں ایک دل چسپ چال یہ بھی تھی کہ جن جانوروں کا گوشت عرب کھاتے تھے مثلاً بھیڑ بکریاں وغیرہ ان کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ کہتے تھے کہ زندہ بچے ان کے پیٹ سے جو پیدا ہوں وہ صرف مردوں کے لئے ہیں، ہاں! مرد بچوں کے گوشت میں اتنے تھے کہ عورتوں کا بھی حق ہے کہتے تھے ما فی بطون هذا الا نساء خالصات لذ کو سنانا و محرم علی ازواجنا (سورۃ الانعام)، اس جاہلی دستور کی جو تشریح تفسیر کی کتابوں میں کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ بچوں کے متعلق کہتے تھے کہ ان پر مردوں کا حق ہے، اسی لئے نہ بچوں کو ذبح کر کے صرف مرد کھا جاتے تھے، ہر مادہ بچے جب پیدا ہوتے تو عورتوں سے کہہ دیا جاتا کہ ان کو اگر ذبح کر دیا جائے گا تو موشیوں کا سلسلہ ہی گھر میں ختم ہو جائیگا۔ یوں زندہ بچوں کے گوشت سے عورتیں ہمیشہ محروم رہتی تھیں، اتفاقاً مردہ بچہ اگر پیدا ہوتا تب اسکے گوشت کو

لیکن باوجود ان مظالم کے بیوہ عورتوں کو آئندہ نکاح کے قانونی حق سے قطعی طور پر محروم ٹھہرانے کا فیصلہ عرب کے ان جاہلوں نے بھی نہیں کیا تھا۔ ظلم کا یہ پہاڑ اس صنفِ نازک و ضعیف پر اسی ملک میں توڑا گیا، جہاں کی عورتیں مردہ شوہروں کے ساتھ جل کر اپنی غیر معمولی وفاداریوں کا ثبوت پیش کر رہی تھیں گو یا ان ہی وفاداریوں کا صلہ یہ تھا کہ عرب کے جاہلوں کی زندہ درگور لڑکیوں سے بدتر حال میں اس ملک کے مردوں نے یہاں کی عورتوں کو ہزار ہا ہزار سال سے تڑپنے اور پھڑکنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ قبریں دفن ہو جانے کے بعد زندہ رہنے کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے، اسی لئے میں تو کہتا ہوں کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے حرم کے واقعی محسوس حقیقی معنوں میں درحقیقت ہمارے ملک کے باشندے تھے، اور ان میں کتنے اب بھی ہیں جن کو اپنے جرم پر اس وقت تک شرارت کا دھوکہ لگا ہوا ہے، کہ تعجب اس امت پر ہے جو جاہلیت سے نکالنے ہی کے لئے برپا کی گئی تھی، اس ملک میں پہنچ کر اس نے بھی اپنی معیاری زندگی میں اسی کالے، بدترین کالے ظالمانہ گناہ کو شریک کر لیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہندی رزم درواج

لے سستی کی رزم بھی شاید عقد پرگان کی مانند کی طرح ہندوستان کی خاص ملکی رسم تھی۔ ہندی خواتین کے جذبہ بہرہ و فاکو اس رسم کا منشا ٹھہراتے ہوئے ایک صاحب اس ظالمانہ انسانیت سوز رسم کی داد دے رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ ”مہر و فاکو“ کے لئے کیا صرف غریب عورت پیدا ہوئی ہے۔ محبت و افسوس کا تقاضا یہ تھا تو ہمارے تھا کہ مرد بھی بیوی کے مرجانے کے بعد اس کے ساتھ جل جاتا۔ لیکن ایک طرف ملاحظہ خود بتا رہا ہے کہ عرب کے جاہل دھوکہ دے کر عورتوں سے جیسے کھینچتے رہتے تھے۔ اسی قسم کی بازیگری مردوں کے جذبات سے ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی تھی۔ ۱۲ (ازبندہ محمد طیب غفرلہ) یہ وفاداری نہیں تھی بلکہ اس مظلومیت اور ذلت آمیز زندگی سے چھٹکارے کے لئے جو برہمنی کے زمانہ میں عورت کو گزارنا پڑتی تھی یہ جل جانا ایک مذہبی حرکت ہوتی تھی۔ عمر بھر کے جلا ہے سے بچے کیلئے ودیک ساہ کلا جلا یا بہت جل کھیتی تھیں۔ اسلئے خود اس ملک میں بھی دختر کشی کی کبھی تھی پیدا شدہ لڑکیاں گلا گھونٹ کر اور ایسی اوقات انہوں نے پیدا شدہ لڑکی کے منہ میں رک کر زہر سے مادی جاتی تھیں۔ برطانیہ کی حکومت نے سرکاری قوت سے اس رسومِ قبیحہ کو بند کیا ہے، پس ہندوستان عورت کی ترنیل و توہین اور سچ کنی میں عرب سے کہیں آگے تھلا عرب میں عورت کی مظلومیت اسلئے کی سچ کنی کی رسوم بد کو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی روشنی نے ختم کیا اور ہند میں ناٹھان بول نے عورت کی گلو فاکو کے لئے مساعی جلیلہ

آوردہ سرخو مہیتوں کو تو مسلمانوں نے آہستہ آہستہ اختیار کیا، لیکن جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے خانی خان نے جو یہ لکھا ہے کہ

”در شادی و کد خدائی بہ طور پیردی آن جماعت (یعنی ہندو) بہ عمل می آوردند“

پھر اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ اسلامی دنیا کے کسی حصہ میں اس رسم بدکار و راج نہیں ہے، بلکہ ”وارثان آہنہا بزدل بقصد کفو می آرند“

اپنے زمانہ یعنی عہد محمد شاہی تک کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ

”در ہندوستان کہ میان شرفائے اسلام کہ مراد از اصل مشائخ عرب ست این عمل (عقد بیوگان) در ہندوستان قبیح و عیب دانستہ ترک رویہ آباد اجداد را کہ می افح حکم خدا و مطابق شرع محمدی ست نموده اند“

مسلمانوں نے اس ملک میں آباد ہو جانے کے بعد اس طریقہ کو کیوں اختیار کیا۔ اسکی توجیہ کرتے ہوئے خانی خان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ

”اگر دختر شیرخوارہ را بہ عقد اھلہ در آرد، دختر ہر بہاں شب اول میرد باز بہ نکاح دیگرے نمی آرند“

اصرہ یہ بیان کر کے کہ شرافت و نجابت کا دار مدار ہندوستان میں چونکہ اسی رسم پر ہے ”اور بقول خانی خان کے عام قاعدہ ہے کہ

”چوں شرفا ہر قوم را بہ اشراف ہر دیار ہم چشتی بہ میاں می آئند، بہ تقاضائے غیرت کہ ما از چہ راہ کثر ازین جماعت با شیم تبعیت این رسم را سرا یا بہ آورد غیرت و نشان شرافت و نجابت دانستہ ترک رویہ بزرگان سلف نموده اند“

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں شرافت و نجابت کا معیار چونکہ عموماً یہی قرار پا گیا تھا کہ بیوہ ہوتے کے بعد کسی دوسرے مرد کا ہنہ عورت نہ دیکھے، اس لئے مسلمانوں نے بھی اپنی شرافت کا معیار اسی کو اختیار کیا، کچھ ایسا معاملہ ہو چکا ہے کہ خانی خان نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ ”اس وقت

اس مسئلہ کے متعلق دلوں میں کچھ اصلاحی خیالات ابھرنے لگے تھے۔ کیونکہ آخر میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی ان الفاظ میں کیا ہے،

”اگرچہ اس طریقہ عقلاً و شرعاً محمود نیست و در بی ضمن مفید بسیار حاصل می گردد کہ بہ توضیح آں نہ پرمناختن اولیٰ“ ۳۵

اور یہی وہ زمانہ ہے، جب مسلمانان ہند کو چوکھاتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے حضرت شاہ دہلی رحمۃ اللہ علیہ یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”یکے از عادت مشینہ ہندو آنست کہ چون شوہر نہ لے بمیرد نڈازند کہ آن زن شوہر دیگر گست“

اور یہ بتاتے ہوئے کہ

”این عادت اصلاً در عرب نہ بود نہ قبل از آن حضرت و نہ در زمان آنحضرت و نہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم“

ان تہیدی امور کے بعد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسلمانان ہند کو وصیت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ عبارات ان کے وصیت نامہ ہی کی ہے۔ مگر رسم و رواج نے مسلمانوں کے اند بھی اس بری عادت کو اس حد تک مستحکم کر دیا تھا، کہ بجائے وصیت کے بے ساختہ اس موقع پر وہ دعائیں مشغول ہو جاتے ہیں، کچھ کہنے سننے کی جگہ فرماتے ہیں۔

”خدا تعالیٰ رحمت کناد بر آن کس کہ این عادت مشینہ را متلاشی سازد“

جس سے یوں بھی شاہ صاحب کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے، نیز آگے ان ہی کے ان فقرات کہ	اگر ممکن نہ باشد کہ از عموم ناس مرتفع شود،
اور اگر عام مسلمانوں سے اس رسم کا ازالہ ممکن نہ ہو	در میان قوم خود اقامت این عادت
تو چاہئے کہ خود اپنے کمنہ میں عرب کی اس عادت	عرب باید کرد اگر این نیز ممکن نہ باشد
کو جاری کیا جائے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو،	این عادت را قبیح باید دانست و بدل
تو اس عادت کو چاہئے کہ دل سے برا سمجھا جائے۔	

دشمن آں باید بود کہ ادنیٰ مراتب نہی مسکر | اور اس کا دشمن بن جانا چاہئے کہ بری بات کے
بہیں مست مٹا وصیت نامہ | انسداد کا یہی آخری درجہ ہے۔

میں نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ان کی پوری عبارت اسی لئے نقل کی ہے کہ
اس رسم بد کی گرفت کی سختی جس حد تک ہندوستان کے مسلمانوں میں پہنچ چکی تھی، اس کو ان کے مذکور
بالا الفاظ سے ہم کچھ سکیں، ان کا دل تڑپ رہا تھا چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو اس کے ترک
پرمادہ کریں۔ لیکن حالات ان کے سامنے ایسے تھے کہ بظاہر کامیابی سے کچھ ناامید نظر آتے ہیں
اسی لئے آخر میں دل سے برا جاننے کی آخری تدبیر کے استعمال تک وہ اتر آئے ہیں، اہ اسی
سے امیر شاہ خان مرحوم کی ان روایتوں کی بھی تصدیق ہوتی ہے، جنہیں مسئلہ عقد بیوگان کے سلسلہ
میں ہم ارداع ثلاثہ میں پاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نانیہال قصہ پچھلت کے مستند
بزرگوں کے حوالہ سے امیر شاہ خان یہ روایت کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید صیبا کہ معلوم
ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے ہیں، مولانا شہید کی ہمیشہ کا عقد گھڑی میں مولانا رفیع الدین
ابن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمن صاحب سے ہوا تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد
مولوی عبدالرحمن صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور مولانا اسماعیل شہید کی ہمیشہ صاحب بیوہ ہو گئیں،
اب سنئے خود شاہ ولی اللہ کے گھرانے کا یہ قصہ ہے، مولانا اسماعیل کا یہ بیان امیر شاہ خان نے نقل
کیا ہے کہتے تھے کہ

”جب میں اپنی بہن کو مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتا تھا، تو نکاح ثانی کے فضائل قصداً چھڑا دیتا

تھا کہ مبادا میری بہن کو ترغیب ہو، اور وہ نکاح کر لے“ ۱۱۹۔ ارداع

عقد بیوگان کے سلسلہ میں خانوادہ ولی الہی کے احساسات کی نزاکتوں کا یہ حال تھا، تو اسی سے
سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی ذہنیت اس بات پر کیا رہی ہوگی، یا کیا ہو سکتی
تھی۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کراچے ہوتے ہوئے دلی کی دعا قبول ہوئی اور

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس رحمت کے مستحق ہوئے جس کی دعا شاہ صاحب نے مانگی تھی، یہ قصہ کافی طویل ہے، سیرت سید احمد شہید میں اس کی تفصیلات پڑھئے، امیر شاہ خان کہا کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید سے کسی نے پوچھا کہ اپنے چچا شاہ عبد العزیز اندر بد القادر سے زیادہ سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے گردیدگی کی وجہ آپ کیسے کیا ہوئی؟ تو جواب میں اسی کا حوالہ دیا کہ ان کی صحبت میں یہ جرأت مجھ میں پیدا ہوئی کہ اپنی بیوہ بہن کا عقد زور دے کر میں نے خود کرادیا۔ جس کی تفصیل خان صاحب ہی یہ بیان کرتے تھے کہ چلت میں ”عقد بیوگان“ کی طرف مسلمانوں کو ایک دن برسرِ سبزوئی مولانا اسماعیل شہید توجہ دلا رہے تھے کہ جمع میں کسی نے عرض کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، مولانا شہید کچھ گئے، اور منبر سے اتر گئے، فرمایا کہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پھر پوچھنا، یہ کہتے ہوئے سیدھے بچلت سے دلی پہنچے، اور اپنی بیوہ بہن کے قدموں پر غلامہ ڈال دیا، اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگے کہ

”تم چاہو تو میں، وعظ کہہ سکتا ہوں، در نہ نہیں کہہ سکتا۔“

وہ بے چاری حیران تھیں کہ قصہ کیا ہے تب کھلے کہ تمہارے عقد نہ کرنے کی وہم سے میری دھڑ بے اثر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مولانا شہید کی ہمشیرہ صاحبہ حالانکہ بیمار تھیں، اور نکاح کی صلاحیت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی، لیکن بھائی کے اصرار سے راضی ہو گئیں، اور بچلت ہی کے مشہور عالم سید شہید کے رفیق مخلص مولانا عبدالحی سے ان کا نکاح کر دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب، امیر شاہ صاحب کا یہ علم تھا، یا واقعہ یہی تھا کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں

”مولوی اسماعیل صاحب کی بہن کا نکاح ثانی سب سے پہلا نکاح ثانی تھا۔“ ۶۵

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک کا آغاز حضرت سید شہید اور ان کے رفقاء کی طرف سے ملک میں جب شروع ہوا تو اس سلسلہ میں مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ صاحبہ کا

لے لینہ بھی صورت حال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کو بھی پیش آئی ہے اور انہوں نے بھی اپنی بڑی بہن کا نکاح اسی طرح کر کے اس دعوت (نکاح بیوگان) میں قوت پیدا کی تھی۔ (محمد طیب غفرلہ)

عقد ثانی پہلا عقد ثانی تھا۔ گویا اس رسم بر کے ازالہ کے سلسلے میں یہ پہلا تاریخی نمونہ تھا۔

ادراج ثلاثہ وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر علماء کا ایک طبقہ عقد بیوگان کی کوششوں میں نہک اور مشغول ہو گیا تھا، کوئی بے چارے مولوی عبد الرحیم صاحب تھے وہ تو ”رائٹوں کی شادی والے“ مولوی کے نام ہی سے مشہور ہو گئے تھے (دیکھو ادراج ثلاثہ ص ۱۷) اس سلسلہ میں مولوی محبوب علی دہلوی مرحوم کا نام بھی خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ مگر بایں ہمہ شہبائے نسل کی راسخ رسم جودلوں کی گہرائیوں میں پستہ پستہ سے جا گزیں تھی، اس کی برڈوں کا نکالنا آسان نہ تھا، اور تو اور یہی دیوبند کا قصبہ جہاں آج دارالعلوم ہے، اسی کا ایک قصبہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی سلسلہ میں نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ بھلت کے ایک عالم باعمل مولانا وحید الدین مرحوم تھے، وعظان کا عام طبر پر مقبول تھا، خصوصیت کے ساتھ دیوبند کے شیخ زادوں میں غیر معمولی احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ان کی اصلاحی باتیں عموماً لوگ مان لیتے تھے۔ ایک دن دیوبند ہی میں دینڈا کہتے ہوئے، مولوی وحید الدین بے چارے نے عقد بیوگان کے مسئلہ کا ذکر بھی پھیر دیا۔ کہتے ہیں کہ ابھی تہبیدی شروع ہوئی تھی، کہ مجلس سے قصبہ کے ایک رئیس شیخ زادے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اور منبر کے پاس بے ساختہ درڑتے ہوئے پہنچے، مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا، اور برسر مجلس ڈانٹتے ہوئے بولے کہ

”بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو“ ص ۱۷

۱۷ ابتدا میں حضرت سید شہید کی جہادی ہم میں یہ بھی حریک تھے۔ لیکن بعد میں اپنے بعض اختلافی نقاط نظر کی وجہ سے وہی واپس آ گئے تھے، ادراج ثلاثہ میں ان ہی کے کچھ کے ایک غیر معمولی نوہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ غدر کے ہنگام میں کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا فتویٰ تھا کہ حکومت قائد کے خلاف شریعت میں وجہات جائز نہیں ہے جب ہنگامہ فرد ہوا تو اپنے اس فتوے کے صلہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے گیارہ گاؤں کا ذمیہ پیش ہوا، کہ تمہاری جاگیر میں حکومت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ لکھا ہے کہ ذمیہ کو لے کر اسی انگریز دفتر کے سامنے مولوی صاحب نے چھاڑ دیا۔ جس نے ذمیہ پیش کیا تھا، غصہ میں کہہ رہے تھے کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ میرے نزدیک مسئلہ کی شکل ہی وہی تھی۔ ص ۱۷ ادراج

بیان کیا ہے، کہ بے چارے مولوی صاحب مرحوم دم بخود ہو کر رہ گئے، کیونکہ مجلس میں کسی کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ شیخ صاحب یہ کیا کر رہے ہو، گو یا ساری مجلس شیخ صاحب ہی کی مویہ اندہم نواتھی،

بہر حال یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ”عقد بیوگان“ کی اس تحریک کی مخالفت میں بد بخت مسلمانوں کی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا گیا تھا، حتیٰ کہ سید شہید کی جہادی مہم کی ناکامی تک میں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دوسرے اسباب کے ”عقد بیوگان“ کے سلسلے کی کش مکش کو بھی دخل تھا۔ تاہم حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دعا، اندر ہی اندر اپنا کام کرتی چلی جاتی تھی، سید شہید اور ان کے رفقاء کے بعد جیسا کہ ہمارے مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، ’اضلاع سہارنپور و مظفر نگر وغیرہ میں سیدنا امام الکبیر کے استاذ حضرت مولانا ملوک علی اور کاندھلہ کے مشہور بزرگ مولانا مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ حسن تدبیر کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مشغول رہے، مولانا مظفر حسین کا مذہبی کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہوئے وہی فرماتے ہیں کہ

”بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً ان ہی سے ہوئی، اور دلاً یہ ہے کہ

ملوک علی صاحب، نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا۔“ ص ۳۱

اور ان بزرگوں کے بعد، جیسا کہ مصنف امام ہی نے اطلاع دی ہے کہ

”ان دونوں بزرگواروں (مولانا مظفر حسین و مولانا ملوک علی)، کے قدم قدم حضرت مولانا

(سیدنا امام الکبیر، نے اس کو پورا شائع کیا۔“ ص ۳۱

ان کی اس تاریخی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ”خدا رحمت کند برآں کس کہ اس عادت شنیعہ را مستلاشی سازد۔“ اس ولی اللہی دعا اور تمنا کی تکمیل بالآخر سیدنا امام الکبیر کی ذات بابرکات پر ہوئی۔ اس کو پورا شائع کیا، ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت تو اجمالی الفاظ میں ادا ہوئی ہے، ’سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس اجمال کی تھوڑی تفصیل بھی کی ہے، اس کا ذکر

کرتے ہوئے کہ

”نکاح ثانی بیوگان کو ایسا براہ سخت عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا، اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا تو مارنے مرنے کو مستعد ہو جاتے تھے“

ان ہی حالات میں ان کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے استاذ اور بزرگوں کے نقش قدم پر اس سلسلے میں جدوجہد شروع کی، مواعظ و خطبات میں مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانے لگے، لکھا ہے کہ

”اول اول لوگوں کے کانوں میں جو نئی بات پڑی، تو چونکے، ادھر گھر گھر اس کا چرچا ہوا“

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

”اور بعض بعض نے خلاف میں منصوبے کاٹھے“

واشداً علم بالصواب یہ کون لوگ تھے اور اضلاع بہار، بنور و مظفرنگر کے کن مقامات کے رہنے والے تھے، بظاہر دیوبند اور نانوتہ ہی کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر باوجود ان منصوبوں کے حضرت دالانے پوری استقامت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مردوں کو سیدنا الامام الکبیر نے چمک چمکا کر مانوس بنایا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مردوں کے خیال میں تبدیلی پیدا بھی ہوئی تو کیا۔ رسم دواج کی غیر معمولی تاثیر قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ مردوں سے زیادہ خود مختار توں میں ”عقد ثانی“ کا خیال عفت و ناموس کے لئے دارغ بن چکا تھا، کسی عورت کے لئے اس کا سوچنا بھی اس کے نزدیک گناہ اور پاپ بنا ہوا تھا، مردوں کے بعد ضرورت تھی کہ عورتوں کے اندر رسم دواج کے پیدا کئے ہوئے غلط جذبات اور جھوٹے احساسات کا قلع قمع کیا جائے، اور یہی حکیمانہ تدبیر حضرت دالانے اختیار کی۔ مردوں کے مجالس کی تقریروں کے بعد اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

”نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے، اور بیواؤں کے کانوں تک

مصناین نکاح ثانی پہنچنے لگے۔“

اور اس سلسلہ میں جہد و جد آپ کی اس نقطہ تک بقول ان کے پہنچ گئی کہ
”کوئی بیوہ، اور وارث بیوہ، ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے فتنہ اُٹ نہ
پہنچے ہوں۔“

الغرض آپ کی تبلیغ کا جو میدان تھا، اس میں اندہ ہونا باہر اپنی آواز آپ نے پہنچادی، ادھر کوشش
تو قول اور گفتار کے سلسلہ میں تھی، لیکن آپ سن چکے کہ کہنے سے پہلے جس کی عادت بھی تھی کہ جوابات
دہ سروں سے کہی جائے، پہلے خود کر کے دکھلا دی جائے، خصوصاً اس سلسلہ میں نفسیاتی طور پر اس کی زیادہ
ضرورت تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ
”جب مولانا نے اول اس کام کا بیڑا اٹھایا، تو کسی کو اس کی امید نہ تھی کہ یہ کام چل
سکے گا۔“

پھر وہی اطلاع دیتے ہیں کہ چل سکنے کے لئے ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ دہری دیوان جی حاجی محمد حسین
مرحوم، حضرت دالاجی کو اپنا ہاتھ پاؤں کہتے تھے، اور علاوہ برادری کے غیر معمولی محبت و اخلاص نے
جتنیں آپ کے گھر کا رکن خصوصی بنادیا تھا۔ ان کی ایک بیوہ ہیں تھیں۔ حضرت نے ان ہی کو آدہ
کیا کہ اپنی بہن کا عقد ثانی کر دیں۔ لکھا ہے کہ

”ادیں میان محمد حسین صاحب کی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح ثانی ہوا۔“

اور صرف ہمشیرہ ہی نہیں بلکہ دوسری جگہ دہری یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حاجی حسین مرحوم کی
”ایک بھانجی بیوہ کا نکاح ثانی بھی کرایا۔“

سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ حاجی محمد حسین مرحوم

”چونکہ اپنی قوم میں عالی نسب ہیں، اس لئے ان کا یہ فعل زیادہ مؤثر ہوا۔“

اور دیوان جی ہی کے پیش کئے ہوئے عملی نمونوں کو کافی قرار نہیں دیا گیا۔ سوانح مخطوطہ کے
مصنف نے لکھا ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب عقد بیوگان کی تحریک زور شور کے ساتھ

جہاری تھی، یہ اتفاقی واقعہ پیش آیا کہ سیدنا الامام الکبیر کی

”ہمشیرہ اسی سرحد میں بیڑہ ہو گئیں۔“

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ آپ کی یہ بیڑہ ہو جانے والی ہمشیرہ صاحبہ حالانکہ اولاد والی تھیں، لیکن قدرت کی طرف سے اپنے گھر کی طرف سے ایک عملی مثال کے پیش کرتے کا موقع سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا۔ اور ٹھیک جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی بہن کا عقد کر کے قول کو فعل کے مطابق کر کے دکھایا تھا، سیدنا الامام الکبیر نے بھی جو کچھ دوسروں سے فرما رہے تھے خود کر کے دکھایا اور آل و اولاد رکھنے والی اپنی بہن کو عقد ثانی کرتے پر آپ نے راضی فرمایا، اور ان کا نکاح ہو گیا۔

۱۵۔ اس کا تفصیل واقعہ جو میں نے اپنے بزرگوں سے بکرات و مرآت مناسبت ہے، بعینہ اسی انداز کا ہے جو حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دیوان میں نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے تھے، اشارہ وعظ میں شیوخ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت انداز سے سمجھ گئے کہ وہ بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کر چکے، فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہریں مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت وعظ کی جوتی داند اور گھر میں تشریف لے گئے مجلس اپنی جگہ جمی رہی۔ گھر میں پہنچ کر اپنی بیڑہ بہن سے جو عمر میں بڑی تھیں اور کافی ضعیف ہو چکی تھیں، پیر کر کر بجا جت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک بہت سے ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اور میں احیاء سنت کے قابل ہو سکتا ہوں بہن نے گھبر کر کہا کہ بھائی ایسی کیا بات ہے میرے پیر تو چھوڑ دو میں کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسول کے احیاء کا سبب بنوں؟ فرمایا کہ آپ نکاح فرمائیں، اس پر بہن نے کہا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہو چکی ہوں سر سفید ہو چکا ہے نکاح کی عمر نہیں ہے۔ فرمایا یہ سب صحیح ہے مگر یہ نکاح محض عقد بیوگان کی سنت کے احیاء کے لئے ہو گا، کسی طبی ضرورت کی بناء پر نہیں۔ اُس پر بہن راضی ہو گئیں اسی وقت گھر ہی میں حضرت نے نکاح پڑھا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے۔ مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی۔ حضرت نے بقیہ وعظ شروع فرمایا۔ وہ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہی ہوئے تھے پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ تو نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں آپ کی بہن بیڑہ بیٹھی ہوئی ہے؟ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ بیٹھی ہیں ان کے نکاح کے گواہ تو اس مجلس میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح تو ہماری موجودگی میں ہوا ہے اس پر تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے اور پھر یہ تحریک نہایت قوت سے آگے چلی۔

محیط غفرلہ

ظاہر ہے کہ جہاں گشتار کردار کا قالب ان شکلوں میں اختیار کر رہا تھا وہاں اگر یہ صورت پیش آئی ہو، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ

”پھر تو اس دھوم دھام سے نکاح دثانی، جو سنے گئے، جیسے کنواری لڑکیوں کے“

ہمارے مصنف امام نے سیدنا امام الکبیر کے شعلی جو یہ خبر دی تھی کہ ”عقد بیوگان کی عام اشاعت ان ہی کی بدولت ہوئی“ اس کا مطلب یہی تھا، کہ عزت و ناموس کے منافی بیوہ عورتوں کے

عقد کو جو عموماً سمجھا جاتا تھا، اس غلط فہمی کا ازالہ ہو گیا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

”یہ تو نہیں کہ سب بیواؤں کا نکاح ہو گیا، مگر جو رنگ دل کے اندر تھا کہ نکاح ثانی کو نہ کہی

اور شرافت کے خلاف سمجھتے تھے وہ دہ ہو گیا“ اور عیب نہ رہا، ص ۱۱۱

اس میں شک نہیں کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے، زیادہ تر اس کا تعلق

اسی علاقہ کے مسلمانوں سے ہے جس میں سیدنا امام الکبیر نے اپنی تحریک جاری کی تھی، لیکن

دارالعلوم دیوبند کے قائم ہو جانے کے بعد سارے ہندوستان میں پڑھ پڑھ کر علماء جو پچھلے آگے

ان کی اہم ان کے زیر اثر شخصیتوں کی بدولت ہمارے زمانے تک عقد بیوگان کے وہ ارجحیت کافی

وسعت پیدا ہو چکی ہے۔

۱۱۔ سیرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس رسم بد کے ازالہ میں جو کچھ کام ہوا، براہ راست

دارالعلوم دیوبند امداد کے ہم خیالوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بلکہ حضرت سید شہید کے ماننے والوں میں ایک طبقہ

اہل حدیث کو جو پیدا ہو گیا تھا، اس کی طرف سے سچی کافی جدوجہد ہوئی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم بیوہ کی مناجات وغیرہ

کا بھی کافی اثر بڑا عجیب بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان پچھلے دنوں خود ہندوؤں میں بعض لوگ بدھابواہ کی تحریک کو

لے کر کھڑے ہوئے اور گو مسلمانوں کی جیسی کامیابی تو ان کو نہیں ہوئی ہے لیکن قدرت کا پھر بھی یہ تماشا ہی ہے کہ

جن کو دیکھ کر مسلمان اس سلسلہ میں جگڑے تھے، خود ان ہی میں اس ظالمہ رسم کے خلاف تجویزیں سوچی جاتی لگیں، اور

تعموداً بہت عمل بھی ہوئے لگا۔ بہر حال اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر طبقوں کا بھی اس

اصلاح میں غیر معمولی حصہ ہے۔ بہار کے جس علاقہ میں فاکر کا دل ہے، یعنی ضلع چٹہ کا مشرقی علاقہ جسے گد یا گدہ

بھی کہتے ہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں اس علاقہ کی سادات برادری میں سب سے پہلے موضع دمنہ جو مولانا سید

سلیمان ندوی کا مولود غشا ہے، اسی گاؤں کے ایک بزرگ حافظ محمد حسین مرحوم نے (باقی صفحہ ۱۶ پر)

کچھ بھی ہو، آج "حقوق نسوان" کے نام نہاد مغالطی عنعان کی دایوں سے احترام و اکرام کے پیدائشی حقوق سے صنف نازک کی محرومی کا جو عام کاروبار جاری و ساری ہے، جن نسوانی خصوصیتوں کا ذکر بھی انسانی مجالس میں عورتوں کے ناموس و عزت پر ناپاک حملہ سمجھا جاتا تھا، شریف ماغوں میں جن کا تصور بھی گناہ بن جاتا تھا۔ آج تصویروں اور محسوس میں ان ہی کو نمایاں کر کے بازار میں چیزیں فروخت ہو رہی ہیں، تجارت کی گرم بازاری کا واحد ذریعہ زائد دزدی کا عام طریقہ صرف یہی ہو گیا ہے کہ اپنی ماؤں بہنوں، بیٹیوں، کی عریانیوں کا تماشا دکھا دکھا کر خریداروں کی توجہ مال کی طرف پھیری جائے۔ صابن کی ایک، ٹکیہ کے بیچے کے لئے، نسوانی عزت و ناموس کو داؤ پر بٹھانے والے پرٹھا ہے۔

حرم عفاف کا ایک ایک سرمایہ لٹ رہا ہے، لٹایا جا رہا ہے، لیکن رسوائیوں ہی پر بھرا یا جا رہا ہے کہ عورتوں کی آبرو و احترام کی ضمانت پوشیدہ ہے جو چیز بجز کٹافوں کے اور کچھ نہیں ہے باور کرایا جا رہا ہے کہ اُسی سے جنس لطیف کی لطافتوں میں لطافتوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے، ادنیٰ نوع انسانی کی پیدائش، نشوونما کا سارا بار بار جو تنہا اٹھائے ہوئی تھی، اُسی غریب عورت پر شاید یہ بھی چاہا جا رہا ہے کہ معاشی جدوجہد کا بوجھ بھی اسی پر لا دیا جائے۔ مردوں کا بے غیرت طبقہ معاش کی ہلکی ذمہ داری کو بھی چاہتا ہے کہ اپنی پیٹھ سے جھٹک کر الگ ہو جائے۔

(گزشتہ صفحہ سے) عقد بوجان کا عملی نمونہ اپنی بیوہ کی کا عقد کر کے پیش کیا، اور حافظ صاحب مرحوم سیدنا امام الکبیر کے خاص وابستوں میں تھے۔ اجتہاد میں جیسا کہ اپنی کتاب کمالات رحمانی میں انہوں نے لکھا بھی ہے، حضرت امامی سے شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہوا تھا، بعد کو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی سے بھی مستفید ہوئے۔ اگرچہ حافظ صاحب مرحوم کا عملی نمونہ بھی اقامتی جرات کے لئے کافی نہ ہوا، لیکن آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے برادری کے ایک سربراہ کدوہ وکیل مولوی محمد حسین مرحوم جو حکومت بہار میں وزارت تعلیم کے محکمے سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی جوان بیوہ کو ملکی کا عقد کر کے دوسروں کے لئے راستہ صاف کر دیا، اور اب الحمد للہ کسی قسم کا محضہ اس علاقہ کے مسلمانوں میں عقد بیوگان کی طرف سے باقی نہیں رہا ہے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وقتاً فوقتاً اس کی مثالیں آنے دن پیش آتی رہتی ہیں جن میں مسند حسنہ خلیفہ ابو جہا حوجہ من عمل بہا کا قانون ہر منزل پر کام کرنے والوں کو انشاء اللہ کام دے گا۔ ۱۲

خدا ہی جانتا ہے کہ حق کے لباس میں ”باطل“ کا یہ طوق بنی آدم کے گھرانوں میں جو لمبل مچائے ہوئے ہے اس کا آخری انجام کیا ہوگا؟

لیکن عورتوں ہی کے حقوق کا ایک پہلو یہ بھی تھا، جو آئین کے نامعلوم زمانہ سے سرزمین ہند میں انتہائی ظالمانہ پالیسیوں کا شکار بنا ہوا تھا، کسی شہر اور ہنگامہ کے بغیر اس بے زبان طبقہ کے حقیقی بھی خواہوں نے چیرہ دستیوں کے آتشیں سند سے ان کو کال لینے میں کامیابی حاصل کی، سچ پچھے تو عورتوں کے حقوق کے احیاء اور حفاظت کا صحیح طریقہ یہ یا اسی قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جنس نسوانی کے نجات دہندوں میں ہمارے سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ العزیز کا وجود بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان آبرو باختوں کا غوغائی شہرہ تو آپ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا، جو عورتوں کے حقوق کی چیخوں کے کانوں کو بہرا بنائے ہوئے ہیں لیکن قدرت کے عطا کئے ہوئے حقوق جن کا ہر طبقہ جائز طور پر حقدار تھا، ان کی پامالی آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی ”عقد پوگان“ کے مذکورہ بالا کا زمانہ کے سو آپ کو یاد ہوگا، کسی موقع پر اس کا ذکر کر چکا ہوں، جلال آباد جو ضلع مظفر نگر کا مشہور قصبہ تھا نہ بھون کے نواح میں ہے، اسی قصبہ کے مسلمان باشندوں کی اس بری رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

”وہاں لوگوں کا حق نہیں دیا جاتا۔“

سیدنا الامام الکبیر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کے مسلمانوں کی جائداد کا خریدنا اسی لئے جائز نہ ہوگا، یہ روایت حضرت مرشد تھانوی کی قصص الاکابر میں پائی جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے حضرت والا کے اس فتوے کی بدولت اپنے شرعی حصہ کے پانے میں کتنی غریب لڑکیاں کامیاب ہوئی ہوں گی جہاں تک میں جانتا ہوں، کم از کم مظفر نگر سہارنپور وغیرہ رو میکمینڈ کے عام اضلاع کی اسلامی بستیاں اس باغیانہ طرز عمل کی آلودگیوں سے پاک ہو چکی ہیں اور یہ دعویٰ مشکل ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے فضیلت نظر کو تلہیر کے اس عمل میں دخل نہ تھا، عرض کر چکا ہوں کہ وراثت کے مسئلہ میں بھی جب وہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کر کے آپ دکھا چکے تھے، جسے مسلمانوں کی زندگی میں آپ دیکھنا چاہتے تھے

تو جیسے "عقد بیگانگان" کے قولی و عقد کے ساتھ آپ کا عملی نمونہ بشارت مند رہا۔ اسی طرح وراثت کے باب میں بھی آپ کے طریقہ عمل کی پیروی لوگ کیوں نہ کرتے۔

بہر حال داخلی اصلاحات کے سلسلے میں جیسے عقد بیگانگان کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر خانوادہ ولی اللہی کے تقاضے سے متاثر تھے اور ولی اللہی طریقہ کے بزرگوں ہی کے کام کی آپ نے تکمیل فرمائی تھی اسی طرح جیسا کہ پہلے بھی تھا دوسرے شعبوں میں بھی اسی خاندان کے دینی احساسات سے آپ کی اثر پذیری ایک قدرتی بات تھی، اسی خاندان کے تعلیم یافتہ بزرگوں کے حلقہ میں آپ کی علمی اور عملی صلاحیتیں برود کے کار آئی تھیں، قلب مبارک خانوادہ ولی اللہی کے اکابر کی عظمت و احترام سے محو تھا خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کا اور آپ کے مینوں صاحبزادوں، مولانا شاہ عبدالعزیز مولانا شاہ عبدالقادر مولانا رفیع الدین کا ذکر جس غیر معمولی عقیدت و ادب کے ساتھ آپ کیا کرتے تھے۔ اسی سے آپ کے دل کی کیفیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا نام چپاں کہیں آپ نے لیا ہے، وہاں

"حجتہ اللہ فی العالمین، خاتم المحدثین والمفسرین محمد بن عبد المکملین از بدۃ الناطقین مولانا

شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ" ص ۱۷۰

یا قریب قریب اسی قسم کے الفاظ نے ساختہ آپ کے قلم سے نکلتے چلے گئے ہیں، اہم یہی خیال ان کا دوسرے بھائیوں کے متعلق تھا۔ بقول میر شاہ خان مرحوم جیسا کہ ادوار نمائش میں ہے

واضح یہ ہے کہ

مولی اللہی خاندان کے ایک ایک فرد سے محبت اور فدایت تھی " ص ۱۷۱

لیکن ان ولی اللہی بزرگوں میں آپ کی خصوصی محبت و عقیدت کا مرکزی محور جیسا کہ دیکھو والوں نے نقل کیا ہے، حضرت مولانا ساعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک ہستی تھی "میر شاہ خان مرحوم تو کہا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

"مولانا شہید سے عشق تھا" ص ۱۷۲

اور شہوتِ قاعدہ من احب شہیناً اکثراً ذکرہ جس چیز سے آدمی کو محبت ہوتی ہے اس کی یاد کر
 بھی وہ زیادہ کرتا ہے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے عشق کے اس دھوے کے ثبوت میں خان صاحب
 مرحوم حضرت والاکئی اس عادت کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ حضرت نانوتوی کا حال یہ تھا
 کہ مولانا اسماعیل شہید کا آپ کی مجلس میں

”کسی نے تذکرہ چھیڑا تو اس کی بات کاٹ کر خود ان کا تذکرہ شروع کر دیتے تھے۔
 سچو چھو تو مولانا شہید کی علمی و روحانی عظمت کے سوا اس غیر عادی تعلقی میں جہاں تک میرا ذرا حصہ ہے۔
 قاعدہ ہند کے بانی مولانا ابوالحسن علی

کا قانون بھی کارفرما تھا۔ سیدنا امام الکبیرؒ نے اپنی زندگی کے حالات، نیز زیادہ تر ان کے ایک سنت زیادہ
 بزرگوں کو ایامِ مذہبیت ہی میں غمزدگی کا سبب سمجھا کر فرمایا تھا کہ ”ایک بے مال و محتاج آدمی جسے چھتے ہوئے
 نظر آئے تھے خود آپ کے استاد مولانا منہک علیؒ ہمارے اسماعیلی کے نقب سے خوش و غم ہو گئے
 کی بابتی مناسبت اور فطرتاً ہی آپ کا اقرار فرمایا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں مسلمانانِ ہند کے داخلی اصلاحات کی فہرست ”دونوں بزرگوں کی اگر ایک جوتی ہو
 ہوتا بھی چاہئے تھا“ اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعض نئے حالات اور اثرات
 نے جہاں تک میرا خیال ہے اس سلسلہ کو سیدنا امام الکبیرؒ کے عہد میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار
 بنا دیا تھا تفصیل کا تو موقع نہیں ہے۔ لیکن اجمالاً اتنی بات تو کہلی ہوئی ہے کہ غیر اسلامی عناصر چپکے
 چپکے مسلمانوں کی دینی زندگی میں حیلوں سے جذب ہوتے چلے جا رہے تھے، تاہم ہندوستان
 میں پہنچ کر وہی مکروہ و مہیب قالب سامنے آچکا تھا جسے دیکھ کر بے ساختہ سیدنا امام الکبیرؒ
 فرما نے پر عبور ہو جاتے تھے کہ

”کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں؟“ مثلاً فیوضِ قاسمہ
 ”اصل یہی مسئلہ ”سنت و بدعت“ کا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْحَقُّ | آگاہ یہ کہ اللہ ہی کے لئے ہے دینِ خالص

کے قرآنی نصب انہیں کی طرف واپس لے جانے کے لئے بیرونی آلائشوں سے مسلمانوں کے دین کو پاک کرنے کا سلسلہ حضرت محمد خالف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے جو شروع ہوا تھا۔ تطہیر و تزکیہ کا یہ کاروبار بہ تدریج آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا حضرت مجدد کے بعد خانوادہ دینی الہی نے اس راہ میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ تا انکہ حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنے شیخ طریقت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اس تحریک کو "ہندو گہر تحریک" بنا دیا۔ سنت و بدعت کی کشمکش کے ان ہی دنوں میں یورپ کی ایک ایسی عیسائی قوم کی حکومت ملک پر قائم ہو گئی، جو عیسائی دین کے قدیم کلیسائی نظام کی تقلید کا جو اپنی گردن سے اتار چکی تھی، بلکہ ایک طبقہ ان کا مذہبی مسلمات کے متعلق غیر معمولی طور پر بے باک ہو چکا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کے بعض مالک میں بھی یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اگلی نسلوں کے دین پر اعتماد کر کے پھلی نسلیں جن باتوں کو مانتی ہیں اور ہی ہیں ضرورت ہے کہ ان پر تنقید کی جائے۔ خصوصاً عرب جو مسلمانوں کا دینی مرکز ہے اس تحریک کا وزن اسی کے بعض خاص ملاقوں پر غیشتر معمولی طور پر پڑ رہا تھا۔ نجد کے باشندے، اور اسی علاقہ کے ایک عالم محمد بن عبدالوہاب اس تحریک کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔

یہی بیچ رہتی تھی تاثری اسباب تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہید جس جماعت کو چھوڑ کر احیاء علم و دین پر زور دیا "کی قدوسی صف میں شریک ہوئے تھے۔ اس جماعت کے بعض افراد تطہیر و تزکیہ کے اس عمل میں مدد سے تجاوز کرنے لگے۔ مٹھے ہوئے گوشت کے ساتھ زندہ گوشت پر بھی عمل جراحی کرنے لگے، بے احتیاطیاں اس حد تک ترقی کئے کہ پہنچ چکی تھیں کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی ضرائین اور شریعت تک کو نشتر زنی کی دھمکیاں دیں گئیں

تھیں، اور بقول سیدنا اقسام الکبیر

"علماء و فقہاء جن کو خلاصہ امت کہتے" ملک فیوض کا سب سے

اسی خلاصہ امت کو اپنے عمل جراحی کا تختہ مشتق ان لوگوں نے چاہا کہ انہیں لایا جائے مگر باصلاح

کی سیرزدہ سالہ دینی و علمی تالیف کے سارے اوراق ہی کو چاہتے تھے کہ بے دردی کے ساتھ پھاڑ دیا جائے۔

الغرض بدعت کے ساتھ ساتھ ایسی بے شمار چیزوں کو وہ بدعت ٹھہرانے لگے، جن کے بدعت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہی دشواری اور پیچیدگی تھی جس سے سیدنا امام الکبیر کو دو چار ہونا پڑا، ایک طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ”اسلامی دین“ کو غیر اسلامی آلودگیوں سے پاک کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا جائے لیکن اسی کے ساتھ ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی، جب دیکھتے تھے کہ بے تیزیوں سے کام لے کر نوچنے والے ان چیزوں کو بھی نوج کھسوٹ رہے ہیں جن کے بغیر مسلمانوں کی دینی زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائیگا۔ اپنی کتاب توثیق الکلام میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے مسلمان نمازوں میں امام ابو حنیفہ کی تحقیق پر بھروسہ کرتے ہوئے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ جو نہیں پڑھتے ہیں، اُن کے اس طرز عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ٹھہرا کر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو مورد طعن جو بنایا جا رہا ہے، سیدنا امام الکبیر کے قلم سے اسی موقع پر یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

”اس پر بھی امام ابو حنیفہ پر طعن کئے جائیں، اور نہ ارکانِ حرّات پر عدم جوازِ صلوٰۃ کا الزام

ہوا کرے تو کیا کیجئے، زبانِ قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں، دیوار نہیں، پہاڑ نہیں۔“

توثیق الکلام ص ۱۱

اسی سے ان کے ذہنی اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں چند مسطردوں کے بعد

ارقام فرماتے ہیں، :-

”جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے، دل جل کر خاک ہو جاتا ہے اور یوں

جی میں آتا ہے کہ ان زبانِ درازیوں کے مقابل میں ہم بھی لیں ترانیوں پر آجائیں، اور

دو چار ہم بھی سنائیں، پر آئیہ اذ اخاطبہم الجاہلون قالوا سلما، و اذ امزوا باللغو

مورد اکو اہم اور احادیث منع نزاع رافع ہیں ۲۱

علم دینی صبر و ثبات کے جتنی جذبات کا سیدہ امام الکبیر کے خیال کیجئے اور پھر سوچئے اگر دماغی گرفت کی وہ کیا کیفیت ہوگی جس سے ان الفاظ کے لکھنے پر آپ کو مجبور کیا۔

اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عثمانی مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہم کی زبانی ہی سلسلہ میں بعض لطیفے حضرت دالا کے فقیر نے سنے ہیں جن میں ایک مشہور لطیفہ یہ بھی ہے جو فقرہ الحمد للہ کے سرگرم رکن مولوی محمد حسین بٹاوی کے سوال کے جواب میں حضرت دالا نے ارقام مندرمایا ہے۔ بہر حال لطیفہ یہ سننے میں آتا ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب نے حضرت دالا کو لکھا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنی ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا کوئی شاگرد بھی وہاں موجود نہ ہو۔ حضرت نے منظور فرما کر جواب تحریر فرمایا کہ تشریف لے آئیں۔ (ترغیب) چنانچہ مولانا موصوف حضرت دالا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہی عرض کیا کہ تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں اجازت دے دی گئی

جہاں تک یاد پڑتا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ بات فقیر نے سنی تھی، فرماتے تھے کہ حجرہ بند کر دیا گیا، ہم طلبہ باہر تھے۔ دونوں میں گفتگو ہونے لگی، ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ اس گفتگو کو کسی طرح منسنا چاہئے (میں اسی دروازہ سے لگ کر بیٹھ گیا جس کے متصل ہی اندر حضرات بیٹھے تھے، حضرت دالا نے مولانا سے فرمایا کہ دیکھئے جس مسئلہ میں لگی گفتگو فرمائی ہو، اس میں دو باتوں کا خیال رکھئے۔ ایک یہ کہ مسئلہ زیر بحث میں خفیہ کا مذہب بیان فرمانا آپ کا کام ہوگا اور دلائل بیان کرنا میرا کام ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں، اس لئے میرے مقابل میں آپ جو قول بھی بطور معارضہ پیش کریں وہ امام ہی کا ہونا چاہئے۔ یہ بات مجھ پر حجت ہوگی کہ شامی نے یہ لکھا ہے اور صاحب درمختار نے یہ فرمایا ہے، میں ان کا مقلد نہیں۔ چنانچہ فاتحہ خلف الامام، رفع یدین آمین یا بھروسہ وغیرہ بہت سے مختلف ذیل مسائل زیر گفتگو آئے اور حسب شرائط طے شدہ مولانا محمد حسین صاحب مذہب اخلاف

بیان فرماتے اور حضرت دلا دلائل سے اسے ثابت کرنے حضرت کی تقریروں کے بیان مولانا محمد حسین صاحب جہوم جہوم جاتے اور بعض اوقات توجوش میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے کہتے کھڑے ہونے کے قریب ہو جاتے جب گفتگو ختم ہو چکی تو محمد طیب (مولوی محمد حسین صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

”مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور مقلد ہوں یعنی بایں زور علم و فراست و قوت استنباط تقلید کے کیا معنی؟“

جواب میں حضرت شیخ الہند کہتے تھے میں نے سنا حضرت دلا الارشاد فرما رہے ہیں

”اور مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور غیر مقلد ہو یعنی مدعی اجتہاد ہو“

اسی طرح ”خلاصہ است“ کے دوسرے رکن ”فقرا“ کے طرز عمل اور طریق زندگی ان کے خاص مشاغل اور احساسات و وجدانات جن کی اجمالی تصویر ”تصوف“ سے کی جاتی ہے، یہاں کی یہ ٹولی اس طبقہ پر جن حر فگیروں اور نکتہ چینیوں سے کلام لیکر غلطی کے ساتھ صحیح عن اصر کو بھی ملایا میٹ کرنے پر تلی ہوئی تھی، لکھن کے ساتھ گہوں کو بھی دینی بصیرت سے محرومی کی وجہ سے جیس رہی تھی۔ گو یا دین کی روح ہی کے بغض کرنے کی نگر میں مشغول تھی، سیدنا الامام الکبیر اس طبقہ کے ان رجحانات سے بھی غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ اپنی بعض تحریروں میں بڑی تسویوں کے ساتھ اسی سلسلہ میں ”سنت و بدعت“ کی صحیح حدود کو سمجھانے کی آپ نے کوشش کی ہے حکیم ضیاء الدین مرحوم (امپور منہیاران والے) کے نام مطبوعہ مکتوب فیوض قاسمیہ کے مجدد میں جو شریک ہے، ہے تو چند صفحات ہی کا یہ خط لیکن ”سنت و بدعت“ کے متعلق جتنی بڑی جھڑپیں ہیں کم از کم فقیر کی نظر سے گزری ہیں، میرا احساس تو یہی ہے کہ شاید اتنی ”جاہلیت“ کے ساتھ مسئلہ کا تصنیف کسی ایک کتاب میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ اسی میں نمونہ دوسری باتوں کے یہ سمجھاتے ہوئے کہ

علاج میں بعض ایسے امور ہوتے ہیں، بعض اوقات وہ ضررنا اور عرضنا امور ہوتے ہیں

پر لکھنے یا کہنے میں نہیں آتے، کیونکہ عاقل اور بے وقوف سب ان کے مامور بہ ہوتے
کو سمجھ جاتے ہیں۔“

پھر مطلب کو مثال سے ذہن نشین فرماتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ
جیسے شربت بنفشہ کہ بعض اوقات پیساری کی دکان وغیرہ پر تیار نہیں ملتا اس
صورت میں اس کی ترکیب کا دریافت کرنا پھر اس کے اجزاء کا مثل بنفشہ و شکر
مار (پانی) وغیرہ اور اس کے سامان کا مثل دیگچی و آتش دان وغیرہ فراہم کرنا بھی
مامور بہ ہوتا ہے، اور اس مامور بہ کو لکھا پڑھا، ہر کس و نا کس سمجھتا ہے۔“
۲۵ فیوض تاسمیہ

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مریض یا مریض کے تیمار دار پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تم نے
دیگچی میں دھاتوں کو کیوں ڈالا، دیگچی کو جو لمبے پر کیوں چڑھایا جو لمبے کے لئے ایندھن کا بندوبست
کیوں کیا۔ طبیب نے تو صرف ”شربت بنفشہ“ کے چینی کا حکم دیا تھا، اور یہ سارا کاروبار شربت پلنی
کے سلسلے میں جو تم نے انجام دیا ہے اس سے طبیب کے مشاغل کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔
تو بحر جنون کے ادب بھی کچھ سمجھا جاسکتا ہے۔

سید نلالہ ام الکبیر نے اسی طبی تمثیل کو پیش کر کے سمجھایا ہے کہ
”ایسے ہی علاج قلبی میں بہت سے امرد ہوتے ہیں، کہ وہ صراحتاً مامور بہ نہیں ہوتے،
ضمناً و عرضاً مامور بہ ہوتے ہیں، اس وجہ سے ظاہر میں وہ بدعت معلوم ہوتے ہیں،
حقیقت میں بدعت نہیں۔“ ۲۵

حقیقت یہ ہے کہ حضرات صوفیاء کرام کے بعض مشاغل جن کا حقیقی مقصد ”تصفیۂ باطن“
اور ”صحیح نسبت“ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، ان کے متعلق یہ شبہ کہ کتاب و سنت میں ان کا ذکر
نہیں ملتا، انصاف سے اگر کام لیا جائے تو آسانی اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، ہاں! بجائے
وسیلہ کے ان مشاغل اور مقدمات کو دین کے حقیقی مطالبات میں ان کو شریک کرنا، یہ خیال

یہ عقیدہ بلاشبہ بدعت بن جائے گا۔ خود سیدنا الامام الکبیرؑ نے یہی لکھا ہے کہ
 ”اگر ان امور کو کوئی مقصود بالذات سمجھے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت ان کی حجاب
 آوری بوجہ ذریعہ ہونے امور مسنونہ کے نہیں، تو اس وقت میں یہی امور دور بہ
 نہ رہیں گے۔“

اسی کے بعد فرماتے ہیں کہ

”تو اب لاریب یہ سب امور بدعت ہو جائیں گے۔“

اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ شرعی مطالبات کی تکمیل کی صورت اگر ان
 امور کے بغیر کسی وجہ سے کسی کے لئے ممکن ہو جائے تو فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یہ ہوگی کہ
 ”شریت ہفتہ کہیں تیار مل جائے تو پھر وہ امور جن کو ذریعہ تحصیل شریعت ہفتہ قرار دیا
 ہے، مامور بہ نہ ہے۔“

اور جیسے صوفیہ کے بعض مشاغل جن کا صراحتاً ذکر کتاب و سنت میں نہیں ملتا، لیکن امور مطلوبہ
 جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ مثلاً

”توجہ الی اللہ، اور تحصیل محبت خداوندی، اور قلع قمع محبت دنیا اور اہل دنیا اور
 تہذیب اخلاق و ازالہ خصال ناشائستہ۔“

ان امور کے حصول میں ان مشاغل سے مدد ملتی ہے، اور بقول ان ہی کے
 ”اہل عقل و تجربہ کاروں پر پوشیدہ نہیں کہ امور مذکورۃ الصد کو بیشک ان مقاصد
 کے حصول میں مداخلت تام ہے۔ اس لئے ضمناً اور عرضاً مامور بہ ہوتے۔“

اسی طرح ابتدا و اکتوب میں اس قسم کی چیزوں کا مثلاً آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ
 ”کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ کلام اللہ اس طرح سن
 اولہ الی آخرہ اور ان میں لکھا ہوا تھا، نہ اس میں اس زمانہ تک نازلہ برائے یہ حرم ایجاد
 ہوئے تھے، نہ کتب احادیث یوں تصنیف ہوئیں، نہ تمدن کتب فقہ و اصول فقہ

اور تفسیر کا دستور تھا۔

طبقہ علماء کی مذکورہ بالا خدمات یا اسی نوعیت کی جو دوسری چیزیں ہیں۔ سب کو آپ نے اسی مد میں شمار فرمایا ہے جو سنت اور غرضاً مامور ہیں یعنی شریعت کے مطالبات کی تکمیل میں معاون ممد ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک حکیمانہ فیصلہ سیدنا الامام الکبیر کا وہ بھی ہے جسے آپ کی کتابوں میں تو میں نے نہیں پایا ہے، لیکن آپ کے خلف رشید مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حیدر آباد کی ایک مجلس میں اس کا تذکرہ فرمایا تھا، خاکسار بھی اس مجلس میں شریک تھا، جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں درج کر دوں۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ شرعی مطالبات کو دہ حصوں میں تقسیم کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ایک حصہ قوان مطالبات کا ایسا ہے جس کی روح اور قالب یا معنی اور صورت دونوں ہی کو شریعت نے متعین کر دیا ہے۔ مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ روح اس کی ذکر اللہ ہے، اقامۃ الصلوٰۃ لذلک امری، قائم کرو نماز کو میری یاد کیلئے، مشریت نے اس کی تصریح بھی کی ہے، اور اسی کے ساتھ نماز کے قالب اور ظاہری صورت کو بھی متعین کر دیا ہے، یعنی ہر رکعت میں قیام کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے کہ ایک رکوع دو ہجڑے ہوں وغیرہ وغیرہ، پس اس قسم کے مطالبات میں تو روح اور معنی کے ساتھ شرعی مطالبات کی ظاہری شکل و صورت میں بھی کسی قسم کی تربیم یا اضافہ کا حق کسی کو نہیں ہے، اسی کے مقابلہ میں شرعی مطالبات ہی کی ایک قسم ایسی بھی ہے کہ اصل مقصد اور روح کا مطالبہ کر کے قالب اور شکل و صورت کے مناسبت آزادی بخشی گئی ہے۔ مثلاً جہاد ہی کے حکم کو لیجئے، اعلا کلمۃ اللہ اور کفر کی شوکت و قوت کا ازالہ اس حکم کی روح ہے، لیکن شریعت نے اس کا پابند لوگوں کو نہیں بنایا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کا زچہ قالب کیا اختیار کیا جائے، عہد نبوت میں صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہاد کے فرض کو

لے سنت و بدعت کے بارہ میں اس حکیمانہ فیصلہ کی تفصیلات اور بہت اہل لطیف مباحث مصباح التراویح میں موجود ہیں جو شوق رکھتے ہوں اس میں مطالعہ فرمائیں۔ محمد طیب غفرلہ

اور برچھے، ڈھال، تیر و کمان وغیرہ آلات کے ذرائع کو اختیار کر کے ادا کرتے تھے، لیکن موجودہ زمانہ میں جنگ کے آلات بدل گئے ہیں، آج کل توپ، بندوق، نئے آلات حرب استعمال ہوسکتے ہیں، پس جہاد کے حکم کی تعمیل کی سعادت ان جدید آلات حرب کو استعمال کر کے جو حاصل کرنے کا یقیناً شریعت ہی کے مطالبہ کی وہ تعمیل کر رہا ہے، اس پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ جہاد میں خلاف مسنون چیزوں کا استعمال کر رہا ہے، اور بجائے سنت کے وہ بدعت کا مرتکب ہے۔

برسوں کی سنی ہوئی بات ہے، جہاں تک حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے بات سمجھ میں آئی تھی، اپنے الفاظ میں میں نے اس کو ادا کر دیا ہے۔ کچھ بھی ہو جو بھی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہے، وہ حضرت دالکی مذکورہ بالا تقسیم کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جہاد کا جو حال ہے، تقریباً کچھ یہی صورت ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ذکر اللہ کی بھی نظر آتی ہے۔ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہ و بعدہ (یعنی کھڑے بیٹھے لیٹے) ہر حال میں ذکر اللہ کو مشغول بنانے والوں کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، اللہ کے ذکر کا حکم بھی دیا گیا ہے، اور اسم اللہ کے ذکر کا مطالبہ بھی قرآن ہی میں پایا جاتا ہے، لیکن ان ذکری مطالبات کی تعمیل کا کوئی خاص قالب نماز وغیرہ مطالبات کی طرح شریعت نے مقرر نہیں کیا ہے، پس جہاد کے حکم کی تعمیل حالات و در وقت زمانہ کے لحاظ سے جس شکل میں بھی کی جائے گی، جیسے وہ مشرعی مطالبہ ہی کی تعمیل ہے، اسی طرح صدیقیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے حالات کے لحاظ سے جو قالب اور جو شکل بھی ذکر اللہ کے لئے جس زمانہ میں بہ اختیار کی ان کے اس طرز عمل کے متعلق یہ سوال کہ شریعت میں ان خاص طریقوں کا پتہ نہیں چلتا، خود ہی سوچنے کہ کیا صحیح دینی بصیرت کا یہی تقاضا ہے؟

بہر حال سیدنا امام البکر رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے مسلمانوں کی دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ کا کام تو یک سوئی سے انجام پا رہا تھا، مقابلہ میں صرف وہی طبقہ تھا جو

ما وجدنا علیہ ابناءنا و اولیٰہی | ہم نے اپنے پچھلے باپ و داد کو اس پر نہیں پایا
کو حق و باطل کا صحیحاً شہرہ دیتے ہوئے اسی پر اصرار کر رہا تھا، لیکن تطہیر و تزکیہ کے اس اصلاحی

میدان میں سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں اترے تو دوسری ٹوٹی مسلمانوں میں ان لوگوں کی پیٹھا ہو چکی تھی جو

ان هذ الا اساطير الاولين | یہ تو صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں

کا حربہ بے دردی کے ساتھ ہر اس چیز پر بے محابا چلا رہی تھی جو اگلی نسلوں سے منتقل ہو کر پچھلی نسلوں تک پہنچی تھی، فقہ و تصوف کا سدا سرا یہ ان کے نزدیک

ان هذ الا افك قدیمہ | یہ محض وہی پہلی بہتان بندی ہے۔

سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ واقعی معیار حق و باطل کا نہ آبائیت ہی کا اول الذکر مسلک ہے اور نہ افکیت کا آخر الذکر طریقہ، ایسی صورت میں اس شخص کا کام متدرجاً بہت زیادہ دشوار ہو جاتا ہے، جو ان دونوں مختلف ذہنیاتوں کے اثر سے آنا دہو کر حق و باطل کے واقعی معیار پر چیزوں کو پرکھنا چاہتا ہو، سچ پوچھئے تو کچھ ایسی قسم کی صورت حال سے مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر دوچار تھے، ان کی دینی بصیرت پارہی تھی کہ ان دونوں متخالف ذہنیاتوں کے نتائج میں سچ کے ساتھ کچھ جھوٹ اور جھوٹ کے ساتھ کچھ سچ بھی شریک ہے، جھگڑوں و رگڑوں کے اس طوفانی ہنگامہ میں حق و باطل کے انبار سے اصل حقیقت کو کھینچ کر باہر لانا، اور آدمی خود جو کچھ دیکھ رہا ہو دوسروں کو بھی دکھانا، خود سوچنے کہ یہ کتنا نازک کام ہے، لیکن اسی حد سے زیادہ نازک کام کہ جہاں تک آپ کے امکان میں تھا کمال حزم اور غایت احتیاط کے ساتھ آپ انجام دیتے رہے، اسی سنت و بدعت والے مسئلہ میں یہ سمجھانے کے بعد کہ بہت سی باتیں جو بدعت نہیں ہیں،

”ان کو بدعت کہنا اپنا تصور فہم ہے“

لیکن احتیاط دیکھئے کہ صاف لفظوں میں ان امور پر ”سنت“ کے لفظ کے اطلاق کو بھی آپ پسند نہیں فرماتے، بلکہ مذکورہ بالا تفہیمی کوششوں کے بعد آخر میں لکھتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ ”ہاں سبب اس کے کہ ظاہر شرع میں یہ نامور ہے نہیں، اس وجہ سے ان کو اگر

سنت نہ کہا جائے اور ملحق بالسنّت کہا جائے تو مضائقہ نہیں“ ۱۷ فیوض قاسمیہ

اسی زمانہ میں لوگوں نے ”سماع موتی“ کے پرانے مسئلہ کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنا چاہا تھا، عام مسلمانوں کے قبری کاروبار کے ان قصوں کو دیکھ کر جن کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا یہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ ”کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں“ بعضوں نے جاہل موتی کے سماع ہی کا انکار کر دیا جائے مطلب ان لوگوں کا یہ تھا کہ بنیادی اڈے ہی کو اڑا دیا جائے۔ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔

پوچھنے والے نے سیدنا الامام الکبیر سے بھی اسی مسئلہ کو دریافت کیا۔ حضرت دالالے چند اوراق میں سوال کا جواب دیا ہے اور ”جمال قاسمی“ نامی مجموعہ مکاتیب میں یہ جواب شریک ہے، حاصل یہی ہے کہ سماع موتی کا آپ نے انکار نہیں فرمایا، لکھا ہے کہ جب

”قبرستان میں گذرے تو سلام سے درلے نہ کرے، اور من پڑے تو یہ یہ مناسب وقت بھی پیش کرے، ورنہ سخت بے مردتی ہے، جو یوں آنکھیں چرائے چلا جائے“

اور یہ تو خیر قول ہے، آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں آپ کے مسلک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہ

”بزدلوں کے مزار پر جایا کرتے، دعا کر کے چلے آتے“

آگے صراحت اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے کہ

”سماع اولیاء اللہ کے قائل تھے“

اور قائل ہی نہیں بلکہ آگے لکھتے ہیں کہ

”اگر کسی نے کسی مزار پر جاتے، اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا، تو آواز سے عرض کرتے

کہ آپ میرے واسطے دعا کریں“ ۱۸

اسی سلسلہ میں حکیم صاحب مرحوم نے مکمل شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے مزار واقع مراد آباد کے اس قصہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، جسے شاید کسی جگہ میں درج کر چکا ہوں، حتمی صہ یہی ہے کہ

مکمل شاہ صاحب کے مزار کے پاس ایک دفعہ حکیم صاحب نے رکھا کہ سیدنا الامام الکبیر
تشریف فرما ہیں۔ حکیم صاحب بھی مزار کے قریب پہنچے اور بے خیالی میں ان کا پاؤں مزار شریف سے
چھو گیا، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ حضرت والا کو دیکھا کہ بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے میرے
پاؤں کو کپڑے ہوئے مزار سے الگ کر رہے ہیں، حکیم صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر ترزوہ طاری ہو گیا
اور زمانہ تک اپنی اس جرات بے جا پر دل نادم رہا۔

اور ایک حکیم صاحب ہی نہیں، مولانا طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی یادداشت میں
ارقام فرمایا ہے کہ حضرت نانوتوی

”اپنے بزرگوں سے میں نے یہ سنا ہے کہ کایہ شریف تشریف لے جاتے تو رڑکی سے
پیدل، خشکے پاؤں ہو جیتے اور شب کو روضہ میں داخل ہو کر کواڑ بند کر دیتے تھے، اور
تمام رات حضرت صابر صاحب کے مزار پر تنہائی میں گزارتے تھے۔“

اسی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے مولانا منظور نعمانی مدیر الفرقان (لکھنؤ) کے
حوالہ سے روایت بھی درج کی ہے کہ سنبھل سے مراد آباد جاتے ہوئے راستہ میں ایک جھاری
کے اندر اینٹوں کا ڈھیر سا نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ سیدنا الامام الکبیر اسی راہ سے چلے گئے پر گزر
رہے تھے، جوں ہی کہ تاگہ اس جھاڑی کے سامنے پہنچا، تاگہ کو روک جائے گا حکم دیا، اور
ترک اینٹوں کے اس ڈھیر کے قریب پہنچے، مراقب ہو گئے، مراقب سے فارغ ہو کر تاگہ کی
طرف جا رہے تھے اور زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے۔

”اللہ اکبر بہت ہی جلالی آدمی ہیں۔“

مولانا منہر صاحب نے سنبھل کے رئیس نواب عاشق حسین صاحب سے یہ روایت
سنی تھی، اس سفر میں حضرت والا کے ساتھ خود نواب صاحب موصوف اور ان کے ماموں
منشی حبیب الدین مرحوم تھے، جن کا شمار سیدنا الامام الکبیر کے عشاق میں ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے، جس شخص کے متعلق اس قسم کے مشاہدات، موعظات، منظر، رنگ

پہنچے ہوئے ہوں۔ مثلاً: مرد ہر میں سادات کا جو خاندان شیخ آبن کی اولاد میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ”شیخ“ کے لفظ کی وجہ سے آبن صاحب کی سیادت پر لوگ شک کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان ہی شیخ آبن کے مزار پر سیدنا الامام اکبر مولانا احمد حسن امروہوی کے ساتھ تشریف لے گئے جن کا نسب تعلق شیخ آبن سے تھا۔ مزار پر مرقبہ کے بعد سر اٹھا کر مولانا احمد حسن کو خطاب کر کے حضرتؑ فرماتے لگے، کہ

”مولوی احمد حسن اب مشہور کرو اپنی سیادت میں۔“

یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں لوگ جو نقل کرتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ”سماغ مرقی“ کے سلسلہ میں حضرت دالانے جس پہلو کو ترجیح دی ہے اظہار ہے کہ اس کے سوا اور رد کر ہی کیا سکتے تھے۔ کیا اپنے مشاہدے کا انکار کرتے؟ لیکن بایں ہمہ اسی مضبوط مکتوب میں جس میں ”سماغ مرقی“ کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو نقلی و عقلی وجوہ کی روشنی میں پیش فرمایا ہے، اسی میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”عوام اپنے خیال خام میں اولیاء کو قادر اور منصور یعنی ”شعی جہتاج الیہ“ سمجھتے ہیں،

تو اگر اس زمانہ میں اس امکان استماع کا بھی چرچا کیا جائے تو اس غل سے نصیر مینی تو کچھ متصور نہیں، البتہ تقویۃ مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے۔“

اس لئے مصلحت کا تقاضا آپ نے ہی قرار دیا ہے کہ

”مناسب ہے کہ عوام کو فقط طریقہ مسنونہ زیارت قبور کا تعلیم کیا جائے اور اس سے

زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دے۔“ ص ۱۱ جہاں قاضی

یہی آپ کا خیال بھی تھا، دیکھنے والوں کا بیان بھی یہی ہے، کہ اسی کے مطابق آپ کا عمل بھی تھا،

۱۵۔ اس منکاشہ کا ذکر مولوی اظہار النجیب عیسیٰ امروہوی نے اپنے خط میں کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی محمود احمد صاحب عیسیٰ نے بعد کو تاریخ امروہہ کا آب لکھی جس میں شاہی دثانی اور پرانے کاغذات پیش کئے ہیں جن کے شیخ آبن کی سیادت کی تاریخی شہادت بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے ۱۲

حکیم منصور علی خاں نے بزرگان دین کے مزاروں کی حاضری کے متعلق مذکورہ بالا دستور کا جہاں ذکر کیا ہے کہ یہ دستور قس و قس وقت تک تھا جب آپ تنہا ہوتے، لیکن بجائے تنہائی کے حکیم صاحب ہی کا بیان ہے کہ

”ہمراہیوں کے ساتھ آہستہ دعا اور سورتیں پڑھ کر چلے آتے۔“ ۱۹۲ مذہب منصور
 ”زیارت قبور کے طریقہ مسنونہ“ سے غرض یہی تھی، کہ سلام والی دعا کر کے قرآن پڑھ کر ثواب اس کا صاحب مزار کو پہنچا دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف عام مسلمانوں کے غلط رجحانات کی تصحیح بھی کرنا چاہتے تھے، اور جہاں تک ممکن تھا مصالح کے اقتضاؤں کی بھی رعایت فرماتے تھے، لیکن ہی کو ساتھ اپنے نزدیک جس چیز کو حق جانتے تھے، اس کو چھپاتے بھی نہ تھے، مصلحت کا مطلب آپ کے یہاں یہ نہیں تھا کہ کسی حقیقت اور واقعہ کا انکار کر دیا جائے خود اس کی مثال دین میں موجود تھی، اسلام سے پہلے شرک کی گرم بازاروں میں جیسا کہ دنیا جانتی ہے، ملائکہ کے عقیدے کو بہت زیادہ دخل تھا، یہ بات کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کے علاوہ بھی ایسی نادیدہ مخلوق زندہ ہستیاں ہیں جن کے ساتھ نظام عالم کے مختلف شعبوں کی تنظیم و نگرانی متعلق ہے۔ بعض ان میں پانی کے، بعض ہوا کے بعض پرانے کے بعض موت کے بعض حیات کے، فرشتے ہیں، اور قدرت ان ہی کو ذریعہ بنا کر کائنات کے سارے کار و بار کو انجام دے رہی ہے، سمجھا جاتا ہے کہ فرشتوں یا دیوتاؤں کی پوجا یا ث اور عبادت کا ردراج اسی عقیدے کے غلط استعمال کی پیداوار ہے۔ ایسی صورت میں شرک کے قلع قمع کی یہ ایک کارگر تدبیر ہو سکتی تھی کہ ”الملائکہ“ کے عقیدے ہی کو دین سے خارج کر دیا جائے۔ مصالح کی وجہ سے اگر کتمان حق جائز ہوتا، تو ”الملائکہ“ کا عقیدہ سب سے زیادہ کتمان کا مستحق تھا، لیکن اس عقیدے سے خاموشی تو بڑی بات ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دینی دائرے میں داخل ہونے کے لئے جن امور پر ایمان لائے کا مطالبہ سب سے پہلے کیا جاتا ہے، اسی مطالبہ میں اہمیت باللہ کے بعد ہی وہ ملائکتہ کا جزو بھی شریک ہے، اللہ سمجھایا ہی گیا ہے کہ ”الملائکہ“ کو سزا کر اس عقیدے

کے استعمال کا جو غلط اور مسلک طریقہ ہے اس سے لوگوں کو روکا جائے۔ اسلام کی تاریخ موجود ہے مسلمان ملائکہ کے وجود کو بھی اپنے دینی عقیدے میں شریک کئے ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں مشرک کی دوسری قسموں میں چاہے مسلمان کتنی ہی تباہیوں کے شکار ہوئے ہوں لیکن ”ملائکہ“ یا دیوتاؤں کی عبادت کا مدراج شاید ان میں کبھی واپس نہ ہوا، ایسی صورت میں سوچنا چاہیے کہ ”قبری کا دربار“ روکنے کے لئے قطعی طور پر ”سارع موٹی“ کا انکار اور اسی کو دینی مصلحت کا اقتضا قرار دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے

یہ دوسری بات ہے کہ شرعی نصوص کا نتیجہ ہی کسی کے نزدیک سارع موٹی نہ ہو۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ سارع موٹی ہی شرعی نصوص کا اگرچہ اقتضا ہے، لیکن مصلحت کی بنیاد پر اس کا انکار کرنا چاہئے میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کی بات ہے جسے قرآن میں

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَانْتُمْ تَعْلَمُونَ | حَقِّ دَبَّاطِلِ كَوْمَتِ رِلَاؤِ اور جانتے ہو جھٹے حَقِّ كَوْمَتِ چھپاؤ۔

کے الفاظ میں یہود کا شیوہ قرار دیا گیا ہے، زیادہ سے زیادہ مصالح کی رعایت جائز بھی ہو سکتی ہے تو اسی حد تک جیسا کہ سیدنا الامام الکبیر نے ارقام فرمایا ہے، کہ زیادہ جہاں اس مسئلہ کا عوام میں مناسب نہ ہوگا، ان کو بس قبروں کی زیارت مسنونہ کا طریقہ بتا دیا جائے۔

بہر حال جہاں تک سیدنا الامام الکبیر کے اقوال و افعال ہم تک پہنچے ہیں، ان سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف خائف کائنات کے ساتھ آپ چاہتے تھے کہ عبدیت خالصہ اور کامل بندگی کا رشتہ اسلام کے جو قائم کیا ہے، اس میں کسی قسم کی چمک پیدا نہ ہو، مسلمانوں کے قدم ٹھیک ایسا نہ نبض و ایتانک ہستعین پر پوری قوت کے ساتھ جے رہیں، تو دوسری طرف پوری نگرانی اس کی بھی فرماتے رہے کہ اللہ کے انعام یافتہ بندوں کے ساتھ بھی مسلمانوں کا احترامی ربط مصلحت نہ ہو

۱۔ مکتوبات حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ میں حضرت مدظلہ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں تصریح فرمائی ہے کہ ہمارا ارادہ ہمارے بزرگوں کا ہی مسلک ہے کہ سارع موٹی ثابت ہے۔ محمد طیب غفرلہ

دوسرے نظروں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ

صراط الذین انعمت علیہم اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا

پر قائم رہنے کی جو آرزو قرآن ہی نے مسلمانوں میں پیدا کی ہے، چاہتے تھے کہ اس آرزو کا
نور بھی ان کے دلوں میں کم نہ ہو، 'ارواحِ ثلاثہ میں امیر شاہ خان مرحوم کے حوالے سے یہ روایت
جو نقل کی گئی ہے کہ

’کسی عامی نے حضرت نانو تووی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت یہ جو بزرگوں کے قریب
دفن ہونے کی تمنا کرتے ہیں اس سے کیا فائدہ؟ جب کہ نہ کسی کی برائی کسی پر پڑے گی،
نہ کسی کی نیکی کسی کے کام آئے گی۔‘

شرکاء آلودگیوں کے متعلق جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پیدائش میں بزرگوں کے احترامی جذبات
کی حوصلہ افزائیوں کو زیادہ دخل ہے۔ ان کے لئے بڑا اچھا موقعہ تھا کہ اس عامی کے عاقلانہ خیال
کی تائید کرتے ہوئے کہہ دیتے کہ ہاں تم سچ کہتے ہو، لیکن امیر شاہ خان مرحوم کا بیان ہے، ’کہ

’لے یہ مسائل الدین نامی تصانیف تھا جو دیوبند کا باشندہ تھا اس نے حضرت نانو تووی رحمۃ اللہ کا دعویٰ اپنی ابتدائی عمر
میں پایا تھا۔ بعد میں حضرت الامام علامہ امیر شاہ صاحب رحمۃ اللہ سے بیعت ہوا۔ اس نے یہ واقعہ مجھ سے بھی بیان
کیا تھا۔ محو طیب غفرلہ‘

’لے یہ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے قرآنی نعوس مثلاً لیس للذین الاما سسی (یعنی نہیں ہے آدمی کیلئے گروہی جو
کچھ اس نے خود کوشش کی، یا لا فخر ولا مدۃ و فدا آخری (ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا) کو پیش نظر رکھ کر اس قسم
کا فیصلہ نہ نہ شفاعت ہی سے کوئی مستفید ہو سکتا ہے‘ ’ادعوہ مالی ہو بایمانی کسی قسم کی عبادت کا ثواب‘ (دوسروں
سبک نہیں پہنچا یا جاسکتا) ظاہر ہے کہ حامیانہ فیصلہ سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، کیونکہ شفاعت
کا قانون ہو، یا ایصالِ ثواب کا ان سب کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ آدمی پہلے ایمانی دائرے میں اپنے آپ کو داخل
کر چکا ہو، ورنہ جو سمن نہیں ہے یقیناً اس کے لئے شفاعت ہی مفید ہو سکتی ہے اور نہ ایصالِ ثواب کے قانون سے
ہو مستفید ہو سکتا ہے، پس معلوم ہوا کہ ان امور سے بھی فائدہ ایمانی دائرے میں داخل ہونے کی سہی اور کوشش ہی سے
آدمی کو پہنچا ہے، پس ان صورتوں میں بھی یہ بات صادق آتی ہے کہ اپنی سہی اور کوشش ہی سے وہ مستفید ہوا اگر
ہو میں ہونے کی سہی اور کوشش اس کی طرف سے نہ ہوتی تو یقیناً وہ ان قوانین سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے برعکس اس عای کے اس غلط احساس کا انکار کرنا چاہا، چونکہ بے چارہ عای آدمی تھا، علانہ طریقہ سے فحاشی مناسبت معلوم نہ ہوئی، بلکہ اس وقت جس کام میں مشغول تھا، یعنی حضرت والا کو پنکھا پھیل رہا تھا، پنکھا بڑا تھا حضرت کے سوا اور بھی جو اس مجلس میں شریک تھے۔ پنکھے کی ہوا سے مستفید ہو رہے تھے۔ سامنے کی اسی مثال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھنے والے سے دریافت فرمایا کہ ”بھائی! تم اس مجمع میں پنکھا کس کو چل رہے ہو؟“ اس نے عرض کیا کہ ”حضرت آپ کو“ آپ نے پوچھا کہ ”ہو اور دل کو بھی لگ رہی ہے؟“ اس نے کہا کہ ہاں۔ تب یہ کہتے ہوئے کہ ”یہ جواب ہے تمہارے سوال کا“ اس کو یہ سمجھانے لگے کہ

”حق تعالیٰ کی طرف سے جب رحمت و مغفرت کی ہوائیں چلتی ہیں، تو مقصود وہی بزرگ ہوتے ہیں، مگر حسب قرب و بعد پہنچتی ہیں، سب اس پاس والوں کو بھی ملتا۔ کسی مولوی کے چپ ہونے کے لئے خواہ سامنے کی یہ مثال کافی ہو، یا ناکافی، لیکن پوچھنے والا غریب عای آدمی تھا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تسلی اسی مثال سے ہو گئی، اب سلسلہ کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، جس پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔ تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مشرکان آلودگیوں کے خطرات سے جو خود بھی چوکتا رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ

اس سلسلہ کی اصل علی حقیقت رہی ہے جس کی طرف اپنے نوٹ میں خاک رے اخراج کیا ہے، بزرگوں کے مکانی بچارے سے بھی فائدہ ہوسکتا ہے کہ پہنچ سکتا ہے، اور نہ ابو جہل خواہ مکہ ہی میں دفن ہوتا، اس غریب کو زمین کی پاکی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ آخر دفن ہونے پر بزرگوں کے چارہ اور قرب مکانی کا کوئی فائدہ اگر نہ ہوتا، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روضہ پاک میں دفن ہونے کی آرزو کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیوں قرار دیتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے میر شاہ خان کی اس روایت پر ایک ماضیہ بھی ارقام فرمایا ہے، جس میں مشہور حدیث ”ھم القوم لا یشقی جلیسہم“ واللہ داسے لوگ ایسی قوم کے لوگ ہیں جن کا ہم نشین ناکام نہیں ہو سکتا، کی عمویت سے بھی مسلمانوں کے اس خیال کی تائیدی شہادت پیدا کی ہے کہ بزرگوں کے قرب دفن ہونا مردے کے لئے فائدہ بخش ہے، ایک ضعیف روایت کا بھی اس سلسلہ میں لوگ تذکرہ کرتے ہیں جس میں صاحبین کے منظر میں دفن ہونے کا ہدایت کی گئی ہے، اگرچہ حدیث کی سند پر اعتماد نہیں ہے (باقی صفحہ پر)

اللہ کے معاملہ میں مسلمانوں کی پوری پوری نگرانی کی جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی اللہ والوں کی رفاقت و معیت کے عقیدے کی حفاظت میں کتنی غیر معمولی بیدار دماغی سے کام لے رہا ہے مرنے کے بعد بھی جہانی رفاقت اور مکانی معیت کی قدر و قیمت کے احساس کی کمی جس کے لئے ناقابل برداشت تھی، سمجھا جاسکتا ہے، کہ ان ہی بزرگوں کے معنوی حسن رفاقت کی قرآنی آرزو کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کیا ہوگی یا کیا ہو سکتی ہے۔

سچ پوچھئے تو ”کچھ دار و دروازہ“ کا یہی مسلک جس میں جام شریعت کے ساتھ سندان عشق و دنوں ہی کے حقوق اور اقتقاؤں کی تکمیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے، عملی طور پر اس کو ناپائیدار اور کر کے دکھا دینا، مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلے میں مسیدنا الامام الکبیر کا اپنے عہد خاص میں ایک ایسا کارنامہ ہے، جس سے جیسا کہ چاہئے تھا، مسلمانوں کا نہ تو وہ رجعت پسند آبائی طبقہ ہی مانوس ہو رہا تھا جو حق و باطل کی مشناخت میں ہمیشہ یہ دیکھنے کا عادی تھا کہ ان کے والد مرحوم کا خیال کیا تھا، اور نہ بیابانوں کا وہ گروہ اس مسلک کو پسند کرتا تھا، جو مسلمانوں کی دینی تاریخ کے دباؤ سے آزد ہو کر سن مانے فیصلوں پر جبری ہو گیا تھا۔ کچھ دن غیر معمولی کش مکش کی

(سلسلہ ۱۲) علامہ مخدوم جنہوں نے مفاد حسنہ میں اس رویت کا ذکر کر کے محدثین کی تنقید کو نقل کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال ہمیشہ مقبول رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہذا ۱۲ھ اللہ والوں کے جوہر میں دفن ہونے کو اچھا سمجھتے رہے ہیں۔ ۱۲

۱۱ھ واقعہ یہ ہے کہ جتنے مبلغ پہلے ہی میں ان دونوں تعلقات کا ذکر یعنی اللہ اللہ والوں کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ تعلق کی ضرورت کیا ہے چاہئے سر منقح کر دیا گیا، شاید دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی، خالق باغات اللہ تعالیٰ کو ساتھ آیا اللہ تعالیٰ کے احساس کو پیدا کرنے کے بعد آگے حکم دیا گیا ہے کہ ”انعمت علیہم“ دین لوگوں پر خدا نے انعام کیا، ان کے حرا پر بھی چڑھایا جائے اسی کی دعا کی جائے اور سب جانتے ہیں کہ یہ نعمت علیہم اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے جس کی تفصیل اولیٰ اللہ الذین انعم اللہ علیہم من الذین یبینون الصدایقین والشیہد اعوان الصالحین وحسن اولئک رفیقاً میں فرمائی گئی ہے ۱۲

۱۱ھ برہن جھکا ہے اور پانی گرنے نہ دے محمد طیب
۱۱ھ اشارہ ہے اس شرک طرف :- در کہنے ہاں شریعت در کہنے سندان عشق :- ہر سوئے کے ساتھ جام و سندان عشق
مقصود اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو عظیم و عشق شریعت و طریقت اور حال و قال دونوں کا جامع جو، یعنی عالم باہر اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہو جسے عارف کہتے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

صورتیں دونوں کے ساتھ پیش آئیں لیکن بتدریج آبائی جمود کا رنگ بھی اترنا چلا گیا اور حد سے گزری ہوئی آزاد خیالی میں آہستہ آہستہ اعتدال کا رنگ پیدا ہوا، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہند کی اکثریت ہر پھر کروا نہتہ یا نڈا نہتہ اسی کو مسلمانوں کی صحیح دینی زندگی سمجھنے یا ماننے لگی ہے۔ جسے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے احباب و اصحاب نے قرآن و عمل اپنے اپنے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا یا آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ اور یہیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیاء الآخرہ حضرت قطب گنگوہی مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی گرانمایہ خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، امام ربانی حضرت گنگوہی کو مختلف وجوہ سے اس راہ میں کام کرنے کے مواقع بہت زیادہ میسر آئے، اجمالی طور پر مسلمانوں کی دینی زندگی کے اس قالب کی غام تعبیر و پربندیت سے کی جاتی ہے۔ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقی تقلید اور اتباع سنت کے ساتھ موقیانہ زندگی، اس جماعت کے اہل علم کی خصوصیت ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے مجلدات کی ضرورت ہے، سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں نے حضرت والا کے عقائد اور طریقہ عمل کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی حکامی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے اور حضرت امام اعظم اور حضرت شیخ محمد الدین ابن عربی اور حضرت مجدد الف ثانی کے کلمات اور حالات کے نہایت معتقد تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے علوم کو سب بزرگان دین کے علوم سے اعلیٰ و افضل بتلاتے تھے“ ص ۱۹۲

اسی کے بعد حکیم صاحب نے اولیاء اللہ کے مزاروں کے ساتھ حضرت والا کے طریقہ عمل کو بیان کرتے ہوئے مکمل شاہ صاحب مراد آبادی کے مزار والے اس قصہ کا تذکرہ کیا ہے جسے نقل کر چکا ہوں، حاصل ان کے بیان کا بھی وہی ہے جو فقیر نے عرض کیا۔

تاہم ”مسلمانوں کی داخلی اصلاحات“ کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر کے طریقہ کار کے متعلق اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنی اصلاحی کوششوں کو چاہتے تھے کہ حتی الوسع فقہ و فساد کی کدورتوں سے پاک رہے۔ ”فیوض قاسمہ“ میں ایک فارسی مکتوب مولوی عبداللطیف نامی کسی صاحب کے نام ہے، اس زمانہ میں لوگوں نے ”علم غیب“ کے عنوان سے ایک مسئلہ مسلمانوں میں چھیڑ دیا تھا، یعنی حق سبحانہ و تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف علم غیب کے لفظ کا انتساب شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ مولوی عبداللطیف صاحب نے حضرت سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا تھا، اصل مسئلہ کی تحقیق آپ نے جو کی ہے۔ اس کا ذکر قواعد و اثبات آپ کے علمی و فکری نظریات کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ یہاں تو باہمی مشاجرات و منازعات کے متعلق حضرت کے رجحان طبع کو پیش کرنا چاہتا ہوں

جواب کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے ہوئے کہ

”عنایت نامہ رسید انا باعث لال گردید“

پھر اس قسم کے لاحقہ حاصل مباحث کے جھگڑوں و رگڑوں کے متعلق آپ کے دلی جذبات کا جو رنگ تھا اس کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

”یارب این زمانہ چہ پرشور است، کہ بجائے محبت و اخوت اسلامی، عداوت ہا برخاستند

و در آن مسائل کہ متفق علیہا بودند، اختلاف پیدا آمد“

اسی قسم کے ایک دوسرے نزاعی مسئلہ کے متعلق اپنے ایک اردو گرامی نامہ میں ارسام فرماتے ہیں :-

”اس زمانہ میں یہ توقع ہے چاہے کہ اختلاف اٹھ جائے، اور اتفاق پیدا ہو جائے۔

ہاں وبالعموم ایسے روزگار میں نہم و انصاف ہوتا تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات

اٹھ جائے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعدا ہیں کہ یہ اختلاف

ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تنفر یک دگر ہے، کوئی کسی کی

نہیں سنتا اور بے سمجھے دوسروں کی رسم و رواج کو غلط سمجھتا ہے۔“

الغرض نئے نئے عنوانات سے معمولی معمولی جزئی باتوں کا مسلمانوں میں چرچا کر کے افتراق و شقاق پیدا کرنے کی عام مولویانہ عادت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا امام الکبیر فطرۃ کا رہ تھے، اور اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے، اسی طرح فرعیات میں ایسے اختلافی مسائل جن میں سلفا عن خلف نقاط نظر کا اختلاف علماء میں رہا ہے ان کے متعلق آپ کا خیال تھا، اور کتنا پاکیزہ خیال تھا، اس قسم کے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ

”طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں“

اور اپنے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہ

”اگر ایک طرف ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف دالوں کو برا بھونچا پڑے گا۔“

آگے ارقام فرماتے ہیں۔

”اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔“

آپ کا ایک طرز عمل اس نوعیت کے مسائل میں عموماً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادالان پر ہشکل قلم اٹھاتے تھے، پوچھنے اور دریافت کرنے پر کسی نے زیادہ اصرار کیا، تب مجبوراً جو ترجیحی نقطہ نظر اس خاص مسئلہ میں آپ کا ہوتا اس کو ظاہر تو کر دیا کرتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں تقریباً بالاسترام اس قسم کے الفاظ فرماتے چلے گئے ہیں، مثلاً جمعہ کی نماز کے متعلق علماء اہل السنۃ والجماعت کا ایک قدیم ”خلاقیہ“ یہ چلا آرہا ہے کہ دیہاتی آبادیوں میں اقامت جمعہ جائز ہے یا نہیں۔ میر محمد صادق نے جو غالباً سہارنپور کے رہنے والے تھے اپنے خط کے ساتھ حکیم عبدالسلام صاحب کا اسی مسئلہ کے متعلق ایک سوال بھی بھیجا تھا، اسی کا جواب دیا گیا ہے، ”فیوض قاسمیہ“ میں یہ بھی شریک ہے، جواب میں جن اجتہادی پہلوؤں کا اظہار فرمایا گیا ہے، ان کا ذکر تو اپنی جگہ پر کیا جائے گا، مگر ان کے سوا

مختلف عبرت آموز اجزاء پر یہ مکتوب مشتمل ہے۔ حکیم عبدالسلام کا ذکر باوجود ”معاصرت“ کے سنئے کن الفاظ میں فرماتے ہیں،

”مجمع البحرین شریعت و طریقت، مخدوم و مطاع خاص و عام جناب مخدوم مولانا سید عبدالسلام صاحب دام برکاتہ“

وامتداع علم بالصواب یہ مولوی عبدالسلام کون صاحب ہیں، کوئی بھی ہوں۔ لیکن پچھلی نسلوں میں ہم نے ان کی شہرت نہیں سنی ہے۔ لیکن دیکھ رہے ہیں حضرت والا کن غیر معمولی القاب و آداب کے ساتھ ان کا ذکر فرما رہے ہیں۔ اسی خط میں کتابوں کی کمی کے سوا اس قسم کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں، یہ فرماتے ہوئے کہ

”میچ دانی، وایں بے سرو سامانی نہ جہرات ہم چو کار ہا بدل آئند نہ دل بدست کار فرماید“

آگے لکھتے ہیں

”ذخیرہ ام ہیں خیالات پر آگندہ من اند کہ کیے را اگر بدل می نشیند دیگر آں را از جملہ مضامین شعریہ می بیند“

پھر یہ لکھ کر کہ حکم کی تعمیل کو ضروری خیالی کر کے جواب تو دے رہا ہوں ارقام فرماتے ہیں۔

”اگر پسند خاطر خدام والا مقام افتادہ فہو المراد ورنہ کالا کے زیوں بریش خاوند تارہ خو را باز خواہم گرفت“

یہ فقرے تو خط کی ابتدائی تہید کے ہیں، مضمون کو ختم کر کے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”ایں است انچہ ذہن ہارسلئے من ہداں می رسد“

اور خود اپنے متعلق اس مصرعہ کو لکھی

نہ قاضیم نہ فقیہم نہ مفتیم نہ امام

کو استعمال کر کے لکھ ہے کہ اجتہاد کا حق مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس لئے خلق اللہ کو اپنی خیمالات کے

ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا اور یہ لکھ کر کہ

”اگر دیگران ہم صغیر من شوند فہم“

اسی کے بعد تہید والے فقرے کا اعادہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

”دور نہ کلائے نروں، برنش خاوند! این دفتر بے معنی را بر سر من زنند“

اور یہ تو اپنے مستقل ہوا، لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی ہے، علم کا باطل زعم دلوں میں تنگی بٹکا ہوں

میں کو تلمیذی کے امراض کو جو پیدا کر دیتا ہے، ان امراض کے علاج کے لئے پڑھنے والوں کو

چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ان الفاظ پر غور کریں۔ یہ فرمانے کے بعد کہ ”میرے خیالات کو تو میرے

سر پر مار دیجئے“ بغیر کسی دفعہ غم کے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

”ہر چہ مناسب وقت و مانند موافق اشارات علماء ربانی کہ از اتباع قرآن و حدیث

دور نیکنند اختیار فرمائند“

یہی نہیں آگے یہ بھی ہے کہ

”و این نیاز مند را ہم مطلع فرمائند“

اطلاع بخشی کی یہ درخواست کس لئے کی گئی ہے؟ کیا اعتراض و تنقید کے لئے؟ نہیں،

سنئے فرماتے ہیں

”تا بہ پیردئی جم غفیر من ہم سرودیم“ دور بے تفرق کلمہ نشوم“ ۲۹

اور یہ مضمون کسی ایک جگہ آپ کے قلم سے اتفاقاً نہیں نکلا ہے۔ قاسم العلوم کے ایک مقالے میں بھی

یہی ارقام فرمایا گیا ہے۔

”ہر چہ بدل می ریزند بر صفحہ می گذارم اگر راست آید از ان طرف ست“ دور نہ من خود بر

بیج مانی دلدانی خود گواہم“

حضرت دالاکے مضامین اور کتابوں میں بہ کثرت اس کی مثالیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیگی۔

لوگوں کو حیرت ہوئی ہے کہ دوست تو دوست، دشمن بھی سیدنا الامام الکبیر کا نام حبیب لیتو ہیں تو

احترام ہی سے لیتے ہیں۔ مشکل ہی سے اس کی نظیر پیش ہو سکتی ہے کہ مخالفوں نے بھی حضرت والا کی شان میں ان نالائق اور ناشائستہ الفاظ کو استعمال کیا ہو، جن کے استعمال کرنے کے عادی اس زمانہ کے مناظرہ باز مولوی عموٹا ہو گئے تھے؟

مگر مجھے اس پر اس لئے تعجب نہیں ہونا کہ حضرت والا نے جس طرز عمل کو اختیار فرمایا تھا یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا، قرآن ہی میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا یہ قدرتی طریقہ ہے، مگر ہر ہوسناک کا یہ کام نہیں ہے۔

اور یہ مقام نہیں عطا کیا جاتا مگر انہیں کو جو صابر و بردبار ہیں اور نہیں دیا جاتا مگر انہیں کو جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔

وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا
وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا ذُو حُظٍّ عَظِيمٍ

یعنی ہر دل کو یہ وسعت اور ہر آنکھ کو فراخی کی یہ دولت کب نصیب ہوتی ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی دینی تربیت و اصلاح کا جو کام بھی آپ کرتے رہے، اس میں دل آزاری یا دوسروں کی تحقیر و توہین سے بچنے کی ممکنہ کوششوں میں بھی ہم آپ کو مشغول پاتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ”دراہنت“ یا بے جا اغراض و چشم پوشی بھی آپ کی عادت نہ تھی۔ اس کی متعدد مثالیں گزر چکیں کہ ادنیٰ درجہ کے عامی آدمیوں کی دعوت بھی سیدنا الامام الکبیر رد نہیں کرتے تھے اور شاید کرتے نہیں سکتے تھے۔ دیوبند کے نورانیہ اللہ دیا کا قصہ گزر چکا ہے کہ برستے ہوئے پانی میں کھل کا چوٹا باندھ کر اس غریب کے گھرانہ چھری رات میں آپ پہنچے اور ماش کی روٹی، ماش کی دال جو اس نے پیش کی یہ جاتے ہوئے کہ انہضام اس کا دشوار ہو گا۔ محض اس کی دل دہی کے لئے نوش جان فرمایا۔ لیکن اسی کے ساتھ دعوتوں ہی کے سلسلہ میں مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ کلی دستور تھا کہ

”جاہلوں کی نذر و نیاز کا کھانا کبھی نہیں کھاتے“ ۱۹۲۷ء مذہب منصور

یہ ”نذر و نیاز“ کا قصہ جو ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کا کسی زمانہ میں تقریباً کچھ لازمی جزو کی

حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا افسانہ طویل ہے، خانوادہ دلی الہی کے مصنفین کی کتابوں میں خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز اور مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نحووں کی کتابیں جو منسوب ہیں ان میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر آپ کو سیر حاصل بخٹیں یس بی۔ اس زمانہ میں شیخ مدد کے نام کے بکرے، اور سید احمد کبیر و حضرت بوعلی ظہند کے نام کے گاؤ، حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی کے نام مرغ کے چھوڑنے اسیا خرمیں ان کو ہار بھول پہنا کر ذبح کر کے دعوتوں کے اڑانے کا عام ذوق پھیلا ہوا تھا۔ شکل ہی سے مسلمانوں کی کوئی آبادی شمالی و جنوبی ہند میں ہوگی، جس میں نذر کئے ہوئے نہ کورہ بالا جانور گھومتے پھرتے نہ نظر آتے ہوں، اب تو بجز پیران پیر کے مرغ کے دوسرے قصے کم از کم شمالی ہند میں ختم ہو چکے ہیں۔ اسی خاندان کے بزرگوں کی جدد جہد سے تطہیر و تزکیہ کا یہ کام پورا ہوا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے نذر کئے ہوئے تمام جانوروں کو ما اہل بیت لغیر اللہ کے تحت داخل کر کے فتویٰ دیا تھا کہ ان کے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہے جس پر بڑے ہنگامے برپا ہوئے۔ سیدنا الامام الکبیر نے بھی ایک مضمون حضرت شاہ صاحب کے فتوے کی تائید میں ارقام فرمایا تھا، جو قائم العلوم نامی ”مجموعہ مکاتیب“ میں شریک ہے، انشاء اللہ کتاب کے اگلے حصہ میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا، یہاں یہ کہنا ہے کہ خود حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتوے پر طوفان برپا ہوا تھا، وہی زندہ جانوروں کے متعلق جہاں اس پر مصر تھے کہ خدا ہی کے نام پر ان کو کیوں نہ ذبح کیا جائے، جب بھی ان کے گوشت کا کھانا درست نہ ہوگا۔ وہیں یہ فتویٰ ان ہی کی طرف ان کے مجموعہ فتاویٰ میں منسوب کیا گیا ہے کہ حیوانی نہیں بلکہ ماییدہ تشیر برنج (کھیر) پلاؤ وغیرہ جیسے کھانے پر اگر فاتحہ دیا گیا ہو تو ان کا حکم کیا ہے، کسی نے دریافت کیا، جواب میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ارقام فرمایا کہ

”اگر فاتحہ بنام بزرگے دادہ شد پس اغیار را ہم خوردن ازان جائزست“ ص ۱۱۱

لہٰذا مرغ شمالی ہند سے بالکل پرہیز کر چکا ہے یہاں اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا محمد طیب علیہ السلام (۱) صحیحہ صفحہ پرا لا حظ ہو

میرے سامنے مسئلہ کی تفصیل نہیں ہے، حاشیہ میں حضرت شاہ رفیع الدین کے جن فتوؤں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تفصیل کے لئے ان کو پڑھنا چاہئے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی طرف یہ فتویٰ حالانکہ فسوب تھا، لیکن باوجود اس کے آپ دیکھ رہے ہیں اس احتیاط کو کہ سیدنا الامام الکبیر اس قسم کے مشتبہ کھانوں سے بھی پرہیز ہی فرماتے رہے، اور دعوت کرنے والوں کی دل شکنی کی پردہ بھی اس راہ میں نہیں کی جاتی تھی حالانکہ آپ کی افتاد طبع کے لحاظ سے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ چیز ناقابل برداشت تھی۔

مگر عملی احتیاط کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی دینی کمزوریوں خصوصاً ان کی دینی زندگی کی برائیوں کو لاشعور یعنی "بدعات" کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے نقطہ نظر کا صحیح اندازہ اس حکیمانہ تقسیم ہو سکتا ہے جسے اس مسئلہ میں آپ نے اختیار فرمایا ہے، یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ جو حیثیت کسی جاہل مریض کی طبیب کامل کے مقابلہ میں ہوتی ہے، یہی حیثیت امت کے عام افراد کی آیت اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ہے، یہی نہیں بلکہ اسی کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ

"طیب کامل اور سار جاہل میں اتنا فرق نہیں، جتنا خدا و رسول، امت میں فرق

مستعلقہ صورت گذشتہ مسئلہ میں نے شاہ صاحب کے اس فتوے کے نقل کرنے میں قصداً ترمیمی پیرایہ بیان احتیاط کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف بزرگوں سے کان میں یہ بات پڑی ہے کہ خدامی کا جو مجموعہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں کچھ تصرفات بھی ہوئے ہیں، دانشناظم بالعداب، مطبع مجتبیٰ کے مبلوہ نسخے سے مذکورہ بالا الفاظ نقل کئے ہیں چند خاص فتوے شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کی علماء کو خصوصیت کے ساتھ ان جواہروں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ نذر نیازہ وغیرہ الفاظ ہندوستان میں جو استعمال ہوتے ہیں، نہ بمعنی شرعی است کہ ابواب غیر واجب مست از جنس عبادات متعودہ بطریق تقرب الی اللہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ان الفاظ کا استعمال بمعنی عرفی مست جہ عرف آن مست کہ انجہ پیش بزرگان می برند نذر و نیاز گوشت، لکھا ہے کہ شرعی معنی جو نذر کے ہیں میرا نے اولیاء اللہ حرام است، اسی طرح فاتحہ میں بھی شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ بتوں اور مشائخ کے آگے بھینٹ چڑھانے کی جو نوعیت ہوتی ہے اگر فاتحہ دلائے جائے کی نیت میں بھی کچھ اسی قسم کی باتیں شریک ہیں تو مشرک کی میں فاتحہ داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایصال ثواب کا مطلب ہے توجائز ہے۔ مسلمانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ چڑھائے یا بھینٹ کا اعتقاد اگر رکھتے ہوں تو اس کو اپنے اندر سے نکالیں۔ ۱۲

ہے۔“ (فیوض قاسمیہ ص ۱۷۷)

یہی حقیقت کی صحیح اور واقعی تعبیر ہے، اور یہ مان لینے کے بعد جیسا کہ وہی ارقام فرماتے ہیں، خود بخود یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ

”جیسے بیمار جاہل کو اطباء متقدمین کے قواعد طب اور اطباء زمانہ کے نسخہ جات میں کمی و بیشی یا تغیر و تبدل مانا ہے اور کرے تو اطباء سے دھنکار لے، اور تمام خویش و اقربا دوست آشنا کی بوچھاڑ پڑے۔“

اسی طرح حضرت والا فرماتے ہیں کہ

”تمام امت (کے لوگ) کو عالم ہوں، یا جاہل، فقیر یا صفا ہوں، یا نیا دار، خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں عقائد ہوں یا اعمال، قواعد کلیہ ہوں یا صور جزئیہ، تبدیل و تغیر کی و بیشی کا اختیار نہیں، اور کرے تو خداوند تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغضوب اور خلافت کے نزدیک بحکم عقل مغلوب ہونگے۔“

اس جملہ بیان کے بعد ارقام فرمایا گیا ہے کہ دین میں

”اسی تغیر و تبدل اور کمی و بیشی ہی کا نام بدعت ہے۔“

بدعت کی اسی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ ”تمام بدعات“ کی نوعیت ایک ہی جیسی نہیں ہے اپنی حکیمانہ تقسیم کو ان الفاظ میں پیش فرماتے ہوئے کہ

”عقائد کے تغیر و تبدل کو ہم ماس البدعات کہتے ہیں، اور قواعد کلیہ کے تغیر و تبدل کو ہم ”بدعت کبریٰ“ قرار دیتے ہیں۔“

بدعت کی ان دونوں اہم شکلوں کے ساتھ آخری شکل اسی کی یہ ٹھہراتے ہوئے کہ

”اعمال جزئیہ کی کمی و بیشی کو ہم ”بدعت صغریٰ“ کہتے ہیں۔“

بعض تشریحی اشاروں کے بعد اپنے اس فیصلہ کو جو قلم بند فرمایا گیا ہے، کہ

”بالجملہ ہم، تغیر و تبدل عقائد کو جیسے سید و حوارج و معتزلہ فرمایا ”راس البدعات“

اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیر و ماتم داری کو بدعت کبریٰ، اور کمی و بیشی صورت جزئییہ کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں۔

اور لکھا ہے کہ

”برائی کی کمی و زیادتی بدعات میں بقدر بڑائی و چھوٹائی بدعات کے سمجھتے ہیں۔“

حاصل یہی ہے کہ بدعت چھوٹی ہو، یا بڑی، بدعت ہی ہے، اور گمراہی و ضلالت کے سوا وہ اور ہونہی کیا سکتی ہے۔ لیکن ایک ہی لاشی سے بدعت کی ہر قسم کو ہانکنا ”شرعی حقائق“ کی صحیح یافت سے محرومی کی دلیل ہے، اور دل کا خیال خواہ کچھ ہی ہو، لیکن اس باب میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی احساس کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے کہ

”بدعتیں جن کو کبریٰ کہئے، بیش تر فرقہ باطلہ مثل شیعہ و خوارج میں پائے جاتے ہیں اور کثر بعض جماعت اہل سنت میں نظر آتے ہیں۔“

اور اہل سنت کے بعض جماعت جن میں ”بدعت کبریٰ کی بعض قسموں کی نشان دہی حضرت والائے فرمائی ہے، سمجھا آپ نے یہ کون لوگ ہیں؟ الحمد للہ کہ اب ہندوستان میں ان کا پتہ نہیں ہے۔ سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں یہ لکھ رہے تھے، اس وقت تک ان لوگوں سے ملک پاک نہیں ہوا تھا، یہ بے قید فقیروں کی مختلف ٹولیاں تھیں جن میں بعض رسول شاہی، بعض امام شاہی، بعض نوشاہی، بعض خلیفہ نشاہی، وغیرہ وغیرہ بیسیوں ناموں سے نکل پڑی تھیں۔ بہر حال حضرت والائے بھی ”اہل سنت کے ان بعض جماعت“ جن کی بدعات کو آپ نے ”بدعات کبریٰ“ کے ذیل میں شمار کیا ہے، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی موقع پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”اس زمانہ کے اہل حیرت و بے قید فقیروں کی تائید آپ کو کچھ تلمیذ شاہان مرحوم کے موقوفات (ادعاج ثلاثہ) میں ملے گی، خاکسار نے بھی جو کتاب ”اطلاقی تصوف“ کے نام سے لکھی ہے، مقالات کی شکل میں اس کا کثرت و بیش تر حصہ ۱۱ صحن ۱۲ نامی حیدر آباد کے ایک ماہوار رسالہ میں شائع بھی ہو چکا ہے، اس میں بھی کچھ ان ٹولوں کے حالات مل سکتے ہیں، ”مناقب العارفین“ صوفیہ ہند کا ایک تذکرہ راہبر کے ایک مصنف نے لکھا ہے، اس میں بھی کچھ چیزیں درج ہو چکی ہیں ۱۲

”ان کو اہل سنت والجماعت کہنا محض تکلف و محاز ہے، فقط باعتبار اشتراک بعض علامات اہل سنت جن کے سبب سے اہل سنت فرقہ باطلہ مشہورہ سے متمیز ہیں، ان کو اہل سنت کہتے ہیں، در نہ یہ لوگ بھی مثل دیگر فرقہ باطلہ ایک مذہب باطل رکھتے ہیں۔“

آگے مدار یہ فقیروں کے ساتھ مثلاً رسول شاہی فقیروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ ”ان کے یہاں وضو نماز اور حرمت شراب و بھنگ وغیرہ سے بالکل دست برداری اختیار کی گئی ہے تو سب اصحاب اور ماتم و تعزیہ داری وغیرہ میں شیعہ و خواجہ کو متمیز ہیں۔“ ص ۱۱

بہر حال اس قسم کے دین باختہ طبقات کے سوا مسلمانوں کی عمومیت اور مسود اعظم سنی مسلمانوں کی جو ہے، ان کی بدعات کو ”ناس البدعات“ یا ”بدعات کبریٰ“ کے مقابل میں حضرت دالانے بدعت کی آخری قسم یعنی ”بدعت صغریٰ“ ہی کے ذیل میں عموماً داخل فرمایا ہے، جن کی برائی بدعت کی دونوں اہم قسموں کے مقابل میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے۔ حضرت دالانے گاہ میں اتنی زیادہ سخت نہ تھی، جتنی شدت بدعت کی ان دو قسموں میں پائی جاتی ہے۔ آپ نے مثلاً بدعت صغریٰ کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے کہ

”جیسے اکثر اہل اسلام میں بعض مواقع پر رسم سلام مسنون موقوف ہو گئی، اور حضرت مسیح وغیرہ القافہ نواحدات شائع ہو گئے۔“

یہی رسم بدعات مسلمانوں میں جو مروج ہو گئی تھی، حتیٰ کہ عوام سے منتقل ہو کر، خواص کی مجلسوں تک اس کا اثر اس زمانہ میں پھیل گیا تھا، اس کا ذکر کر کے حضرت دالانے لکھا ہے کہ

”سو یہ صمد جزئیہ کی کمی دہشی ہے۔“ ص ۱۲

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں میں جو بدعتیں پھیلی ہوئی تھیں ان کو بدعت تو آپ ضرور قرار دیتے ہیں، اور خود عملی حیثیت سے آپ کا اصرار اس باب میں جتنا شدید اور سخت تھا اس کا

پتہ اسی سے چلتا ہے، مگر جاہلوں کے نذر و نیاز کا کھانا خود کبھی نہیں کھاتے، مگر نظری و قوی حیثیت سے ان کی نوعیت بدعت ہونے میں ان امور کے مانند تھی، جنہیں ”بدعات کبریٰ“ و ”در اس الہیہ“ آپ سمجھتے تھے۔ علمی حیثیت سے اس سلسلہ میں حضرت والا کی تحقیقات کے تفصیلی جائزہ کا تو یہاں موقع نہیں ہے، اس کے لئے تو اگلے حصہ ہی کا انتظار کرنا پڑے گا، یہاں تو عام مسلمانوں یا کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ اہل سنت و الجماعت یا سنی مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں آپ رو بہ اور طریقہ عمل کا تذکرہ مقصود تھا، انشاء اللہ اس کے سمجھنے کے لئے اتنی بحث اس مسئلہ پر کافی ہو سکتی ہے۔

اصلاحی دائرے میں ”عقد بیوگان“ کے مسئلہ کے بعد دوسری چیز تطہیر و تزکیہ کا بھی کام تھا خانوادہ ولی اللہی سے اس تحریک کی ابتدا ہوئی تھی، حضرت مولانا اسماعیل شہید کے زمانہ میں پردان چڑھی، اور ولی اللہی خدمات کا جائزہ قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء کرام کے سپرد ہوا، تو ان بزرگوں نے بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا، لیکن جہاں تک حضرت والا کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے عام مولویوں کی طرح اصلاح کے اس خاص پہلو کو نہ آپ سب کچھ خیال کرتے تھے اور نہ جیسا کہ آپ نے دیکھا بدعت کی تمام قسموں کی نوعیت بھی آپ کی نظر مبارک میں ایک ہی جیسی تھی، اور نہ اہمیت ہی میں سب کا درجہ مساوی تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے حضرت والا کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”مولانا کی نظر اصول پر تھی، نہ فرورغ پر“

آگے جو یہ لکھا ہے، کہ

”خود تو مستحبات بھی ترک نہ کرتے تھے، اور مکروہات سے بد مزہ فرماتے تھے، مگر اور دن (یعنی عام مسلمانوں) کے ترک و اختیار سے کچھ پروا نہ کرتے مگر فرض و واجب کے تارک پر صبر نہ کرتے اور اس کے روگ کو کال حکمت سے دور فرماتے“ ص ۲۹

یہ بڑے بہتر کی بات ہے اور قرآن و قیاس و روایات و حکایات کی امداد سے فقیر جس نتیجہ تک پہنچا ہے اسی نتیجہ تک معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دیدہ مشاہدات اور عملی تجربات سے وہ بھی پہنچ گئے ماحصل وہی ہے کہ ”فرق مراتب“ کی جو قدرتی کیفیت شرعی مطالبات و منہیات میں پائی جاتی ہے، مسلمانوں کی ”داخلی اصلاح“ کے معاملہ میں یہ نکتہ حضرت دالائی حکیمانہ نظر سے کبھی اوجھل نہ ہوا، چاہتے تو آپ بھی یہی سمجھتے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی غیر دینی آلائشوں سے پاک ہو کر صحیح اسلامی قالب میں ڈھل جائے لیکن بنی آدم کی فطری کمزوریوں کی بھی رعایت فرماتے، فرض و واجب کی حدود میں جو چیزیں داخل نہیں ہیں، ان کے متعلق بہ نسبت قول کے عملی درس آپ کے نزدیک بآرا آدمی کا زیادہ ضامن تھا، سوانح مخلوط کے مصنف نے جو یہ لکھا ہے کہ ”مستحبات و مکروہات کے ترک و اختیار سے کچھ پروا نہ کرتے“ اس بے پروائی کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبان مبارک سے ٹوک ٹاک کے عادی اس نوعیت کے امور میں آپ نہ تھے۔ اس باب میں کر کے کہنا تا اسی کو کافی خیال فرماتے تھے۔ آپ کے قلمی مآثر میں ان کی ساخت کی کمی جو محسوس ہوتی ہے، جن کا تعلق آپ ہی کی اصطلاح کی رو سے ”بدعات و غیرہ“ سے ہے اس کا اثر بھی یہی ہے۔ ظلم کا درجہ تو زبان کے بعد ہے، زبانی ارشاد سے ان امور میں جو احتیاط سے کام لیتا ہو، سمجھا جاسکتا ہے کہ وہی ان پر قلم اٹھانے کو کس حد تک مفید خیال کر سکتا تھا، کاش اہل علم کی عمودیت میں بھی شرعی مطالبات و ممنوعات کے ”فرق مراتب“ کی یہ تیز پیدا ہو جائے، تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھگڑنے بلکہ لڑ پڑنے کے الزام میں مولویوں کی رسوائیاں اس حد تک نہ پہنچتیں، جہاں تک وہ پہنچ کر رہیں۔ مستحبات و مکروہات کے سلسلے کے ایک ایک جزیرہ پر بطور تیار کر دیا گیا ہے، اور علمی مباحث سے زیادہ بسا اوقات پھلکار بازوں تک نوبت پہنچ گئی تھی،

غفر الله لنا ولهم قتلک امة قد خلت لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت

لیکن اسی کے ساتھ سوانح مخلوط کے مصنف کے بیان سے ایک نئی آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے، یعنی اخذ و ترک یا کرنا نہ کرنا جن باتوں کا استحباب و کراہت کی حدود سے تجاوز نہ کرنا

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو حضرت والا کی اصطلاح کی دوسے کہہ سکتے ہیں کہ ”بدعات صغیرہ“ کے متعلق جہاں آپ کا یہ طرز عمل تھا، وہیں ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اصلاحی نظام نامہ میں علاوہ ان کے اس قسم کی چیزیں بھی شریک تھیں جن پر بدعت کے اصطلاحی لفظ کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا تھا، لیکن امتداد زمانہ سے بدعت کا رنگ ان میں پیدا ہو چلا تھا، یا بجائے بدعت کے اسلامی تعلیمات کے دوسرے واقعات کا اتقنا تھا کہ ان کی طرف بھی توجہ کی جائے۔

بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اخروی ثواب و عقاب کے نتائج کی اعمال و افعال پر مرتب ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف وحی و نبوت ہے، اسی لئے کسی قول و فعل حرکت و سکون پر حکم لگانا کہ خدا اس سے خوش ہو تا ہے یا ناخوش، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ اسی لئے بدعت نام ہے اسی اضافہ کا جس کے متعلق اخروی ثواب و عقاب یا حق تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا خیال شریعت کے توسط سے بنی قائم کر لیا جائے۔ ورنہ اس خیال کے بغیر کسی قسم کا کام اگر کیا جائے تو محض اس لئے کہ عہد نبوت و قدس مشہود لیا یا بغیر میں اس کا پتہ نہیں چلتا، ہم اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ الدین کے اس مجموعہ میں اضافہ نہیں ہے جس کے ساتھ خدا کی رضا مندی یا ناراضگی کا تعلق ہوتا ہے۔ میں احداث فی احوالہذاں (جس نے ہمارے اس کام میں نئی بات کا اضافہ کیا، بدعت کی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حراشہ فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ دین میں اضافہ یہی بدعت ہے، حضرت الاستاذ الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ اسی بنیاد پر فرمایا کرتے تھے کہ شادی بنیاد وغیرہ جیسے چیزیں جن رسوم کا اضافہ مسلمانوں نے کر لیا ہے۔ شغل گشت کرانا، روضہ نشینی اور بھی داہی تھا، یہ باتیں تو ان رسوم کو بدعت کی مدین ہم اس لئے داخل نہیں کر سکتے کہ ان اعمال و افعال سے ثواب و عقاب کا سلسلہ ان کے نزدیک تعلق نہیں ہے، نہ کوئی نہیں سمجھتا کہ وہ لگاؤ گھوڑے پر بیٹھا کہ شہر میں گشت اگر نہ کر لیا جائے گا تو گناہ ہو گا یا کرنے پر ثواب ملے گا، فرماتے تھے کہ ان رسوم کو بچانے کے بدعت کے اصراف فضول خرچی لغو و بیهی اعمال وغیرہ کی مدد میں ہم داخل کر سکتے ہیں کہ شریعت میں امور کہ بھی پسند نہیں کرتی بلکہ چاہئے تو اس کو اپنی دھاکت کی مدین شدید کر دیتے۔ اپنے آپ کو امتحان بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا یہ بھی غیر شرعی فعل ہے۔ اسی طرح فرماتے تھے کہ بیت کے متعلق رسوم کی نوعیت تو مختلف ہے۔ موت کا تعلق عالم آخرت سے ہے، کرنے والے ثواب و عقاب کے خیال سے نہ بھی کرے، لیکن موت کی خصوصی کیفیت میں اس کی صلاحیت ہے کہ رفتہ رفتہ اس خیال کو عوام میں پیدا کر دے کہ غلام دہم کے کرنے سے مردے کو آرام و سکون ملتا ہے، کیا جائے گا تو دکھ ہو گا، یہ پھر وہی ثواب و عقاب کا خود تراشیدہ عقیدہ ہے جو اعمال و افعال میں بدعت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

دوبند کے مسلمانوں نے باہمی معاہدے کی شکل میں حضرت دالا کے سامنے ایک صلاحی
 وثیقہ پر دستخط کئے تھے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی وثیقہ کا ذکر کرتے ہوئے، اس کے
 دوسرے مندرجات و مشتملات کے ساتھ لکھا ہے کہ حسب ذیل امور بھی اس میں تھے یعنی بیاب
 شادی میں جو مسرفانہ فضول رسوم مقرر ہیں، اور ان کی پابندی سے بہت تکلیف اور زبرداری اٹھانی
 پڑتی ہے، بالکل موقوف کر دیئے جائیں گے، اسی طرح عیادت (بیابا پرسی) کے سلسلہ میں رسوم
 بڑھاتے ہوئے لوگوں نے اس نوبت تک ان کو پہنچا دیا تھا کہ علاج و معالجہ کے ناگہانی مصارف
 کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مالی مصیبت اس خاندان پر ٹوٹ پڑتی تھی جس میں اتفاقاً کوئی بے چارا
 مرض کا شکار ہو جاتا تھا۔ خصوصاً مستورات و دونوں میں کس کس کر یکے بعد دیگرے بیمار کے گھر پر ملنا
 کر دیتی تھیں۔ ان کی خاطر و مدارات سواری شکاری کے قصوں سے لوگوں کا ناک میں دم آگیا تھا،
 لیکن رسوم کی انہیں زنجیروں کا ٹوڑنا آسان نہ تھا۔ دوبند کے مسلمانوں کو اس پر راضی کر لیا گیا
 تھا کہ ”مستورات جو مریض کی عیادت کو جاتی ہیں، اور اس میں بیمار، اور تیار دار دونوں کو تکلیف
 ہوتی ہے“ اس رسمی دستور کو ترک کر دیں گے۔ مطلب یہی تھا کہ عیادت کے مسنون طریقہ پر
 مزید اضافے جو باعث گرافٹی بن گئے ہیں، وہ چھوڑ دیئے جائیں گے

عیادت کے بعد پھر تعزیت اور پرسہ کے مراسم کے طول طویل قصے تھے۔ مرنے والے
 کے مرنے کے بعد ہر تھوڑے سے تھوڑے وقفے سے معاشی موت کی کش مکش میں پس ماندوں کو مبتلا
 ہونا پڑتا تھا، سوگ، چہارم، دہم، چہلم، چھ ماہی، برسی کے نہ ختم ہونے والے دعوتی مطالبات

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) بدعت کی یہی روح جو اسے انفرادی اور رسول کی حد میں داخل کر دیتی ہے۔ وہ مان
 ہے جس کی وجہ سے مذہب نے اس کو غیر معمولی قرار دیا ہے۔ ۱۲ (حاشیہ کا مضمون بالکل حق ہے لیکن اگر اس کی تفسیر
 اس طرح کی جاوے کہ شادی بیابا میں جولاہی اور انجام دے جاتے ہیں انہیں تو رسوم سے تفسیر کیا جائے اور جولاہی
 میں جو فضولیات و غرافات برتی جاتی ہیں انہیں بدعت کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے حضرت لنگوچی کی یہی اصطلاح تھی پس رسوم کی
 بدعتیں نہیں کہ ایک بدعت ہو اور ایک حماقت، بلکہ امر کی بدعتیں ہیں ایک رسوم اولیٰ بدعت یا اصطلاح زیادہ واضح ہوگی حضرت اولیٰ
 اکثریری تقدس سرہ حضرت لنگوچی کی اصطلاح کی تفصیل و تشریح فرمایا کرتے تھے جس کا مصنف نے حاشیہ میں حوالہ دیا ہے
 محمد طیب غفرلہ

تھے، جو برادری والوں کی طرف سے مرسلے والے کے پس ماندوں پر عالم ہو جاتے تھے، اور جس راہ سے بھی ہو، برادری کے ان مطالبات کی تکمیل پڑی مجبور تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ تعزیت کے سلسلے میں بھی ساری غیر شرعی رسوم کو ختم کر دیا جائے گا، اسی کے ساتھ ایک دفعہ اسی ”باہمی معاہدے“ کے وثیقہ میں یہ بھی تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف کے بجنسہ الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں کہ،

”مستورات کے لباس میں جو اسراف ہو رہا ہے اس کی اصلاح کی جاوے۔“

یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ مولویوں کے عام طبقہ کی نظر زیادہ تر ان ہی امور پر مرکوز ہوتی ہے جنہیں اصطلاحاً ”بدعات“ کہتے ہیں۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں سیدنا الامام الکبیر کے اس اصلاحی نظام نامہ کی مذکورہ بالا دفعات کو، جیسا کہ میں نے عرض کیا ان میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں حالاً یا مآلاً ”بدعت“ بن جانے کی صلاحیت تھی، مگر اسی کے ساتھ ہم ان ہی میں ان اجولہ کو بھی پاتے ہیں، جن کے انسداد کی طرف اسی کی توجہ ہو سکتی ہے جس کی نظر میں مواد کے ساتھ مسلمانوں کے معاش اور معاشی مشکلات کو بھی کافی اہمیت ہو۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھوک کو کھانے پر اور پیاسوں کو پینے پر آمادہ کرنے کے لئے آج کل ترقی و دروج وغیرہ کے عنوانوں پر وعظ فرمایوں کا انداج عموماً جو جاری ہے اور انسانی جبلت جو فطرتاً شیعہ (لاچ)، اور بطوعیت (بے صبری) کے تقاضوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو آمادہ کیا جاتا ہے، کہ جس حد تک اس جذبہ کا بھڑکانا ممکن ہو، کوشش کا دقیقہ اس میں اٹھا نہ رکھا جائے لاپچی بنو اور لاپچی بنتے چلے جاؤ۔ حریص بنو اور بنتے چلے جاؤ، ان ہی عزائموں پر دھواں دھار تھریں گے ہیں، خیلے دیئے جاتے ہیں، میز اور کرسیوں کے ساتھ ساتھ اب تو محراب و منبر تک حرمی آزار کے ان ہی موانع سے بل رہے ہیں۔ العیاذ باللہ شاید میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ سیدنا الامام الکبیر کا بھی کوئی حصہ وعظ و پند کے اس عجیب و غریب حصے میں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کے عہد مبارک ہی میں دعاء و ہدایہ کا ایک بڑا طبقہ حکومت مسلطہ کے زیر اثر مسلمانوں کو دسی قسم کے وعظ و شیعہ لگا تھا۔

خود رہتا تھا اور دوسروں کو دلانا تھا۔ چھاتیاں پیٹی جا رہی تھیں۔ کپڑے پھاڑے جا رہے تھے۔ طبع قوم تھی، اور نصب العین ترقی۔ ترقی کا لفظ تھا، اکبر مرحوم جسے دیکھ دیکھ کہا کرتے تھے۔

ترقی کے سچے کیا کیجئے
کمپٹی میں چندے دیا کیجئے

ظاہر ہے کہ جس لاہوتی دانش اور فکر کی فرزائگی سے سیدنا الامام الکبیر فطر ثامن فرزند تھے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کے انتساب کی جرات کون کر سکتا ہے۔ میرا خیال تو ہے کہ ان نئے عنوانوں پر وعظ کہنے والے غریبوں کو شاید خود بھی اس کا شعور نہ تھا کہ حقیقی عنوان ان عنوانوں کا بالآخر کیا ٹھہرتا ہے ”دنیا کے جس حد تک لالچی بن سکتے ہو، بنتے چلے جاؤ“ انسانیت کا یہی سب سے بڑا کمال اور نقطہ عروج ہے۔ بھلا کوئی سنجیدہ آدمی اس موضوع پر وعظ کہنے کے لئے پر ثبات عقل و ہوش ایک لمحہ کے لئے بھی آمادہ ہو سکتا ہے، مگر فطرتی دل آویزیوں نے معافی سے ان کی توجہ پھیر لی تھی۔ اپنے نزدیک وہ یہی سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کے آگے کسی بڑے نصب العین کو پیش کر رہے ہیں۔ اسی لئے میں ان بزرگوں کو قابل معافی سمجھتا ہوں جنہوں نے دنیا طلبی کے مواظپ سے مسلمانوں کے کانوں کو بہرا بنا دیا تھا۔ غفر اللہ لہم۔ نیت بہرہ ال ان کی لالچی تھی اور اب بھی ترقی و تعلق کی ان ہی پرانی کلیروں کو جو پیٹے چلے جا رہے ہیں، بجز اس کے کہ ان کی عقلوں پر ترس کھایا جائے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض یہ کر رہا تھا کہ سوانح مخلوط کے مصنف کے بیان کے مطابق دیوبند کے مسلمانوں کے راضی نامہ کے مذکورہ بالا دفعات کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے، کہ حکومت کے دد میں اپنی حاکمیت کے زمانہ کے رواجوں اور دستوروں کے نبہنے کا جذبہ مسلمانوں پر جو مسلط تھا، چلنے کے بعد بھی رسی کی اینٹھن باقی تھی۔ اسی کی گرفت سے دل تو سب ہی بے کل اور بے چین تھے۔ لیکن زبان سے اپنی زبانوں کے اقرار پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ حمیت اور غیرت کا مسلمانوں کے شاید یہی تقاضا تھا۔ مگر پانی سر سے اونچا بہ چکا تھا۔

جو کچھ دلوں میں تھا، جرأت کر کے سیدنا الامام الکبیر نے چاہا کہ عمل میں بھی اس کو دخل کر کے پھیلاؤ کو چادر کی وسعت کے مطابق کر دیا جائے اور گو بظاہر اصلاح کے ان شعبوں کا تعلق، اگرچہ معاش ہی سے تھا، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ اسراف و تبذیر وغیرہ کے قوانین کو نافذ کر کے اسلام نے گویا اس حد تک مسلمانوں کی دنیا کو بھی دین اور دین کا ایسا جز بنا دیا ہے۔ جس کی خلاف ورزی سے معاش کے ساتھ مسلمانوں کا معاویہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض دفعات اسی راضی نامہ کی ایسی بھی ہیں، جن میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دین میں خود تراشیدہ اضافہ بن جانے کی بھی کافی صلاحیت تھی، ایسی صلاحیت کہ دین کا کوئی سچا ہمدرد اور حنادم صادق اس سے قطع نظر نہیں کر سکتا، جیسا کہ میت کے متعلق رسوم وغیرہ کے حال کو ظاہر ہے، خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی داخلی اصلاح کے سلسلہ میں بیان کرنے والوں نے یہ اور اسی قسم کی باتیں نقل کی ہیں، یہ راضی نامہ جو دیوبند کے مسلمانوں کے درمیان حضرت دالاکہ تحریک سے ملے ہوا تھا، سوانح محفوظہ کے مصنف نے اس کا تذکرہ کر کے یہ اطلاق بھی دی ہے، کہ صرف ”کاغذی راضی نامہ“ بن کر نہیں رہ گیا تھا، بلکہ دہی لکھتے ہیں کہ اسی کی بدولت، ”شادیوں میں بھی فضول خرچی اکثر موقوف ہو گئی، اور رسوم کی پابندی بالکل نہ رہی“ اسی طرح مسلمانان ہند پر خاندان کے کسی رکن کی موت جس نہ ختم ہونے والی مالی مصیبت کے طوفانی دہانے کو کھول دیتی تھی، اس کی طرف اشارہ کر کے وہی خبر دیتے ہیں کہ

”میت کے رسوم بہت کم ہو گئے، اکثر جگہ سے سیدم و دہم و بستم و چکم موقوف ہو گیا“

لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ عمل کی دنیا سے منقطع ہونے والوں کو شرعاً عملی دنیا کے رہنے والوں سے جو امداد مل سکتی تھی فیض کا یہ دردرازہ بھی بند ہو گیا تھا، بد قسمتی سے رسوم کے اسناد کے بعد ایسا اوقات کچھ اسی قسم کی صورت حال پیش بھی آجاتی ہے، اگرچہ یہی قالب میں مرنے والوں کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ چونکہ زیادہ تر سوسائٹی کے دباؤ کا وہ نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے عمومی

مردہ رسوم سے بھی بچ پوچھئے تو مرنے والے کی روح کو مستفید ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔
 بہر حال سیدنا امام الکبیر کی تحریک سے ایک طرف رواجی دستور کی زنجیریں جہاں کاٹی اور تھڑی جا رہی
 تھیں، وہیں دوسری طرف جیسا کہ سوانح مخطوط کے مصنف ہی نے لکھا ہے کہ
 ”ایصالِ ثواب میرت کا پورا پورا طریقہ شرع شریف کے موافق ہو گیا۔“

یعنی رسمی قیود سے آزاد ہو کر مرنے والوں کے نام جن مالی اور بدنی عبادات کی راہوں سے
 ثواب پہنچانے کی شرعاً گنجائش تھی، اس کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ باقی رکھنے کی
 کوشش کی گئی اور آج تک مجدد اللہ اس کا سلسلہ باقی ہے، چاہئے بھی یہی کہ ان طریقوں کو شرعی
 حدود کی پابندی کرتے ہوئے باقی رکھا جائے۔ عمل کی دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کے ساتھ
 حسن سلوک کی بھی ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور اسی تدبیر سے زندوں اور مردوں کے درمیان گو نہ
 ایک قسم کا تعلق بھی قائم رہتا ہے، بہر حال اہل السنۃ والجماعت یا سنی مسلمانوں میں ایسے رسوم
 اور رواج جن کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی، ان سے تو مسنیوں کی دینی زندگی کو پاک و صاف کرنے میں
 جرات اور کامل عزم و ارادہ کا اظہار آپ کی طرف سے ہوتا تھا، لیکن ایسے مسائل جن میں علماء
 اہل السنۃ والجماعت میں علمی اختلافات تھے۔ یعنی اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ہر فرقہ کتب و
 سنت ہی کے شواہد پیش کیا کرتا تھا، سیدنا امام الکبیر ان مسائل میں اگرچہ خود اپنی ترجیحی رائے
 بھی رکھتے تھے۔ پوچھنے والے پوچھتے، تو وجوہ کے ساتھ اپنی رائے سے لوگوں کو آگاہ بھی کر دیا
 کرتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ آپ کا اصولی مسلک اس قسم کے اختلافی مسائل میں یہ بھی تھا جس کا
 ذکر اپنے بعض مکتوبات میں فرمایا ہے۔ یعنی امت کے اکابر اور سربراہان علماء جن مسائل میں باہم
 مختلف ہیں ان کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ

”اگر ایک طرف بالکل ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا بھنسا پرشے گا۔“

اپنے مشا کا اظہار حضرت والا نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

”اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہونٹھیں

کہ دوسری طرف کو باطل باطل سمجھ لیں“ ص ۹ جہاں قاسمی

اور یہی ہے بڑے پتے کی بات جس کی پردہ منظرہ اور مباحثہ کی مساندستوں میں مبتلا ہو کر لوگ باطل نہیں کرتے، آخر جن بزرگوں کے ساتھ حسن ظن کا تعلق ان کے علم و عمل کی وجہ سے امت قائم کر چکی ہے، ان کو اچھا بھی سمجھنا اور پھر ان ہی کی طرف یہ بھی منسوب کرنا، کہ کتاب و سنت کے اقتضاؤں سے بے پروا ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا، خود ہی سوچئے کہ ذہنی تناقض کے سوا اور کیا ہو؟ اور جہاں ان اختلافی مسائل کے متعلق آپ کا یہ مشورہ تھا کہ ”خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہونٹھیں، کہ دوسری طرف کو باطل باطل سمجھ لیں“ اسی طرح تکفیر و مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگانے کا جو رجحان مولویوں میں بڑھتا جا رہا تھا، اس کے متعلق حضرت دالا کے نقطہ نظر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، اپنے ایک فارسی مکتوب میں خاص مسئلہ جو اس زمانہ میں چھڑا ہوا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے ادبیہ فرماتے ہوئے کہ

”وہ مسلمانان کیست کہ قرآن دین و ایمان او نباشد“ ص ۱۴

اور اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر عام مشورہ آپ نے یہی دیا ہے کہ

”بناؤ علیہ تا مقدرہ کہے را کافر نباید دانست“ ص ۱۴ فیوض قاسمیہ

خلاصہ یہ ہے کہ رائے میں اختلاف کی آزادی کے فطری حق کو محفوظ کرتے ہوئے اہل علم کو مذکورہ بالا نوعیت کے مسائل میں ایک ایسے اسلم و احکم طریقہ کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہو جس کی اگر پابندی کی جائے تو ایک بہترین شائستہ باادب ماحول نزاعی مسائل کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مقصد ہر حال میں یہ تھا کہ حتی الوسع لڑنے جھگڑنے میں مولویوں کا طبقہ عموماً اس زمانہ میں بہت زیادہ بدنام اور سوا ہو رہا تھا۔ اس بدنامی اور رسوائی کو کم کیا جائے۔ اپنے بعض مکتوبات میں حضرت دالانے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ

”یاد باد این زمانہ چہ پر شوہرست کہ بجائے محبت و اخوت اسلامی، عداوت ہا بہر بغاوتند“

اور یہ عداوتیں، جو محبت و اخوت کی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، فرماتے ہیں کہ بڑے اہم مسائل سے ان کا تعلق نہیں ہے، بلکہ

”دراں مسائل کہ متفق علیہا بودند اختلاف پدید آمد“ ^{مشہد} فیوض قاسمیہ

اور ایک دوسرے خط میں جس کی زبان اردو ہے، بڑے اندہ ہناک لہجہ میں ارقام فرماتے ہیں، ”یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تنفر ^{مشہد} یک دگر ہے۔“ فرماتے تھے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنا ہی بے معنی ہے، تیرہ سو سال سے امت جو کچھ مانتی چلی آ رہی ہے خواہ مخواہ اس میں شاخا لے نکالے ہی کیوں جائیں، اور اختلاف کسی وجہ سے اٹھ کھڑا ہی ہو تو اختلاف سے عداوت کیوں پیدا ہو، باہمی منافرت کے بغیر بھی کیا مسائل کی علمی تحقیقات ممکن نہیں،

بڑی مایوسی کے لہجہ میں اپنے اردو زبان والے خط میں ارقام فرماتے ہیں۔

”اس زمانہ میں ہر توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے“

پھر مرض کے سبب کی تشخیص خود ہی یہ فرمائی ہے کہ

”ابنار و زکار میں فہم و انصاف ہوتا، تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے۔“

اور سچ پوچھئے تو ہماری یہ ساری رسوائیاں جو غیر قوموں کے سامنے ہوتی رہتی ہیں، ”فہم و انصاف“ کی کمی ہی کے نتائج ہیں، بلکہ فہم اور سمجھ لوگوں کی درست ہوتی، تو انصاف کا جذبہ خود بخود ابھر آتا مگر کیا کیجے، بقول سعدی

گر از بسیط زمیں عقل منعدم گردد

بخود گمان نہ برد هیچ کس کہ نادانم

اس زمانہ میں ہندوستان پر جا کمانہ اقتدار جس قوم نے اپنا قائم کر رکھا تھا، علمی تحقیقات کے سلسلے میں اس قوم کی عام روش اور طریقہ کا چرچا بھی یہاں پہنچنے لگا تھا، بظاہر میرا خیال ہو شاید اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اردو زبان والے اسی خط میں حضرت والا کی نوک قلم

سے یہ الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے۔

”مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں (غیم و انصاف) نصیب اہل ہیں“ مثلاً

بہر حال باوجود ان بابوسیوں کے آپ کی طرف سے کوشش اسی کی جاری تھی کہ مسلمانوں میں جہاں تک ممکن ہو، اختلافات کی ناگوارادہ کردہ شکل اگر کبھی طر پر ختم نہ ہو، تو ممکن حد تک ان کے دائرے کو کم کیا جائے۔

اسی قسم کے ایک مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی رائے کو درج کرنے کے بعد فارسی زبان کے ایک مکتوب میں مکتوب الیہ سے اس کی فرمایش کرتے ہوئے کہ دوسرے معتبر اہل علم و تقویٰ سے بھی استمراج کر لیجئے۔ ادھر کچھ ان سے معلوم ہو، مجھے بھی اس سے مطلع کیجئے کس لئے مطلع کیجئے؟ کیا اس لئے کہ پھر جواب الجواب تیار کر کے بھیجوں؟ نہیں ان ہی سے سنئے، ارقام فرماتے ہیں۔

”ایں نیازمند رہم اطلاع فرمائند تا بہ پیردی جم غفیر من، ہم سرور ہم در پر تفریق کمر دشوم“ مثلاً فیوض قاسمیہ

لیکن اپنی ذات کی حد تک ان تویموں کے باوجود، اصل دین کے ساتھ آپ کی سرگرمیوں کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ ایک مسئلہ کے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ شرعی اصطلاحات

لئے قرآن مجید میں ایک سے زیادہ جگہ پر فرمایا گیا ہے کہ ”الغیب“ کا علم حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے، **فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ** (یونس)، **إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ** (حجرات)، لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی میں ہے کہ اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے مطلع فرماتا ہے **وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكَ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مَنْ يَرْسُلُ مِنْ دُونِ مَنْ يَشَاءُ** (آل عمران)، اب سوال یہی ہے کہ غیر اللہ کو غیب کا علم جو عطا ہوتا ہے اس پر بھی ”علم الغیب“ کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت دالالتے ارقام فرمایا ہے کہ عام مسلمانوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ بالذات ادب الغیب کے علم کی ان دونوں قسموں کو علم بالغیب کہتے ہیں، پس غیر اللہ کی طرف علم غیب کو منسوب کرنے کا یہ مطلب کوئی نہیں سمجھتا کہ بالذات غیب کا علم ان کو حاصل ہے بلکہ یہی سمجھتے ہیں کہ غیب کے اس علم سے حق تعالیٰ نے ان کو سرفراز کیا ہے، ظاہر ہے کہ اسی صورت میں مسئلہ علم غیب کا اختلاف عقلی نزاع کی صورت اختیار کر لیتا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے فیوض قاسمیہ مثلاً

سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو عوام کے احساسات کو پیش نظر رکھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ
 ”ایں نزاع لفظی برپا شد“

یعنی لفظی ہیر پھیر سے زیادہ مسئلہ کی نوعیت اہم کچھ باقی نہیں رہتی۔ مگر باوجود اس کے فرماتے
 ہیں کہ،

”اگرچہ معنی مختصر عوام یا شد بر اہل ایمان، ہیچو اطلاق دیگر کفریات اگرچہ بہ تادریل حسن باشد
 گراں باشد“ ۱۷

مطلب یہ ہے کہ شرعی اصطلاحات کا خواہ کوئی عامیہ مطلب کیوں نہ تراش لیا جائے، اللہ اس
 عامیہ مطلب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بظاہر کسی قسم کا ستم بھی محسوس نہ ہو، لیکن اس
 دلچسپ مثال کو پیش کرتے ہوئے، یعنی

”اگر کسی نام فرزند خود اللہ یا رسول اللہ بہ نہد“

سیدنا الامام الکبیر نے پوچھا ہے کہ نام رکھ لینے والے کو اجازت دے دی جائے گی
 کہ اپنے بچے کو اللہ کے نام سے پکارے، یا رسول اللہ کے نام سے مخاطب کرے؟ ظاہر ہے
 جیسا کہ اوقام فرماتے ہیں

”اہل ایمان ایمان و عمل عقل و نقل را گوارا نتوان شد“

آپ نے اس کے بعد اس مسئلہ کی طرف بھی اسی سلسلہ میں قیود و دلائل سے کہ گالی یا دشنام
 میں جن الفاظ کو لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ واقعہ نہیں ہوتا۔ لیکن لفظ میں بھی قوت ہوتی ہے
 تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ رد عمل گالیوں کا کیا ہوتا ہے۔ پس عوام اپنے باہمی تعلقات میں الفاظ
 کے لفظی تقاضوں کو بھی جب برداشت نہیں کر سکتے، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ کتنا گزندہ اور کتنی تکلیف
 ان الفاظ سے بھی ایمان والوں کو پہنچ سکتی ہے، جن کا مطلب خواہ وہ نہ ہو، جو ان الفاظ سے بظاہر
 سمجھ میں آتا ہے،

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف رسولوں کو فحاشی کی جارہی ہے کہ اپنے آپ کو جو مسلمان۔

اکثر صوبوں کے بھی دہی مطلق العنان حکمران بن گئے تھے۔ اور مرکز بھی ان ہی کے زیر تسلط ہو چکا تھا، اورنگ زیب عالمگیر انارکلیہ برہانہ کے بعد تختِ برجن نام نہاد بادشاہوں کو ہم پاتے ہیں، ان میں بعض تو علانیہ شیعہ عقائد اختیار کر چکے تھے۔ براہ راست عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ اول آپ سن چکے کہ علماء اہل سنت والجماعت کو دربار شاہی میں بلا بلکہ خود مذاکرہ کے تشیع کی پشت پناہی کر رہا تھا، حمید اور عیدین کے خطبوں سے خلفائے ثلاثہ کے اسرار گرامی کو خارج کرنے کا فرمان بھی اس نے صادر کیا تھا، اور مغل حکومت کے ان شاہانِ شطرنج میں جو بظاہر شیعہ نہ تھے، بلکہ نام کی حد تک اپنے آپ کو سنی ہی کہتے اور سنی ہی سمجھتے بھی تھے۔ لیکن عملاً ان کی دینی زندگی میں بھی تشیع کے عناصر و اجزاء کچھ اس طرح گھل مل چکے تھے کہ ان میں اور شیعوں میں بہت کم فرق باقی رہا تھا۔ حکومت کے اسی رنگ میں بنا چکا ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی رنگ چکی تھی۔ خصوصاً سیدنا امام الکبیر نے جس علاقہ میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں، مختلف شہاد میں پیش کر چکا ہوں، کہ اس علاقہ میں جو شیعہ نہیں تھے، ان کی دینی زندگی بھی تقریباً تشیع کی زندگی بن چکی تھی۔ سنیوں اور شیعوں میں شادی بیاہ کے تعلقات چونکہ قائم تھے، اس لئے سیاسی اقتدار

لے عالمگیر کے بد حال قلعہ کارنگ بہلے ہوئے کہاں تک پہنچا تھا، ایک چشم دید شہادت اسکی 'برزم آخر' نامی کتاب ہے، جس کے مصنف کی زندگی کا بڑا حصہ لالی قلعہ میں گزرا تھا، منجملہ دوسری باتوں کے اسی کتاب میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے۔ اکثر سلاطین (شاہی خاندان کے افراد) قلعہ میں تعزیر داری کرتے تھے، فقیر میک بنتے تھے، کوئی نشان چھ کوئی تعیب بناتا تھا، کوئی تاشہ کوئی ڈھول، کوئی جھانچہ، تعزیروں کے آگے بجاتا تھا، کوئی مرٹھے پڑھتا تھا، مرٹھے خوانوں کو درگاہ میں چار چار پشتریاں، چکنی ڈلیاں، بھجنے ہوئے غریبوں کے بیج اور دھننے کی ملا کرتی تھیں۔ بڑی دھوم سے قلم اٹھاتے تھے، مثلاً یہ حال تو مغل شاہزادوں کا تھا، باقی خود بادشاہ سلامت سوا سی کتابیں لکھا ہے کہ "بادشاہ حضرت امام حسن حبیبیؑ کے فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے، گھٹے میں سبز کفن جھولی ڈالتے، بادشاہ کے گھر میں زنجیریں ڈال کر سید کھینچتے تھے، اور حضرت عباس علیہ السلام کے سقے بھی بادشاہ بہتے تھے، لال کھار دے کی ایک لنگی باندھے، شربت کی بھری چوٹی ایک مشک کندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلایا کرتے تھے، منہ الفریضہ و عشرہ محرم میں جو کچھ شیعوں کے پرانا ہوتا تھا۔ لال قلعہ کے سنی بادشاہوں کے یہاں بھی ہر ایک کی نقل ہوتی تھی، ۱۲۰

باہر سے اور معاشرتی تعلقات اندر سے اس رنگ کو بچنے سے بچنے ترک کرتے چلے جا رہے تھے پانی جب سر سے ادنیٰ ہوا چکا تھا، تب خانوادہ دلی الہی کو اس مسئلہ کی طرف توجہ ہوئی، حضرت مولانا گنگوہی کے حوالہ سے تذکرۃ الرشید میں یہ تاریخی بیان درج کیا گیا ہے، فرماتے تھے کہ شیعوں کے متعلق

”ہمارے اساتذہ توشاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے برابر تکفیر کی

کے قائل ہیں، بعضوں نے اہل کتاب کا حکم دیا ہے اور بعضوں نے مرتد کا۔“ ۲۸۶

خود سیدنا الامام الکبیر نے اپنے ایک مکتوب میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی مالابدمنہ فارسی کے فقہی، متن کے مشہور مصنف نے کوئی ”سیف مسلول“ نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مشیعوں اور سنیوں میں ازدواجی تعلقات کا جو عام رواج تھا، اس کی مخالفت کی گئی تھی، ”فیض قاسمیہ ص ۷۷“ بظاہر ہے کہ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مرزا منظر جانجنان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بالکل آخر زمانہ میں مفاسد کی شدت کو دیکھ کر یہ کتاب تصنیف فرمائی ہوگی، خود میری نظر سے یہ کتاب قاضی صاحب کی نہیں گذری ہے۔

بہر حال حد سے زیادہ جو فتنہ بڑھ چکا تھا، اور سچے پوچھنے تو فتنے کی اسی آگ میں وہ سب کچھ جل گیا جس کا جہلنا مسلمانوں کے لئے اس ملک میں مقدر ہو چکا تھا۔ دروکی یہ داستان طویل ہے اور ہندوستان کیا واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کا یہ جاں گداز حادثہ ہو اب اس قصے کو تو چھوڑئیے، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گو تشیع کے ساتھ سختی اور تشدد کا یہ برتاؤ ابتداء میں مناسب معلوم ہوا، لیکن اشتباہ و التباس کا جو غبار حق پر چھایا ہوا تھا گو وہ ہٹ گیا، تسنن و تشیع میں جو فرق تھا، وہ عوام کے سامنے بھی آگیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تشدد میں قدرتا نرمی پیدا ہو گئی، اور شیعہ جو بہر حال ہندوستان کی اسلامی آبادی ہی کے اجزاء تھے اور ہیں ان کے متعلق اور تو اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو فتویٰ منسوب

کیا گیا ہے، اس کا حاصل بھی معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر شیعوں میں جو اصرار کرتے ہیں کہ قرآن اصلی قرآن نہیں ہے، بلکہ (العیاذ باللہ) یہ بیاض عثمانی ہے، ۱۰ ادویوں و جن کی پہلی بنیاد انکتاب ہی کو مشکوک ٹھہرا رہے ہیں، اہل صحابہ کی اکثریت جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مسلمانوں تک پہنچی ہے، ان ہی کو ناقابل اعتماد ٹھہرا کر دین کی دوسری بنیاد سنت کو ستر کر دینے کے مجرم ہیں۔ زیادہ تر اس قسم کے خیالات اور عقائد بجائے عوام کے چونکہ شیعوں کے خواص یعنی علماء ہی میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ان کی حد تک تو شاہ عبدالعزیز ادران کے بعد کے علماء کے فتوے کو برقرار رکھتے ہوئے، حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے (یعنی شیعوں کے)

”جہلاً فاسق ہیں“۔ ۲۸

اور یہ بڑے پتے کی بات ہے، کہ جاہل سلمان، خراسانی ہو، یا شیعہ، مسلمان ہونے کی وجہ سے قرآن کو بہر حال اللہ کی کتاب ہی مانتا ہے۔ اس غریب کو ان دایہ تباہی نظموں سے کیا سروکار۔ جو شیعہ علماء کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

فیوض قاسمیہ نامی والے مجموعہ مکاتیب میں سیدنا الامام ابوالکیر کا یہی ایک خط پایا جاتا ہے، جس میں شیعوں کے متعلق بعض دل چسپ حکیمانہ نکات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امام اللہ شیعوں کے دین کو برزخی دین قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں،

”بلحاظ ان کہ کلمہ شہادت، برزبان اور جنات مست، برصوم و صلوة و حج و زکوٰۃ وغیرہ اعمال

اسلامیان کے اعمال دین اسلام باشند“

یعنی نماز، فتنہ حج و زکوٰۃ وغیرہ اسلامی اعمال کے ساتھ شیعہ بھی

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ

کی تصدیق کرتے ہیں، دل سے بھی مانتے ہیں، اور زبان سے بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں، یہ پہلو تو شیعوں کا اسلامی ہے، اور اسی کے ساتھ

”مجلد اعمال و افعال شان و عقائد باطلہ و اہواز ائمہ شعار شان است و بدعات شنیعہ
و معمولات قبیحہ کردار شان“

ایک پہلو شیعوں کی دینی زندگی کا یہ بھی ہے کہ اس قسم کی باتیں چونکہ

”اڑا تار کفر چہ انجام کفر ہیں مخالفت قرآن و حدیث باشد“

ان ہی وجوہ کی بنیاد پر آپ نے لکھا ہے کہ شیعوں کا دین کفر و اسلام کے درمیان ایک قسم کا
برزخی دین ہے کہ

”برزخ ہماں سمت کہ از ہر طرف اثرے بخود کشد و منظر آثار اطراف خود گرد“

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام کے مقابلہ میں شیعوں کی مذکورہ بالا امتیازی خصوصیتوں کو پیش نظر
رکھتے ہوئے سنیوں کے بعد شیعہ ہی اس کے مستحق تھے کہ ان کی طرف توجہ کی جائے اور اس
سلسلہ میں بھی جو کچھ آپ سے ہو سکتا تھا کرتے رہے، تصنیفی سلسلہ میں تو ہیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ
سیدنا امام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی
دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، ساتھ ساتھ تین صوفیوں
سے نامہ و راق میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ تقطیع متوسطہ اور لکھائی بھی اس کی گتھی ہوئی ہے۔ اپنے
عام طریقہ تصنیف کے خلاف اس کتاب میں بکثرت دوسری کتابوں کے حوالوں کو بھی آپ نے
پیش کیا ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی، اس کا نام
”ہدۃ الشیعہ“ ہے، کتاب کے خصوصی نقاد نظر کا ذکر و انشاء اللہ اگلی جلد میں کیا جائے گا یہاں
حضرت الاکی ”داخلی خدمات“ کی دوسری منزل کا صرف تذکرہ مقصود ہے۔ بڑے دردناک
ہجہ میں کتاب کو ختم کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ شیعوں کو چاہئے کہ

”اس عقیدہ بد سے باز آ کر توبہ و استغفار سے تدارک مافات کریں آئندہ مانیں تو وہ نہیں“

ما نصیحت بجائے خود کردیم روزگار سے درس بسر بردیم

در نیار و بگوشت اندر کس بر رسولان یلاغ باشد و دس

ایک یہی کتاب نہیں، آپ کے خطوط میں بھی جو شائع ہو سکے ہیں، شیعوں کے متعلقہ
مباحث و مسائل ہی کو ہم زیادہ پاتے ہیں، آپ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ پہلے بھی
کہیں ذکر گذر رہا ہے کہ شیعوں میں وقت کے مشہور مجدد مریدی حامد حسین صاحب لکھنؤی تھے۔
اپنی شان اور اپنے مقام کا خیال نہ کرنا، ان کی تفسیر ان کے پاس پہنچ گئے، جس پر ان
میں پہنچے تھے، اس کا ذکر اپنے ایک خط میں مولوی حکیم ضیاء الدین، ایسویں سال میں لکھا
فرمایا ہے۔

”بے عمامہ و رد مال چنانکہ حادث من سرت بر مکانے کہ مولوی حامد حسین صاحب
لکھنؤی شیعہ..... فرود کش بودند فرتم“

واللہ اعلم بالصواب صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا، کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ یہ خیال کہ لکھنؤ پہنچ کر
مولوی حامد حسین صاحب سے حضرت والائے ملاقات کی تھی، بظاہر کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا
زیادہ فرینہ اسی کا ہے کہ میرٹھ یا سہارنپور یا ملکن ہے، دہلی ہی کسی درجہ سے مولوی حامد حسین آئے
تھے، اور حضرت دالان کے پاس پہنچے۔ اس سلسلہ میں کچھ مناظرہ اور مکالمہ کی صورت بھی پیش
آئی، اور مولوی حامد حسین صاحب کو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ مولانا محمد قاسم صاحب سے گفتگو
کر رہے ہیں۔ اسی موقع پر بجائے مشہور نام کے تاریخی نام غور شیدہ حسن آپ نے اپنا بتایا تھا،
تحفہ اثنا عشر یہ میں بھی شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنا تاریخی نام غلام حلیم ہی درج کیا ہے۔
اضطراراً بزرگوں کی سنت کی پیروی کی سعادت سمجھنا چاہئے کہ آپ کو حاصل ہو گئی۔

اور مجھ ہی سے یاد ہو گا آپ یہ سن چکے ہیں کہ شیعوں کی طرف سے یہ مطالبہ پور قاضی نامی قصبہ
میں جب پیش ہوا کہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اگر مولوی محمد قاسم ہم لوگوں کو
لے مولوی حامد حسین کے نام کے ساتھ مجتہد کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ شیعوں میں غیر معمولی امتیاز ان کو حاصل تھا
حضرت دالائے بھی ان کا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو اب ختمی الکلام کا ہے بسوٹا سکی باستقصا الانجاء
نورثہ اندہ و ہم شیعہات در میان زمین و آسمان نظیر ندارد آفتاب وقت و بدر نیز بے نظیر اندہ صلا
لکھ یہ واقعہ میرٹھ میں نواب محمد علی خاں کے مکان پر پیش آیا ہے۔ عظیم

کرادیں تو ہم شیعہ سے توبہ کر لیں گے، تو خلاف دستور حضرت کو جوش آگیا، اور ان کے مطالبہ کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے، مگر مطالبہ کرنے والے ہی بھاگ گئے۔

اسی پور قاضی ہی کے شیعوں کے متعلق مولانا طاہر صاحب نے اپنے فائدہ ماجد کے الفاظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے یہ ہدایت نقل کی ہے کہ سیدنا الامام الکیسویں زمانہ میں پور قاضی پہنچے تھے تو اتفاقاً یہ محرم کا مہینہ تھا، حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر پور قاضی کے شیعوں کو ہوئی تو ایک وفد ان کے سربراہ آوروں کا خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہو کر پور قاضی کے شیعوں کو منون فرمایا جائے۔ خلاف توقع بجائے انکار کے حضرت نے فرمایا کہ میری ایک شرط بھی منظور کی جائے تو میں اس مجلس میں شریک ہو سکتا ہوں، جو شرط پیش کی گئی اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا؟ شرط یہ تھی کہ اسی مجلس میں

جو کچھ عرض کروں، اسے سن لیں۔

دفد نے اس شرط کو تو منظور کر لیا، مگر اسی کے ساتھ ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے

”پہلے مجلس ہوگی، اس میں حلوا بھی تقسیم ہوتا ہے، وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔“

آپ نے اس اضافہ کو بھی مان لیا اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر بھی ہوئے، حلوا جو دیا گیا اسے بھی لے لیا، جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہو گئیں، تب ماتم کی اسی مجلس میں حضرت والا نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہداء وصیت

تو کتب فیکہ الثقلین کتاب	میں تم میں دو بھاری چیزوں کو چھوڑتا ہوں، اللہ کی
اللہ و عاتقی	کتاب، اور اپنی اولاد

پر ایک مخلص و ميسوط تقرر فرمائی، سننے والے خلاصہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہدایت کے لئے حضرت والا نے فرمایا علم و عمل دونوں کی ضرورت ہے۔ علم کے لئے تو اللہ کی کتاب ہے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت پاک میں نسلِ مناصبت کی ذبح سے عمل کی صلاحیت
نسبتاً زیادہ ہونی چاہئے۔

الغرض ماتم کی اس مجلس میں اسی اجال کی تفصیل کچھ ایسے رنگ میں کی گئی کہ بھلے تم
کے تہلیل کی مجلس بن گئی، روایت کے آخر میں مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد کا حوالہ
دیتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ

”اس وعظ کے بعد بہت سے لوگوں نے توبہ کی“

بظاہر اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کشمیری عقائد سے تائب ہو کر لوگ سنی بن گئے۔

اس میں شک نہیں کہ علمی وقار و عظمت کے رکھ رکھاؤ کے لئے عموماً مولویوں نے جن پابندیوں
کی رعایت کو ضروری ٹھہرایا ہے۔ فطرتاً سید اللہ امام الکبیر کی نظر میں ان کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی
مولوی حامد حسین مجتہد شیعہ کے گھر میں جس شان سے آپ تشریف لے گئے، خود اس واقعہ سے
بھی آپ کی انقلاب کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک موقع پر دینے الشیعہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے
یعنی خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کی اشاعت و تشریح چونکہ غیر معمولی حصہ
تھا، گویا قرآن کے معلم اور استاد ہونے کی حیثیت ان کو حاصل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشیخہ
بابہ جو غیر معمولی کدو کا کوشش کے قرآن کو زبانی یاد کرنے میں عموماً کامیاب نہیں ہوتے، یہ دلیل ہے
کہ استاد کے باطنی فیض سے وہ محروم ہیں، اسی عام مشہور تجربہ کی تائید اپنے چشم دید شاہدہ سے
فرماتے ہوئے آپ نے شیعوں کے ایک عالم جن کا نام مولوی جعفر علی تھا، اور شیعوں کے دئی
میں پیش امام تھے۔ اپنے زمانہ میں ان کی ہستی دلی کے شیعوں کی مرجع بنی ہوئی تھی، اہل مشہور
تھا کہ مولوی جعفر علی صاحب قرآن کے حافظ ہیں۔ ان ہی کا ذکر کرتے ہوئے سید مظہر امام الکبیر
نے لکھا ہے کہ

”ان کے حفظ کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں غدر سے پہلے پچھم خود اس حشر

نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خاں کی مسجد میں ہوا کرتا

تھا، مثلاً دیگر حضار شیعہ مذہب حائل میں دیکھ دیکھ پڑھتے تھے۔ نس پر بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے: "مذہب الشیعہ"

ظاہر ہے کہ حامد علی خاں کی مسجد میں یہ جلسہ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، خاص شیعوں کی طرف سے منعقد ہوتا تھا۔ ۱۰ دہائیہ واقعہ غدر سے پہلے کا ہے، عمر حضرت دالاک کی زیادہ نہ ہوئی، ممکن ہے طالب علمی کے دنوں کی بات ہو۔ لیکن اس زمانہ میں خانوادہ ولی اللہی کی وجہ سے شیعوں اور سنیوں کی باہمی کش مکش جس حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے لحاظ سے میں تو اس کو بھی حضرت دالاک کی طبیعت و راستہ مزاجی ہی کا نتیجہ سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پور قاضی کے شیعوں کی ماتمی مجلس میں آپ کی شرکت اور اسی مجلس میں علو سے کا قبول فرمانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ پور قاضی کے سنیوں میں معلوم ہونا ہے جس کی وجہ سے کافی کھل بلی مچ گئی۔ عام سنی مسلمانوں پر علماء اہل السنۃ والجماعت کی وجہ سے اس زمانہ میں قدغن تھا کہ شیعوں کی ماتمی مجالس میں شرکت سے بھی پرہیز کریں اور ان مجالس میں جو چیزیں تقسیم ہوتی ہیں ان کو نہ لیا کریں۔ مولوی طاہر صاحب کی ہدایت میں ہے کہ حضرت دالاک سے پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو پہلے کچھ اعراض فرمایا گیا۔ لیکن جب زیادہ اصرار اس کی طرف سے بڑھا، تب لکھا ہے کہ واقعہ کو سمجھاتے ہوئے فرمایا گیا کہ "بھائی اگر کوئی قوی آدمی تھوڑا سا زہر کھالے تو اس کے حق میں وہ نقصان نہیں کرتا، لیکن اسی زہر کو ضعیف اگر کھا جائے تو مر جائے۔"

اور اسی کے بعد دل کی جرات تھی اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا کہ ان کی مجلس میں شریک ہو کر "اگر میں نے حلو لیا اور قبول کر لیا تو ان کی مجلس میں کلمہ حق بھی تو پہنچا دیا۔"

اس حلوہ لینا ثابت ہے۔ کھانا ثابت نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا جو ذرا سے مشتبہ مال سے بھی اجتناب کر لینے کے عادی تھے وہ اس حلوہ کو کیسے کھا سکتے تھے۔ یہ قبول حلوہ محض تبلیغ کلمہ حق کی ضرورت سے کیا گیا گیا۔ جب کہ شیعوں نے کلمہ حق سننے میں قبول حلوہ کی شرط لگا دی تھی یعنی اس کے بغیر وہ کلمہ حق سنا نہیں چاہتے تھے۔ پس حضرت نے اس قبول حلوہ کو ادائے فرض کے مقدمہ کی حیثیت سے گوارا فرمایا۔ محمد طیب غفرلہ

روایت جس طریقہ سے ہم تک پہنچی ہے، اعتماد کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتی ہے اور گو یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن تبلیغی فرائض سے صحیح معنوں میں سبک دہشی کی اثر آفریں اور نتیجہ خیز راہ یہی ہو سکتی ہے، اگر شرط اول اس راہ میں یہی ہے، کہ جبہ و دستار کے خود تراشیدہ احترامی و سادس سے دل و دماغ کو پاک کر کے فرض کے حقیقی احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کیا جائے۔

ایک مشہور و معروف بزرگ نے لکھنؤ میں فقیر سے ایک دفعہ کہا تھا، ان کی بات یاد آتی ہے، مذکر شیعہ اور سنی مباحثوں اور مناظروں کا چورہا تھا۔ اسی آسان کے ایک نجم ثاقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اشر کے اسی فقیر نے بھی سے پوچھا کہ نصف صدی کی تحریری و تقریری کوششوں کا نتیجہ ان کے کیا ہوا؟ کیا تم نے سنا کہ کوئی شیعہ سنی ہو گیا ہو؟ اپنی معلومات کی حد تک نفی کے ساخا کس راہ اس کا جواب کیا دے سکتا تھا۔ پھر بعض واقعات اپنے سنائے اور بتایا کہ فلاں فلاں آدمی کٹر شیعہ تھے لیکن تقریر و تحریر کی ہنگامہ آرائیوں کے بغیر محمد اشر اسلام کی صادق احمدی روح کے پانے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

خود سیدنا الامام الکبیر بھی تقریری و تحریری کا دوبارہ کی لا حاصلی سے واقف تھے، اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ایک پہلو افادیت کا سولہوں کے اس کا دوبارہ کا بھی آپ نے پیدا فرمایا ہے۔ یعنی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ حقیقی مطلب تو اس رسالہ کے وہی لوگ ہیں، جو شیعہ عقائد رکھتے ہیں، اور بقول آپ کے یہ سالہ شیعہوں کے لئے

”اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصول ایمان ہے“

لیکن اسی کے ساتھ آپ نے لکھا ہے کہ سنیوں کے لئے بھی ان مضامین کو غیر مفید نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ حضرت والا کے الفاظ میں ان کا

”یہ فائدہ ہے کہ کچھوں کے لئے مفید یقین اور کچھوں کے لئے باعث اطمینان ہے“

اور کوئی مشہ نہیں کہ فائدہ کا یہ پہلو جس کا آئے دن تجربہ ہوتا رہتا ہے، کچھ کم قیمتی نہیں ہے، اسی لئے حضرت والا کی زندگی میں قصبہ پور قاضی کے ماتر کی مثالیں جہاں ملتی ہیں، وہیں آپ اس کی کوشش بھی فرماتے رہتے تھے کہ ملک اور حکومت کے خاص حالات کے تحت خود شیعوں کی دینی زندگی جو شیعہ عقائد و اعمال کے جرائم سے مسموم ہو گئی ہے۔ اس زہر کو بھی جس طرح ممکن ہو، نکالا جائے۔

خود شیعوں کے نائب ہونے کی مثالیں تو بجز پور قاضی کے اس قصہ کے اور مجھے تک نہیں پہنچی ہیں لیکن شیعوں میں جو کچے تھے، ان کے شکوک کو مشارکین کی روشنی پیدا کی گئی اور جو

لئے اس سلسلہ میں جھٹک جو واقعہ پیچھا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ مجھ سے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاٹہ ضلع میرٹھ نے بیان کیا بعد انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن پھیلا دوہ ضلع میرٹھ سے سنا جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں تلاذہ میں ایک زبردست عالم تھے اور آخر میں قوت نسبت و مباحث سے اس دم پر پہنچ گئے تھے کہ چل ڈھال اصناف گشت تک حضرت دالاجیا ہی ہو گیا تھا۔ حضرت کے دیکھنے والے بعد سے انہیں دیکھ کر حضرت نانوتوی کا مشہ کرنے لگتے تھے حضرت شیخ البند محمد اگر اپنے استاد کے نظریات میں سے کسی چیز میں الجھ جاتے تھے تو بعض اوقات سفر کر کے پھیلا دوہ جاتے اور مولانا عبدالحق صاحب مرحوم سے لڑتے۔ مانق المعروف کا تاریخی نام خود شیعوں کا نام نہیں ہے ہی ایک نظم کے ساتھ کہ کر بیٹھا تھا۔ جس میں حضرت نانوتوی کے علم دایم تادمی دونوں کے ابن اچھی کر دیے گئے۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب سے فرمایا کہ جب حضرت نانوتوی در مباحثہ شایعہ پڑھتے تھے تو شاہجہان پور کے قریب کسی گاؤں کے چند غریب شیعوں نے دو خالی شیعوں کے اثرات میں دیے ہوئے بے بس تھے۔ کیونکہ چندا مشیعوں ہی کا تھا، حضرت کو کھا کر جاتے یا آتے حضرت دلا اس گاؤں کو آخر قدم سے حوت بچھیں اور یہیں کچھ چند نصیحت فرمادی۔ تاکہ ہائے لئے صلاح و ظاہر اور تقویٰ کا باعث ہو۔ حضرت دلا نے خوشی ان کی حوت منظر فرمائی جیسا کہ فرما دی حوت و پیشکش بطور دعوت قبول فرماتے کی عادت تھی بعد جاتے یا آتے ہونے اس گاؤں میں مائرے شیعوں میں اس سے کہلی ہی تھی۔ فکر یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے دعوے کا اثر شیعوں پر ہو جائے اور شیعہ دباؤ کی تعلیم ٹوٹ جائے تو انہوں نے یہی توفیق اثرات کی کاٹ کے لئے کھنڈ سے چار شیعہ مجتہد تاریخ مقررہ پر بلائے اور آرام یہ ملے پایا کہ مجلس و دعائیں چاروں کوڑوں پر چاروں مجتہد بیٹھ جائیں اور چالیس اعتراضات منتخب کر کے دس دس اعتراض چاروں پر بانٹ دیئے گئے کہ انشاء و دعائیں اس طرح کئے جائیں کہ ان میں سے ایک ایک اعتراض کوئی ایک ایک

پکے تھے ان کو اطمینان و سکینت کی خشکیوں سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے لئے تو اصلاح
منظر نگار و سہارنپور وغیرہ کے قصبات اور دیہات کے مسلمانوں کی دینی زندگی جہاں تک میرا خیال

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) اس سے حضرت نشیں، تو دوسرے کو نہ کا اور پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کو نہ
کا۔ اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض و جواب میں جتنا کر کے وقت ختم کر دیا جانے سب
غیبی مدد اور حضرت دلا کی کرامت کا حال سننے کے حضرت نے وعظ شروع فرمایا۔ جس میں گلاؤں کی تمام شیعہ
برہمہ ی بھی جمع تھی۔ وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے
اعتراضات نے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے
کردن اٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے
سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے ان معزورہ شبہات کے مکمل حل سے گلاؤں کے شیعوں اس قدر مطمئن اور
منشروع ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کر لی اور سستی ہو گئے۔

مجتہدین اور عوامی شیعہ جو دہریوں کو اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو انہوں نے حرکت
نہ پوچی کے طور پر اس مشہور منڈی کو مٹا دیا اور حضرت دلا کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک
نوجوان لڑکے کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے اکر عرض کیا کہ حضرت نماز جنازہ آپ پڑھا دیں۔ پھر دکرام یہ تھا کہ جب
حضرت رد کیسریں کہہ لیں تو صاحب جنازہ اکدم اٹھ کھڑا ہوا اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزا اور مسخر
کیا جانے لگا۔ حضرت دلا نے صحت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور میں سنی۔ اصول نماز الگ الگ ہیں۔ آپ
کے جنازہ کی نماز مجھ سے پڑھوانے میں جائز کب ہوگی؟ شیعوں نے کہا کہ حضرت بزرگ ہر قوم کا بزرگ
ہی ہوتا ہے۔ آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔ حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرمالیا۔ اور جنازہ پر
ہنچ گئے۔ مجمع تھا۔ حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھنے
گئے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور انقباض چہرہ سے ظاہر تھا۔ نماز کے لئے عرض کیا گیا تو
آگے بڑھے اور نماز شروع کی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ کے مطابق جنازہ
میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے "ہو غم" کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے
ہونے کی سنسکار دی۔ مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اور جہ پڑی کر کے اسی حصہ
کے جہ میں نہر مایا کہ "اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔ دیکھتے گیت تو مرد
تھا۔ شیعوں میں دو نما پٹینا پڑ گیا اور بجائے حضرت دلا کی سبکی کے خود ان کی سبکی
اور سبکی ہی نہیں سبکی سوت آگئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر باقی مانع شیعوں میں سے بھی بہت سے
تائب ہو کر سستی ہو گئے۔

محدث غفر

ہے، زندہ شہادت کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ مغل حکومت کے آخری دور میں بارہم کے جن سادات نے کنگ میکر (بادشاہ گر) ہونے کی حیثیت حاصل کرنی تھی وہ اسی اطراف و جوانب کے رہنے والے تھے جن کا اثر پھیلنا قدرتی تھا۔ ان کے سوا دوسرے اسباب بھی تھے کہ اور تو ادر ضلع سہارنپور کا یہی قصبہ دیوبند جو آج سنیوں کا سارے ہندوستان میں مادی و لمبا بنا ہوا ہے۔ کسی موقعہ پر میر شاہ خان مرحوم کی اس اطلاع کا ذکر کر چکا ہوں کہ سیرٹھ پا پور گاؤں میں بلند شہر کے ساتھ ساتھ وہی کہتے تھے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ

”دیوبند میں بھی سب تفضیلی تھے“ ملا ادر داغ ٹلاڑ

اسی موقعہ پر اگرچہ خاں صاحب کا یہ بیان بھی درج ہے کہ حضرت سید شہید کی کوششوں سے ابتداً اس علاقے کے مسلمانوں کے تفضیلی رجحانات کے ازالہ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی، لیکن صدیوں سے لوگوں میں جو ہر سرایت کئے ہوئے تھا۔ اسی کا کلی استیصال ظاہر ہے کہ اچانک نہیں ہو سکتا تھا۔ سیدنا الامام الکبیر جن دنوں میں دیوبند کو وطن بنا کر یہاں مقیم ہو چکے تھے۔ اسی زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر لوگ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے اچھے اچھے متاذ گھرانوں میں تفضیل کا اثر موجود تھا، بلکہ سوانح معظوظہ کے مصنف

لے لیکن جہاں ان کنگ میکروں نے شہیت کو اپنے افراد قند سے مداح دیا وہاں حضرت والا کی تاثیر و قوت خدادان کنگ میکروں پر بھی اپنا کام کر گئی۔ ان سادات بارہم میں سے خانبہاں پور۔ رتھیرٹی۔ ادر منصور پور کے خاندان حضرت ہی کے ہاتھ پر نائب ہوئے، ادر سنی بنے ادر اس قدر گردیدہ اور محب بن گئے کہ ان کی دیوبند کی آمد و رفت مثل اہل بیت کی آمد و رفت کے ہو گئی ہے۔ ادر حق کے یہاں جب پہلی لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام فاطمہ ہے (سکھیا) تو سید نور الحسن صاحب رتھیرٹی اُس کے لئے کپڑوں کے جوڑے اور پچکانہ فریور اسی انداز سے نوا کر لائے، جیسے اپنے خاندان میں کسی قریبی عزیز کے یہاں ولادت ہوئے ہر چیز لائی جاتی ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹہ غنائے وقت اپنے قبیلہ ادر عالم کو ہدایت فرما کر گئے تھے کہ مشکلات کے وقت سوری سید محمد نبید صاحب رتھیرٹی خان جہاں پور کی طرف رجوع کریں۔ یہ خاندان مجدد اللہ کے شقی ادر دیاستوں کے باوجود نہایت سدری اور متشرع ہیں۔

محمد طیب غفرلہ

نے بجائے تفصیل کے لکھا ہے کہ

”مادہ دفع کا غالب تھا“ ۱۷۳

اسی وجہ سے آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے ساتھ کش مکش کی صورت اسی دیوبند میں جو پیش آئی وہ سننے کے قابل ہے، اس کا ذکر سوانح مخفیہ کے مصنف نے بھی کیا ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی مولانا محمد طیب اصفیہ کے مراسلہ سے معلوم ہوئی۔

واقعہ یہ ہے، یاد ہو گا کہ دیوبند میں سیدنا الامام الکیبر کے گھر کی عام ضروریوں کی سربراہی کا تعلق دیوان جی محمد حسین صاحب سے تھا، حضرت والا کے فرائض میں تھے، ان ہی کا قصہ ہے کہ مرید ہونے کی خواہش سیدنا الامام الکیبر سے ظاہر کی۔ لیکن آپ نے حضرت گنگوہی سے مرید ہو جانے کا حکم دیا۔ اسی وقت گنگوہہ جاکر حکم کی تعمیل کر کے سیدنا الامام الکیبر کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر مستدعی ہونے کے اب تو مجھے اپنا مرید بنالیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ تو مرید ہو چکے، بڑے مرید کہاں ہوا۔ صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی سعادت سے سرفراز ہوا ہوں۔ عرض کا یہ طریقہ تھا

۱۔ دیوان جی کے کچھ حالات کا ذکر پہلے کر چکا ہوں دریافت کرنے پر مولانا محمد طیب صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ تیسین نام کے دو صاحبوں کا خدو بھی تعلق سیدنا الامام الکیبر سے تھا، جن میں ایک تو ہی دیوان جی دیوبند کے رہنے والے تھے اور بقول مولانا طیب صاحب دیوبند میں حضرت والا کی خانگی اور ذاتی امور کا تعلق ان ہی سے تھا، لکھا ہے کہ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اپنے زمانہ مکان کے حجرے میں ذکر کرتے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب سیانی، مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں کشفی حالت دیوان جی کی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ باہر مشرک۔ رائے جانے والے نظر آتے رہتے تھے۔ درود و اوار کا حجاب ان کے درمیان ذکر کے وقت باقی نہیں رہتا تھا، ان ہی دیوان جی کے ایک مکاشفہ کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مشائی عالم میں ان پر منکشف ہوا کہ دارالعلوم کے چاروں طرف ایک سرسبز دھڑا تھا ہے۔ اپنے اس کشفی مشاہدہ کی تصویر خود یہ کیا کرتے تھے کہ نہ انیت اور تہجد و آندہ کی کے آثار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں نمایاں ہوں گے۔ دارالعلوم کے کتب خانہ کے سب سے پہلے عرصہ بھی ہی دیوان جی تھے۔ بقول مولانا حبیب الرحمن دارالعلوم کا یہ دو زمانہ تھا کہ دربان سے لیکر مہتمم تک سب کے سب صاحب نسبت تھے۔ دیوان جی نے تو نوش کے آدمی تھے۔ سیدنا الامام الکیبر کی مجلس میں باہر سے آنے والوں کو اکثر یہ ہوا کرتا کہ حضرت مولوی ہیں۔ دوسرے صاحب سیانی نام کے مولانا کے رہنے والے تھے۔ اور عجیب بات ہے کہ جب تک توطن کا تعلق نہ ہو تو حضرت کا دہا کو جان کے تمام خانگی کاموں میں شمول نہیں ہوتا۔

ایسا تھا کہ منظوری کے سوا دوسری صورت ہی کیا ہو سکتی تھی۔

بہر حال قصہ ان ہی دیوبند کے حاجی محمد حسین دیوان جی کا ہے، شمار اُن کا دیوبند کے سربراہ شیوخ میں تھا، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کے نانیہالی رشتہ داروں میں تھے۔ مگر خاندان میں دیوان جی کے جیسا کہ سوانح مخطوط کے مصنف نے لکھا ہے کہ

”ان کے ہاں کی تعزیرہ داری مشہور تھی۔“ ص ۱۲

اور خاندان پر جب رض کارنگ چڑھا ہوا تھا تو تعزیرہ داری نہ چرنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی؟

بہر حال سیدنا الامام الکبیر کے فیض صحبت کی اثر پذیری نے اس فیصلہ پر جب دیوان جی کو مجبور کیا، کہ اپنے اقتداری دائرے میں تعزیرہ داری کی رسم کو ختم کر کے رہوں گا، تو دیوبند کی تاریخ کا وہ ایک اہم واقعہ بن گیا۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”عمل کی مسجد جس میں آج کل مولانا حسین احمد صددار العلوم دیوبند پانچویں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔“

یہی مسجد دیوان جی کے محلہ کی مسجد تھی۔ تعزیرہ اس مسجد میں بھی رکھا جاتا تھا اور محرم میں اسی مسجد سے وہ تعزیرہ اٹھتا تھا، مولانا طیب صاحب نے اطلاع دی ہے کہ

”اٹھانے والے سنی ہوتے تھے، کچھ شیعہ گھرانے بھی اس جگہ تھے۔“

دیوان جی نے سب سے پہلے اپنے محلہ کی اسی مسجد کو تعزیرہ کے قصہ سے پاک کرنے کا ارادہ کیا اور بردایت مولانا طیب صاحب

”اعلان کر دیا کہ اس سال اس مسجد سے تعزیرہ نہیں اٹھے گا۔“

یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا، دیوبند کی شیعہ آبادی ہی میں نہیں بلکہ تعزیرہ بدست سینوں میں بھی اس اعلان سے کھلبلی مچ گئی۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ پہلو تو

”اس محلہ کے شیوخ بگڑ گئے، اور کہا کہ سر قلم ہو جائیں گے، مگر تعزیرہ اٹھے گا۔“

یہ سن کر دیوان جی کی زبان سے بھی بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

”اگر گزرا تو میری لاش پر سے گزرے گا“

ادب بدرجہ عجلہ سے آگے بڑھ کر فتنہ کی آگ سارے قصبہ میں پھیل گئی۔ بقول مولانا طیب صاحب قصبہ دیوبند کی

”شیوخ کی برادری دیوان جی کے خلاف متحد ہو گئی“

ظاہر ہے کہ یہ معمولی فتنہ نہ تھا، اس وقت دیوبند کے شیوخ کی برادری میں کافی ہیکڑی والے لوگ تھے۔ استعمال غلط ہو، لیکن اس وقت مسلمانوں کے عزم اور ارادہ میں کافی قوت تھی، دیوان جی کے خلاف قصبہ کے شیوخ برادری کے اس اتحاد کو کافی اہمیت حاصل ہو گئی، اندر ہی اندر جو کچھڑی پک رہی تھی، اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر تک بھی پہنچی، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”حضرت (دانا توئی) کے علم میں جب یہ آیا، اور معلوم ہوا کہ موقعہ پر شہر میں عظیم ترین ہنگامہ برپا ہونے کا خطرہ ہے۔

تو ایک دن جب دیوان جی حضرت دالا کی مجلس مبارک میں حاضر تھے، اور بقول مولانا طیب صاحب اسی مجلس میں

”شہر کے اکابر شیوخ اور دوسری برادریوں کے بڑے موجود تھے“

سیدنا الامام الکبیر دیوبند جی کو مخاطب بنا کر فرماتے لگے کہ

”بے خدا اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم مجھ سے ذکر تو کر لیا ہوتا“

یہ بات تو دیوان جی سے کہی گئی، اور اس کے بعد اسی بھری مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی عام اعلان فرمادیا گیا کہ

”لیکن خیر اب اگر ایسا کہہ دیا گیا ہے، تو دوسرا ستر قائم کالگا ہوا ہے“

مطلب یہ تھا کہ اپنی لاش پر دیوان جی نے اعلان کیا تھا کہ تعزیر گزیرے گا۔ اسی

لاش کے ساتھ دوسری لاش جسے قزیہ لے جانے والے اپنے قدموں کے نیچے پائیں گے وہ محمد قاسم کی لاش ہوگی۔

بھری مجلس کے اس خونی اعلان کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی سامنے آیا۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”جب یہ جملہ (یعنی قاسم کا سر بھی رگاہوا ہوگا) شہر میں مشہور ہوا، تو ہمیشہ درباردیاں متحد ہو کر تیار ہو گئیں، کہ اگر شیوخ نے دیوان محمد حسین صاحب کے ساتھ کوئی نازیبا برتاؤ کیا، تو یہ ساری برادریاں ان شیوخ کے مقابل ہو جائیں گی۔“

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، علاوہ عثمانی شیوخ کے دیوبند کے مسلمانوں کی آبادی مختلف پیشہ وندوں مثلاً پارچہ بانوں، روغن گردن و غیرہ پر مشتمل ہے۔ پیشہ وندوں کی یہ ساری برادریاں حضرت دالاسے غیر معمولی عقیدت کا تعلق رکھتی تھیں، یہ سننے کے ساتھ ہی کہ دیوان جی کے سر کے ساتھ یہ نالایق نام الکیہ نے اپنے سر مبارک کو بھی باندھ دیا ہے۔ اس وقت اس کا اغازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا اثر ان عقیدت مند غلصہ مسلمانوں پر کیسا مرتب ہوا ہوگا۔ اہد بات کچھ ان ہی پیشہ وند برادریوں تک محدود نہ رہی، بلکہ بقول مولانا طیب صاحب،

”خود شیوخ میں بھی دو گروہ ہو گئے، بڑا گروہ حضرت (نانو توئی) کی حمایت پر تل گیا۔“

اہد یوں واقعہ اس رنگ میں لوگوں کے سامنے آگیا کہ مولانا طیب کے بیان کے مطابق،

”گو یا پورا شہر ان شیوخ کے مقابلہ کیلئے تیار ہو گیا۔“

یوں بجائے ایک سر کے دیوان جی کے سر کے ساتھ دیکھا گیا کہ بے شمار سر لگے ہوئے ہیں، یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ اگر مولانا طیب صاحب یہ خبر نہ بھی دیتے کہ

”اس ایک جملہ ہی سے معاملہ ختم ہو گیا۔“

تہ خود بخود اسی نتیجہ تک عقل بھی پہنچتی سارے شہر کے مسلمانوں سے مقابلہ کی ہمت
آخر مخالفوں کا گردہ کیسے کر سکتا تھا، یوں ایک بڑے فتنہ کا بھی قلع قمع ہو گیا، باہمی
خون ریزی سے دبو بند والے بچ گئے، اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف
بقول مولانا طیب صاحب

”مسجد محل سے تعزیر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا“

اور جب ایک جگہ سے یہ قدیم رسم اٹھ گئی، تو ان ہی کی روایت ہے کہ

”شہر کی جن جن سنی مسجدوں میں سے تعزیریں اٹھنے تھیں وہ سب ختم ہو گئے“

سوانح مخطوط کے مصنف نے بھی جن کے سامنے یہ سائے قہر گزے تھے، لکھا ہے کہ

”انہوں نے (دیوان جی نے) اس کا (تعزیر داری کا) استیصال کامل کر دیا ہے“

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو“ ص ۱۱۱

ان کی اسی ہمت مردانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے بھی لکھا ہے کہ،

”یہ واقعہ دیوان جی مرحوم کے حسنات میں سے ایک بہترین حسنہ بلکہ سب سے حسنہ

شامت ہوا“

کوئی شبہ نہیں کہ دیوان جی کی ہمت مردانہ یقیناً مستحق تحسین و آفریں ہے۔ لیکن طوطی کے ساتھ

آئینہ کے پیچھے چھپے ہوئے سکھانے والے استاد پر جب نظر پڑتی ہے، تو یہی کہنا پڑتا

ہے کہ طوطی کی ساری گفتگو طوطی کی نہیں، بلکہ اس کی تمہی، جو آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو

کر رہا تھا،

در پس آئینہ طوطی صفتہ داشتہ اند انچا استاد ازل گفت ہماں می گویم

خلاصہ یہ ہے کہ شیعہ عقائد سے نائب ہو کر جو واقعی شیعہ تھے، وہ سنی ہوئے یا نہ ہوئے

لیکن سنیوں میں جو کچھ تھے، ان کے پکے بننے میں اور جو پکے تھے ان کو زیادہ پختہ بنانے

میں سیدنا امام الکبیر کی طرف سے جو عملی اقدامات ہوتے رہے، ان کا اندازہ اسی قسم کی

مشائروں سے ہوتا ہے۔ گویا خانوادہ دلی الہی کی سدی محوری خدمات کو آگے بڑھانے اور ان کے دائرے کی وسعت میں ممکنہ حد تک جتنا آپ کے بس میں تھا، آخر عمر تک جدوجہد، سعی و کوشش کا سلسلہ آپ کی طرف سے مسلسل جاری رہا، اور کلب و قالب دونوں کو حساب سے اسلامی دین کو آلائشوں سے پاک کر کے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں نے مسلمانان ہند کے آگے پیش کیا تھا، علما و تقریرا و تحریرا اسی کی طرف آپ عالم سلازوں کو بھی دعوت دیتے رہے، اور درس و بیعت کی راہ سے چند چیدہ و برگزیدہ نفوس عالمیہ کی تربیت و تعلیم خاص توجہ سے فرمائی، جو آپ کے بعد اسی نصب العین کے زیر اثر کام کرتے رہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیب سے کچھ اسباب بھی ایسے پیش آتے رہے، کہ جتنا زیادہ حسن قبول دلی الہی نصب العین کو ستیذنا الامام الکبیر کے فرم سے حاصل ہوا، شاید یہ کیفیت ازل ہی سے آپ کے لئے مقدر تھی، بیوہ عورتوں کے عقد کا مسئلہ ہو، یا سنت و بدعت، تقلدیت و غیر تقلدیت، تصوف و توہب، تشیع و تسنن وغیرہ کے قصے ہوں، ان سارے مسائل میں دلی الہی مسلک اور نقطہ نظر کو ہند گیر عیسیت جیسی آپ کی بدولت میسر آئی، بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام قدرت نے آپ ہی کی ذات بابرکات سے لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی زندگی کے دلی الہی رنگ کا نام ہی اب دیوبندیت ہو گیا ہے، جو کچھ پوچھئے تو "قاسمیت" ہی کے لفظ کی دوسری تعبیر ہے، رحمۃ اللہ علیہ و آلہ و سلمہ د

اللہم ہدنا اتقاہ و احشرنا فی ذمۃ احبائہ آمین۔

”دفاعی اقدامات“

سیدنا الامام الکبیر کی مذکورہ بالا اصلاحی خدمات جن کا تعلق خود مسلمانوں اور ان کے مختلف طبقات کی دینی زندگی سے تھا۔ ان خدمات میں آپ کب سے مشغول ہوئے؟ صحیح طور پر اس کا متعین کرنا دشوار ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ دین کا علم حق و باطل راست و نادرست کی امتیازی قوت جیسے جیسے نشوونما پاتی جاتی تھی اس قوت کے اقتضائوں کی تکمیل و تکمیل کا ذوق بھی بڑھتا چلا گیا، اپنی سرور و بیجاہ کی تقسیم پر نظر ثانی غالباً اس راہ میں آپ کا پہلا نمایاں قدم تھا، گویا خود اپنے نفس سے چاہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اصلاح کی ابتدا ہوئی۔ اور عقد بیروگان کے مسئلہ کی نوعیت سمجھنا چاہئے،

عائذہ عشیرو تک الاقربا بین | (اے پیغمبر) اپنے قریب کے رشتہ داروں کو وعدہ آؤ
الہی، سے ڈراؤ۔

کے ربانی فرمان کی تمثیلی شکل تھی، بہت کم بچوں ہی دائرے میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، تاہم ان کے سفیوں کے بعد اپنے احاطہ میں شیعوں کو بھی اس نے سمیٹ لیا۔ آپ نے جن بزرگوں سے تعلیم پائی تھی۔ خصوصاً حضرت مولانا ملوک العلی صاحب اپنے زمانہ میں خانوادہ دلی الہی کے دلی میں واحد نمائندہ تھے، ان کے علمی و عملی رجحانات سے آپ کا متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی، مصنف امام کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ عقد بیروگان کی رواج پذیری میں مولانا ملوک العلی جرح و شدہ علیہ کا بھی کافی حصہ تھا، لکھا تھا کہ

”والد مرحوم نے (یعنی مولانا ملوک علی نے) اس کا (عقد بیروگان کا) نہایت خوبصورتی

سے اجرا فرمایا“ ۱۷

ان کے ساتھ مولانا مظفر حسین کا ندھلوی کی کوششوں کا ذکر کر کے مصنف امام نے یہ اور مقام فرما کر کہ

”ان دونوں بزرگواروں کے قدم بقدم حضرت مولانا (ٹافٹوی) نے اس کو پورا

شارح کیا۔“

خود اس سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ غم کے ساتھ اپنے استاد مولانا مملوک العلوی کے عملی ذوق سے بھی سیدنا الامام اعلیٰ غیر محسوس طور پر متاثر ہوئے تھے۔ : سوال اس کے کچھ بات یہی ہے کہ آنکھیں حضرت دلا نے جس ماحول میں کھولی تھیں، یہ سارا ماحول ہی حضرت مشاء دلی اندادان کے جانشینوں کے اصلاحی ہنگاموں سے اس زمانہ میں گونج رہا تھا حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی، مولانا اسماعیل شہید اندان بزرگوں کا جو تعلق حضرت حاجی امد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، خود سید شہید کی تالوث میں تشریف آوری، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزوں کا ذکر ابتدائی تہذیب میں بھی اور دوسرے مقامات پر بھی گذر چکا ہے۔ ان معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کیسے بتایا جاسکتا ہے کہ اپنی زندگی کی کس منزل میں اصلاحی کاروبار کے اس سلسلہ کی باگ سیدنا الامام الکبیر کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔ بلکہ یہی سمجھنا چاہئے کہ ان امور سے دلچسپی لینے کی صلاحیت جب سے آپ میں پیدا ہوئی اس میں مشغول ہو گئے اور جب تک زندہ رہے، اس راہ میں جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے۔ آفتاب کے متعلق یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ کب سے چمکنے لگا۔ اور کب تک چمکتا رہا۔ آفتاب نام ہی اس کا ہے جو خود روشن ہو اور دوسروں کو روشنی تقسیم کر رہا ہے۔

لیکن آپ کی ان ”داخلی خدمات“ جن کے متعلق پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ کے ساتھ اقبیازی خصوصیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، آپ کے ساتھ دوسرے اہل علم و دین کا بھی، ان خدمات میں کافی حصہ ہے، جن میں خود آپ کے وفاء خصوصاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے،

لیکن ”داخلی خدمات“ کے مقابلہ میں ”دعاوی اقلادات“ کے زیر عنوان سیدنا الامام الکبیر کی جن مخلصانہ مساعی، اور سرفروشانہ مجاہدات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، یہ عجیب بات ہے کہ عمر کی پینزل

جس میں داخل ہونے کے بعد کام لینے والے نے آپ سے یہ مہات انجام دلائے۔ یہ شکل
 بیس تیس سال سے زیادہ مدت کی نہیں ہوتی۔ اسی محدود مدت میں حالات ہی کچھ ایسے پیش
 آئے کہ پے در پے ایکے بعد دیگرے 'ایسے مہات کی سرانجامی کے لئے قدرت کی طرف
 سے آپ کا انتخاب ہوا، جن کے آثار و نتائج، ثمرات و برکات سے نہیں کہا جاسکتا کہ مستقبل کی
 کتنی صدیاں متاثر و مستفید ہوتی رہیں گی۔

تاریخ ہند میں شہداء کے ہنگامہ کے نام سے جو واقعہ مشہور ہے، کہنے والے ہی ہنگامہ
 کو غدر کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، اور کچھ دنوں سے آزادی کی پہلی جدوجہد کے عنوان
 سے بھی اب لوگ اس کا چرچا کرنے لگے ہیں۔ حساب سے سیدنا الامام الکبیر کی عمر اس وقت
 ۳۷-۳۸ سال کے درمیان ہونی چاہئے، جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک کم پچاس یعنی ۴۹
 سال کی عمر میں پیمانہ حیات آپ کا تبریز ہو گیا، اور یہ سارے کارنامے جن کی داستان اب
 سنائی جائے گی، چونکہ ان سب کا تعلق شہداء والے ہنگامہ اور اس کے بعد کے زمانہ سے
 ہے، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے غدر ان کارناموں کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن مدت اور زمانہ
 جس میں یہ ساری باتیں آپ سے بن آئیں، اور لینے والے نے جو کام آپ سے لیا، وہ یہی دہائی
 گیارہ سال کی محدود مدت اور محدود زمانہ ہے۔

قبل اس کے کہ کچھ آگے بڑھوں، بے ساختہ اس وقت بھی غل میں اصل کی زندگی کا
 عکس معلوم ہوتا ہے کہ جھانک رہا ہے۔ ۶۳ سال کی زندگی میں وہاں بھی دیکھا گیا تھا کہ
 انسانی تاریخ کے رخ کو پھیر دینے والے واقعات مدنی زندگی کے دس سال کی محدود
 مدت ہی میں پیش آئے تھے۔ گویا اسی دس سال میں قیام قیامت تک اسلام کی بلکہ کہئے
 تو کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے مستقبل کی تاریخ پوشیدہ تھی، صلی اللہ علیہ وسلم کھولنے والے جن
 کی راہ میں اپنا سب کچھ کھوتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، مگر کن ماہوں سے وہ کیا کچھ نہیں پاتے۔

علیٰ اختیاری انداکستانی اور میں جن کے لئے بیرونی سنت اور تہاغ محبوب حقیقی کی دولت (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر تو ایک ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے بریٹش
 اقتدار کے سیاسی تسلط کا جو واقعہ ان ملک میں پیش آیا تھا یعنی انگریزوں کی نئی حکومت اس
 ملک میں جو قائم ہو گئی تھی ان انگریزوں اور ان کی حکومت سے سیدنا الامام اعلیٰ کے احساس کا

(گزشتہ صفحہ سے) متاثر ہوتی ہے ان کے لئے کوئی اور غیر اختیاری (مہر میں بھی مطابقت و مشابہت کا دروازہ
 پہلے ہی سے کھول دیا جاتا ہے، تاکہ ظن اور اصل میں خلقی اور اختیاری تطبیق کی سعادت بہم پہنچا دی جائے
 اور اصل کا پورا پورا عکس ظن میں نمایاں ہو جائے۔ مثلاً تمہید میں حضرت مولف سوانح مجدد نے نانوتہ کی
 جفریائی صورت کو کچھ روڈ کے جھنڈ کے جھنڈ نانوتہ کو ڈھانپے ہوئے ہیں، مزینۃ النبی سے مشابہ دکھائی
 ہے۔ دیوبند کی حالت قبل از رد و حضرت والا صاحب سوانح مخطوط نے انتہائی ظلم و جہل کی دکھائی ہے
 جس کا تذکرہ تاسیس مدرسہ دیوبند کے ضمن میں آ رہا ہے، جو اشد ہے زمانہ جاہلیت کے۔ پھر حضرت
 والا کے رد و سے علم و عمل کا ماحول بن جانا اور کمال کی روشنی پھیل جانا دکھایا ہے پڑا شبہ ہے طلوع آفتاب
 رسالت کے، یہاں حضرت مولف سوانح دام مجدد حضرت والا کی مدت اصلاح و تربیت دس سال دکھلا رہے
 ہیں جہاں شبہ ہے مدنی زندگی کے دس سال کے، اور حضرت شیخ الشارح حاجی امداد اللہ صاحب نے
 حضرت والا کے ایک خاص قلبی حال (انتہائی ثقل و بوجھ سے زبان کے منوں زنی ہو جانے) پر حضرت والا
 کو فرمایا کہ مبارک ہو، حق تعالیٰ آپ کو علوم نبوت سے سرفراز فرمائے گا جو حسب ارشاد حضرت حاجی صاحب
 اشد ہے ثقل و دمی کے، پھر صاحب سوانح مخطوط نے نور نبوت کے زیر سایہ حضرت والا امداد اللہ کے کئی ساتھیوں
 مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا رفیع الدین صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب کو خلفاء اور بعد سے تشبیہ دیتے
 ہوئے دینی اصلاح کے عناصر اور بعد سے تیسرے فرمایا اور لکھا کہ حضرت والا علم و کرم و رحمت و شفقت اور دین و علم میں نسبت
 صدیقی سے سرفراز تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جلال و شدت میں نسبت قادری سے ممتاز تھے مولانا رفیع الدین
 صاحب انکسار نفس اور حیا میں نسبت عثمانی سے مشرف تھے اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب قوت فیصلہ اور
 احسانیت دانے میں نسبت مرقضوی رکھتے تھے، نور نبوت کی تربیت کے زیر سایہ وزیر سرکردگی حضرت والا حق تعالیٰ
 نے ان ہی عناصر اور بعد سے تجدید و احیائے دین کا کام اس مدرسہ کے راستہ سے لیا اس طرح حق تعالیٰ نے ظن میں
 اصل کا عکس ایک ہی جہت میں نہیں جہات متعددہ کو نمایاں فرمایا پھر وہی عالم کو میں حضرت والا کے کمال تبلیغ سنت اور کمال
 محبت نبوی کا گویا اختیاری تبلیغ چونکہ آپ کی مشرت میں خلعت نبوت کو دیا گیا تھا جسے نمایاں ہوتا تھا اس لئے کوئی طریقہ حضرت والا کی
 طبیعت نہ نظر پڑتی تھی بلکہ آپ کے متعلقہ زمانہ ممکن اور احوال و سوانح نے بھی اصل کو حقیقتاً زمانہ مکان اور احوال و سوانح کے عکس انداز
 کی سعادت پائی۔ کوئی جہاں یا مساند اس کے موازنہ حضرت والا کیلئے نبوت کا اثبات یا علیادہ یا شرعی ہی مساند نہ کچھ لے بلکہ نبوت کی انتہائی
 غلامی و انکساری اور کوئی مشابہت یا تبصیف کو نصیب نہ ملی یہی سبب یا مساند تھیں بلکہ انتہائی غلامی اور بیرونی نبوت کی دلیل ہوئی
 محمد علیہ السلام

جو تعلق تھا، مختلف موقعوں پر اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں۔ بجائے ٹن کے گھنڈی اور ٹکرے کی استعمال پر زندگی بھر جو اس لئے اصرار کرتا رہا کہ ٹن لگانے کا طریقہ انگریزوں کا رواج دیا ہوا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انگریز اور انگریزیت کے متعلق اس کی نفرت کے جذبات کی شدت کا حال کیا ہو گا۔ اپنی کتاب ہدایت الشیعہ میں ایک موقع پر لوگوں کے طبعی رجحانات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اصرار لکھ کر کہ مثلاً غذا میں

”کسی کو میٹھا بھاتا ہے، کسی کو نمکین، کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے، کسی کو نفرت“

بے ساختہ تمثیل کے لئے آپ کے سامنے جو مثال آئی ہے، وہ یہ ہے،
 ”انگریزوں کو عطر نفیس سے تنفر، اور مچھلی کے اچار سے جسے سونگھ بھی لیجئے، تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں، رغبت“
 آگے اسی کے بعد آپ کے الفاظ ہیں۔

”پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خرم دشا، عیش و آرام سے رہیں، اور خوشبو سونگھیں تو مرجائیں“ ص ۵۷

اور یہ تو خیر سمجھنی باتیں ہیں، مغل حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھہر چکے ہوئے انگریزوں کی طرف سے اس فیصلہ کا جب اعلان کیا گیا کہ لال قلعہ سے آل تہجد کا آئینہ کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہ رہے گا، اور بہادر شاہ مرحوم کے بعد شاہی خاندان کے لوگوں کو قلعہ سے نکال دیا جائے گا۔ حکم دیا گیا کہ آئینہ ہر دلی میں بہادر شاہ کا بیٹا مسکن پذیر ہو۔ یہ فیصلہ ۱۸۵۷ء میں کیا گیا تھا۔ یاد ہو گا، ٹھیک دس سال اسی دلی کے محلہ کوچہ جیلان کے ایک مکان میں جھلنگے پر سیدنا الامام الکبیر کو جس حال میں پایا گیا تھا، مصنف امام نے اپنے الفاظ میں اس زمانہ کی تصویر آپ کی جو کھینچی ہے۔ یعنی باوجود شکستہ مزاج ہونے کے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ترش رد منہوم رہتے تھے بال بکھرے ہوئے کپڑے پہنے کھپے، جوئیں سر میں بھری ہوئیں نہ کھانے کی خبر نہ پہننے کی بُرا

کئی کئی دن کی پکی ہوئی خشک روٹیوں کے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو بھگو کر چالینا، اور پھر ہی چھلنے پر پڑ جتنا یہ اہل اسی قسم کے دوسرے چشم دید مشاہدات مصنف امام کے جو نقل کر چکا ہوں، نیز اسی کے ساتھ انگریزی حکومت کی بنیاد کا الزام آپ پر مختلف موقعوں پر چو لگایا گیا۔ پھر آپ کے بعد انگریزی حکومت کے ساتھ آپ کے تلامذہ اور خلفاء کے تسلی کی آئندہ مسلسل جو ذیعت ہی جس کے دیکھنے والے اور جاننے والے اس وقت بھی موجود ہیں۔ ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی کہہ سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں انگریزوں کی حکومت

۱۵ حضرت اقدس کے تمام تلامذہ میں انگریزوں سے نفرت کا یہ جذبہ مشترک کے طہ پر پایا جاتا ہے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چونکہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور آپ کے جذبات کا گہرا رنگ لئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ حضرت دلا کے اس جذبہ نفرت کے بھی مظہر تھے۔ بالمشہ سے داپسی پر جب ترک موالات کا استفتاء حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اپنے تین شاگردوں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا صدیق حسین احمد صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں۔ ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں گے۔ فرمایا کہ مجھ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ شدت لئے ہوئے ہے۔ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

ولا یجوز منکھ شنآن قوم علی
ان لا تعدلوا

کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل سے
ہٹانے دے۔

اس لئے آپ ہی لوگ لکھیں۔ اس واقعہ سے جہاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا انتہائی فتویٰ و تدبیر نمایاں ہے، وہیں اس جذبہ کا غلبہ بھی واضح ہے۔ میرے بھائی مولانا محمد طاہر مرحوم نے اس زمانہ میں حضرت سے پوچھا کہ حضرت ان انگریزوں کی کوئی بات (جیسی بھی ہے) فرمایا کہ ہاں ان کے کباب بہت اچھے ہوں گے۔ خود انگریز بھی اسے محسوس کرتے تھے چنانچہ مرچس میسن جو اس زمانہ میں یو۔ پی کے گورنر تھے، ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ اگر اس شخص (مولانا محمد حسن) کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کو بے نہیں اڑیگی، جس میں کوئی انگریز ہو گا نیز یہ بھی (ایسی ہی کا متولہ ہے کہ اگر اس شخص کی بیٹی بولی کر دی جائے تو ہر بولی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی یہ حقیقت وہی سیدنا الامام الکبیر کے جذبات تھے جو حضرت شیخ کے دگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ جب مستفیدین کا یہ حال تھا تو اندازہ کر لیا جائے کہ اصل کا مقام کیا ہو گا۔ محمد طیب غفر

کی طرف سے کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ دنیا تو خیر ختم
ہی ہو چکی، لے دے کر بچا کچھ اسرہایہ مسلمانوں کی پاس دین کا رہ گیا ہے۔ سو بقول اکبر مرحوم

نئی نئی آنچیں لگ رہی ہیں، یہ قوم بسکیں گھل رہی ہے
نہ مغربی ہے نہ مشرقی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

خواص ہی نہیں، غدر سے پہلے ہی جیسا کہ سرسید مرحوم نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں لکھا ہے،
”رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی، کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو بیٹھے زہر
اور شہد کی چھری، اندھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی“ صلا ضمیمہ حیات جاوید

”رعایا ہندوستان“ کے عوام کے تاثرات کے متعلق سرسید مرحوم کی جب یہ شہادت ہے
تو سمجھا جاسکتا ہے کہ حال سے مستقبل کے نتائج تک پہنچنے کی جتنی زیادہ بصیرت جن لوگوں میں
تھی، ان ارباب فکر و نظر کا حال کیا ہوگا، یوں بھی جب یہ سب کچھ دیکھا جا رہا تھا کہ اصلی اور مصنوعی
(یعنی دسی) پادریوں کا بیڑی دل، ہندوؤں اور مسلمانوں کے دھرم اور دین کے چاٹ جاتے
کے لئے ملک کے طویل و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ سرکاری حکام خفیہ اور بسا اوقات علانیہ
بھی، دام سے دم سے قدم سے ان پادریوں کی ہمت افزائیوں میں مشغول و منہمک نظر آ رہے
تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے دینی پیشواؤں کی تحقیر و تہوہین کا بازار ہر طرف گرم تھا، دین کے
ان خطرات کے ساتھ ساتھ دنیا کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے راجہ اور والیان ملک نواب اور
رئیس نان مشینہ کے محتاج بن کر گلی کو چوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ عوام کی غربت اس حد
تک پہنچی ہوئی تھی کہ بقول سرسید مرحوم ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیراناں پر ہر ہندوستانی اپنی
گردن کٹوا کر پونجوشی تیار ہو جاتا تھا۔ صلا (بغاوت ہند)

یہ انداز غیظ و نفرت کے واقعات و حالات جن سے عام طور پر لوگ واقف بھی ہیں اور موقعہ موقعہ
سے اس کتاب کے مقدمہ میں بھی، اصل کتاب میں بھی ان ائمہ کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

اب اسی کے ساتھ جب ہم یہ سنتے ہیں، کہ فوج کی بغاوت عام کے بعد آگے چلے ہندوستان کے

مختلف علاقوں کے باشندے ہنگامہ خد کی آگ میں جیسے کود پڑے تھے، اسی طرح سیدنا الامام البکر بھی عملاً اس میں شریک ہو گئے تھے۔ خود بھی شریک ہوئے اور آپ کے پیرو مرشد، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمتہ اللہ علیہ، نیز آپ کے رفیق الدنیاء الآخرۃ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس کش مکش میں حصہ لیا، تو بظاہر اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ دلائل و دلائل دیوبند کے متوسلین عموماً اپنی مجلسوں میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔

واقعات و حالات سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے، اور لکھنے والوں نے جو اس زمانہ میں موجود تھے، انہوں نے بھی لکھا ہے کہ کسی باضابطہ اسکیم، یا لائحہ عمل کے تحت غور کا یہ ہنگامہ پیش نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہندوستان کی کسی خاص قوم یا کسی خاص طبقہ نے بغاوت کہنے، یا آزادی کی جدوجہد کا پروگرام بنایا تھا، بلکہ صحیح یہی ہے کہ شہرہ میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد، ہندوستان کی حکومت کا باضابطہ چارج لینے کا فیصلہ انگریزی قوم نے مجب کر لیا اور سو سال کی طویل مدت میں ہندوستان کے باشندوں کو انگریزوں اور انگریزی حکومت کے طور و طریقہ، رنگ و ڈھنگ، کے تجربہ سے ان کے باطنی ارادوں کا پتہ جو کچھ بھی چلا، مجموعی طور پر سب سے ملک کے باشندوں میں بے زاری کے جذبات پر ردِ ثل پاتے چلے جا رہے تھے، اس عرصہ میں انگریزی حکومت کا دائرہ بھی وسعت کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ برہما سے سرحد کا بل و تند حار، اور نیپال سے اس کنارہ کی جنگ کا کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا جس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریز قابض و دخیل نہ ہوں۔ فتوحات کی اس عجیب و غریب وسعت میں بجائے گوروں کی پلٹن کے ہندوستان کی کالی پلٹن کے اخلاص و جان نثاری اور یہی خواہی کے (سو حیرت انگیز تجربات انگریزوں کو ہوئے کہ گوری پلٹن کی گراں فوج کے مقابلہ میں کالی پلٹن کی اور زانی پر بھروسہ کر کے ہر فوج میں کالوں کو اکثریت حاصل ہو گئی، حتیٰ تک جس سے گورے نا آشنا تھے۔ ہندوستانی فوج اسی نمک کی کان انگریزوں کو نظر آئی، دوسری طرف کالی پلٹن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ جنگ کے جدید حربی آلات کی جگہ یہ سمجھنے لگی کہ اپنی کثرت تعداد سے انگریزوں کو

ہم لوگوں نے اسے ممالک فتح کر کے حوالہ کر دیے ہیں، اند تو کچھ نہیں لیکن اس احساس نے کالی پلٹن کے نازخروں کے سمندر تازیانہ کا کام کیا۔ کالی پلٹن کا یہ بھی ایک نعرہ تھا کہ چربی ملے ہوئے کار توں کو دانتوں سے نہیں کاٹیں گے۔ وہ تو خریداروں پر اپنا ناز دکھا رہے تھے، لیکن تقدیر نے اسی ناز کو ناز بنادیا۔ انگریز کچھ اڑ گئے، غرور تو کالوں کے دماغ میں بھر ہی گیا تھا، اٹھ کھڑے ہوئے، اردو ہی ہندوستانی فوج جو خود ماٹرا یعنی بیچ پی کر اپنے گورے انگریزوں کو چاول کھا رہے تھے، پراصر کر رہی تھی، انگریزوں ہی کو نہیں، بلکہ ان کے بچوں، اند ان کی عمر توں کو اس طریقہ سے قتل کرنے لگی، کہ گویا وہ انسان نہ تھے۔ فوج جب باغی ہو گئی، تو ملک کے عام باشندے جو سو سال کے اس عرصہ میں انگریزی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کے سامنے بھی نجات کی ایک صورت آگئی، مختلف علاقوں کے برباد اور تباہ ہوئے والے خاندانوں میں بھی کچھ اباں آیا، کچھ غنڈوں، شہدوں کو بھی لوٹ مار کا موقع مل گیا، یوں مل ملا کر وہ صورت پیش آئی، جسے چاہے آپ عذر و لغات کہئے، چاہے اس کا نام آزادی کی جدوجہد رکھ دیجئے۔ اس میں ہندو مسلمان اور دونوں قوموں کے چھوٹے بڑے عوام و خواص سب ہی طرح کے لوگ شریک تھے لیکن بایں ہمہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جیسے پہلے کوئی لائحہ عمل لوگوں کے سامنے نہ تھا، بعد کو بھی ضبط و نظم کے قائم کرنے کا عام طور پر نہ لوگوں کو خیال ہی ہوا، اردو قسطنطنیہ کی طرح کچھ کیا بھی گیا تو حد سے زیادہ بے جان مضاعف، گستاخ و شکستہ تھا۔

جب سب سے بڑے مرکز، جسے فوجیوں نے بھی سب سے بڑا مرکز بنایا تھا۔ یعنی دہلی یہاں کا نظم و ضبط جس کے دل و دماغ کے سپرد کیا گیا تھا۔ یعنی سراج الدین ظفر شاہ مرحوم سید احمد خاں ان کے دربار کے خطاب یافتہ درباری آدمی تھے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ ظفر شاہ کے متعلق ان کے ظم سے جو نکلے ہیں، بے بنیاد ہیں، لکھتے ہیں کہ ”ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں سکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کے ملکوں کی خبر لے آتا ہوں، اور اس بات کو اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا، اور درباریوں سے

تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے۔ ۱۶

میں نہیں بلکہ وہی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

”لوگ اس کے (خضر شاہ) کے مرید ہوتے تھے کسی فائدہ کی نظر سے: بطور اعتقاد“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی اہلخانہ منصوبیت اس زمانہ میں سلاطین اور حکمرانوں کے کمالات میں شمار ہوتی تھی، خاکسار ٹرنک میں جب پڑھتا تھا تو ریاست کے والی مرحوم ابراہیم علی خان خلیل کے متعلق یاد آیا اپنے استاد مولانا برکات احمد صاحب کی زبانی اس قسم کی باتیں سن کرتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے نواب صاحب کو خیال ہو جاتا تھا کہ کچھ ہوں سے لوگوں کے ہر مشیدہ ہو گئے۔ دربار والے جو تاڑ جاتے تھے کہ اس وقت نواب صاحب اپنے غائب ہونے کے مانجھو لیا میں تھیں، ایک دوسرے کی اشاروں اشاروں میں پوچھتے کہ سرکار کیا ہوئے۔ دوسرا فحجب سے سر نہلاتا کہ خدا جانے کیا ہوئے۔ چند لمحہ بعد پھر نواب صاحب کاکون کے بعد برہنہ ہونا اور درباری کہتے کہ سرکار کے ساتھ کیا صورت پیش آئی، پوچھتے کہ کیا ہوا، تب درباری باور کراتے کہ گدی سے اچانک حضور تائید ہو گئے۔ مسکرا کر جواب دیتے کہ ان باتوں کا عوام سے چرچا نہ کرنا، حیدر آباد کے نواب افضل الدولہ مرحوم جو غدد کے زمانہ میں حیدر آباد کے حکمران تھے، یہ سننا ہے کہ شکار میں حیدر آباد سے دو تین میل نکل جانے کے بعد کہتے کہ تم لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہو۔ میں اپنے ملک سے یا ہرن جاؤں گا۔ لوگ کہتے کہ سرکار ابھی تو سیکڑوں میل تک آپ کا علاقہ ہے۔ تب بگڑ کر فرماتے کہ تم مجھے دھوکہ دے کر انگریزوں کے علاقہ میں داخل کر دینا چاہتے ہو۔ مرشد آباد کی سند پر سراج الدولہ کے قتل ہو جانے کے بعد انگریزوں نے نجم الدولہ نامی خاندان کے کسی فرد کو بٹھایا۔ معاہدہ یہ طے پایا کہ بنگال بہار اڑیسہ تینوں صوبوں میں حکمرانی کا اقتدار انگریزوں کو حاصل ہو گا اور نجم الدولہ کو سالانہ پچاس لاکھ روپے بطور وظیفہ دیئے جاویں گے، شہر لاڈ کلاہو جس سے یہ معاہدہ طے ہوا تھا، اس نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ اس معاہدہ سے بہت مسرور تھا اور رخصت کے وقت کہنے لگا کہ خوب ہوا اب تو جیتنے چاہیں گے محل بنائیں گے (تاریخ راجہ شیو پرشاد سنگھ) نو عمر لڑکے نحر بہار حکمرانوں کو نکال کر تخت پر تہنہ کرنے کے لئے عموماً اس زمانہ میں بے چین نظر آتے ہیں یہی بنگال کا سراج الدولہ جو ۲۲ سال کی عمر میں قتل ہی ہو گیا، اپنے حقیقی نانا علی دودی خان ناظم بنگال جس نے یتیم ہو جانے کی وجہ سے سراج الدولہ کو لڑکے کی طرح پالا تھا اور اپنے بھتیجا ضابطہ دلی عہد بھی بنادیا تھا لیکن سراج الدولہ کی عمر غالباً پندرہ سولہ کی ہو گئی کہ بہار آباد بنے بھاگ کر ٹخنے عظیم آباد آگیا، اور اپنے خدائی نانا کے مقابلہ میں اعلان جنگ دے کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت آصف جاہ دانی دکن دلی کے وزیر اعظم ہو کر دکن سے تشریف لے گئے۔ دکن میں اپنی جگہ اپنے بیٹے ناصر جنگ کو نائب بنادیا تھا لیکن وزارت چھوڑ کر پھر اپنے ملک کی طرف جیب ناہیں ہونے لگے تو معلوم ہوا کہ صاحبزادہ والا تباہی لگے مقابلہ میں کھڑی ہیں، (باقی اگلے صفحہ پر)

ان مریدوں میں ایک مرزا غالب بھی تھے جو چار شخص نسبتیں بادشاہ سے رکھتے تھے سید صاحب نے لکھا ہے کہ ظفر شاہ کو

”کوئی دلی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا“ اس کے منہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے منستے تھے۔ ص ۲۱

اور چال کچھ اسی غریب ظفر شاہ مرحوم کا نہ تھا اس زمانہ میں ریاست نامارت کے لوازم میں منجملہ ادب باتوں کے اس قسم کی اہلیاں بھی شریک تھیں۔

ایسی صورت میں عوام کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن خواص اور خواص میں بھی سیدنا امام الکبیر جیسے ہم و فراست اور دینی ذمہ داریوں کے محسوس کرنے والی ہستیوں کے متعلق یہ دیکھتے ہوئے کہ آج کل فضل و کمال بڑائی اور زندگی کا سب سے بڑا معیار ٹھہرایا گیا ہے کہ سیاسی کاندہا میں سب سے زیادہ حصہ جس نے لیا وہی سب سے بڑا آدمی ہے اور دوسرے میدانوں میں خواہ کچھ ہی حال ہو کبھی مقام کا مالک ہو لیکن سیاست کے میدان کا جو اپنے آپ کو کھلاڑی ثابت نہ کر سکا وہ کچھ نہیں ہے۔ اسی عام سطحی معیار کو دیکھ کر بے دھڑک یہ مان لینا کہ غدر کے ہنگامہ میں سیدنا امام الکبیر نے اسی طرح حصہ لیا تھا جیسے اس ملک کے عام باشندے اس کی آگ میں کود پڑے تھے۔ سیدنا امام الکبیر کی شان ہی کے مطابق اس قسم کا عاجلانہ فیصلہ درست ہو سکتا ہے اور نہ واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے جیسا کہ میں عرض کر چلا آ رہا ہوں کہ یہ نئی قائم ہونے والی حکومت مسلسل اپنی اعلانیہ اور خفیہ طرز عمل سے ہندوستان کے باشندوں کو اپنی طرف سے بے زار اور حد سے زیادہ

دُشمنانہ سلوک سے، حضرت آصف جاہ کے بعد نظام علی خان دکن کے والی ہوئے۔ ان سے بھی ان کے صاحبزادے عالی جاہ باغی ہو گئے اور زمانہ تک ملک کے نظام کو وہ ہمہ جہت کرتے رہے۔ کھنڈ میں اسی قسم کی آخر اتفرقی پھیلی ہوئی تھی، ان قہدن کو کوئی لکھے تو بڑی کتاب بن سکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ سکھوں کی تازہ دم قیام کے اہل کی ذہنیت جیسا کہ راجہ شیو پرشاہ نے لکھا ہے یہ ہو گئی تھی کہ انگریزوں کے پیش خوار بن جانے میں بجائے حکمرانی کے ان کو زیادہ ہولت محسوس ہوتی تھی، تاریخ جہان ملاحظہ

بے زار بناتی چلی جا رہی تھی۔ جن لوگوں میں بصیرت و دانائی کی روشنی جتنی زیادہ تھی، اسی حد تک نفرت اور بے زاری کے جذبات بھی ان کے شدید تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس باب میں سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک کی گرائیاں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، حد سے گذری ہوئی تھیں مولانا طیب الحنفیہ سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اتار کر براہ راست انگریزی قوم نے ہندوستان کی حکومت کا جائزہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی قبضہ بنا کر دی میں ملکہ کی تاج پرشی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا، اس زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام دہلی میں تھا۔ لیکن جوں ہی کہ اس جشن کے انعقاد کا ساز و سامان ہونے لگا، دیکھا گیا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب فرماتے ہیں۔

”حضرت نانوتوی دہلی سے دیوبند چلے آئے، اور فرمایا کہ مجھ سے انگریزوں کی شوکت نہیں دیکھی جاتی، اس لئے دہلی سے دیوبند چلا آیا کہ نہ دیکھوں گا، نہ کوٹ ہوگی، (سیاسی یادداشت ص ۱۱)

ظاہر ہے کہ کسی قوم اور حکومت کی طرف سے دل گرفتگی کی یہ آخری شکل ہو سکتی ہے لیکن اسی موقع پر آگے مولانا طیب صاحب کی اس روایت میں ایک اضافہ بھی ہے۔ اسی اضافہ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، لکھا ہے کہ

”نیز فرمایا کہ الحمد للہ اتنی طاقت تو ہے کہ سارا دربار درہم برہم کر دوں مگر نبھانے والے نظر نہیں آتے، اس لئے دہلی چھوڑ کر چلا آیا، کہ نہ ان کا کردار دیکھوں گا، نہ کوٹ و سوخت ہوگی۔“

حضرت والا کی طرف جس دعوے کو اس اظہار میں غسوب کیا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ دربار کے درہم برہم کر دینے کے جس امکان اور طاقت کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کیا عار و ہمت کی روحانی اور باطنی قوت کے امکانات کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا گیا ہے؟

بظاہر اول دہریہ میں ممکن ہے ذہن اسی کی طرف منتقل ہو جائے۔ لیکن اس راہ میں اثر اور رسوخ
 اکیس کے ستر و اخفا کی غیر معمولی کوششوں سے جو واقف ہیں، اگر سوچیں گے، تو یقیناً ان جب
 عجب نہیں تو یہ بات خلاف دستور ضرور معلوم ہوگی، جہاں تک میں جانتا ہوں یا دوسروں سے
 سنا ہے، ناگزیر مجبوری کے بغیر اپنی زندگی کے اس باطنی پہلو کی ہر ابھی چاہتے تھے، کہ
 کسی کو نہ گنتے پائے۔

اسی لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں سرسید مرحوم نے
 انگریزوں کے دورِ انکار و سوسوں کا ازالہ کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا جو اظہار کیا ہے، کہ
 ”میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا، کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب
 کے جاکوں پر جہاد کریں۔“

بلکہ فوج کے متعلق بھی اپنا ذاتی احساس انہوں نے ظاہر کیا ہے۔

”فوج میں بھی ہرگز مشورہ اور پہلے سے صلاح نہ تھی۔“

اور وہی جو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ”جہاد کے فتویٰ“ کے نام سے باغیوں نے جس فتوے کو مشہور
 کیا تھا، اس پر علماء کے دستخط زیادہ تر جعلی تھے۔ حتیٰ کہ وہی لکھتے ہیں کہ

”ایک آدمہ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی گئی تھی جو قبل غدر مرچکا تھا۔“ ص ۱۹

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مستند سوانح عمری تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں جو خبر

۱۹۱۷ء کے ہنگامہ کا قصہ جب میدان کا دار سے نکل کر کاردی تحقیقات کا دل اور کالج کے پروفیسر نے استادوں
 کے سامنے آیا، تو کسی کو اس کی جڑوں میں نظر آتی تھی۔ ایک صاحب کو دلی عہد ایران کے خیر میں کاغذ لگیا
 تھا، جس میں بیرونی تسلط کے مصائب کو بیان کرتے ہوئے ایرانیوں کو ہندوستان کے حال سے ہجرت پذیر ہونے
 کی وصیت کی گئی تھی، اسی کا غد کو بنیاد بنا کر بعض کہتے تھے کہ سرچشمہ بغاوت کا ایران میں تھا خدا حبس نے
 ہندوستان میں لے کسی دبا وغیرہ کے مقابل میں بظہر ٹوٹ کر کے گاؤں گاؤں میں دھنیاں باٹنی تھیں، پھر لگیا کہ
 ان مدٹیوں پر بغاوت کا بیجام لکھا ہوا تھا۔ لوگ ان کو چٹ کر چکے تھے۔ یہ چپا تیاں مشہور ۱۹۱۷ء میں تقسیم ہوئی
 تھیں، اور بھی طرح طرح کی بدخواہیاں تھیں، جن میں مدوں اگر مزہ مستند ہے۔ تفصیل کے لئے غدر کے
 لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۳

دی گئی ہے کہ۔

”سنایا گیا ہے کہ ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کا ردوائی سے منع کیا۔“^{۱۲۵}
 یہ یا اسی قسم کی باتیں کتابوں میں جو ملتی ہیں، ان کو محض وقتی مصلحت اندیشیوں کا نتیجہ قرار دے کر
 خواہ مخواہ اس پر اصرار کرنا کہ کسی باضابطہ پروگرام کو طے کر کے آزادی کی یہ جدوجہد ہندوستان
 میں شروع ہوئی تھی شاید درست نہ ہوگا، بلکہ واقعہ کی صحیح نوعیت وہی معلوم ہوتی ہے کہ ^{۱۸۵۶ء}
 میں جنگ پلاسی کے جیت لینے کے بعد سو سال تک انگریزی حکومت کے مسلسل تجربات
 ہندوستانیوں میں بے نادری کی آگ کر بھڑکاتی چلی جا رہی تھی، ایک اندر دنی زخم تھا جو اندر
 ہی اندر شعوری و غیر شعوری طور پر پکنا چلا جا رہا تھا۔ تاہم ایک ٹھیک تئہ سال کے بعد ^{۱۸۵۶ء}
 میں چربی ملے ہوئے کار تو سوں کا قصہ منہ بن گیا، زخم پھٹ گیا، دے ہوئے شعلے بھڑک
 اٹھے، چونکہ کسی باضابطہ نظام کے تحت اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ افراتفری پھیل گئی۔ ایک علاقہ
 کی سن کر دوسرے علاقہ والوں میں توپل میں چل کی کھل ملی جگ لگئی، پھر جو کچھ ہونا تھا، ہوا، چاہے
 اسے نوشتہ تقدیر کہئے، یا زشتی اعمال کا قدرتی نتیجہ قرار دیجئے۔ ایک ہندو مورخ راجہ شیوپر شاد
 نے اپنی آنکھوں سے دتی میں جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اہ کتابوں میں ”زشتی اعمال“ کی نادر ی
 صورت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ دونوں ہی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

”یہ سانحہ نادر شاہی سے بھی بڑھ کر ہو گیا۔“^{۱۲۶}

خصوصاً روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں بجائے اس باطنی پہلو کے کافی گنجائش اس بات کی بھی

ہے مگر عجیب بات ہے کہ نادر ہی بے چارہ اب تک بدنام ہے، یوں بھی تو سوچنا چاہئے کہ قتل عام جو نادر
 کے حکم سے دلی میں ہوا، مورخین کا بیان ہے کہ نصف یوم سے آگے نہ بڑھا۔ سیرالتاخرین میں ہے ”چوں
 نصف روز بگذشت، نادر شاہ، اندر آئے امان قیہ، السیف دہ دود لشکریان دست کو تاہ کر دندہ“^{۱۲۷} لیکن دلی پر
 قابض ہو جانے کے بعد ایام غدر میں شیوپر شاد کا بیان ہے کہ ^{۱۷۱۵ء} ^{۱۷۱۶ء} ^{۱۷۱۷ء} ^{۱۷۱۸ء} ^{۱۷۱۹ء} ^{۱۷۲۰ء} ^{۱۷۲۱ء} ^{۱۷۲۲ء} ^{۱۷۲۳ء} ^{۱۷۲۴ء} ^{۱۷۲۵ء} ^{۱۷۲۶ء} ^{۱۷۲۷ء} ^{۱۷۲۸ء} ^{۱۷۲۹ء} ^{۱۷۳۰ء} ^{۱۷۳۱ء} ^{۱۷۳۲ء} ^{۱۷۳۳ء} ^{۱۷۳۴ء} ^{۱۷۳۵ء} ^{۱۷۳۶ء} ^{۱۷۳۷ء} ^{۱۷۳۸ء} ^{۱۷۳۹ء} ^{۱۷۴۰ء} ^{۱۷۴۱ء} ^{۱۷۴۲ء} ^{۱۷۴۳ء} ^{۱۷۴۴ء} ^{۱۷۴۵ء} ^{۱۷۴۶ء} ^{۱۷۴۷ء} ^{۱۷۴۸ء} ^{۱۷۴۹ء} ^{۱۷۵۰ء} ^{۱۷۵۱ء} ^{۱۷۵۲ء} ^{۱۷۵۳ء} ^{۱۷۵۴ء} ^{۱۷۵۵ء} ^{۱۷۵۶ء} ^{۱۷۵۷ء} ^{۱۷۵۸ء} ^{۱۷۵۹ء} ^{۱۷۶۰ء} ^{۱۷۶۱ء} ^{۱۷۶۲ء} ^{۱۷۶۳ء} ^{۱۷۶۴ء} ^{۱۷۶۵ء} ^{۱۷۶۶ء} ^{۱۷۶۷ء} ^{۱۷۶۸ء} ^{۱۷۶۹ء} ^{۱۷۷۰ء} ^{۱۷۷۱ء} ^{۱۷۷۲ء} ^{۱۷۷۳ء} ^{۱۷۷۴ء} ^{۱۷۷۵ء} ^{۱۷۷۶ء} ^{۱۷۷۷ء} ^{۱۷۷۸ء} ^{۱۷۷۹ء} ^{۱۷۸۰ء} ^{۱۷۸۱ء} ^{۱۷۸۲ء} ^{۱۷۸۳ء} ^{۱۷۸۴ء} ^{۱۷۸۵ء} ^{۱۷۸۶ء} ^{۱۷۸۷ء} ^{۱۷۸۸ء} ^{۱۷۸۹ء} ^{۱۷۹۰ء} ^{۱۷۹۱ء} ^{۱۷۹۲ء} ^{۱۷۹۳ء} ^{۱۷۹۴ء} ^{۱۷۹۵ء} ^{۱۷۹۶ء} ^{۱۷۹۷ء} ^{۱۷۹۸ء} ^{۱۷۹۹ء} ^{۱۸۰۰ء} ^{۱۸۰۱ء} ^{۱۸۰۲ء} ^{۱۸۰۳ء} ^{۱۸۰۴ء} ^{۱۸۰۵ء} ^{۱۸۰۶ء} ^{۱۸۰۷ء} ^{۱۸۰۸ء} ^{۱۸۰۹ء} ^{۱۸۱۰ء} ^{۱۸۱۱ء} ^{۱۸۱۲ء} ^{۱۸۱۳ء} ^{۱۸۱۴ء} ^{۱۸۱۵ء} ^{۱۸۱۶ء} ^{۱۸۱۷ء} ^{۱۸۱۸ء} ^{۱۸۱۹ء} ^{۱۸۲۰ء} ^{۱۸۲۱ء} ^{۱۸۲۲ء} ^{۱۸۲۳ء} ^{۱۸۲۴ء} ^{۱۸۲۵ء} ^{۱۸۲۶ء} ^{۱۸۲۷ء} ^{۱۸۲۸ء} ^{۱۸۲۹ء} ^{۱۸۳۰ء} ^{۱۸۳۱ء} ^{۱۸۳۲ء} ^{۱۸۳۳ء} ^{۱۸۳۴ء} ^{۱۸۳۵ء} ^{۱۸۳۶ء} ^{۱۸۳۷ء} ^{۱۸۳۸ء} ^{۱۸۳۹ء} ^{۱۸۴۰ء} ^{۱۸۴۱ء} ^{۱۸۴۲ء} ^{۱۸۴۳ء} ^{۱۸۴۴ء} ^{۱۸۴۵ء} ^{۱۸۴۶ء} ^{۱۸۴۷ء} ^{۱۸۴۸ء} ^{۱۸۴۹ء} ^{۱۸۵۰ء} ^{۱۸۵۱ء} ^{۱۸۵۲ء} ^{۱۸۵۳ء} ^{۱۸۵۴ء} ^{۱۸۵۵ء} ^{۱۸۵۶ء} ^{۱۸۵۷ء} ^{۱۸۵۸ء} ^{۱۸۵۹ء} ^{۱۸۶۰ء} ^{۱۸۶۱ء} ^{۱۸۶۲ء} ^{۱۸۶۳ء} ^{۱۸۶۴ء} ^{۱۸۶۵ء} ^{۱۸۶۶ء} ^{۱۸۶۷ء} ^{۱۸۶۸ء} ^{۱۸۶۹ء} ^{۱۸۷۰ء} ^{۱۸۷۱ء} ^{۱۸۷۲ء} ^{۱۸۷۳ء} ^{۱۸۷۴ء} ^{۱۸۷۵ء} ^{۱۸۷۶ء} ^{۱۸۷۷ء} ^{۱۸۷۸ء} ^{۱۸۷۹ء} ^{۱۸۸۰ء} ^{۱۸۸۱ء} ^{۱۸۸۲ء} ^{۱۸۸۳ء} ^{۱۸۸۴ء} ^{۱۸۸۵ء} ^{۱۸۸۶ء} ^{۱۸۸۷ء} ^{۱۸۸۸ء} ^{۱۸۸۹ء} ^{۱۸۹۰ء} ^{۱۸۹۱ء} ^{۱۸۹۲ء} ^{۱۸۹۳ء} ^{۱۸۹۴ء} ^{۱۸۹۵ء} ^{۱۸۹۶ء} ^{۱۸۹۷ء} ^{۱۸۹۸ء} ^{۱۸۹۹ء} ^{۱۹۰۰ء} ^{۱۹۰۱ء} ^{۱۹۰۲ء} ^{۱۹۰۳ء} ^{۱۹۰۴ء} ^{۱۹۰۵ء} ^{۱۹۰۶ء} ^{۱۹۰۷ء} ^{۱۹۰۸ء} ^{۱۹۰۹ء} ^{۱۹۱۰ء} ^{۱۹۱۱ء} ^{۱۹۱۲ء} ^{۱۹۱۳ء} ^{۱۹۱۴ء} ^{۱۹۱۵ء} ^{۱۹۱۶ء} ^{۱۹۱۷ء} ^{۱۹۱۸ء} ^{۱۹۱۹ء} ^{۱۹۲۰ء} ^{۱۹۲۱ء} ^{۱۹۲۲ء} ^{۱۹۲۳ء} ^{۱۹۲۴ء} ^{۱۹۲۵ء} ^{۱۹۲۶ء} ^{۱۹۲۷ء} ^{۱۹۲۸ء} ^{۱۹۲۹ء} ^{۱۹۳۰ء} ^{۱۹۳۱ء} ^{۱۹۳۲ء} ^{۱۹۳۳ء} ^{۱۹۳۴ء} ^{۱۹۳۵ء} ^{۱۹۳۶ء} ^{۱۹۳۷ء} ^{۱۹۳۸ء} ^{۱۹۳۹ء} ^{۱۹۴۰ء} ^{۱۹۴۱ء} ^{۱۹۴۲ء} ^{۱۹۴۳ء} ^{۱۹۴۴ء} ^{۱۹۴۵ء} ^{۱۹۴۶ء} ^{۱۹۴۷ء} ^{۱۹۴۸ء} ^{۱۹۴۹ء} ^{۱۹۵۰ء} ^{۱۹۵۱ء} ^{۱۹۵۲ء} ^{۱۹۵۳ء} ^{۱۹۵۴ء} ^{۱۹۵۵ء} ^{۱۹۵۶ء} ^{۱۹۵۷ء} ^{۱۹۵۸ء} ^{۱۹۵۹ء} ^{۱۹۶۰ء} ^{۱۹۶۱ء} ^{۱۹۶۲ء} ^{۱۹۶۳ء} ^{۱۹۶۴ء} ^{۱۹۶۵ء} ^{۱۹۶۶ء} ^{۱۹۶۷ء} ^{۱۹۶۸ء} ^{۱۹۶۹ء} ^{۱۹۷۰ء} ^{۱۹۷۱ء} ^{۱۹۷۲ء} ^{۱۹۷۳ء} ^{۱۹۷۴ء} ^{۱۹۷۵ء} ^{۱۹۷۶ء} ^{۱۹۷۷ء} ^{۱۹۷۸ء} ^{۱۹۷۹ء} ^{۱۹۸۰ء} ^{۱۹۸۱ء} ^{۱۹۸۲ء} ^{۱۹۸۳ء} ^{۱۹۸۴ء} ^{۱۹۸۵ء} ^{۱۹۸۶ء} ^{۱۹۸۷ء} ^{۱۹۸۸ء} ^{۱۹۸۹ء} ^{۱۹۹۰ء} ^{۱۹۹۱ء} ^{۱۹۹۲ء} ^{۱۹۹۳ء} ^{۱۹۹۴ء} ^{۱۹۹۵ء} ^{۱۹۹۶ء} ^{۱۹۹۷ء} ^{۱۹۹۸ء} ^{۱۹۹۹ء} ^{۲۰۰۰ء} ^{۲۰۰۱ء} ^{۲۰۰۲ء} ^{۲۰۰۳ء} ^{۲۰۰۴ء} ^{۲۰۰۵ء} ^{۲۰۰۶ء} ^{۲۰۰۷ء} ^{۲۰۰۸ء} ^{۲۰۰۹ء} ^{۲۰۱۰ء} ^{۲۰۱۱ء} ^{۲۰۱۲ء} ^{۲۰۱۳ء} ^{۲۰۱۴ء} ^{۲۰۱۵ء} ^{۲۰۱۶ء} ^{۲۰۱۷ء} ^{۲۰۱۸ء} ^{۲۰۱۹ء} ^{۲۰۲۰ء} ^{۲۰۲۱ء} ^{۲۰۲۲ء} ^{۲۰۲۳ء} ^{۲۰۲۴ء} ^{۲۰۲۵ء} ^{۲۰۲۶ء} ^{۲۰۲۷ء} ^{۲۰۲۸ء} ^{۲۰۲۹ء} ^{۲۰۳۰ء} ^{۲۰۳۱ء} ^{۲۰۳۲ء} ^{۲۰۳۳ء} ^{۲۰۳۴ء} ^{۲۰۳۵ء} ^{۲۰۳۶ء} ^{۲۰۳۷ء} ^{۲۰۳۸ء} ^{۲۰۳۹ء} ^{۲۰۴۰ء} ^{۲۰۴۱ء} ^{۲۰۴۲ء} ^{۲۰۴۳ء} ^{۲۰۴۴ء} ^{۲۰۴۵ء} ^{۲۰۴۶ء} ^{۲۰۴۷ء} ^{۲۰۴۸ء} ^{۲۰۴۹ء} ^{۲۰۵۰ء} ^{۲۰۵۱ء} ^{۲۰۵۲ء} ^{۲۰۵۳ء} ^{۲۰۵۴ء} ^{۲۰۵۵ء} ^{۲۰۵۶ء} ^{۲۰۵۷ء} ^{۲۰۵۸ء} ^{۲۰۵۹ء} ^{۲۰۶۰ء} ^{۲۰۶۱ء} ^{۲۰۶۲ء} ^{۲۰۶۳ء} ^{۲۰۶۴ء} ^{۲۰۶۵ء} ^{۲۰۶۶ء} ^{۲۰۶۷ء} ^{۲۰۶۸ء} ^{۲۰۶۹ء} ^{۲۰۷۰ء} ^{۲۰۷۱ء} ^{۲۰۷۲ء} ^{۲۰۷۳ء} ^{۲۰۷۴ء} ^{۲۰۷۵ء} ^{۲۰۷۶ء} ^{۲۰۷۷ء} ^{۲۰۷۸ء} ^{۲۰۷۹ء} ^{۲۰۸۰ء} ^{۲۰۸۱ء} ^{۲۰۸۲ء} ^{۲۰۸۳ء} ^{۲۰۸۴ء} ^{۲۰۸۵ء} ^{۲۰۸۶ء} ^{۲۰۸۷ء} ^{۲۰۸۸ء} ^{۲۰۸۹ء} ^{۲۰۹۰ء} ^{۲۰۹۱ء} ^{۲۰۹۲ء} ^{۲۰۹۳ء} ^{۲۰۹۴ء} ^{۲۰۹۵ء} ^{۲۰۹۶ء} ^{۲۰۹۷ء} ^{۲۰۹۸ء} ^{۲۰۹۹ء} ^{۲۱۰۰ء} ^{۲۱۰۱ء} ^{۲۱۰۲ء} ^{۲۱۰۳ء} ^{۲۱۰۴ء} ^{۲۱۰۵ء} ^{۲۱۰۶ء} ^{۲۱۰۷ء} ^{۲۱۰۸ء} ^{۲۱۰۹ء} ^{۲۱۱۰ء} ^{۲۱۱۱ء} ^{۲۱۱۲ء} ^{۲۱۱۳ء} ^{۲۱۱۴ء} ^{۲۱۱۵ء} ^{۲۱۱۶ء} ^{۲۱۱۷ء} ^{۲۱۱۸ء} ^{۲۱۱۹ء} ^{۲۱۲۰ء} ^{۲۱۲۱ء} ^{۲۱۲۲ء} ^{۲۱۲۳ء} ^{۲۱۲۴ء} ^{۲۱۲۵ء} ^{۲۱۲۶ء} ^{۲۱۲۷ء} ^{۲۱۲۸ء} ^{۲۱۲۹ء} ^{۲۱۳۰ء} ^{۲۱۳۱ء} ^{۲۱۳۲ء} ^{۲۱۳۳ء} ^{۲۱۳۴ء} ^{۲۱۳۵ء} ^{۲۱۳۶ء} ^{۲۱۳۷ء} ^{۲۱۳۸ء} ^{۲۱۳۹ء} ^{۲۱۴۰ء} ^{۲۱۴۱ء} ^{۲۱۴۲ء} ^{۲۱۴۳ء} ^{۲۱۴۴ء} ^{۲۱۴۵ء} ^{۲۱۴۶ء} ^{۲۱۴۷ء} ^{۲۱۴۸ء} ^{۲۱۴۹ء} ^{۲۱۵۰ء} ^{۲۱۵۱ء} ^{۲۱۵۲ء} ^{۲۱۵۳ء} ^{۲۱۵۴ء} ^{۲۱۵۵ء} ^{۲۱۵۶ء} ^{۲۱۵۷ء} ^{۲۱۵۸ء} ^{۲۱۵۹ء} ^{۲۱۶۰ء} ^{۲۱۶۱ء} ^{۲۱۶۲ء} ^{۲۱۶۳ء} ^{۲۱۶۴ء} ^{۲۱۶۵ء} ^{۲۱۶۶ء} ^{۲۱۶۷ء} ^{۲۱۶۸ء} ^{۲۱۶۹ء} ^{۲۱۷۰ء} ^{۲۱۷۱ء} ^{۲۱۷۲ء} ^{۲۱۷۳ء} ^{۲۱۷۴ء} ^{۲۱۷۵ء} ^{۲۱۷۶ء} ^{۲۱۷۷ء} ^{۲۱۷۸ء} ^{۲۱۷۹ء} ^{۲۱۸۰ء} ^{۲۱۸۱ء} ^{۲۱۸۲ء} ^{۲۱۸۳ء} ^{۲۱۸۴ء} ^{۲۱۸۵ء} ^{۲۱۸۶ء} ^{۲۱۸۷ء} ^{۲۱۸۸ء} ^{۲۱۸۹ء} ^{۲۱۹۰ء} ^{۲۱۹۱ء} ^{۲۱۹۲ء} ^{۲۱۹۳ء} ^{۲۱۹۴ء} ^{۲۱۹۵ء} ^{۲۱۹۶ء} ^{۲۱۹۷ء} ^{۲۱۹۸ء} ^{۲۱۹۹ء} ^{۲۲۰۰ء} ^{۲۲۰۱ء} ^{۲۲۰۲ء} ^{۲۲۰۳ء} ^{۲۲۰۴ء} ^{۲۲۰۵ء} ^{۲۲۰۶ء} ^{۲۲۰۷ء} ^{۲۲۰۸ء} ^{۲۲۰۹ء} ^{۲۲۱۰ء} ^{۲۲۱۱ء} ^{۲۲۱۲ء} ^{۲۲۱۳ء} ^{۲۲۱۴ء} ^{۲۲۱۵ء} ^{۲۲۱۶ء} ^{۲۲۱۷ء} ^{۲۲۱۸ء} ^{۲۲۱۹ء} ^{۲۲۲۰ء} ^{۲۲۲۱ء} ^{۲۲۲۲ء} ^{۲۲۲۳ء} ^{۲۲۲۴ء} ^{۲۲۲۵ء} ^{۲۲۲۶ء} ^{۲۲۲۷ء} ^{۲۲۲۸ء} ^{۲۲۲۹ء} ^{۲۲۳۰ء} ^{۲۲۳۱ء} ^{۲۲۳۲ء} ^{۲۲۳۳ء} ^{۲۲۳۴ء} ^{۲۲۳۵ء} ^{۲۲۳۶ء} ^{۲۲۳۷ء} ^{۲۲۳۸ء} ^{۲۲۳۹ء} ^{۲۲۴۰ء} ^{۲۲۴۱ء} ^{۲۲۴۲ء} ^{۲۲۴۳ء} ^{۲۲۴۴ء} ^{۲۲۴۵ء} ^{۲۲۴۶ء} ^{۲۲۴۷ء} ^{۲۲۴۸ء} ^{۲۲۴۹ء} ^{۲۲۵۰ء} ^{۲۲۵۱ء} ^{۲۲۵۲ء} ^{۲۲۵۳ء} ^{۲۲۵۴ء} ^{۲۲۵۵ء} ^{۲۲۵۶ء} ^{۲۲۵۷ء} ^{۲۲۵۸ء} ^{۲۲۵۹ء} ^{۲۲۶۰ء} ^{۲۲۶۱ء} ^{۲۲۶۲ء} ^{۲۲۶۳ء} ^{۲۲۶۴ء} ^{۲۲۶۵ء} ^{۲۲۶۶ء} ^{۲۲۶۷ء} ^{۲۲۶۸ء} ^{۲۲۶۹ء} ^{۲۲۷۰ء} ^{۲۲۷۱ء} ^{۲۲۷۲ء} ^{۲۲۷۳ء} ^{۲۲۷۴ء} ^{۲۲۷۵ء} ^{۲۲۷۶ء} ^{۲۲۷۷ء} ^{۲۲۷۸ء} ^{۲۲۷۹ء} ^{۲۲۸۰ء} ^{۲۲۸۱ء} ^{۲۲۸۲ء} ^{۲۲۸۳ء} ^{۲۲۸۴ء} ^{۲۲۸۵ء} ^{۲۲۸۶ء} ^{۲۲۸۷ء} ^{۲۲۸۸ء} ^{۲۲۸۹ء} ^{۲۲۹۰ء} ^{۲۲۹۱ء} ^{۲۲۹۲ء} ^{۲۲۹۳ء} ^{۲۲۹۴ء} ^{۲۲۹۵ء} ^{۲۲۹۶ء} ^{۲۲۹۷ء} ^{۲۲۹۸ء} ^{۲۲۹۹ء} ^{۲۳۰۰ء} ^{۲۳۰۱ء} ^{۲۳۰۲ء} ^{۲۳۰۳ء} ^{۲۳۰۴ء} ^{۲۳۰۵ء} ^{۲۳۰۶ء} ^{۲۳۰۷ء} ^{۲۳۰۸ء} ^{۲۳۰۹ء} ^{۲۳۱۰ء} ^{۲۳۱۱ء} ^{۲۳۱۲ء} ^{۲۳۱۳ء} ^{۲۳۱۴ء} ^{۲۳۱۵ء} ^{۲۳۱۶ء} ^{۲۳۱۷ء} ^{۲۳۱۸ء} ^{۲۳۱۹ء} ^{۲۳۲۰ء} ^{۲۳۲۱ء} ^{۲۳۲۲ء} ^{۲۳۲۳ء} ^{۲۳۲۴ء} ^{۲۳۲۵ء} ^{۲۳۲۶ء} ^{۲۳۲۷ء} ^{۲۳۲۸ء} ^{۲۳۲۹ء} ^{۲۳۳۰ء} ^{۲۳۳۱ء} ^{۲۳۳۲ء} ^{۲۳۳۳ء} ^{۲۳۳۴ء} ^{۲۳۳۵ء} ^{۲۳۳۶ء} ^{۲۳۳۷ء} ^{۲۳۳۸ء} ^{۲۳۳۹ء} ^{۲۳۴۰ء} ^{۲۳۴۱ء} ^{۲۳۴۲ء} ^{۲۳۴۳ء} ^{۲۳۴۴ء} ^{۲۳۴۵ء} ^{۲۳۴۶ء} ^{۲۳۴۷ء} ^{۲۳۴۸ء} ^{۲۳۴۹ء} ^{۲۳۵۰ء} ^{۲۳۵۱ء} ^{۲۳۵۲ء} ^{۲۳۵۳ء} ^{۲۳۵۴ء} ^{۲۳۵۵ء} ^{۲۳۵۶ء} ^{۲۳۵۷ء} ^{۲۳۵۸ء} ^{۲۳۵۹ء} ^{۲۳۶۰ء} ^{۲۳۶۱ء} ^{۲۳۶۲ء} ^{۲۳۶۳ء} ^{۲۳۶۴ء} ^{۲۳۶۵ء} ^{۲۳۶۶ء} ^{۲۳۶۷ء} ^{۲۳۶۸ء} ^{۲۳۶۹ء} ^{۲۳۷۰ء} ^{۲۳۷۱ء} ^{۲۳۷۲ء} ^{۲۳۷۳ء} ^{۲۳۷۴ء} ^{۲۳۷۵ء} ^{۲۳۷۶ء} ^{۲۳۷۷ء} ^{۲۳۷۸ء} ^{۲۳۷۹ء} ^{۲۳۸۰ء} ^{۲۳۸۱ء} ^{۲۳۸۲ء} ^{۲۳۸۳ء} ^{۲۳۸۴ء} ^{۲۳۸۵ء} ^{۲۳۸۶ء} ^{۲۳۸۷ء} ^{۲۳۸۸ء} ^{۲۳۸۹ء} ^{۲۳۹۰ء} ^{۲۳۹۱ء} ^{۲۳۹۲ء} ^{۲۳۹۳ء} ^{۲۳۹۴ء} ^{۲۳۹۵ء} ^{۲۳۹۶ء} ^{۲۳۹۷ء} ^{۲۳۹۸ء} ^{۲۳۹۹ء} ^{۲۴۰۰ء} ^{۲۴۰۱ء} ^{۲۴۰۲ء} ^{۲۴۰۳ء} ^{۲۴۰۴ء} ^{۲۴۰۵ء} ^{۲۴۰۶ء} ^{۲۴۰۷ء} ^{۲۴۰۸ء} ^{۲۴۰۹ء} ^{۲۴۱۰ء} ^{۲۴۱۱ء} ^{۲۴۱۲ء} ^{۲۴۱۳ء} ^{۲۴۱۴ء} ^{۲۴۱۵ء} ^{۲۴۱۶ء} ^{۲۴۱۷ء} ^{۲۴۱۸ء} ^{۲۴۱۹ء} ^{۲۴۲۰ء} ^{۲۴۲۱ء} ^{۲۴۲۲ء} ^{۲۴۲۳ء} ^{۲۴۲۴ء} ^{۲۴۲۵ء} ^{۲۴۲۶ء} ^{۲۴۲۷ء} ^{۲۴۲۸ء} ^{۲۴۲۹ء} ^{۲۴۳۰ء} ^{۲۴۳۱ء} ^{۲۴۳۲ء} ^{۲۴۳۳ء} ^{۲۴۳۴ء} ^{۲۴۳۵ء} ^{۲۴۳۶ء} ^{۲۴۳۷ء} ^{۲۴۳۸ء} ^{۲۴۳۹ء} ^{۲۴۴۰ء} ^{۲۴۴۱ء} ^{۲۴۴۲ء} ^{۲۴۴۳ء} ^{۲۴۴۴ء} ^{۲۴۴۵ء} ^{۲۴۴۶ء} ^{۲۴۴۷ء} ^{۲۴۴۸ء} ^{۲۴۴۹ء} ^{۲۴۵۰ء} ^{۲۴۵۱ء} ^{۲۴۵۲ء} ^{۲۴۵۳ء} ^{۲۴۵۴ء} ^{۲۴۵۵ء} ^{۲۴۵۶ء} ^{۲۴۵۷ء} ^{۲۴۵۸ء} ^{۲۴۵۹ء} ^{۲۴۶۰ء} ^{۲۴۶۱ء} ^{۲۴۶۲ء} ^{۲۴۶۳ء} ^{۲۴۶۴ء} ^{۲۴۶۵ء} ^{۲۴۶۶ء} ^{۲۴۶۷ء} ^{۲۴۶۸ء} ^{۲۴۶۹ء} ^{۲۴۷۰ء} ^{۲۴۷۱ء} ^{۲۴۷۲ء} ^{۲۴۷۳ء} ^{۲۴۷۴ء} ^{۲۴}

ہے کہ اس امکان کو غماہری اسباب پر محمول کیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر اپنے اثر اور رسوخ کے لحاظ سے جو کچھ کر سکتے تھے، اس کو تو جانے دیجئے۔ اس قسم کے رنگ میں بھنگ جب مشاہدہ بتا رہا ہے کہ معمولی ہم پھینکنے والے ہنگامی دہشت پسند بھی ڈال سکتے تھے، اور لارڈ ہارڈنگ کے ساتھ اسی دقتی میں جتن ہی کے موقعہ پر درہمی اور برہمی کے جس نمائشے کو دیکھا گیا تھا، اس کے دیکھنے والے تو اب بھی مل سکتے ہیں۔ یوں بھی اصولاً تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے۔ بلکہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

”مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے“

خود یہ بھی بتا رہا ہے کہ اسباب و علل کے جس عمومی نظام کے تحت دنیا چل رہی ہے سیدنا الامام الکبیر کے سامنے اللہ کی یہی سنت اور قدرتی کار فرمائیوں کا یہی عام پہلو تھا، حاصل گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت مسئلہ کے ختم کر دینے یا کم از کم اس کے نظام کو الٹ پلٹ دینے کے امکانات کو پاتے ہوئے بھی، سیدنا الامام الکبیر یہ محسوس فرماتے تھے کہ اس تخریب کے بعد تعمیر کی دشواریوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے عام سنت اللہ کی رو سے جن ناگزیر ضمانتوں اور اسباب و شروط کی ضرورت ہے ان سے اس زمانہ کا ماحول خالی اور مخلص نظر آ رہا تھا، اور یہی چیز تھی، جو تخریبی امکانات سے فائدہ اٹھانے میں مزاحم ہو جاتی تھی، ملک اس زمانہ میں جس جال میں تھا، عوام و خواص جس رنگ میں رنگین تھے۔ جس نے حکیمانہ بصیرت کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہے، وہ اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، ظفر شاہ اور اسی عہد کے بعض دوسرے حکمرانوں کے متعلق نوٹ میں جو معلومات درج کی گئی ہیں، کم از کم یہی اس دعوے کی توجیہ کے لئے کافی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا طیب صاحب کی یہ روایت اگر صحیح ہے، اور نہ صحیح ہونے کی بظن ہر کوئی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی، تو خود یہی اس بات کی کافی ثبوت ہے، کہ مشہد کے ہنگامہ میں آپ کی شرکت کسی باضابطہ سوچے ہوئے لائحہ عمل کا

نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ شہداء سے پہلے تقریباً سو سال تک انگریزوں کے مقابلہ میں اصحاب علم و دین کی طرف سے جو خاموشی اختیار کی گئی، اور اسی کا یہ جواب کہ دینی ذمہ داریوں کا احساس علماء میں مردہ ہو چکا تھا کچھ عام حالات کے لحاظ سے ممکن ہے کہ کسی حد تک صحیح بھی ہو لیکن اسی زمانہ میں آخر سید شہید مولانا شبید اور ان کے راستنباذ مخلص رتھا کی جاں بازیوں کی دیکھتے ہوئے پھر کثرت کا دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ ان بزرگوں کی جدوجہد کا رخ بھی بجائے انگریز اور انگریزی حکومت کے پنجاب کی سکھ طاقت کی ہی طرف اول سے آخر تک جو پھرا رہا، خود اس واقعہ کی توجیہ نیز شہداء کے ہنگامہ کے فرد ہو جانے کے بعد مدت تک سکوت اور خاموشی کی فضا جو قائم رہی اس حال کو دیکھ کر جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے یہ عاجلانہ فیصلہ اور ڈری بے باکی کی بات ہوگی کہ ایسا فی زندگی سے عوام کے ساتھ خواص بھی کلیتہً محروم ہو چکے تھے اور کفر کی نہ بھی لیکن ان میں ہر ایک بخوشی درضا جاہلیت کی زندگی پر قانع ہو کر بیٹھ گیا تھا، آخر میں پوچھتا ہوں کہ شہداء میں جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن اس طوفان کے اتر جانے کے بعد خود سیدنا الامام الکبیر کی خاموشی اور سکوت

لے کوئی شبہ نہیں کہ شہداء کا فوجی ہنگامہ اور اس کی خبر پر انگریزوں کے نظام سے تنگ آئے ہوئے بہت دوستانیوں کا جگہ جگہ کھڑے ہو جانا ایک وقتی جذبہ تھا جو اپنے اسباب کے لحاظ سے تو وقتی نہ تھا مگر ہفتہ (دو ٹھ جائے) کے لحاظ سے وقتی تھا۔ لیکن ان بزرگوں کا اس میں کھڑا ہونا کسی وقتی جذبہ اور ہنگامی حرکت کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل کا ثمرہ تھا۔ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کا مشن ہمہ وقت ان بزرگوں کے پیش نظر تھا، اس کے لئے یہ وقت اور وقت کا ہنگامہ انہیں سازگار نظر آیا تو اس متواتر مشن کی روشنی میں سیدان میں اتر آئے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان کہ دوسرے دیوبند شہداء کی ناکامی کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا۔ جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آئیگی اس کی واضح دلیل ہے کہ کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل تھا جس میں شہداء میں کامیابی نہ ہوتی تو اس کے لئے دوسرا راستہ سوچا گیا، اور بقول حضرت مولف سوانح کہ یہ ہنگامہ اگر اس وقت کی زمین ہستہ پر ختم ہو گیا تھا تو ان بزرگوں کے دل و دماغ سے ختم نہ ہوا تھا جو برابر مستعد رہے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس ہنگامہ کی ناکامی پر سیدنا الامام الکبیر ان کے شیخ اور اس حلقہ کے دوسرے بزرگوں نے ان اسباب ناکامی کو تاڑ لیا تھا۔ اللہ ہی اسباب کا ازالہ اس دوسری صورت سے کرنا چاہتے تھے یہ اسکی واضح دلیل ہے کہ ان حضرات کی اس میں شرکت غیر شعوری یا جذباتی رنگ سے نہ تھی بلکہ ایک مقصد کی روشنی میں تھی۔ محمد طیب غفرلہ

یقیناً بے معنی اور بلا وجہ نہ تھی۔ خدا جزا خیر دے مولانا طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کہ
”مگر سلجھانے والے نظر نہیں آتے“

ان حقیقت افزہ الفاظ پر شتل روایت کو بہت سی ذہنی الجھنوں کے سلجھانے کا سامان انہوں
نے مہیا فرما دیا ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مصنف امام نے اسی غدد کے ہنگامہ کے متعلق اس کا ذکر کرتے ہوئے
کہ سرکار میں اس کی خبری کی گئی تھی، کہ حکومت سے بغاوت کے اس قصہ میں وہ بھی شریک
تھے، آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

”مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے، ملک دہال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ
صورت ہی کیوں ہوتی، کہیں کے ڈپٹی، یا صدر الصدور ہوتے“ ۱۹

اسی طرح حضرت گنگوہی بھی غدر ہی کے مجرموں میں ماخوذ ہوئے تھے اور کچھ دن جیل میں گزارنے کے بعد رہائی
ہوئی تھی، اس واقعہ کی تفصیل کرتے ہوئے، مولوی عاشق الہی صاحب نے حضرت گنگوہی
کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید میں مجنسہ ان ہی الفاظ کا تقریباً اعادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
”یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے“

ملک دہال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کوئی کہیں کا ڈپٹی
اور کوئی کسی جگہ کا صدر الصدور، کچھ پنی کے حالی شان مکرے، اور عدالت کے
دسجے اور اونچی چھتوں والے سکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والوں مجرموں
اور کھڑے بوریا کے فرش والے نادریک گوشوں میں کیوں پڑتے“

۲۶
۱۷ تذکرۃ الرشید

خصوصاً خط کشیدہ الفاظ دونوں حضرات کے ایک ہی ہیں۔ واقعات سے جو واقف ہیں، اور سچ
پر چھنے، تو ان حضرات کی عملی شہادت کا واقعہ کوئی راز و رن خانہ تھا بھی نہیں، ”مخلبا“ میں جہات
طے ہوئی ہو، اور کی گئی ہو، راز بن کر وہ کیسے رہ جاتی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ دونوں حضرات کے

اس بیان کو عموماً لوگ وقتی مصالح کا اقتضا قرار دے کر دل میں سمجھ لیتے ہیں، کہ واقعہ کی تعبیر میں "تورہ" کے اس طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے جس کی شرعاً و اخلاقاً سمجھا جاتا ہے کہ اجازت ہے، ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے، لیکن اگر غور کیجئے، تو واقعہ کی تعبیر کا عام پیرایہ بھی شاید یہی ہو سکتا تھا۔ سب سے زیادہ مستحق توجہ مذکورہ فقرہ میں

"فسادوں"

کا لفظ ہے۔ دونوں حضرات انکار اس کا کر رہے ہیں کہ "فساد" کی شرکت سے دونوں حضرات بری تھے۔ آخر قرآن مجید ہی میں جب فرمایا گیا ہے کہ

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعُهَا لِلَّذِينَ لَا	یہ دار آخرت ہم ان ہی کیلئے رکھینگے جو زمین میں
يُورِثُونَ حُلُوفَ الْأَرْضِ وَلَا فُسَادًا	بگاڑا اور تکبر نہیں کرتے

اور ایک اسی ایک آیت میں کیا آپ قرآن پڑھئے، شروع سے آخر تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسی آیتیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیں گی، جن میں زمین پر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں اور ان کے مفسدانہ کاروبار پر زبرد تو بیخ انتہائی سخت اور کثرت لہجوں میں کی گئی ہے۔

پس ایسے بدترین قرآنی جرم سے براہت کا دعویٰ اگر کیا گیا ہے، تو آپ خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کیا کیا جاتا، اسی لئے بجائے "تورہ" کے میرے نزدیک تو واقعہ کے اظہار کا یہ سیدھا سادہ طریقہ ہے، اور یہی سوچنے کی بات ہے، کہ "فساد" جس کی نفی کی گئی ہے، اس سے کیا مراد ہے۔ اور شرکت کا واقعہ جو یقیناً واقعہ ہے، اس کی صحیح نوعیت کیا تھی۔ ادب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء خالص نے اس مہم میں یقیناً حصہ لیا تھا۔

اس مسئلہ میں آئندہ جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس سے پہلے ایک بات سن لی بنے جن معلومات کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچنے اور پہنچانے کی کوشش کروں گا، ان کا بڑا حصہ ایسا

کتابوں سے ماخوذ ہے جو عمر فارست و خیر زادہ و گیر کی اس قیامت کے بعد لکھی گئی ہیں، جسے غدر کے بعد انگریزی قوم کے مجنونانہ انتقامی جذبات نے اس ملک میں برپا کر رکھا تھا۔ ع بات پر یہاں زبان کھلتی ہے، اللہ۔

صرف شاعری نہیں، بلکہ اس عہد میں واقعہ بھی یہی گذر رہا تھا۔ اس روح فرسا جہاں گذرنا حادثہ کا جہ پر بیس اکیس سال بھی نہیں گزرنے تھے۔ جب ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب مرتب فرمائی تھی، ان کے بعد مولانا عاشق الہی صاحب مرحوم نے حضرت گنگوہی کی سوانح عمری مدون کی سب قہہ کافی ہو چکا تھا، اسی لئے بہت سی باتیں جو مصنف امام کی کتاب میں محلہ تھیں، مولانا عاشق الہی کی کتاب میں ان کی تفصیل کا مرقعہ میسر آیا، سوانح مخطوطہ کے نام سے سیدنا الامام الکبیر کی جس غیر مطبوعہ ناقص سوانح عمری کا ذکر کیا چلا آیا ہو، صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ مصنف امام سے پہلے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ یا اس کے بعد تصنیف ہوئی، تاہم اتفاقاً یہی ہے کہ بزن و کیش زد و برد، دھر پڑ، گنج سوا، کا مسئلہ حکومت کی طرف سے ختم نہیں ہوا تھا، بظاہر اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں سرے سے اس واقعہ کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی۔ ہے، صرف ایک موقع پر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے تذکرے میں

لے سوانح مخطوطہ ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی ہے۔ جب سیدنا الامام الکبیر کی ذات پر ایک سال گذر چکا تھا۔ چنانچہ بنا و مدرسہ دیوبند کے مسئلہ میں خود سوانح مخطوطہ سے ہی یہ اقتباس پیش کر لیا ہے۔ جیسا کہ آگے آگے گا اور مصنف امام کی سوانح اس سے مقدم ہے جو سیدنا الامام الکبیر کے سن وفات ۱۱۹۶ھ میں لکھی گئی ہے جیسا کہ اس سوانح کے اس قدیم نسخہ کے ٹائٹیل سے معلوم ہوتا ہے، جو مطبع صادق الانوار بھاولپور میں طبع ہوا اس نسخہ کے ابتدائی برسیدہ اور دیدہ اوراق میرے پاس محفوظ ہیں۔ محمد طیب

۱۸۷۱ء جہاں تک اھمر کا اندازہ ہے سوانح مخطوطہ میں اس سلسلہ سے خاموشی اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ صراحتاً دیکھا گیا اس کا تذکرہ بھولہ اور اھام میں کیا گیا ہے۔ مرا شاہن اوراق میں حضرت والا کے مجاہدانہ کارناموں کا ذکر ہے۔ دہ اوراق غائب ہیں۔ مگر فہرست مضامین میں اس کا متعلق عنوان رکھ کر ان اوراق میں تذکرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جسے سکوت نہیں کہا جاسکتا۔ پھر اس اقتباس میں بھی جو حضرت مؤلف سوانح امام مجدد نے فرمایا ہے۔ یہ تذکرہ مثل مراحت کے ہے۔ کیونکہ اس اقتباس سے تاسیس مدرسہ کا زمانہ ہندوستان کی اس قیامت کبریٰ کا زمانہ ہے۔ جس میں ہنگامہ شدہ کے پس منظر کے طور پر اور دیگر اور دن و گئی کے حادثہ رونما تھے اور خود حضرت مؤلف سوانح ہی کا بیان آگے آ رہا ہے (مسلط بنار دارالعلوم کے سلسلہ میں باقی اگلے صفحہ)

یہ لکھتے ہوئے کہ

”یہ وہ زمانہ ہے، جس میں ملک ہندوستان میں ایک ہنگامہ سخت برپا ہوا تھا، جس کو عوام الناس غدر کہتے ہیں۔“

ضدِ اتنی بات ان کے قلم سے بھی نکل پڑی ہے۔

”اگر وہ معرکہ تھا، جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل ہو گئی تھی، اور منلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی، اور کارخانہ اسلام کا تہہ دار بالا ہو گیا تھا۔ مسلمان ہوتا ہی جرم ہو گیا تھا۔ اکابر دین کا خاتمہ ہو گیا تھا، ہر مسلمان سراپہ حال تھا، ہر مؤمن شکستہ بال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی، نہ میں سمجھ نہ تو سمجھ کا حال تھا، یا نفسی نفسی کا مقام تھا۔ جتنا جوڑا تھا، اتنا ہی بڑا اس پر صدر تھا۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے، اور بعض بعض جو پنچہ اجل سے بچے، اس ملک سے ہجرت فرما گئے، ہندوستان میں اسلام پر قریب قریب اسی کے صدر عظیم واقع ہوا تھا، جیسے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر کل اسلام پر مسلمانوں کی قلت کفار کی کثرت کفر کی شدت بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین نسیا نہیں ہو جائے گا“ ضد

اس میں شک نہیں کہ جس زمانہ میں وہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت اتنا بھی لکھ دینا غیبر معمولی ایمانی قوت، اور اسلامی حمیت کے بغیر آسان نہ تھا۔ مگر یہ بات کہ جس شخص کی سوانح نگاری کا

رگزدہ صفحہ کلان سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صدر دین کو استادِ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا محض قلم کے لئے قائم کیا تھا؟ نہیں، بلکہ شہرہ کے ہنگامہ کی ناکامی کی تلافی کے لئے جس سے حضرت کا ان واقعات میں دخل نہ پایا ہے۔ بہر حال سوانح مخلوط کی فہرست میں حضرت کے جہاد کا عنوان اور واقعات جہاد کی سرخیاں اور اس اقتباس میں شہرہ کا پس منظر اور اس میں ناسیس دانا علوم کی صورت سے حضرت دانا کا عزم و قصد اسی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں کہ حضرت دانا کی شرکت بھی اس میں اپنے مقاصد کے تحت ہوئی اور سوانح مخلوط کے مصنف نے اس کے اظہار و انداز سے سکوت داغواض بھی نہیں کیا۔

محمد طیب غفرلہ

فرض وہ انجام دے رہے ہیں۔ اس کا بھی نغیا یا اثبات اس ہنگام سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا، یا نہیں، یہ سوال ہی اٹھایا گیا ہے، اور نہ صراحت یا کنایہ جواب ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ البتہ ایک جگہ سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے عالم عابد حافظ حاجی وغیرہ عنوانوں کے ساتھ

”غازی“ ۱۵

کے عنوان کو بھی ہم پاتے ہیں، لیکن غزا کے اس فرض کو کب کہاں، کس شکل میں، کس حالت میں انجام دے کر ”غازی“ کے اس لقب کے آپ حقدار ہوئے۔ کتاب کا جتنا حصہ میرے پاس ہے، اس میں تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

بہر حال مصنف امام کی کتاب، اور حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید جسے مولانا عاشق الہی نے مرتب فرما کر جماعت دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کی، اور کافی تنقید و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی، اس وقت تک کسی قسم کی تنقید اس کتاب کی ردائتوں پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے، ان دو مطبوعہ کتابوں کے سوا مولانا طیب صاحب، اور مولانا طاہر صاحب سیدنا الامام الکبیر کے دونوں سید و رشید ثقہ پوتوں کی قلمی یادداشتوں کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر اس سلسلہ میں واقعات کی جو ترتیب میری سمجھ میں آئی ہے اسے قلم بند کرتا ہوں، واللہ هو المامہ للصواب والیہ المرجع والمآب تمہیداً آغاز قدر کے بعض اجمالی پہلوؤں کا ذکر مناسب ہو گا۔

۱۵۹۹ھ میں مولانا طیب صاحب نے کابل کا مشہور سفر جیب کیا تھا، ۱۲۵۲ھ کا بل ظاہر شاہ اندامشاہ زمانہ کی ملاقات، بلکہ مصافحہ و معارفہ کے بعد کلاں کا مرقعہ بھی سوننا کو بھرا آیا تھا، بڑے بڑے و زمانے شہستان غازی کے چشم و چراغ کو اپنے سردوں اور آنکھوں پر بٹھایا۔ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ مرحوم کے پاس سیدنا الامام الکبیر کی ایک ٹوپی بیلو تیسرے رکھنوی تھی۔ یہ ٹوپی ان کے یہاں اس وقت پہنچی تھی جب ان کا خاندان ہندوستان ہی میں مقیم تھا، دستبرد تھا اور شاید اب تک ہے کہ اس شاہی خاندان میں کوئی جیب بیلو بڑھاتا ہے تو شہانہ کی نیت سے یہ ٹوپی اسے پہنائی جاتی ہے۔ غالباً نادر شاہ کی والدہ یا دادی سے (باقی اگلے صفحہ پر)

پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شہداء کے ٹھیک ستو سال بعد جوں ہی کہ شہداء کا سال شروع ہوا،
جنوری کا پہلا مہینہ تھا کہ کلکتہ کی چھاپنی ڈم ڈم میں پہلی دفعہ کار توڑوں میں گائے اور سور کی چسپری
کے قصہ کا آغاز ہوا۔ وہی قصہ بڑھتا رہا، کار توڑوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کی تعمیل سے جن ہندوستانی
سپاہیوں نے سرتابی کی تھی، ان کی پلٹن ہی کو گورنر جنرل نے برخاست کر دیا جس سے کالی پلٹن
میں کافی خوف و ہراس اور آزدگی کے جذبات پیدا ہوئے، بارکپور (کلکتہ) کی چھاپنی میں اسی کا
رد عمل اس شکل میں ہوا کہ ایک سپاہی نے افسر پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس سپاہی کی گرفتاری میں دوسرے
ہندوستانی سپاہیوں نے کوئی دلچسپی نہ لی، اسی کو جرم قرار دے کر بارکپور کی سات پلٹنوں کی ہوتوئی
کے ساتھ ساتھ گورنر جنرل نے ایک جہاد اور ایک سپاہی کو قوبھانسی پر چڑھا دیا، اور دو کو کالے پانی
کی سزا جس دھام کی شکل میں دی گئی۔ حرم کے مقابلہ میں سرتابی سختی ہندوستانی فوجیوں کے لئے
ناقابل برداشت ثابت ہوئی، جہاں جہاں کنوینٹنٹ اور فوجی چھاندنیاں تھیں، انہی اندر سنگتو ہوئے

(گذشتہ صفحہ سے) خاص طور پر عرض کر کے سیدنا امام الکبیر سے یہ ٹوپی حاصل کی تھی۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ کابل میں
مولانا طیب صاحب کو اپنے چھوٹی زاد بھائی سیدنا امام الکبیر کے فواسے مولانا محمد میاں جو عام طور پر منصور
انصاری ہجرت کابل کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے گھر میں قیام کا موقع ملا، بظاہر بہت سی باتوں کے ان ہی مولانا
منصور انصاری نے اس ہم میں سیدنا امام الکبیر کے عملی اشتراک کی متعلقہ رفاہیوں کو ایسے ذریعہ سے مولانا طیب
صاحب تک پہنچایا تھا کہ ان رفاہیوں کو چشم دید شہادتوں کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔ یاد ہو گا کہ ان کے
خاص رفاہیوں میں سیدنا امام الکبیر کے ایک صاحب مولانا منیر ناوٹوی بھی تھے۔ اس ہم میں اولیٰ سے
آخر تک وہ شریک تھے اور شریک ہی نہ تھے بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو حکم دے
رکھا تھا کہ سیدنا امام الکبیر کے ساتھ ساتھ رہیں اور اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ کسی خطرے میں مولانا
اپنے آپ کو نہ ڈرہوئے کی وجہ سے نہ ڈال دیں۔ اس حکم کی تعمیل کی وجہ سے واقعہ کے ایک بہترین
گواہ رہ بن گئے تھے۔ ان ہی مولانا محمد منیر صاحب سے مولانا منصور انصاری تک معلومات
پہنچی تھیں۔ یہ ساری باتیں خود مولانا محمد طیب صاحب کی یادداشت میں درج ہیں۔ اسی طرح
مولانا محمد طاہر کی یادداشت کے بلے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ براہ راست اپنے والد مرحوم مولانا
حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشقی ہوئی رفاہیوں کو انہوں نے قلم بند کر لیا
تھا۔ ۱۲ -

یہ آگ پہنچتی رہی، تاہم ۵ مئی ۱۹۴۷ء یعنی ۱۰ رمضان ۱۳۶۶ء کو میرٹھ کی چھاؤنی میں بھی آگ بھڑک اٹھی، گوروں کی تعداد میرٹھ کی اس چھاؤنی میں دو ہزار دوسرے زائد نہ تھی، اس کے مقابلے میں کالی پلٹن والوں یعنی ہندوستانی فوجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی، پھر غیر فوجی عملہ جو صرف ہندوستانی تھا، مزید بے براں۔ فوج کے چاروں طرف آبادی ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں ہی ہندوستانیوں کی تھی، جیل خانہ بھی توڑ دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہوا، لیکن میں آگ لگا دی گئی، اور گورے چڑے کا جو آدمی بھی سامنے آیا، مرد ہو، یا عورت، بچے ہوں، یا جوان بلا امتیاز سب کا صفایا شروع ہو گیا۔

انگریزی افسروں نے روک تھام کی کوشش کی، لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی، اتوار کا دن مئی کی دس حساب سے رمضان کی پندرہ ہوتی ہے۔ واقعہ اپنے انتہائی حدود کو پہنچ گیا۔ اتوار کا دن گزار کر کالی پلٹن والے کھلی ہوئی چاندنی میں دتی چل پڑے۔ دلی میں پہنچ کر لال قلعہ پر قبضہ کیا گیا، اور ظفر شاہ بے چارے کو فوج نے مجبور کیا کہ فرضی نہیں بلکہ واقعی ہندوستان کے بادشاہ بن جائیں۔ دتی میں اس کے بعد جو کچھ بھی گذر رہی ہو، لیکن باہر ملک کے طول و عرض میں قدرتا یہ خیال پھیل گیا کہ بجائے کلکتہ کے پھر دتی ہی ہندوستان کا پایہ تخت ہو گیا، اور ہندوستان کی حکومت پھر ہندوستانیوں ہی کے ہاتھ میں آگئی۔ یوں ہر علاقہ کو انگریزوں سے پاک و صاف کرنے کا ارادہ کر لیا گیا، جو بجا متحدہ اڈو کے ساتھ ساتھ ہندیل کھنڈ، اور صوبہ بہار کے بعض حصوں تک بغاوت کہنے، یا آزادی کی یہ تحریک پھیل گئی، دور دور کی چھاؤنیاں، مثلاً متونج، نصیر آباد کے علاوہ بعض بڑی ریاستیں مثلاً سندھیا (گوالیار)، جو کہ اندر وغیرہ بھی اسی پیمٹ میں آگئیں۔

ظاہر ہے میرٹھ جہاں سے یہ آگ اٹھی تھی، روہیل کھنڈ کے سارے اہم مقامات اسی کر اور گرد چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے نہ متاثر ہونے کی آخر وجہ یہی کیا ہو سکتی تھی، ظاہر ہے کہ اتنے طویل و عریض رقبہ کی بغاوت کا فرد کرنا آسان نہ تھا اور نہ چٹ سنگنی پٹ بیاہ کی صورت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ انگریز بھی جی جان چھوڑ کر مقابلہ کے میدان میں اتر آئے بعض

ہندوستانی طبقات کی طرف سے بھی کافی پشت پناہی کی گئی۔ آخر مئی ۱۸۵۷ء میں جو شہزادہ اڑا تھا، جلتے اور جلاتے ہوئے بقول راجہ شیو پرشاد

”شہزادہ کے آخر ہوتے ہوئے جہاں کا تہاں غرہ ہو گیا“

(تاریخ حجام جہاں نما جلد ۱۲)

اپنے موضوع سے ہٹ کر اجمالاً جو کچھ اس واقعہ کے متعلق مجھے عرض کرنا پڑا اس کی غرض بھی یہی تھی، کہ اس مدت کے بارہ میں پڑھنے والوں کو آسانی ہو، جس میں یہ واقعہ ہندوستان میں گذرا تھا۔ یعنی مئی ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۵۸ء تک۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے، کہ ڈیڑھ سال سے دو سال تک کم و بیش ملک اس ہنگامہ کا شکار رہا۔ خبریں جن کا کوئی باضابطہ نظام تو نہ تھا۔ لیکن بہر حال صحیح یا غلط خبریں پھیلتی ہی رہتی تھیں۔ مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ،

”خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ چھوٹی سبھی ہزاروں گپ شب اڑا کرتی تھیں۔“

کبھی معلوم ہوتا تھا کہ فلاں مقام پر ہندوستان کا پلہ انگریزوں کے مقابلہ میں بھاری ہو گیا ہے۔ اڑا لے والے زیادہ تر مزید دماغی اضافوں کے ساتھ اس قسم کی افواہیں زیادہ اڑایا کرتے تھے۔ اور کبھی یہ ماننے پر بھی لوگوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ انگریز غالب آگئے، عوام تو خیر، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، ملک کے ارباب فکر و بصیرت کی نظر زیادہ تر دلی پر اور دلی کے بعد تازہ مردہ حکومت کے پایہ تخت لکھنؤ پر جمی ہوئی تھی، راجہ شیو پرشاد جو اسی زمانہ کے آدمی ہیں

لے اختر یہاں کی اخترگری پھر ٹیلیوں والا شہر لکھنؤ، داہد علی شاہ سے خالی ہو جانے کے بعد بن چکا تھا، لیکن شاہ مرحوم کی جلا وطنی پر سال بھر کا زمانہ بھی نہیں گذرا تھا، یعنی ہر فردی شہزادہ کو انگریز حکومت کی طرف سے ملک اندہ کی ضبطی کا اشتہار جاری ہوا، ہر شہزادہ کی جنوری میں فوج کنوئیل بدلنے لگی، مئی تک فوج اور فوج کے ساتھ ملک باغی ہو گیا۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ جاندار جو پٹ دسلے بچلوں سے لکھنؤ کی طرف پر خالی نہ ہو یا یا تھا، غدر کے بعد شہزادہ برجیس نقد کو دو گونے داہد علی کی بسند پر بٹھا دیا۔ برجیس نو عمر تھا۔ اس کی ماں بیگم ثانی نے حکومت کی باگ سنبھالی، انگریزوں کو لکھنؤ میں کافی دشواری پیش آئی۔ اگر خیال کی امدادات آٹھ ہزار فوج کی شکل میں (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کی تاریخ کے اس فقرے کا معنی

”دہلی اور لکھنؤ کے ٹوٹتے ہی باغیوں کی کمرٹ گئی“ ۱۲۹۰ء جام جہاں نما

جس کا مطلب بھی یہی ہے۔

یہ اتفاق کی بات تھی کہ مقابلہ سب سے زیادہ ان ہی دونوں مقامات میں ہوا، ادکش کش بھی سب سے زیادہ طویل ان ہی دونوں مقامات کی تھی۔ کافی وقفہ اسی لئے سرچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا ان لوگوں کو مل گیا۔ جو عوام کے بھیڑیاد ہسان میں ابتدا ہی سے شریک نہیں ہوئے تھے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامہ میں شریک ہونے والوں میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا، جن کے لئے ”ہو“ کی آواز بس تھی، ہندو اور مسلمان دونوں ہی طرح کے موزوں کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں جو ملتی ہیں۔ مثلاً راجہ شیو پرشاد نے لکھا ہے کہ

”اس عرصہ میں ہزار ہا قیدی چھٹے، اور انہوں نے شہر اور چھاؤنی کے لچے بدرساں

دگدگ مشہور تھے، وقت پر انگریزوں کو مسرہ آتی تو کہنے والے کہتے ہیں کہ لکھنؤ کا سقوط آسان نہ تھا۔ مزید نسی کی کوٹھی، پیل گارڈ کے در و دیوار میں بھی جدوجہد کرنے والوں کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ اس موقع پر بے ساختہ جی چاہ رہا ہے کہ ایک سنی ہوئی بات کا ذکر کر دوں، اگرچہ اب نہ ان باتوں کے سننے والے ہی رہ گئے ہیں اور نہ ماننے والے، نواب صدر یار جنگ مرزا ناہیب الرحمن خاں شیردانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہ سے ایک دفعہ نہیں مختلف موقعوں پر یہ بات فقیر نے سنی تھی کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ بھی تھے۔ اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چودھری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ حضور کو تو میں انگریزوں کی صف میں پار رہا ہوں۔ نواب صاحب ہی دوسرے واقعہ کا ذکر بھی فرماتے تھے کہ خدمت کے بعد جب گنج مراد آبادی دیران مسجد میں حضرت مولانا جاکر شہید ہوئے تو اتفاقاً اسی راستہ سے جس کے کنارے مسجد ہے کسی جہ سے انگریزی فوج گزری تھی، میں نے مسجد سے دیکھ کر پتہ چلا کہ اچانک مسجد کی میسرینوں سے اتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس جو باگ و دو کھوٹے دھڑکھوٹے کانٹے ہوئے تھا اس باتیں کر کے پھر کھڑا پس آگیا اب یاد نہیں ہا کہ پوچھنے پر یہ خود بخود فرماتے گئے کہ سائیس جس میں جو گنگوڑی کے یہ حضرت تھے ہیں پوچھا کہ کیا لکھنؤ تو جواب میں کہا کہ حکم بھی ہمارا ہے۔ یہ روایت فرماتا ہے سنی ہوئی پر باقی خود حضرت کا مطلب کیا ہے؟ حضرت حق کی خالی شکل تجویز میں نام نہ ظاہر ہوتی ہے تخصیل کیلئے شہ ولی اللہ وغیرہ کی کتابیں پڑھئے گویا جو کچھ دیکھا جا رہا تھا اسی کے باطنی پہلو کا یہ کاشفہ تھا۔ ۱۲

تصاف، ڈوم چار فقیر بھک سگے، بہتر، سائیس گھسارے، خدمت گار خانہ سالان اور جملہ کمین اور ذیل سے جو چیرا اس باندھ کر برقعہ بازی کرتے تھے، خواہ بڑا بڑا چچا پاتک لگا کر گھنٹوں تک گھنٹہ پلایا کرتے تھے شائر، ہوئے، ۱۳۱۱ھ میں جہاں نما یا مسرید کے رسالہ میں ہے کہ شریک ہوئے نالوں میں

”ایسے خراب، اور بد رویہ، اور بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوردگی اور تماشائی بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا“ ۱۹۱۱ء ضمیمہ حیات جاوید

ممکن ہے کہ حکومت کو خوش کرنے اور ہندوستان کے عام باشندوں کے جرم کو بھکا کر کے دکھانے کے لئے بھی اس قسم کی باتیں لکھی گئی ہوں۔ لیکن اس کا انکار مشکل ہے کہ جن لوگوں نے ہنگامہ میں حصہ لیا تھا، ان میں کافی تعداد اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، اسی ہنگامہ میں کیا ہنگامہ میں اس تماشائے لوگوں کا پیل پڑنا، ایک عام بات ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی قطعاً غلط ہو گا کہ سنجیدہ، وفہیدہ طبقات کے افراد بھی اس میں شریک نہ تھے۔ یہ حقائق اور واقعات کی تکذیب ہے، البتہ فرق دونوں گروہوں میں یہ تھا کہ عوام کا بے قید طبقہ تو ”ہو“ کے ساتھ کود پڑا، اور وہ بول ہی کود پڑنے کا عورتا عادی بھی ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بڑی غرض ہوتی بھی نہیں، بے آئینی کے منافع سے فوری طور پر مستفید ہونا، کچھ پا کر نکل جانا، ان چھپو رے مقاصد کے سوا مشکل ہی سے ان کا قدم کسی بلند نصب العین کے لئے اٹھتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ عقل و فراست اور اس سے بھی زیادہ دین کی عائد کی ہوئی ذمہ داریاں جن کی زندگی تھی، بلکہ دین ہی کی پکار پر ایک کہنے ہوئے جو اٹھے تھے ان کے متعلق ایک لمحہ کے لئے کسی حیثیت سے بھی یہ سوچا جاسکتا ہے کہ وہ بھی اس حاسیانہ ”ہو“ پر دوڑ پڑے حالانکہ کیف محکمون

اور دل پر بحث کرنے کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کے متعلق محض حسن ظن ہی کی بنیاد پر میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ معلومات کا جو سرمایہ معتبر ذرائع سے مجھ تک پہنچا ہے،

جو بھی ان سے واقف ہوگا، وہ میری ہمنوائی پر انشاء اللہ اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔ اب خاص ترتیب سے اپنی ان معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

۱۔

آپ مجھ سے یہ سن چکے کہ میرٹھ میں کارروائی کا آغاز ۱۵ مئی ۱۹۵۷ء کی ۵ مئی سے ہوا۔ رمضان کی دسویں تاریخ تھی۔ اسی لئے لکھا ہے کہ کھلی چاندنی میں لوگ میرٹھ سے دہلی روانہ ہوئے۔ خیر یہ بات تو تاریخ بتاتی ہے۔ اب سنئے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ ”اسی عرصہ میں غدر ہو گیا“ ۳۶

آگے وہی سیدنا امام الکبیر کے منقول یہ اطلاع دیتے ہیں۔

”بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے،

اس وقت راہ چلنا بدو، ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا“ ۳۷

جس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

- (۱) غدر کے زمانہ میں ہمارے مصنف امام اپنے وطن نانوتہ میں نہیں بلکہ سہارن پور میں تھے۔
- (۲) لیکن سیدنا امام الکبیر (بجائے دہلی یا میرٹھ کے) معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ ہی میں قیام فرما گئے
- (۳) یہ رمضان جس کا مصنف امام نے اس موقع پر ذکر کیا ہے، یقیناً رمضان کا دہری مہینہ ہے، جس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرٹھ کی فوج باغی ہوئی، اد باغی ہو کر دہلی پہنچی۔ قدرتی طور پر دہلی سے جو علاقے زیادہ متصل تھے جیسے مظفرنگر، سہارن پور وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ بے آئینی کے عام آثار سے رمضان ہی میں متاثر ہو چکے تھے۔ راستہ کا امن وامان ختم ہو چکا تھا۔ اب خود عوام نے خود کا قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، یہ اس کا نتیجہ ہو، یا جیسا کہ مولوی عاشق انبی صاحب کا بیان ہے کہ ”گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا۔ اد بعد اشتہار عام اطلاع دے دی کہ اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے“ ۳۸

۳۸ جیسا کہ خشتی صدر از مطبوعہ نای پریس گننہ مرتبہ ملا ناواہ مستات قطب المری احمد صا کھنوی سے واضح ہے ۱۲

اس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہو۔

دہم، سیدنا الامام الکبیر کی جلالت اور پُر دلی (بہادری) کی شہادت کے ساتھ ساتھ مصنف امام کے مذکورہ بالا بیان کا کھلا ہوا اقتضائے یہ ہے کہ غدد کے شروع ہونے کے ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر قطعاً اس ہنگامہ میں شریک نہ ہوئے۔ بلکہ نافوتہ سے سہارنپور آنے کے بعد بجائے اس کے کہ جن میدانوں میں مقابلہ ہو رہا تھا، ان میں سے کسی میدان کی طرف چلے جاتے، اپنے ساتھ مصنف امام کو لے کر وطن نافوتہ ہی تشریف لے آئے۔

یہ بدرہی نتائج ہیں جو مصنف امام کی مذکورہ بالا اطلاع سے پیدا ہوتے ہیں۔ آگے یہ سوال کہ نافوتہ میں آپ کا کب تک قیام ایام غدر میں رہا؟ قطعی طور پر تو اس کا جواب دینا مشکل ہے لیکن مصنف امام اسی سلسلہ میں جب سہارنپور سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ نافوتہ پہنچے، اہل ان دونوں بزرگوں کا قیام اسی قصبہ میں تھا۔ آگے جو یہ لکھا ہے کہ

”جب احقر وطن (نافوتہ) پہنچا، چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں لانا

کی کمال جرات و ہمت ظاہر ہوئی“

بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خود نافوتہ پر بھی لوٹ مار کرنے والے غارتگروں نے حملہ کیا، اور قصبہ دانوں کے ساتھ مل کر ان کی ممانعت میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی امتیازی حصہ لیا۔ ایک نہیں بلکہ ”چند ہنگامہ کے پیش آئے“ کے لئے چاہئے تو یہی کہ ”کافی عرصہ تک مانا جائے کہ نافوتہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام رہا“ افسوس ہے کہ ان ہنگاموں کی تفصیلات کے جانتے کی کوئی صورت باقی نہ رہی، یہ کون لوگ تھے، اور نافوتہ پر بار بار حملہ کیوں کرتے تھے، ان سوالوں کا کیا جواب دیا جائے۔

شاید ان ہی ہنگاموں کی وجہ سے بھی، اور جیسا کہ مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ حفاظت کی ذمہ داری حکومت نے اپنے سر سے اتار کر خود ہندوستان کے باشندوں کے سر ڈال دی تھی کچھ عرصہ سے بھی، یا یہ کہ مستقبل میں کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ کچھ اس کے امکانات کو بھی

سوج کر مصنف امام نے لکھا ہے کہ

”اس زمانہ میں (یعنی جب ملک میں غدد برپا تھا اور ان کا قیام نافوہ میں تھا) ہمارے بھائی ہم عمر، اکثر بندوق اور گولی لگائے میں مشق کرتے رہتے تھے۔“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نافوہ میں شیورخ کی جو عام برادری تھی، اس میں نشانہ بازی وغیرہ جیسے جنگی مشاغل کی مشق کا غیر معمولی ذوق اور شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید آئندہ شریک ہونے اور شریک کرانے کی یہ تہید ہو۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے۔ مصنف امام ہی نے اسی کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان جنگی مشقوں سے کم از کم ذاتی طور پر سیدنا امام الکبیر کا کوئی تعلق تھا، اور نہ کسی خاص قسم کی دلچسپی ہی معلوم ہوتی ہے کہ ان مشاغل سے آپ لیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں نافوہ کے نوجوان چاند ماری کی مشق کر رہے تھے کہ

”ایک دن آپ (سیدنا امام الکبیر) مسجد سے آئے، ہم گولیاں لگاتے تھے، اور نشانہ بازی کے لیے ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا، قریب سے بندوق لگاتے تھے۔ گولیاں مٹی کی تھیں۔“

جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاند ماری میں مٹی کی گولیوں کے استعمال کرنے کا طریقہ ہندوستان میں مروج تھا۔ یا قلت سرایہ کا یہ نتیجہ ہو، بہر حال وہی کہتے ہیں کہ مسجد سے نشانہ بازی کے ہی مقابل پر پہنچ کر

”مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں، مجھے بھی دکھلاؤ۔“

اس کے سوا اور مطلب اس کا کیا سمجھا جائے کہ غدد کے ہنگاموں میں کافی روز جس زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اس وقت تک سیدنا امام الکبیر بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ بندوق کیونکر لگاتے ہیں؟ پہلی دفعہ اپنی پوری زندگی میں بندوق چلانے والوں سے یہ پہلا سوال آپ کی طرف سے شاید

پیش ہوا۔ اب یہ آپ کی عجز و کمیت اور فطرت فائزہ کا نتیجہ تھا جیسا کہ مصنف امام لکھتے ہیں، کہ دریافت فرمائیے پر

”کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا“ ۳۶

گویا کہ کے بھی دکھایا، اند نشانہ پر گونی مارنے کا جو طریقہ ہے، اسے بھی زبانی بتا دیا۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ بس ایک دفعہ دیکھو اور سن لینے کے بعد دیکھا گیا کہ سیدنا امام الکبیر نے

”تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی“ ۳۷

بزرگ نشانہ کی طرف دوڑے یہی لکھتے ہیں کہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ

”صاف گونی نشانہ پر لگی“ ۳۸

اس کے بعد مصنف امام نے اس قسم کی باتوں کا ذکر کر کے کہ نانوۃ کے دوسرے نوجوان جو زمانہ سے نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے اور نیم کے پتہ کی جگہ اس دائرے میں گونی کو پہنچا دینے کو کامیابی سمجھتے تھے جو پتہ کے اندر گر دیکھیں دیا جاتا تھا، ان کے مقابلہ میں بغیر کسی سابقہ مشق کے محض ایک دفعہ دیکھ لینے اور سن لینے کے بعد پہلے فیر ہی میں ٹھیک نشانہ یعنی نیم کے پتہ کو اپنی گونی سے سیدنا امام الکبیر نے جواڑ دیا تھا، ممکن ہے کہ اس کو ”برہدف زند تیرے“ کا اتفاقی واقعہ سمجھا جائے۔ مگر اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر اس خیال کی تردید کرتے ہوئے یہی لکھتے ہیں کہ ”یہ بات اتفاقی نہ تھی، اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادہ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ نہ ہوئی۔ تیرا اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں“ ۳۹

اور جو بھی سیدنا امام الکبیر کی فطرت فائزہ کی خصوصیتوں سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ وہ مصنف امام کی رائے کی تائید ہی کرے گا۔ مگر مجھے اس موقع پر مصنف امام کے بیان کی روشنی میں یہ کہنا ہے کہ مقابلہ اور مقابلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ سیدنا امام الکبیر اگر پہننے سے کئے ہوئے ہوتے، تو اس زمانہ تک آپ کا جنگی آلات کم از کم بندوق کے استعمال سے اس درجہ بیگانہ نہ جانا کیا ممکن تھا،

کچھ بھی ہو، اتنی بات بہر حال یقینی ہے کہ ان ناقابل انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا ہوا اقتضاد ہے کہ مالی خولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ غدر کے ہنگامہ کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے علمی و دینی رفقہ کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف امام نے لکھا ہے کہ

”مولنا فسادوں سے کوسوں دور تھے“

آخر حسب روایت مولنا طیب صاحب جب سنبھالنے والے حضرت والا کو نظر نہیں آ رہے تھے تو تعمیر سے پہلے تخریب کی یا خردوج سے پہلے رلوج کا خیال ممکن ہے عامیوں کے نزدیک ضروری نہ ہو، لیکن سیدنا الامام الکبیر جیسے دین کی مثالی شخصیتوں کے متعلق اس قسم کے خود تراشیدہ ادھام خباہتوں کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں؟

سیاست، جن لوگوں کے نزدیک صرف مار دھاڑ، اکھاڑ بچھاڑ کا نام ہے، وہ تو جو چاہے سوچیں، سوچ سکتے ہیں جو چاہے کریں کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کو جس قلب سلیم، ذہن سلیم، دماغ سلیم، فکر سلیم کا مالک بنا دیتا ہے ان لوگوں سے غوغائیوں اور خوشیوں کی بہنگم حرکات کی توقع دلیل ہے اس بات کی کہ توقع کرنے والے اسلام کی روح سے قطعاً بے گانہ ہیں، ایک صحیح اسلامی وجود، امن کی حالت میں ہو یا جنگ کی حالت میں، کسی دقت اور کسی حال میں کسی کے لئے نہ وہ دھوکا ہے اور نہ فریب، ہر حال میں آئین اور اصول کی پابندی بھی مسلمان کی زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے، اسی لئے اپنے ماحول میں رہنے والوں کے لئے امن و عافیت، طمانیت و سکینت، سلامتی اور غرض باشی کی وہ عجم ضمانت ہوتا ہے۔ دوست تو دوست دشمن بھی اسی بھروسہ کو اپنے دل میں پاتے ہیں اور یہی ان کو پاتا بھی چاہئے کہ غیر آئینی طریقے اختیار کر کے مسلمان کسی کے لئے کسی زمانہ میں کسی جگہ خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس امتیازی خصوصیت سے جو جتنا زیادہ دور ہے، سمجھنا چاہئے کہ اسی حد تک وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی روح سے دور ہے۔



بہر حال فسادوں سے قطعی دور ہونے کے باوجود پھر یہ سوال کہ آخر اس واقعہ کی صحیح نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے یہ سمجھا جانا ہے کہ شیعہ والے ہنگامہ میں سیدنا امام الکبیر نے بھی عملی حصہ لیا تھا۔ جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آرہا ہوں، اصل واقعہ کا انکار تو واقعہ کا انکار ہو گا، ایسے سارے ذرائع جن سے غیر مشتبہ یقین کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ پہلی نسلوں سے آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ قطعی طور پر ثابت ہے، کہ آپ لڑے بھی، زخمی بھی ہوئے الغرض سوانح مخطوطہ کے مصنف کے لفظ ”غازی“ کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان سب کے حاصل کرنے کے مواقع قدرت کی طرف سے آپ کے لئے آسان کئے گئے تھے۔ ایک چیز یعنی تاریخ فار تو ساری کڑیوں کا مرتب کر کے پیش کرنا مشکل کیا میرے لئے تو ناممکن ہے۔ جن وثائق اور کتابوں سے معلومات کی فراہمی میں مدد ملی ہے سب کے سب تاریخ کے ذکر سے خالی ہیں۔ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کب کس مہینہ میں مہینہ کی کس تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔ تاہم ان ہی ہزارگوں کا صدقہ ہے کہ تاریخ کی تعین کے بغیر وہی ہی لیکن واقعات تو بحمد اللہ معلوم ہو گئے۔

غدر کا ہنگامہ ملک کے طول و عرض میں برپا تھا۔ اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کافی عرصہ تک اس زمانہ میں ہم پرمانے پر مجبور ہیں کہ سیدنا امام الکبیر اپنے آبائی وطن نانوتہ ہی میں مقیم رہے۔ نانوتہ کے قیام کے ان دنوں میں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ پر شورش پسند غوغائیوں کی طرف سے متعدد بار حملے ہوئے، باشندگان قصبہ کے ساتھ سیدنا امام الکبیر بھی مدافعت میں حصہ لیتے رہے۔

بقول مصنف امام

”جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی“

مدافعت کی ان کامدائیوں کو بھی غدری ہنگامہ کی شرکت قرار دی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس حد تک قیام نانوتہ ہی کے زمانہ میں گویا آپ شریک ہو چکے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ

شرکت آپ کی تو فرمان نبوی

جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہو لہذا گیارہ شہید
ہو اور جو اپنی آبرو بچانے کے لئے مارا گیا وہ شہید ہے الخ

من قتل دون ماله فهو شهيد ومن
قتل دون عرضه فهو شهيد والحل

کی تعمیل شکل تھی

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے باہر کی جس قوم نے اس ملک پر
سیاسی اقتدار اپنا قائم کر لیا تھا۔ باہر سے مسلط ہونے والے اس بیرونی اقتدار کے ساتھ تصادم اور مقابلہ کی
صورت کہاں اور کیوں پیش آئی، کیونکہ مقصد اس مسئلہ میں مقابلہ اور مقابلہ کا یہی پہلو ہے۔

اس پر غور کرنے کے لئے اس مقدس جماعت کی تاریخ اعلا کلمۃ اللہ کو سامنے رکھ لیں
چاہئے۔ یہ تو ہندوستان سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو کر ایک بدیسی کے اقتدار کے سامنے آ جانے
کا مسئلہ تھا۔ ان حضرات کے سید الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تو خود مسلم اقتدار میں
بھی ہر مذہبی اور سیاسی باطل کے خلاف علم جہاد بلند رکھا، تو ان کے ترمیم یافتہ کفر کی شوکت
کے زمانہ میں اعلا کلمۃ الحق کے مقصد سے کیسے دست بردار ہو سکتے تھے اس لئے ان حضرات کے
سامنے سب سے پہلے تو یہ اعلا کلمۃ الحق کا مقصد سامنے تھا۔ ساتھ ہی قومی طور پر ہندوستان
کی لیسنے والی اقوام میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو انگریزوں کے ابتدائی طرز عمل اور مظالم سے تنگ
آئی ہوئی نہ ہو، جس میں مسلمان خصوصیت سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے ان بزرگوں کے سامنے
اعلا کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ عام ہندوستانی اقوام کی بہبودی اور فلاح کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔
جس کا حل اس کے سوا دوسرا نہ تھا کہ انگریزوں کا اقتدار اس ملک میں باقی نہ رہے۔

ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر کے ان اکابر حضرت سعید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل شہید
جہاں اللہ کا قریبی ایسہ بھی پیش نظر تھا۔ ان چند در چند وجوہات کے تحت ان اکابر میں یہ جذبہ بطور
قد مشترک کے موجزن تھا کہ اس ملک کی بہبود و فلاح انگریزوں کے قیام اور راج میں نہیں ہے
بلکہ ان کے یہاں سے ہٹنے اور باہر ہو جانے میں ہے۔ لہذا اس جذبہ کے ساتھ جس طاقت کی

ضرورت تھی، وہ مسلمانوں میں باقی نہ تھی اگر وہ ہوتی تو ملک ہی ہاتھ سے کیوں جاتا۔ اس لئے رات دن انی بزرگوں میں اس کا ذکر و فکر رہتا تھا، کہ یہ بھاری پتھر اس ملک کے سر سے کیسے اٹھایا جائے۔

اسی دوران میں مشہور کاہنگامہ پیش آیا۔ جب تک اس ہنگامہ کی صورت ایک غمراہ اور بلوہ کی رہی۔ ان بزرگوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جب کہ اس نے طویل کھینچ کر ملک کی رعایا کو راعی کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اور اب سوال ہندوستانی اصرانگریز کا پیدا ہو گیا۔ جس میں اس کے امکانات نظر آنے لگے کہ انگریز کا پنجہ استبداد ڈھیلا پڑ جائے یا اس کے سیربی اکھڑ جائیں تو یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھانا ان بزرگوں کے اصلی اور بنیادی نصب العین میں محسوس ہو سکتا تھا اس لئے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ انگریزوں کے مظالم جو اس سلسلہ کے محرک تھے آخر کار اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے تو اب کون سی چیز رہ گئی تھی جو ان بزرگوں کے ارادوں میں حرکت پیدا نہ کرتی اور سیدنا الامام الکبیر کو جو اس سلسلہ کو بہت پہلے سے بخیر بصیرت و عبرت دیکھ رہے تھے اس میدان میں آنے سے روکتی۔

بہر حال جذبہ اعلاء کلمۃ اللہ، مذہبی حمیت، ملکی غیرت اور براداران ملک کی مظلومیت عامہ کے پیش نظر ان کے استخلاص کا جذبہ وغیرہ اصل بواعث تھے جنہوں نے ان بزرگوں کو خاک و خون کے تراشوں میں لا کھڑا کیا۔

اس سلسلہ میں انگریزی مقابلہ کے بعض ناگفتہ حوادث بھی ایسے پیش آئے جس سے ان بزرگوں کے عزائم میں جلد حرکت ہو گئی اور خود ان حوادث میں بھی بعض شرعی پہلو ایسے تھے کہ ان کی بناء پر ان کے عزائم کو جلد متحرک ہو جانا چاہئے تھا۔ جس میں سے مثلاً ایک یہ بھی ہے جس سے انگریزوں کی معاہدہ شکنی اور غداری کھلے طور پر واضح ہوتی ہے کہ

سب سے پہلے اس باب میں ایک اطلاع مولانا عاشق الہی مرحوم کی کتاب تذکرۃ الرشید میں ملتی ہے۔ مولانا عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے، کہ تمھارے بھون جو سیدنا الامام الکبیر کے پیر و مرشد

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا موطن پاک تھا۔ اسی تھانہ بھون کے قصبہ میں قاضیوں کا ایک اچھا خاصہ خوش حال رئیس خاندان بھی رہتا تھا۔ قاضیوں کے اس خاندان کے ٹوٹے پھوٹے مکانات خستہ و بوسیدہ حال میں اب بھی تھانہ بھون میں موجود ہیں۔ سرسری نظر اس پر خاکسار کی بھی پڑ چکی ہے۔ مکانات کی محل سرائوں کی شان ان سے اب بھی نمایاں ہے۔ بظاہر کافی آمدنی خالی جاگیر حکومت مغلیہ سے قاضیوں کے اس خاندان کو ملی ہوئی تھی۔ جس زمانہ میں غدر کا فتنہ ملک میں مشہور ہوا، قاضیوں کے اس خاندان کے رئیس قاضی عنایت علی خاں نامی تھے۔ مولانا عاشق الہی نے لکھا ہے کہ وہ

”تھانہ بھون کے نیک و نیکو سرکاری ختمیہ خواہ زمیں دار“ تذکرۃ الرشید ص ۱۶۲

تھے۔

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عام بنادت سے بچھوٹے ٹکڑے کے بعد بھی سرکار یعنی حکومت مسلطہ کے ساتھ یہی خیر اسی اور مصالحت پسندی کا رشتہ جن لوگوں سے قائم کر رکھا تھا ان میں تھانہ بھون کے قاضیوں کا یہ زمیندار رئیس خاندان بھی تھا۔ نیز تھانہ بھون کی شورش کے آغاز کے متعلق تذکرۃ الرشید ص ۱۶۲ کے حاشیہ پر جو فقرہ درج کیا گیا ہے کہ

”اسی گھٹا ٹوپ اندھیاد میں جب کہ کئی جگہ غدر پڑ چکا تھا اور وہی اس کا آشیانہ تھا“

اس میں تو اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے، کہ عام بنادت کی آگ ملک میں پھیل چکی تھی اور میرٹھ وغیرہ چھاؤنیوں سے منتقل ہو کر دلی کو اپنی جہد و جہد کش کش کا مرکز جب لوگ بنا چکے تھے، تب کچھ دن بعد غلط فہمی کی ابتداء تھانہ بھون میں ہوئی۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ ادھپس جو کچھ بھی ہو رہا ہو، لیکن جس قصبہ میں بتایا جاتا ہے کہ سید نالامام البکیر نے عملی حصہ لیا تھا، ظہیر غدر کے کافی عرصہ کے بعد اس قصبہ کی ابتداء ہوئی۔ بہر حال مولانا عاشق الہی مرحوم کی تعداد کے مطابق ہوا یہ کہ تھانہ بھون کے ان ہی قاضی عنایت علی کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے، جن کا نام عبدالرحیم تھا۔ لکھا ہے کہ ریاست کے

بست دکشا و نظم و انتظام کا تعلق تو قاضی عنایت علی بڑے بھائی کے سپرد تھا اور قاضی عبدالرحیم چھوٹے بھائی، جن کو قاضی صاحب گریا بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ صرف امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اب کچھ میں نہیں آتا کراہیے زمانہ میں جب ملک میں عام بدمعاشی پھیلی ہوئی تھی، بقول مولوی عاشق الہی صاحب مرحوم

”باہم رعایا میں برسوں کی دینی ہونی عداوت نکلتے اور خدا ہاں نہ کسے کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا، جدھر دیکھو مار پیٹ اور جس محل پر نظر نبرد معرکہ آرائی و جنگ“

اس علاقہ روسکینڈ میں جب سرسید احمد خاں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ بجنور جہاں وہ حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی بجنور سے میرٹھ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن باہر قدم بھالنے کی سبت نہیں ہوتی تھی یہ مشکل بجنور سے ہلڈ ڈرنای مقام تک ڈپٹی رحمت خاں کی مصیبت میں پہنچ پائے۔ سات کو ہلڈور سے پیادہ پا میرٹھ کے ارادہ کر سکے کہ موضع پلانہ کی سرحد پر بقول مولانا حالی

”دو ہزار گنوار مسلح ان کے ٹوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادہ سے دھڑے“

سید صاحب کی زندگی باقی تھی، بخشی نامی ایک پدھان نے جاں بخشی کرائی، پلانہ سے گرتے پڑتے چاندپور پہنچے، چاندپور میں بھی

”کئی ہزار آدمیوں نے بند دقوں اور ہتھیاروں سے ان کو گھیر لیا“

یہاں بھی چاندپور کے رئیس میر صادق علی خاں فرشتہ رحمت بن کر آڑے آگئے اور سید صاحب کی جان بچ گئی۔ چاندپور پھر اؤں ہوتے ہوئے بہ ہزار خرابی افسانہ دخیزاں جس وقت میرٹھ تک پہنچے میں سید صاحب کا مایاب ہوئے تو مولوی حالی صاحب نے لکھا ہے کہ

”ان کے (سید صاحب) کے پاس چھ پیسے اور اس پچھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو

وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا، جہاں حیات جاوید

معرض حالات تو ایسے گندہ ہے تھے۔ لیکن قاضی عبدالرحیم قاضی عنایت علی خاں کے چھوٹے بھائی کو خدا ہی جانتا ہے ہاتھیوں کے خریدنے کا سودا مانع میں کیوں سمایا؟ سہارنپور ہی اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا، وہیں اس شوق کی تکمیل کا امکان تھا، مولانا عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے کہ ہاتھیوں کی خریداری کے شوق میں تھانہ بھون سے

”مع چند احباب کے سہارنپور گئے۔ اور مراٹے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے۔ یہاں تک تو واقعہ عام رنگ میں رہا۔ اب آگے تقدیر تدبیر کے جس پیچیدہ رنگ میں پیش ہوئی اور شرارہ کوہ آتش فشاں بن گیا، اس کی تفصیل سنئے، بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور کا یا تو غدر کے قصوں میں کوئی حصہ ہی نہ تھا، یا کچھ تھا بھی تو بات دہ دیا جی تھی، پنکھی صاحب نامی کوئی انگریز افسر بقول مولانا عاشق الہی

”باغیوں کی سرکوبی کے لئے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظاماً صلح سہارنپور میں معین کیا گیا تھا۔“ ص ۳۷

اتفاق کی بات کہ ایک بنیا جس کا نام تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن مولوی عاشق الہی صاحب کے ان الفاظ سے کہ سہارنپور میں وہی بنیا

”کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا۔“

قیاس یہی چاہتا ہے کہ سہارنپور کا باشندہ نہ تھا، اب خواہ تھانہ بھون کا ہو، یا تھانہ بھون کے قریب کسی جگہ کا، تھانہ بھون کے قاضیوں کے اس خاندان سے وہ صرف اتنے ہی نہ تھا بلکہ کسی وجہ سے وہ ان لوگوں سے کھنچا ہوا تھا، مولوی عاشق الہی نے جو یہ لکھا ہے کہ

”زمیندارانہ قصوں میں آدمی کے دشمن بہتر سے ہو جاتے ہیں۔“

اسی نوعیت کے کسی قصہ میں وہ قاضیوں کے اس خاندان کا دشمن بن گیا تھا۔ ایسے فتنہ اور فساد کے زمانہ میں تھانہ چھوڑ کر قاضی عبدالرحیم کا سہارنپور آنا اور یہ شہرت کہ ہاتھی خریدنے کے لئے آئے ہیں بات ہی ایسی تھی کہ انتقام کا مقصد موقوفہ نہیں ہو سکتا، جو اس نے خواہ اس نے آگیا ہے، پسند نہیں کیا۔

کوٹھی پر پہنچ گیا اور یہ گفتی ہوئی بات اس انگریز کے کان میں پھر تک دی کہ قاضی عبدالرحیم
تھانہ بھون سے

”دہلی کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سے سہارنپور آیا ہوا ہے۔“

بنیے کے ذریعہ یہ خبر شکھی صاحب تک پہنچی، نیز مولوی عاشق الہی صاحب کے حاشیہ
زائے بیان میں یہ فقرہ جو پایا جاتا ہے کہ

”ادھر دشمنوں نے گلی کو چوں میں اس افواہ کو پھیلایا۔“

جس کا بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کمک بھیجنے کے لئے قاضی عبدالرحیم تھانہ سے
سہارنپور ہاتھی کی خریداری کے سلسلہ میں آئے ہیں، یہ افواہ شہر میں عام طبع پر کسی نہ کسی طرح
پھیل گئی یا پھیلا دی گئی تھی۔ نتیجہ ان ساری باتوں کا جو ہو سکتا تھا وہ ہوا، لکھا ہے کہ شکھی صاحب
نے فوراً حکم دیا، اور

”ایک گاندہ سرائے روانہ کیا گیا، اور عبدالرحیم خاں سے ہمراہیاں بالزام بغاوت جیل خانہ

بھیج دیئے گئے۔“

کیونکہ شبہ نہیں کہ غلط ہو یا صحیح۔ لیکن واقعہ جس رنگ میں خود بنیے کے ذریعہ ادھر شہر کی افواہ کی راہ کو
شکھی تک پہنچا تھا، اس کے لحاظ سے اس حد تک شکھی کی کارروائی شاید چٹان قابل اعتراض نہ
ہو سکتی تھی، بقول مولوی عاشق الہی،

”زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا۔“

یہاں تک شکھی نے جو کچھ کیا تھا، کہا جاسکتا تھا کہ اس وقت کے لحاظ سے احتیاط کا تقاضا
بھی شاید ہی ہو سکتا تھا۔

لیکن بات اسی حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی، انگریزوں کا دماغ بوکھلایا ہوا تھا، اور حد
سے زیادہ اختیار بھی قدرۃ آدمی کو بد مست بنا دیتا ہے۔ شکھی نے جیل کے بعد نہ صبری سے
کام لیا اور نہ اصل واقعہ ہی کی تلاش و جستجو تفتیش و تحقیق کی زحمت کو ادا کی اور اگر یہ صحیح ہو جیسا کہ

مولانا عاشق الہی کے حاشیہ والے بیان میں ہے کہ بعد کو حکومت نے نیکی کے فیصلہ کو غلط ٹھہراتے ہوئے اقرار بھی کیا تھا کہ

”علی سے یہ حرکت سوزد ہو گئی“ ۱۷

جانتے ہیں حکومت کی یہ اعتراضی غلطی جس کا مرتکب حکومت کا نمائندہ نیکی صاحب ہوا، کیا تھی؟ بعد بے کسی و بے بسی ایک آدمی نہیں بلکہ قاضی عبدالرحیم ادران کے رفقا جو تھانہ سے ان کے ساتھ آئے تھے، مولوی عاشق الہی کی اطلاع ہے کہ اس

”ناکردہ گناہ جماعت کو بچانسی کا حکم ہو گیا“

ایک ایسا مجہول الحال بنیا جس کا نام آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ کیا تھا، کہاں کا تھا، کس رتبہ کا آدمی تھا اس کی خبر اور بازاری افواہ کی بنیاد پر یہی سوچنے کی بات ہے کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ ایک پوری امن پسند، آئینی زندگی بسر کرنے والی جماعت کو صرف قید و بند ہی کی سزا نہیں بلکہ سب کو کسی تحقیق و تلاش کے بغیر بچانسی پر چڑھا دینا اس کا کچھ خیال نہ کرنا کہ جن لوگوں کو بچانسی دی جا رہی ہے ان میں علاقہ کا ایک صاحب اقتدار رئیس بھی ہے، نیکی صاحب کا یہ بھرانہ اقدام، اہد قطعاً ظالمانہ فیصلہ قطع نظر اس سے کہ کتنا غیر مال اندیشانہ تھا، سوچنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے آئین اور دستور کی بے حرمتی اور رسوائی کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی تھی، غدر کا لفظ جس کا انقباض اور اطلاق اس زمانہ کے ہندوستانیوں کے طرز عمل پر کیا جاتا ہے۔ خدا جانے بولنے والوں کی غرض کیا ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ وہی قانونی اصطلاح ہے جو ہماری فقہ کی کتابوں میں مستعمل ہے تو مطلب اس کا جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں یہی ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے حکومت وقت سے یہ معاہدہ جو کیا تھا کہ اس کے نافذ کردہ آئین و دستور کی پابندی کریں گے اس معاہدہ کو توڑ کر غدر یعنی قانون شکنی کے لوگ مرتکب ہوئے تھے۔

اگر غدر کا یہی مطلب ہے، تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن

۱۸ پچھلے چند دنوں سے جیسے کہ شاید ذکر کر چکا ہوں، بشہرہ کے ہنگامہ کار ہندوستانیوں کی پہلی (دہائی اگلے صفر)

صلح سہارنپور میں غدر کے اس جرم کا مجرم انصاف سے بتایا جائے صحیح معنوں میں کون تھا؟ حکومت کے آئین کو کس نے توڑا۔ یقیناً پنکھی صاحب اس الزام کے ملزم ہیں اور ان کی وجہ سے ہم غدر کے اس الزام کو اس حکومت پر بھی قائم کر سکتے ہیں جس کی نمائندگی سہارنپور میں پنکھی صاحب کرتے تھے۔ آئندہ حوادث و واقعات کے جلد جلد رونما ہونے میں بظاہر پنکھی صاحب اور پنکھی کی آمریت اور اس کی غلامانہ اور ظالمانہ چہرہ دستیوں کو بھی دخل تھا۔ اور قرآن کی سورہ شوریٰ میں اہل ایمان کے امتیازی اوصاف کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے یعنی

اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا کلمہ مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی مشورہ سے تھا اور جو ہمارے دئیے ہوئے ہیں سے خرچ کرتے تھے۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ
وَامْرَهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَاَرْزَقْنَاهُمْ
مِمَّا يَنْفَقُونَ

آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم واقع ہوتا ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔

وَالَّذِينَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْمُبْغَىٰ هُمْ
يَنْتَصِفُوْنَ (پارہ ۲۵ سورہ شوریٰ رکوع ۳)

(گدشتہ صفحہ سے) جنگ آنا دیو وغیرہ کے عنافوں سے لوگ کرتے ملتے ہیں غدر کے لفظ کا مطلق اس واقعہ پر ان کے نزدیک درست نہیں ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ غدر کے لفظ کو بلی بھی دکھا جائے۔ جب بھی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غدر یعنی آئین شکنی کی ابتدا کس کی طرف سے ہوئی؟ باشندگان ہند کی طرف سے یا حکومت کی طرف سے؟ میرے احوال تفصیل کا یہ نہیں لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ کلا تو سوں میں چرئی لگائے اور دانت سے ان کو کٹرائے گا حکم حکومت کی طرف سے دیا گیا اور غلط ہو یا صحیح لیکن جن کو حکم دیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ان کے دین پر دھرم میں حرامہ دخل اندازی تھی۔ حاجت ان کا قانونی حق تھا۔ جس پر پھر دستور ماہ اس کے قلعہ بر خلاف گورنر جنرل نے احتجاج کرنے والے سپاہیوں میں سے بعضوں کو کچلانی اور بعضوں کو بھور دیا۔ خود کی سزا دے دی، بارک پور میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ میرٹھ میں بھی جو کچھ کیا گیا مارشل لا کے اعتبار سے بھی وہ درست نہ تھا۔ اسی طرح سہارنپور میں قاضی حیدر الرحیم اور ان کے رفقاء کا انوارہ پرتش بھی قطعاً قانونی شکنی اور غدر تھا۔ پس اگر غور کیا جائے تو غدر کی صورت ضرور پیش آئی، لیکن ہندوستان کے باشندوں کے بجائے غدر یعنی صابہ کی خلاف ورزی اندامیں شکنی کی ابتدا جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے حکومت ہی کی طرف سے ہوئی۔ پس غدر کا کیوں اٹھایا جائے۔ انکا اس کا کرنا چاہئے کہ ہم ہندوستان میں نے غدر نہیں کیا تھا اس جرم کی جرم خود حکومت تھی۔

اسی ایمانی اقتضائی تکمیل و تکمیل کے لئے کیا گیا تھا، جو کچھ کیا گیا تھا۔

بہر حال اس سلسلہ میں اس نقطہ نظر (انتصار) سے قدم اٹھانا بھی بہر حال واجبات شرعیہ میں سے ایک واجب تھا، جس کی پیروی سیدنا امام الکبیر (ادان) کے وختیاد اکابر سے اس موقع پر کی۔
 عہد ویشاق کے انتفاضوں سے لاپرواہ قطعاً لاپرواہ ہو کر توڑنے والوں نے آئین و دستور کو جو توڑا تھا، اور خود حکومت کے اعتراف و اقرار کے مطابق جو مجرم تھے۔ ان کے ساتھ چیرہ دستی اور زیادتی، یعنی دعدوان کا برتاؤ جو کیا گیا تھا، اس کے مقابلہ میں "انتصار" اور ادخواہی کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، یہاں کامیابی اور ناکامی کے لئے 'فتح و شکست' ہمارا اور جیت کے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ "انتصار" کے لئے یعنی اس حالت میں جو کھڑے ہو گئے وہ کامیاب تھے، اور جس حد تک اس باب میں جتنا زیادہ پیچھے رہ گیا، اسی حد تک سمجھنا چاہئے کہ وہ ناکام ہوا۔

(۳)

حکومت وقت اور اس کے نمائندے کے غدار اور عہد شکنی کے اس فعل کے بعد یعنی جو مجرم نہ تھے، صرف جرم کے مشابہ میں قطعاً خلاف آئین و دستور جن کو مجرم ٹھہرا کر موت کی آخری سزا جو کسی انسان کو کسی انسان کی طرف سے مل سکتی ہے دے دی گئی، اس یعنی کی انتصاری شکست جو سامنے آئیں، اب ان کی تفصیل سنئے، اس تفصیل میں دیکھنے کی چیز صرف یہی ہے کہ دینی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ ہونے میں ہر ہر قدم پر کن کن نزاکتوں اور دقیقہ سنجیوں سے کام لینے والوں نے کام لیا۔
 واقعہ یہ ہے کہ ناکردہ گنہگاروں کے اس "خون ناحق" کی خبر بہادر پور سے جب تھاہ بھون پہنچی اور معلوم ہوا کہ قاضی عبدالرحیم اودان کے ایک ایک رفیق کو پھانسی دے دی گئی تو جن کے اعزاء و اقربا مارے گئے تھے ان پر جو اثر چاہئے تھا وہ تو ہوا ہی۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ سائے نصیب ہی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لیکن قاضی عبدالرحیم کی اصد بے کسی، یہ خلاف توقع موت اور اچانک اس کی خبر جب قاضی عزایت علی بڑے بھائی، ریاست کے امیر کے کانوں میں پہنچی تو قبول مولانا عاشق الہی۔

”اس صدمہ۔۔۔ سے قاضی عسائت علی پر رنج و غم کے پہاڑ لڑاٹ پڑے۔“

ربا ست تو رہا ست زندگی بھی بھائی کے پھانسی پا جانے کے بعد ان پر وہ بھر ہو گئی اور ویسا کر کر کے بھی دکھا دیا، اب نہ رہا ست ہی کا خیال، ان کے دماغ میں تھا نہ جلان کی پروا اور نہ عزت و آبرو کا احساس ان میں باقی تھا۔ گویا جنون کی سی حالت ان پر طاری ہو گئی، مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ

”جیش حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہو گیا۔“

یہاں پہنچ کر مولانا عاشق الہی صاحب کا قلم خاص حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہے۔ بیان ان کا اتنا سچا ہے کہ واقعات کی کڑیوں کے ملائے میں کافی دشواری پیدا ہو گئی۔ تاہم جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اور دوسرے بیانات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے سب کو سامنے رکھنے کے بعد واقعہ کی صحیح ترتیب میرے نزدیک حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

یہ عرض کر چکا ہوں کہ شہداء کا ہنگامہ چند دنوں میں ختم نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ سال بھر کے تقریباً بارہ مہینوں تک کسی نہ کسی شکل میں اس کی آگ ملک کے مختلف گوشوں میں بلند ہوتی رہی، اور مرکزی مقامات دلی، لاہور میں تو کافی عرصہ تک مقابلہ و مقاتلہ کا باز نہ گرم رہا، صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ سہارنپور میں بے گناہوں کی پھانسی پانے کا واقعہ اس سال کے کس مہینہ میں پیش آیا۔ تاہم قرائن و قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ آغاز غلہ کے چند مہینوں کے بعد یہ صورت سہارنپور میں پیش آئی۔ خبر تھانہ بھون پہنچی۔ قاضی عسائت علی انتقام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی اور عددان کا معاملہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا، انتصار اور داد طلبی کہئے، یا انتقام کے لئے تھانہ بھون اور تھانہ بھون کے اطراف و جوار میں جو قصبات و قریں تھے۔ وہاں کے باشندوں کو بھی انہوں نے پکارا۔ نانوہہ بھی منجملہ دوسری بستیوں کے تھانہ بھون ہی کے نواح کی ایک اہم اور بڑی بستی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے نمائندے وہاں بھی پہنچے۔

اور نانوہہ و خیر تھانہ سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا مولانا صاحب نے اپنی

سیاسی یادداشت میں ”تھانہ بھون“ کی جس مجلس شوریٰ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابھی اس کا حال بیان کیا جائے گا۔ ہم اس مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ساتھ حضرت مولنا گنگوہی کو بھی پاتے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انتقام کا ارادہ جب پختہ ہو گیا تو گنگوہہ تک لوگ بھیجے گئے، اور جن جن سے انتقام کی اس ہم میں صحیح راہ نمائی کی توقع ہو سکتی تھی ان کو تھانہ طلب کیا گیا۔ ان دنوں بزرگوں کے مرشد برحق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو تھانہ وطن اور متفرق ہی تھا، ان کے سوا حضرت حافظ محمد صنا من شہید اور مولنا شیخ محمد تھانوی بھی تھانہ ہی میں موجود تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرحیم کے پھانسی پانے کے بعد تھانہ بھون کے رد عمل پر چونکہ حکومت کی نظر بھی تھی، احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا، اس لئے قاضی صاحب کی طرف سے جو انتصاری کہئے یا انتقامی کارروائیاں ہو رہی تھیں، ان کی خبر سب گوشہ نشینوں کے ذریعہ حکومت تک پہنچتی رہتی تھیں۔ شاید اسی زمانہ کی یہ بات ہے جس کا ذکر مولنا عاشق الہی نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر کیا ہے، کہ قاضی عنایت علی کے پاس

”کمپنی کی طرف سے پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آ جاؤ، اپنے بھائی کو صبر کرو غلطی سے یہ حرکت سر نہ ہو گئی ہے، اگر تم انتقام سے باز آ گئے، تو تم کو تھانہ کا نواب بنا دیا جائے گا“

مگر پیام کار گزار ثابت نہ ہوا، جو بلا لے گئے تھے۔ تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔

یہ بالکل ممکن تھا، کہ جمع ہونے کے بعد قاضی عنایت علی صاحب کی منشاء کے مطابق جیسے ہر جگہ بار دھاڑ اکھاڑ بچھاڑ کی اندھا دھند کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ تھانہ بھون میں اسی کو شروع کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ قرآن کی سند پر بالا آیت میں جہاں یعنی کے بعد انتقام کو ایمانی زندگی کا امتیازی وصف قرار دیا گیا ہے۔ وہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

وامرہم شعوریٰ بینہم | اور ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔

ایمانیوں کی شان ہے۔ مولنا طیب صاحب کی سیاسی یادداشت میں ہے کہ تھانہ میں بھی شوریٰ

قائم ہوئی،

”جس میں حضرت گنگوہی، اور دوسرے علماء شریک تھے“

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس مجلس میں

”باہم علمی گفتگو چھڑی“

سوال یہی تھا کہ واقعات جس رنگ میں پیش آچکے تھے، یعنی اپنے قانون کو توڑ کر حکومت اور حکومت کا نمائندہ قدر اور قانون شکنی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس بنی کے مقابلہ میں انصتار کے فرض کو محسوس کرتے ہوئے، جہاد و قتال پر آمادہ ہونے کا وقت کیا آگیا ہے؟ مولانا ضیہ صاحب نے لکھا ہے کہ

”اس موقع پر جہاد کے سب خلاف تھے، صرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مدعیاً طریقہ پر اس میں پیش پیش تھے“

تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر مولانا عاشق الہی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”سنایا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کا رد دانی سے منع کیا۔“

۱۲/۱

اس سے بھی مولانا طیب صاحب ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مطلب ان کا بھی یہی ہے کہ ابتداء میں اس قاہرہ حکومت کے خلاف بغیر مؤثر اسباب جہاد کیلئے کھڑے ہونے کو مجلس شور کے ارکان کی اکثریت نامناسب ہی قرار دیتی رہی۔ واللہ اعلم بالصواب مخالفت کرنے والوں کی طرف سے جو نقاط نظر پیش کئے گئے تھے، وہ کیا تھے۔ مولانا طیب صاحب نے اجمالاً بس اتنا لکھا ہے کہ،

”سب نے جو جہتیں خلاف میں پیش کیں، حضرت (نانوتوی) نے جو جس کے ساتھ سب کا مسکت جواب دیا“

میرے سامنے نہ مخالفت کرنے والوں کی جہتیں ہیں اور ان جہتوں کا جو مسکت جواب دیا گیا تھا،

اس کے علم سے بھی محروم ہوں۔ بظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ مخالفت کرنے والوں کے سامنے قوت و ضعف کا سوال ہوگا، مقابلہ میں ناکامی اور شکست کے سوا جیسا کہ ظاہر ہے اسباب کا افتضاء تھا، کسی دوسرے احتمال کی شکل ہی سے گنجائش پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ نبی کے بعد "انقصار" کو یوں کی مشان قرآن قرار دے چکا تھا۔ اس کا جواب خود ہی سوچنے کیلئے دیا جاسکتا تھا۔

بہر حال تھانہ بھون کی اس "مجلس شورائی" کے مکالمہ و مباحثہ میں جو کچھ بھی کیا گیا ہو، لیکن آخری نتیجہ سامنے ہی آیا، کہ جس بات کی دعوت دی گئی تھی اس سے اعراض و قعود کی کوئی وجہ و جہہ ارکان کی طرف سے پیش نہ ہو سکی۔ صرف مجلس کے ایک رکن حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی جو حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، اور سیدنا الامام الکبیر سے عمر میں بہت زیادہ بڑے تھے۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے، کہ انہوں نے آخری عذریہ پیش کیا، کہ

"اگر آپ کی جھنجھیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہو۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد میں کیا جائے؟"

سوال بالکل اسلامی روح کے عین مطابق تھا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، مشعرہ کے ہنگامہ میں اسی روح کا خیال کم کیا جاتا تھا۔ "ہو" کے ساتھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، کثرت جب تک وحدت کے نظام میں جکڑی نہیں جاتی۔ صحیح نتائج کی امید شکل ہی سے کی جاسکتی ہے دین اور دنیا کے سارے اجتماعی کاروبار میں اسلام کو اس اصول پر جتنا اصرار ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ نماز جو ظاہر ہے کہ بندے اللہ خدا کے دعائی و عبادتی تعلق کا مظہر ہے۔ لیکن اس میں بھی کثرت کو وحدت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے امام بنایا گیا ہے۔ سفوف بھی چند آدمی ساتھ ہوں تو حکم دیا گیا ہے کہ امامت امدارت کا نظم اس میں بھی قائم کر دیا جائے۔

حدیثوں میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ غیروں کے مقابلہ میں چاہئے کہ مسلمان کبیدہ واحدہ (ایک ہاتھ کی شکل میں) اپنے آپ کو پیش کریں، یا دیوار سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان کی

حیثیت اس دیوار کی اینٹوں کی ہی ہے جس میں ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا لے رہی ہو۔ بہر حال ”جہاد“ جیسے اہم اجتماعی اقدام کے لئے امارت و امانت کا مسئلہ بدیہی ہے۔ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ مولانا شیخ محمد صاحب کی نگرانی سے یہ سوال جو اٹھایا گیا تھا اس کا صحیح مقصد کیا تھا؟ جس لب و لہجہ میں ان کا بیان ہم تک پہنچا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ تھانوی غالباً یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ تھانہ بھون جیسے مقام میں اس شرط کی تکمیل آسان نہ ہوگی۔ بظاہر قاضی عنایت علی تھبہ کے رئیس بھی تھے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ سارا ہنگامہ ان ہی کے اختتامی بخش اور دعوت انتصار کی بنیاد پر مہیا ہوا تھا، میں صحیح طور پر ان کے شخصی حالات سے واقف نہیں ہوں، لیکن مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت سے محروم کر دینے کا فیصلہ قدرت جس زمانہ میں کر چکی تھی، اس زمانہ کے عام حالات کی بنیاد پر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ

”قاضی عنایت علی خان پسر نجابت علی خان رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون ضلع مظفرنگر“

کے الفاظ میں مولانا عاشق الہی صاحب اس زمانہ کی جس ہستی کو درویشناس کراتے ہوں، وہ رئیس اعظم زمیندار ہی ہو کر رہ گئے تھے، یا قاضی ہونے کے لئے بنی صفت اور خصوصیات کی ضرورت ہے، ان کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ عام حالت تو اس زمانہ کی یہی تھی کہ خاندان کی کسی پشت میں قاضی کا عہدہ جس کو بھی کبھی میسر آگیا تھا وہ خاندان قاضیوں کا خاندان بن جاتا تھا، گویا سید و شیخ ٹھان وغیرہ جیسے خاندانوں کے ساتھ ساتھ اس ملک میں قاضیوں کی بھی ایک نسل ہی پیدا ہو گئی تھی، اور سید شیخ کے الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کی اس نسل کے افراد اپنے نام کے آگے قاضی کے لفظ کے استعمال کو اپنا خاندانی حق تصور کرتے تھے۔ خواہ قصداً و اقرار سے ان کو دھکا بھی تعلق نہ ہو، اب چاہے دل چاہے لطیف ہو یا دل گداز سا نہ ہو چاہے ہے سمجھئے۔ مگر واقعہ کی صورت یہی ہو گئی تھی۔ گویا نچ یا ڈپٹی وغیرہ کی ملازمت چل کر نیچے بعد اس زمانہ میں، جنوں یا ڈپٹیوں کی نسل جیسی پیدا ہو جائے۔ کچھ اسی قسم کے مخالف کی شکل تھی۔ سرکاری عہدوں، اور مناصب کے پستی پر جانے کی مصیبت جس کا شکار منلی حکومت اپنے ایام سکرات میں ہو گئی تھی۔ شاید اس قسم کی بعضی نسلیں کے

پیدا کرنے میں اسی قطعاً غیر شرعی بلکہ غیر انسانی رواج کو زیادہ دخل تھا۔

کچھ بھی ہو، قیاس کا اقتضائے یہی ہے کہ قاضی عنایت علی صاحب میں شیخ تھا نوزی پارہے ہوں گے کہ امامت کی شرعی شروط نہیں پائی جاتیں۔ امام یا امیر ہو سکتے تھے تو وہی ہو سکتے تھے۔ خیال یہی ہو گا کہ شرط کے مفقود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مشروط یعنی جہاد کی ذریت کا مطالعہ بھی مفقود ہو جائیگا۔ مجلس شورائی کی اکثریت کی جبرائے غی وہی پاس ہو جائے گی، لیکن اچانک دکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر جواب میں فرما رہے ہیں کہ

”نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے“

گو یا ایسا معلوم ہو کہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک یہ مسئلہ سوچ بچار کا بھی مستحق نہ تھا، شاید لوگ سوچ ہی رہے ہوں گے کہ حضرت والا آخر کیا کہنا چاہتے ہیں اور اتنا دشوار مسئلہ اچانک اتنا سہل و آسان کیسے بن جائے گا کہ ان جانتا تھا کہ جس کے متعلق تصور بھی کسی کا گویا نہ ہو گا کہ جہاد کی ادارت قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیں گے، اس کی طرف ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے مناجارہا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں، ”مولنا طیب کی روایت کے الفاظ ہیں“

”حضرت مرشد برحق حاجی صاحب موجود ہیں، ان ہی کے ہاتھ پر رجعت جہاد کی جائے۔“

مسجد میر محمد صاحب کے حجرے میں بہنے والے ایک فقیر بے نوا، سیدنا و سیدنا اکل حضرت حاجی احمد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات مراد تھی۔ اس کے سوا کہ مجلس پر اس تجویز کے پیش کرنے کے ساتھ ہی منام چھا جائے اور دوسری صورت ہی کیا تھی، کس کی مجال تھی کہ امامت کی تمام شرطوں کو پورا کرنے والی شخصیت کا ملہ برقدار کی ہمت کرتا، کلام اور فقہ کی کتابوں میں امام کے لئے جو شرطیں ضروری قرار دی گئی ہیں، وہی نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ سختی اور ادنیٰ جسے کی حیثیت جن امور کو حاصل ہے۔ حاجی صاحب کا وجود باوجود سب ہی کا جامع تھا۔ مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اسی لئے

”سب ساکت ہو گئے اور مستفقہ طور پر سب نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔“

مولانا عاشق الہی مرحوم نے بھی تذکرۃ الرشید میں اسی واقعہ کا ذکر کرنا چاہا ہے، لیکن جس زمانہ میں اپنی کتاب وہ لکھ رہے تھے منظر ہر ہے کہ اتنے کھلے الفاظ میں واقعہ کا تذکرہ نہ کر سکتے تھے اور نہ ایسا کرنا مناسب تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ ”لوگ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزراں دشوار ہے اور یہ معروضہ پیش کیا کہ ”آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنی سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قصے جکا دیا کریں۔“

یہی مقام ہے، جہاں مولانا عاشق الہی کے پیرائے بیان میں تو یہ کارنگ پایا جاتا ہے، کہنا وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ حاجی صاحب کے دست مبارک پر جہاد کی بیعت کر کے کا ارادہ لوگوں نے پیش کیا اور اطلاع دیتے ہیں، کہ

”اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔“

مطلب وہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی تجویز پیش کی لوگ راضی ہو گئے اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تجویز کو قبول کر لیا، یوں وہ اس علاقہ کے مسلمانوں کے ”امیر المؤمنین“ اور دینی امام ہونے کے ساتھ ”سیاسی امام“ بھی بن گئے، گویا اکثر منتشرہ کو شرعی حکم کے تحت پہلے وعدت کا قالب امام و امیر کا انتخاب کر کے کیا گیا، اب سائے پر آگندہ افراد ایک شیرازے میں مسلک ہو گئے، اور قصہ صرف اسی سرسری تنظیم کی حد تک ختم نہیں کر دیا گیا، بلکہ مولانا طیب صاحب نے مولانا منصور انصاری کے حوالے سے سیدنا الامام الکبیر کے رفیق مولانا منیر صاحب کی زبانی جو روداد سنائی ہے، اس سے مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گویا جماعتی حیثیت جو ایک وحدانی جسد کے پیکر میں شکل پذیر ہو چکی تھی، چاہا گیا کہ اس کے

دعوتِ دمرؤسہ اعضاء کو متعین کر کے ہر ہر عضو کا خاص خاص وظیفہ بھی مقرر کر دیا جائے، سچ تو یہ ہے کہ کسی تنظیم کو مکمل کرنے کے لئے جو کچھ بھی اس وقت کرنا چاہئے تھا، سب کچھ کر لیا گیا تھا۔ مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

”حضرت اقدس مولنا حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مرکزِ بیعت جہاد تھے اور حضرت اقدس مولنا حافظ محمد صامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے علم بردار جہاد تھے، حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جامع مجاہدین تھے کہ وہ عقلمند پند و نصیحت و تربیت سے مجاہدین کو مختلف مواقعِ دیہات و قصبات سے جمع کر کے میدان میں لائیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ امیرِ عسکر تھے۔“

مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ کابل میں مولنا منصور انصاری مولنا محمد منیر صاحب کی اس روایت کو نقل کرتے ہوئے، اسلامی ممالک خصوصاً کابل کی عصری اصطلاحوں میں تنظیم کے ان ہی پہلوؤں کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے تھے یعنی حاجی صاحب قبلہ کی حیثیت تو خیر امیر المؤمنین کی تھی، ان کے سوا

”حضرت حافظ صامن شہید، امیر جہاد گویا صدر مجلس جنگ تھے، مولنا محمد قاسم صاحب امیر الافواج چیف کمانڈر مولنا محمد منیر صاحب مولنا نانوتوی کے یاد دہری، فوجی سرکیری حضرت مولنا گنگوہی وزیرِ یلام بندی تھے۔“

الغرض تھا نہ بھون میں جہاد کی اس انصاری ہم کے لئے شرعی تنظیم کے مطابق جو کچھ بھی کرنا چاہا تھا، وہ سب کچھ جب کر لیا گیا، اور گو قاضی عنایت علی صاحب کو کوئی خاص عہدہ تنظیم کی اس اجتماعی ہیئت میں نہیں دیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ علاقے کے وہ رئیس تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالی امداد کا بار زیادہ تر ان ہی پر ڈالا گیا ہو گا، اور جب اپنا سب کچھ اس ماہ میں قربان کرنے کیلئے وہ تیار ہو چکے تھے، تو کوئی وجہ تھی کہ اس ذمہ داری کو بخوشی وہ قبول نہ کرتے، مجاہدوں کے طعام و قیام آلاتِ حرب کی فراہمی، اور ازین قبیل دوسرے جہادی مصارف کے حکفل جہاں تک میں سمجھتا ہوں،

تھانہ بھون کی اس بھم میں قاضی عنایت علی ہی کو ہونا چاہئے تھا، اگرچہ اس باب میں کوئی صریح شہادت مجھے نہیں مل سکی ہے۔

خیر جہاد کی شرعی تنظیم کا مسئلہ تو طے ہو گیا، لیکن شرکت جہاد کے بعض ذہنی شرائط کی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا، مطلب یہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ والدین یا ان میں کوئی ایک اگر زندہ ہو تو ان سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت بھی شرعاً ضروری ہے۔ فقہیہما اجماعاً ان دونوں یعنی والدین کی خدمت گزاری میں جہاد کرو، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کو حکم دیا تھا، جن کے والدین زندہ تھے، اور جہاد میں شریک ہوئے، ان کو دوبار نبوت میں پیش کی تھی۔

اس باب میں نہ اردوں کا حال ہی مجھے معلوم ہے، اور نہ اس کتاب میں ان کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ اس شرعی شرط کی تکمیل میں جو صدیت پیش آئی، مختلف یادداشتوں میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرعی تنظیم کے بعد جب طے ہو گیا کہ مذم کا بازار گرم ہو کر رہے گا اور ظلم کرنے والوں سے بدلہ بہر حال لیا جائے گا، تو سیدنا الامام الکبیر جن کے والدین اس زمانہ تک زندہ تھے، آپ کے دل میں یہ دینی تقاضا پیدا ہوا کہ والدین سے اجازت کے مرحلہ کو بھی طے کر لیا جائے اسی تقاضے کے زیر اثر تھانہ سے آپ نانوتہ تشریف فرما ہوئے۔ مولوی طاہر صاحب سلمہ نے اپنی یادداشت میں اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ،

”شعبہ میں جب اس پر اتفاق ہو گیا کہ اس وقت جہاد فرض ہے، تو حضرت اپنے مکان (نانوتہ) تشریف لے گئے، چونکہ اپنی والدہ کے بہت ہی مطیع اور فرماں بردار تھے، روزانہ دونوں وقت پاؤں دبانان کا معمول تھا۔“

اس معمول کے مطابق ابھی بھی جیسا کہ آگے بیان کیا گیا ہے،

”اپنی والدہ ماجدہ کے پاؤں دباتے ہوئے (ماں کو مخاطب کر کے) فرماتے لگے کہ خدا کی

راہ میں جان اندمال کو فدا کر دینا ایسا ہے، اور جو خوشی سے اپنی جان خدا کے حوالہ کر دیتا ہے، اس کا ایسا درجہ ہے وغیرہ۔“

مطلب یہ ہے کہ اظہار دعا سے پہلے جہادِ ادراہ حق کی جان فزوشیوں، قربانیوں کے شعلے قرآن و حدیث میں جو فضائل بیان کئے گئے ہیں، پہلے اپنی اہل جان رحمۃ اللہ علیہا کو بچھاتے ہیں، روایت میں اس کے بعد ہے کہ

”اس قسم کی پر اثر تہذیب بیان کر کے عرض کیا کہ جہاد فرض ہو چکا ہے۔“

اس سے مطلع کرنے کے بعد اپنے عزمِ ماسخ کا اظہار والدہ ماجدہ کی خدمت میں یاس الفاظ فرماتے گئے کہ دین کا

”یہ مسئلہ ہے کہ اطاعتِ خالق میں والدین کی اطاعت اگر معارض ہو تو وہ ساقط ہو جاتی ہے۔“ مقصد مبارک یہی تھا کہ والدین کو میری ذاتی خدمات کی ضرورت نہیں، نہ ذاتی خدمات کی حاجت تھی، نہ مالی امداد کی، ایسی صورت میں خدائی مطالبہ کی تعمیل میں بلاوجہ رکاوٹ اگر والدین کی طرف سے بھی ڈالی جائے گی تو شرعاً اس قسم کی بے بنیاد رکاوٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ والدہ ماجدہ سے یہ بھی فرمایا کہ

”میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دیں، تاکہ آپ کو بھی اجر ملے۔“

حافظ محمد احمد صاحب نے ان الفاظ کے بعد نہایت کوجس پیرایہ میں ادا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی تفصیل براہِ راست اپنے والد ماجد سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی تھی، حافظ صاحب مرحوم کا بیان ہے،

”چنانچہ خود (سیدنا الامام الکبیر) فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ بڑی سمجھدار تھیں، فرماتے

لگیں کہ بھائی تم اللہ ہی کی چیز ہو، میں خوشی سے تمہیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔“

اٹھاسی کے ساتھ ایمان و یقین کے گھرنے کی اس پروردہ نشین خاتون نے اپنے اکھوتے جوان

بیٹے کو خطاب کر کے بھی فرمایا کہ

”اگر تم زندہ آگے تو میں تم سے مل لوں گی، نہیں تو آخرت میں انشاء اللہ تعالیٰ جا رہی

ملنا ہو گا“

عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ بی بی حبیبہ رحمۃ اللہ علیہا کو کتابی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا، جو کچھ بھی علم و معرفت کی روشنی ان کے اندر تھی، اپنے بزرگوں اور ماحول کی پیداوار تھی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، سکینٹ کی اس خشکی اور طمانیت کی اس ٹھنڈک کو کہ مشاہدہ الٰہی زندگی اور مرے کے بعد آنے والی ایمانی زندگی، دونوں کی حیثیت میں بال برابر فرق ان کے احساس میں نہیں پایا جاتا، ایسا معجزہ ہوتا ہے کہ ان نیک دل مومنہ خاتون کی نظر میں شہادت و غیب دونوں ایک ہیں، سب سے زیادہ حیرت تو مجھے اس فقرے کے لفظ ”جلد ہی“ پر ہے، جس کی یافت باسانی بڑے بڑے صاحب علم و بصیرت کیلئے بھی دشوار ہے۔ عام خیال قیامت اور آخرت کے متعلق تاخیر اندہ دہائی ہی کا ہے۔ کون جائے کہ کروڑوں برس بعد آخرت کا میدان سامنے آئے گا، یا لاکھوں برس بعد۔ لیکن یہ تاخیر اندہ دہائی صرف ان ہی لوگوں کے لئے ہے، جنہوں نے اب تک سمجھا ہی نہیں ہے کہ تاخیر اور دہائی کا موصوف یعنی خود زمانہ کی اصل حقیقت کیا ہے۔ لیکن

لے جنہوں نے قدیم یا جدید فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، ممکن ہے ان کے لئے یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہو، لیکن تھوڑی بہت بھی نظر فلسفہ میں جو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زمانہ جو عام کے نزدیک سب سے زیادہ سمجھی برہمی چیز ہے، لیکن کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کے سامنے زمانہ کا مسلحہ آیا تو سورج بیکار کے بعد اس کو اطلاع کرنا پڑا کہ اس سے زیادہ غریب فی السعریہ کوئی حقیقت مجھے معلوم نہیں ہوتی۔ یعنی جتنا زیادہ سوچے اسی قدر وہ چیتاں بنتی چلی جاتی ہے۔ زمانہ یعنی سال و ماہ اور گھنٹے منٹ دقیقے پر جسے ہم تقسیم کرتے ہیں، خدا سوچے تو یہی کہ عاں میں سے کسی عاصہ کا اس سے تعلق ہے میں پوچھتا ہوں کہ جو یہاں جمعرات کے دن کی شفا نوعیت کیا ہے، کیا وہ کوئی دھنیں لال ہلی چیز ہے جسے ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا چھوکر چمک کر، سونگھ کر، سی کر ہم نے ان کو مانا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں کے مسا اس کا جواب اندک یا ہو سکتا ہے، پھر زمانہ کے جاننے کا دعویٰ آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی زمانہ کو ہم اپنی مذہبی سلوٹ میں شمار کرتے ہیں، اصل پر جو کہ زمانہ کی حقیقت جب تک واضح نہ ہو، زیادہ سویر یا تاخیر و تعجل کو متعلق ہلے احساں کی بنیاد صحیح واقعہ پر قائم نہ ہوگی، فیصلہ کیلئے مسئلہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، ممکن ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے نظریات کو سلسلے میں کتاب کے دوسرے حصہ تک یہ بحث

مجھے سمجھائے بغیر ان کے قلبِ مؤمن کا فیصلہ تھا کہ آخرت والی یہ گھڑی جلد ہی آئے والی ہے۔
 بہر حال جلد ہی کے اس لفظ کو ان جیسی مومنہ غافلہ کی زبان کا شعری لفظ سمجھئے یا غیر شعری، لیکن اپنے
 اکھوتے تحت جگر کو بغیر کسی جزع فزع کے خندہ چینی کے ساتھ رخصت کر دینا، یقیناً کوئی معمولی واقعہ
 نہیں ہے۔ بالیک شاعر رمان کا تخیل خدا جانے اسکو کس پیریز میں ادا کرتا۔

سیدنا الامام الکبیر کے بے ماں ہی کا مرحلہ سب سے بڑا مرحلہ تھا۔ لیکن آسان کر بے درے
 نے اس کو آسان بنا دیا۔ ان کے بعد دوسری منزل پدمہربان شیخ اسد علی صاحب مرحوم کی اجازت
 کی تھی، مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں ہے

”اس کے بعد (یعنی والدہ ماجدہ کی رضامندی حاصل کر لینے کے بعد) حضرت (نافوئی)
 اپنے والد کے پاس تشریف لے گئے۔“

آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب جیسا کہ مولوی طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ
 ”نافوئی میں ہمارا جو جدی مکان ہے، اس میں ایک چوترو بھی تھا اور حضرت مرحوم (نافوئی) کے
 والد مغفور چوترو پر کھڑے تھے۔“

غالباً اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر کے عزم اور والدہ کی خبر شیخ اسد علی صاحب کو نہ تھی، جہاں وہ کھڑے
 تھے، وہیں پہنچ کر بیان کیا گیا ہے کہ

”نہایت عاجزی اور نرمی کے ساتھ اپنے والد سے اس عزم کو ظاہر کیا۔“

شیخ اسد علی صاحب آپ کے والد ماجد جس دنگ کے آدمی تھے، اس پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں،
 مولوی طاہر صاحب نے اس موقع پر لکھا ہے کہ

”ہمارے پردادا (شیخ اسد علی صاحب) چونکہ پڑھے لکھے زیادہ نہ تھے، اس لئے

۱۔ ہمارے وطن ہندوستان کی مقامی روایات کا مجموعہ جو رمان کے نام سے مشہور ہے۔ بالیک اسی کتاب
 کے مصنف کا نام ہے، رام چند برہی روایت کے پیروانی مان کو مشلیا سے بن باس ہونے کے لئے جس
 وقت اجازت طلب ہوئے ہیں، ادرمان سے بیٹا جس وقت رخصت ہوئے لگا ہے۔ شاعر نے اس واقعہ کو جتنے ناک
 تعمیر میں ادا کیا ہے۔ ان کی طرف میرا اشارہ ہے۔ ۱۲

انہوں نے اکھڑنا ہوا جواب اس طرح دیا کہ حضرت کی والدہ سے کہا کہ ذرا میری پگڑی
لے آؤ، وہ لے آئیں، اسے باندھا۔

جہادی ہم میں اجازت طلبی کی درخواست کے جواب میں شیخ صاحب کا یہ طرز عمل یعنی پگڑی کا منگوانا
اور اس کو باندھنا، ظاہر ہے کہ کچھ عجیب سی بات تھی، لکھا ہے کہ بجائے ہاں، نہیں کے شیخ صاحب کے
اس طرز کو دیکھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا

”باداجی! یہ کیوں باندھ رہے ہیں“

تب اپنے دل کی کیفیت کا اظہار شیخ صاحب نے ان الفاظ میں کیا کہ
”تیرے ساتھ سرکٹانے آخر جاؤں گا بھی“

مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ اپنے والد ماجد کی زبان سے یہ سن کر سیدنا الامام الکبیر نے
والد کو مخاطب کرتے ہوئے،

”کسی قدر آواز سے یہ فرمایا کہ آپ میری وجہ سے کیوں سرکٹاتے ہیں۔ اگر آپ کو سرکٹانا
ہے تو اللہ کے لئے کٹائیے اور میرے ساتھ چلئے“

مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں روایت سوال و جواب کے ان ہی الفاظ پر مشتمل ہے، اسی
کے ساتھ مولانا طیب صاحب کی یادداشت کی اطلاع کو بھی جب ہم پیش نظر رکھ لیتے ہیں،
یعنی انہوں نے والد کی اجازت طلبی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”حاضری جہاد کی اجازت دینے میں کسی مد تک حضرت کے والد ماجد نے پس پیش
کیا تھا“ (محلہ مقالہ۔ حضرت نانوتوی کا جوش جہادی) ●

اس سے ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ پگڑی طلب کر کے باندھنے اور اپنے سرکٹانے کا ذکر شیخ
اسد علی صاحب نے جو فرمایا تھا، غالباً ب دلچسپی میں ان کے طنز کی آمیزش تھی۔ یا ایک خیال یہ
بھی ہے کہ حکومت قائمہ مسئلہ افرنجیہ کی دار و گیر کے اندیشہ کو شیخ صاحب نے اس طریقہ سے
ظاہر کیا۔ گویا بیٹے کو سمجھانے لگے کہ تیری وجہ سے میں پھانسی کے تختے پر چڑھایا جاؤں گا۔ قبل

اس کے کہ حکومت مجھے پکڑے، پگڑی باندھ کر خود پھانسی پر چڑھنے اور گردن کٹانے پر طنز پر ہنس میں اپنی آمادگی وہ ظاہر کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ جس چیز کی اجازت ان سے چاہی جا رہی تھی اس سے دو راضی نہ تھے۔ سیدنا امام الکبیر کا یہ فرمانا کہ میرے لئے سر کیوں کٹائیے۔ اشد کیلئے کٹائیے، اور میرے ساتھ چلئے " اس سے کچھ یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔

بہر حال حاصل رہی ہے۔ جیسا کہ مولوی طیب حسنی لکھا ہے کہ اجازت دینے میں آپ کے والد حسنی پس و پیش سے کام لیا اور قبول ان ہی کے اس وقت

حضرت نے کلا طاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق (یعنی خدا کی نافرمانی کا جہاں اندیشہ ہو) وہاں مخلوق کی فرمان برداری کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ شریعت کے اس عام دستور پر عمل فرمایا۔ " ص ۱۸ مقالہ مذکور

اس اجمال کی تفصیل مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں یہ ہے کہ والد سے مذکورہ بالا گفتگو فرمانے کے بعد سیدنا امام الکبیر ان ہی سے یہ کہتے ہوئے کہ

"بندہ رخصت ہوتا ہے"

"السلام علیکم" کے ساتھ اپنے والد ماجد کے سامنے سے رخصت ہو گئے، جس سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد سے اجازت طلبی اور رضا مندی میں آپ کا ایاب نہ ہو سکے لیکن لا نا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

"مگر پھر والد بھی راضی ہو گئے۔"

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ شیخ اسد علی نے شروع میں اپنے جس خیال یا احساس کا اظہار کیا، شاید وہ فوری جذبات کا نتیجہ تھا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے جب تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر کے کا موقع ان کو ملا، خصوصاً بیوی سے ملنے کے بعد جب ان کو معلوم ہوا ہو گا کہ باوجود عورت ہونے کے جب خوشی سے بیٹے کو الٹکی راہ میں سر فرشی کی اجازت دے چکی ہیں، تو مرد ہونے کا اقتضا جو کچھ ہونا چاہئے تھا، اس سے ان کا متاثر ہونا بعید نہیں ہے۔ اسی لئے مولوی طاہر صاحب نے واقعہ کی

توجیہ کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ ”میرے پردادا صاحب زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے“ گویا اجازت دینے میں پس و پیش کرنے کی وجہ مولوی طاہر صاحب کے نزدیک کم علمی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ شیخ صاحب کی تعلیمی و عملی زندگی کا ذکر کر چکا ہوں۔ کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اپنی اہلیہ محترمہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کے مقابلہ میں ان کی تعلیمی سطح بلند اور بہت زیادہ بلند تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی توفیق کا تعلق بجائے علم کے ایمان سے ہے، اور اس موقع پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عورت کا ایمان مرد سے زیادہ دینی ثابت ہوا اور یہ خدا کی دین ہے یقیناً من یشاکو

خیر جس طرح بھی ہو، آگے پیچھے والدین کی رضا مندی کا قصہ ختم ہوا، اور سیدنا الامام الکبیر نانوتہ کی اپنے ”جہادی مرکز“ مستقر تھانہ بھون پہنچ گئے۔

اس کے بعد واقعات جس رنگ میں پیش آئے، ان کی کوئی تفصیلی روداد میرے پاس نہیں ہے۔ تاہم جنتہ جنتہ مختلف دشمنی میں جو چیزیں ملی ہیں، ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کروں گا۔

اس واقعہ کا ذکر مولانا عاشق الہی صاحب نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں کیا ہے۔ واقعہ کی ابتدا مولوی صاحب کے بیان

تھانہ بھون کے مستقر سے پہلا حملہ باغ شیر علی کی سڑک پر

کے مطابق یوں ہوئی کہ انگریزی فوج کے

”چند فوجی سوار کباروں کے کندھوں پر کار تو سوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے۔“

یہ وہی زمانہ ہے کہ جہاد کا مسئلہ تھانہ بھون میں تمام منزلوں سے گزر کر فیصلہ کی آخری صورت اختیار کر چکا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی فوج کے سوار جنگی ذخیرے یعنی کار تو سوں کو لئے ہوئے سہارنپور سے کیرانہ جا رہے تھے۔

یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ جس کی طرف مجاہدوں کی توجہ کا منعطف ہو جانا ایک قدرتی بات تھی، اور

کون کہہ سکتا ہے کہ قریش کے تجارتنی قافلہ پر چودہ حقیقت جٹی سرمایہ کے ساتھ شام سے واپس ہو رہا تھا، اس قافلہ کو ردک لینے کا ارادہ تیرہ سو سال پیشتر کیا گیا تھا، اسلامی تاریخ کے مرقع کی اسی تصویر کی جھلک تھانہ بھون کے مجاہدوں کے سامنے نہ آئی ہوگی، کچھ بھی ہو، موقعہ کو منقسم خیال کر کے قاضی عنایت علی (رئیس تھانہ بھون) کی سرکردگی میں ایک سریہ روانہ کر دیا گیا مولوی عاشق الہی صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ قاضی صاحب

”اپنے چند رفقاء اور رعایا کو ساتھ لیکر شیر علی کے باغ کی سمت کی شرک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گزے ان کا اسباب لوٹ لیا۔“

صرف اسباب ہی نہیں بلکہ آگے وہی جو یہ لکھتے ہیں کہ ”ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر سمت مشرق جنگل کو بھاگا، مگر تھوٹے ٹھکانے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔“ جڑی بر حاشیہ تذکرہ۔

اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسباب کے ساتھ اسباب واسے اور اسباب کے سائے محافظ بھی کام آئے، صرف ایک سوار بھاگنے میں کامیاب ہو سکا لیکن وہ بھی بالآخر گھوڑے سے گر کر لقمہ اجل ہوا۔

تھانہ بھون کے مجاہدوں کی یہ پہلی حربی کامیابی تھی۔ نفوس ہے کہ مولوی صاحب نے قاضی عنایت علی کے ”رفقاء“ کے ناموں کی نشاندہی نہیں کی۔ اسی لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ سیدنا امام اکبر بھی اس پہلی جھڑپ میں بنفس نفیس شریک تھے یا نہ تھے۔ رجحان تو قلب کا اسی طرف ہے کہ اس ”مقدس جنگ“ کی بسم اللہ کی شرکت کی سعادت سے حق تعالیٰ نے ان کو محروم نہ رکھا ہوگا۔

مولوی عاشق الہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ شیر علی کی شرک کی یہی ہم اس مشہور واقعہ کی تہید بن گئی، جس نے ”جہاد

جنگ شامی

تھانہ بھون“ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ یہ لکھتے ہوئے کہ

”اس فساد (یعنی باغ شیر علی کی شرک والے فساد) کی خبر منظر نگار (مستقر ضلع) پہنچی تو

حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا۔

مولانا عاشق الہی نے یہ اطلاع دی ہے کہ حکومت کے اس ارادے سے یعنی تھانہ بھون پر فوج کشی کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس کی خبر جب تھانہ بھون پہنچی اور اسی کے ساتھ ششالی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی چھوٹی خبر پا کر (تھانہ بھون میں) تقارہ بجا دیا گیا اور جتھے کا جھٹا شالی پر چڑھ دوڑا اور کیا جو کچھ کیا۔

شالی جو آج کل سہارنپور سے دلی شاہد رہ جانے والی چھوٹی لائن کا ایک اسٹیشن ہے اور شہید مردم خیر قصبہ کا نہ ہلہ کے قریب ہے، اس قصبہ میں ایک چھوٹی سی گڑھی بھی تھی جو شاید کسی کسی شکل میں آج بھی موجود ہو، تھانہ بھون کے مجاہدوں نے اس گڑھی پر حملہ کیا اور اس کو فتح کیا، اتنی بات تو حد تو اتر تک پہنچی ہوئی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اس نہم میں سیدنا الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہا بھی براہ راست شریک تھے۔ لیکن اس واقعہ کی تفصیلات کیا ہیں؟ مولانا عاشق الہی صاحب کا بیان تو حد سے زیادہ محل ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں، ان کو میں پیش کر دیتا ہوں۔

مکن ہے کہ شالی کی گڑھی پر حملہ کرنے کی ایک وجہ وہ بھی ہو، جو مولانا عاشق الہی نے بیان کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے اس سے بھی زیادہ گہرے اسباب کا سراغ ملتا ہے۔ اس نے اسی چھادی سیلہ میں ارتام فرماتے ہوئے کہ ”حضرت (نانوتوی) کے شاگرد خاص نواب محی الدین خان مراد آبادی کے والد ماجد نواب شہر علی خان، حضرت (نانوتوی) کے معتقد اور بادشاہ دہلی کے مصاحب خاص اور محترم علیہ تھے۔“

بادشاہ دہلی سے مراد ابو ظفر سراج الدین خادم السلاطین الغلیہ ہیں، نواب شہر علی خان مراد آبادی کے مشہور رئیسوں اور بڑے تعلقہ داروں میں شمار دیتے تھے۔ عزت و جہاد کے جس مرتبہ پر تھے اس کے لحاظ سے شاہی دربار سے ان کا تعلق محل تعجب نہیں ہو سکتا۔ نواب شہر علی مراد آبادی

اور سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا عقیدت مندانہ تعلق کے ذکر کے بعد مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ :

”حضرت (نانوتوی) نے ان کی (یعنی نواب شہر علی) کی معرفت بادشاہ دہلی کو جہاد اور استخلاص وطن و ملت کی جنگ پر آمادہ فرمایا“

یہ بھی مولانا طیب صاحب ہی کا بیان ہے۔ کہ

”غرض یہ تھی کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دلی کو انگریزوں سے پاک کرنے کی سعی کریں، اور ہم تھانہ بیھون اندیش ملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر صحیح اصول پر دوطرف سے یہ حملہ اور دفاع عمل میں لے آیا گیا تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے“

کن ذرائع سے اپنی اس روایت میں مولانا طیب صاحب مستفید ہوئے ہیں، سردست میں نہیں بتا سکتا

۱۵۱۱ء حقر نے یہ واقعہ مولانا منصر، مولانا محمد میاں صاحب مرحوم، مہاجر کابل درویش خاص سیاسی حضرت شیخ الہند اور اشرف مرقہ سے کابل میں سنا اور قلب بند کیا۔ مولانا مرحوم احقر کے حقیقی چچو بی زاد بھائی اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے قریبی تھے۔ تحریکات آزادی ملک و ملت کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند کے خاص صاحب ہنر اور معتد علیہ تھے۔ انہوں نے جہاد تھانہ بیھون کے سلسلہ میں بہت سے مفصل واقعات روایت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی مرحوم سے بیان کئے، جو انہوں نے مولانا محمد منیر صاحب سے خود بلا واسطہ سنے۔ غالباً اس سے پہلے کسی مرقہ پر تذکرہ آچکا ہے کہ مولانا محمد منیر صاحب حضرت نانوتوی کے قریبی عزیز اہل امان کے فدائی تھے۔ حضرت حاجی احمد اللہ قدس سرہ نے بحیثیت امام جہاد اُن ہی کو حضرت نانوتوی کے ساتھ لگا دیا تھا کہ وہ ان کی حفاظت اور نگرانی کرتے رہیں۔ کیونکہ حضرت نانوتوی اپنی قلبی شجاعت اور جوش جہاد میں جا بجا بے دھڑک صفوف میں گھس جاتے تھے اور اپنی جان کی کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ اسی خاص حیثیت کی بنا پر مولانا محمد منیر صاحب کو حضرت نانوتوی کے جہاد کے واقعات بہت محفوظ تھے جو چشم دید تھے اور بہت سے ایسے واقعات ان کی روایت سے بھائی صاحب مرحوم سے میں نے سنے جو اردوں سے کہتے ہیں کہ میں نے ان تمام واقعات کی ایک تفصیلی روداد قلمبند کرتی تھی، لیکن واپسی کابل کے وقت میسر نہ ہوا کہ وہ یہ بیان کر سکے۔ اس لئے یہ یادداشت بھائی صاحب مرحوم کے پاس امانت چھوڑ دی گئی کہ وہ کسی مناسب موقع پر بھیج دیں۔ لیکن ہندوستان کی آزادی سے تقریباً چھ ماہ پیشتر ان کا وصال ہو گیا اور موجودہ حکومت ہند کے بعض ذمہ داروں نے جب کہ یہ ارادہ کر لیا تھا کہ باقی اگلے صفحوں

لیکن بہر حال وہ صاحبِ الہیت ہیں، اور ان لوگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، بلکہ ان ہی لوگوں میں مجھے پالنے گئے۔ سن شور و تیرہ تک پہنچے۔ جو سیدنا امام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے براہِ راست صحبت یافتہ اور آپ کے حالات و واقعات کے امین تھے۔

میرا خیال یہ ہے، کہ تھانہ بھون میں تنظیمِ جہاد کے شرائط کی تکمیل کے بعد سیدنا امام الکبیر نے فریبِ شیر علی مراد آبادی کو اس ہم پر آمادہ فرمایا کہ بادشاہ کو وہ تیار کر دیں۔ اور ادھر تھانہ بھون کے ارادہ کیا گیا کہ اقامت کرنے ہوئے، شاد دہ کی راہ سے دہلی پایہ تخت پہنچ جائیں۔ حملہ کے لئے شامی کا انتخاب جہاں دو سرے درجہ سے کیا گیا تھا، منجملہ ان کے ایک بڑی اہم وجہ یہ بھی تھی۔

”ہم تھانہ بھون اور شامی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں“

مولانا طیب کی یادداشت کے اس فقرے کا یہی کھلا ہوا اقتضار ہے۔

باقی مولانا عاشق الہی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ شامی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر یا کہ تھانہ بھون میں نغارہ جنگ بجا دیا گیا۔ اس میں جھوٹی کے لفظ کا صحیح مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ جس وقت شامی کی گڑھی پر تھانہ بھون کے مجاہدوں پر حملہ کیا گیا۔ عام شہود بلکہ متواتر بات ہے، کہ اس وقت انگریزی فوج کے سپاہی اس گڑھی میں قلعہ بند تھے۔ پھر شامی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی خبر کو جھوٹی قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ ہاں اگر یہ مراد ہو، کہ شامی کی گڑھی میں انگریزوں کی فوج جو رہتی تھی۔ یا اس زمانہ میں متعین کی جا چکی تھی۔ اس کے سوا بھی انگریزوں نے تھانہ پر حملہ کرنے کے لئے مزید فوج شامی کی طرف روانہ کی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ خبر جھوٹی ہو۔

(گزشتہ صفحہ سے) اس قسم کی منظر نامہ جلا وطنی کی زندگی گزارنے والوں کو (جو رمانیہ کی جابرانہ پالیسی کا شکار تھے) ہندوستان بلایا جائے، مرحوم اس سے پیشتر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے جن سے وہ یادداشت بھی تقریباً لاپتہ ہو گئی، چند چند جہتہ جہتہ واقعات جو احقر کے حافظہ میں محفوظہ گئے تھے۔ ہندوستان پہنچ کر انہیں قلعہ بند کر لیا گیا تھا جعفر معنف سوانح نے جہادی قتلہ کے ہم سے اسی یادداشت کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ میں نے اس یادداشت کا سلسلہ اس انداز سے تفصیل سے نقل کر دیا کہ آئندہ حوالہ دینا اس کی سہولت نظر ہے۔ محمد طیب غفرلہ

بہر حال ابتدائی اسباب کے لحاظ سے اگرچہ تھانہ بھون کی یہ جہادی تحریک جیسا کہ عرض کر چکی
ہوں، انتصار اور انتقام کی ایک مقامی تحریک تھی، حکومت نے ملک کے باشندوں سے جو آئینی
معاہدہ کیا تھا، اس معاہدہ کو توڑ کر وہ عہد شکنی اور غدور کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسی چیز نے اس
علاقے کے باشندوں کو انتصار و انتقام کے قرآنی حکم کی تعمیل پر آمادہ کیا تھا۔ اسی طرح جیسا کہ
آئندہ معلوم ہوگا، اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے بھی اس تحریک کا دائرہ جیسا کہ خدا کی مشیت تھی
زیادہ وسعت حاصل نہ کر سکا، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ سپہ نالامام الکبیر نے نواب شہر علی صاحب
مراد آبادی کے توسط سے اس تحریک کا ربط ہندوستان کے موہنٹی حکمران سراج الدین بہادر شاہ
سے قائم کر دیا تھا، تو شالی کی گڑھی پر تھانہ بھون کے مجاہدوں کا حلقہ یہی سمجھنا چاہئے کہ شالی
کی گڑھی پر نہ تھا۔ بلکہ یہ اقدام درحقیقت پایہ تخت دلی تک پہنچنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اسی حقیقت
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے اپنی جہادی یادداشت میں لکھا ہے کہ
”سرفروشان دین سردوں کو بتھیلیوں پر لیکر ایک متظم طاقت سے ٹکرانے کیلئے گھروں
سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شالی کی طرف مارچ شروع کیا، جس کا
نصب العین دہلی تھا۔“ ص ۷۷ مقالہ جہادی

ظاہر ہے کہ ایسی صورت بجلئے مقامی ہونے کے ایک ہندو گیر تحریک کا قالب تھانہ بھون کا جہاد
اختیار کر لیتا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن غیر معمولی، اولوالایہدی والابصار شخصیتوں کے مبارک
ہاتھوں میں تھانہ کی جنگی ہم کی باگ تھی۔ ان کے فلک گیر حوصلوں اور سپر پیادوں کا اقتصاد چاہی
تو کمر ہی ہوا، لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا، مجاہدوں کی یہ پوش شالی کی گڑھی پر پہنچ کر ختم ہو گئی،
ہم اس قصہ کو ان ہی معلومات کے ذکر پر ختم کر دینا چاہتے ہیں، جو شالی کی گڑھی کی اس مجاہدانہ
یورش کے متعلق ہندوستان ہو چکے ہیں۔ کب، کس مہینے میں کتنے آدمیوں کے ساتھ شالی کی گڑھی
پر حملہ کیا گیا۔ حالات کے لحاظ سے ان تفصیلات کے ظلم بند ہونے کی صورت ہی کیا تھی، بس اتنا
معلوم ہو سکا ہے کہ خود امیر المؤمنین یعنی حضرت حاجی امجد الدین رحمۃ اللہ علیہ کو تھانہ ہی کے قیام کا

بمشورہ دیا گیا۔ اسی لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے غزوہ کے سر یہ ہی کی شکل میں مجاہدوں کا فوجی دستہ شامی کی طرف سے روانہ کیا گیا تھا۔

اسی سر یہ کی تعبیر مولانا عاشق الہی صاحب نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

”جتنے کا جتنا تحصیل شامی پر چڑھ دوڑا“ ص ۷۷

تصریح تو نہیں کی ہے لیکن ان کے بیان کا اقتضا ہے کہ تھانہ کے رئیس قاضی عنایت علی صاحب بھی اس جتنے میں کہئے یا سر یہ میں شریک تھے۔ نیز تحصیل شامی کی اس یورش کے متعلق مندرجہ طور پر کتابوں اور یادداشتوں میں جو روایتیں پائی جاتی ہیں، اور شہرت بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوبندی حلقہ میں تو اتر کی حدود تک جو روایتیں پہنچی ہوئی ہیں، ان کی بنیاد پر اتنی بات بھی بہر حال یقینی ہے کہ دین کے یہ چار یار یعنی (۱) سیدنا الامام اکبر مولانا محمد قاسم نانوتوی (۲) امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، (۳) حضرت مولانا حافظ محمد صائم شہید (۴) مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی یہ نفس نفس اس یورش میں عملاً شریک تھے، باقی ان ابطال رجال کے سوا اور کون کون تھے۔ ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتے کہ ان کی کافی تعداد تھی۔ ”جتنے کا جتنا“ کے الفاظ مولوی عاشق الہی صاحب نے جو استعمال کئے ہیں، ان کا اقتضا بھی یہی ہے، کچھ بھی ہو، مجاہدوں کا یہ فوجی دستہ خفاقا و ثقالا ان ہی آلات و اسلحہ کے ساتھ جو ان کے پاس تھے۔ یا باغ شیر علی کی سڑک کی غنیمت کی شکل میں قدرت نے ان تک پہنچا دیا تھا وہ شامی کی طرف روانہ ہو گئے۔

تھانہ سے جس وقت یہ سر یہ یا مجاہدوں کا دستہ شامی کے ارادہ سے روانہ ہونے لگا، تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وقت اور مقام کے امیر المؤمنین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد منیر صاحب جن کے متعلق مولانا منصور انصاری صاحب نزہل و دہقان کاہل کے حوالہ سے عرض کر چکا ہوں کہ اس جہادی تنظیم میں ”یاہ حربی“ کا عہدہ ان کو دیا گیا تھا۔ ان ہی مولانا محمد منیر سے سنی ہوئی یہ روایت نقل کی جاتی ہے۔ مولوی طیب صاحب کی یادداشت

میں ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے حاجی صاحب نے مجاہدوں کو رخصت کرتے ہوئے وصیت کی تھی۔

”مولانا یعنی سیدنا امام الکبیرؒ بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں اس لئے آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں“ ص ۷

خاص کر مولانا محمد منیر صاحب ہی کو یہ وصیت اسلئے کی گئی تھی کہ بقول مولانا طیب ”شدت محبت سے ان کو بھی بغیر (مولانا نونووی) کے قرار نہ آتا تھا“
گویا کام ایسے آدمی کے سپرد کیا گیا جو یہی کرنا بھی چاہتا تھا۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا وصیت کا اقتضا یہی ہے کہ حرب و ضرب کر دفر کے متعلق سیدنا امام الکبیرؒ کی افتاد طبع اور فطری رجحان کا تجربہ شاعلی کی جنگ سے پہلے ہو چکا تھا، شیر علی کے باغ والی شہرک کی پریش میں سیدنا امام الکبیرؒ کی ذاتی شرکت کے دلائل میں ہم ہی امدادی وصیت کو بھی ایک دلیل قرار دے سکتے ہیں، آخر سیدنا امام الکبیرؒ کی ان فطری خصوصیتوں کے مشاہدے کا موقعہ وہ کہاں مل سکتا تھا۔

چند میلوں سے زیادہ فاصلہ تحصیل شاعلی اور تھانہ بیون میں نہ تھا۔ اب بھی ان دونوں مقاموں کے درمیان چند سٹیشن پڑتے ہیں۔ مجاہدوں کے ”بھٹے کا بھٹا“ باسانی دہاں پہنچ گیا۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

”شاعلی کے میدان میں رن پڑا“ اور انگریزی فوج سے (مجاہدین کا) مقابلہ ہوا، متبادل میں مجاہدین ہی کو غلبہ نصیب ہوا“

اگرچہ یہ ایک اجمالی بیان ہے۔ لیکن اس سے اس کا تو پتہ چلا کہ جب شاعلی تک مجاہدین پہنچ گئے، تو گڑھی میں جو انگریزی فوج کے سپاہی تھے وہ مقابلہ کرنے کے لئے باہر نکل آئے۔ دونوں میں کافی کشمکش ہوئی۔ اس کشمکش میں کیا کیا صورتیں پیش آئیں۔ اب نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ اور سننے والے بھی ختم ہو چکے ہیں، مولانا منصور انصاری کی زبانی کابل میں مولانا طیب صاحب کو

جو باتیں معلوم ہوئیں۔ ان میں ایک ایمان افروز روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے جسے مولانا منصور انصاری نے براہ راست مولانا محمد منیر صاحب سے سنا تھا۔ اپنے امیر المؤمنین بیرو مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کے مطابق مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کے

”پس پشت بطور محافظہ اس طرح رہتا تھا کہ حضرت (نانوتوی) کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ ان کی محافظت اور نگرانی کر رہے ہیں۔“

دن پڑا ہوا تھا، دارہ گیر بزن و کش کا ہنگامہ رست خیز ہر طرف برپا تھا، مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ

”اس ہنگامہ عشر خیز میں حضرت (نانوتوی) میدان جنگ کے ایک کنارے پر دم لیٹنے کے لئے کھڑے تھے، کہ (انگریزی فوج) کا ایک سپاہی جو صورتاً سکھ (معلوم ہونا) تھا اور ڈیل ڈول میں اساطویل و عریض تھا، کہ حضرت (نانوتوی) کے جثہ کے آدمی اس جیسے تن و توسل رکھنے والے سے چپا رہ سکتے تھے، (انگریزی فوج) کے اسی سپاہی نے حضرت (نانوتوی) کو کنارے میدان کے کھڑا کر دینے کا حکم دیا، اور

اس کے بعد یہ الفاظ روایت میں اس کی طرف جو منسوب کئے گئے یعنی

”حضرت (نانوتوی) کو ڈانٹا، اہ کہا کہ تم نے بہت سرا بھارا ہے۔“

جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ حرب و ضرب میں سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی سربازانہ جدوجہد و غنیم کی فوج میں کافی امتیاز حاصل کر چکی تھی، بہر حال مذکورہ بالا الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی فوج کے اسی دیوبیکر، عنقریب قاتل سپاہی نے کہا، کہ

”اب آ! میری ضرب کا جواب دے۔“

اسی کے ساتھ تلوار جو اس کے ہاتھ میں تھی اس کو بلند کرتے ہوئے چلایا کہ

”یہ تیغ تیرے لئے موت کا پیغام ہے“

یہ فقرہ بھی تمام نہیں ہوا تھا کہ دیکھا گیا

”دو دھارا تیغ پوری قوت سے اٹھا کر حضرت (نافوتوی) پر چلا ناہی چاہتا تھا“

کہ حضرت کی زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوئے، اسی فوجی گروہ سے فرما رہے تھے کہ

”باتیں کیا بنا رہے اپنے پیچھے کی تو خبر لے“

کچھ ایسے لمحہ میں یہ بات اس کے کان میں ڈالی گئی، کہ

”اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا“

اس کا مڑنا تھا کہ سیدنا الامام الکبیرؑ بجلی کی طرح ترپے، مڑنے کے بعد آپ کی طرف رخ کرنے کا

موقعہ بھی اس کو نہ ملا کہ دیکھنے والوں کے سامنے یہ تماشا پیش تھا، مولانا محمد منیر کا بیان ہے، کہ

سیدنا الامام الکبیرؑ نے

”جنید کا ہاتھ اس کے دامنے کندھے پر مارا۔ دارا نے قوت سے کیا گیا تھا کہ تلوار دائیں ہونڈ

کو کاٹ کر گزرتی ہوئی بائیں پیر پر آ کر رکی“

دیکھا گیا تو اس سپاہی کا عفرتی جسد اس طرح خاک پر پڑا ہوا تھا کہ

”سر سے پیر تک دو پارہ ہو کر آدھا آدھا اُدھر گر ا ہوا تھا“ صد جہادی بھالہ

دانتوں ہر باحسان کے قرآنی وصف کی تعبیر یوں ہی پوری ہوتی ہے، سعادت مندوں کو یہی

قسم کی سعادت مندوں سے نوازا جاتا ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہم مشاطی کے میخانہ

جنگ میں نہیں، بلکہ اس تاریخی خندق کے کنارے کھڑے ہیں۔ جہاں عرب کا سورما عمر دین د

ٹھیک اسی شکل میں دو پارہ ہو کر ترپ رہا تھا۔ اس کا انجام تو یہ ہوا، اہل سیدنا الامام الکبیرؑ جو کچھ

ملہ سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھنی چاہئے، اہلیوں بھی واقعہ شہید ہے، کہتے ہیں کہ عمر دین دو سو پلو

کو برابر قریش میں کھجا جاتا تھا، جو زور پہنچاتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ سارے عرب میں ایسی ذرہ کسی کے پاس

نہ تھی، سیدنا علیؓ رضی کرم اللہ وجہہ نے باوجود فوجی عرب کے اس شہید رسد ماکو دو پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ذرہ

کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اس کی کاشش سے اتار کیوں نہ لی تو فرماتے گئے کہ قتل ہوتے ہوئے (باقی اس کے صفحہ پر)

ماندگی محسوس فرما رہے تھے۔ اس غیر معمولی کامیابی نے جیتی اور چالاکی کی نئی قوت آپ میں بھری دکھائی ہے کہ

”اسی بے جان لاشے پر پاؤں رکھنے ہوئے پھر صف قتال میں آگئے۔“

نہیں کہا جاسکتا کہ شاعری کے میدان کی یہ جنگ کیشنگ اور کشتی دیر تک جاری رہی۔

مولانا طاہر صاحب کی یادداشت جس میں اپنے والد حافظ محمد احمد صاحب سے سنی ہوئی روایت اسی سلسلہ میں انہوں نے درج کی ہے، جس کے بعض اجزاء کا ذکر متفرق طور پر کر چکا ہوں۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد شیخ اسد علی سے رخصت ہو کر سیدنا الامام الکبیر تھانہ آئے اور تھانہ کے بعد جب میدان جنگ میں جو نظر ہرے کہ شاعری ہی کا میدان جنگ ہو سکتا ہے تشریف لے گئے تو بیان کیا ہے، کہ تھانہ بھوں میں میدان جنگ کی خبروں کے ساتھ ساتھ شہداء کی

”نعمتیں بھی آتی رہتی تھیں۔“

اور تھانہ کو یہ قصے اطراف و جوانب کی آبادیوں میں پھیل جاتے تھے۔ دکھائی ہے کہ

”گذشتہ صفحے سے اپنی شرمگاہ کو کھول کر میرے سامنے اس کا فرے کر دیا مجھے شرم آئی اور چھوڑ کر چلا آیا۔ اس مبارزے کے دوسرے اجزاء کا کافی دل چسپ ہیں۔ خصوصاً حضرت علی اور عمرؓ کی باہمی گفتگو۔ اس موقع پر ایک سال کے محل کا سامان بھی ملتا ہے۔ حضرت علیؓ، شہرہ جہہ اور خالد بن ولیدؓ ان ہی جیسے نبرد آزما کشتہ کتا صحابیوں کی جگہ ہمارے اہل حق و تعالیٰ چاہک و ستیہ کا ذکر جس وقت کیا جاتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ جن غیر معمولی کرہوں سے یہ کام لیتے تھے ان کی تعلیم ان بزرگوں نے کہاں اور کب اور کن لوگوں سے حاصل کی؟ تاریخ قوائی الملوں کے جواب سے سناکت ہے۔ امویہ آدمی بھی سوچ لیتا ہے کہ عرب ایک جنگ جو قوم تھی اگر یہ کتب عظیم الفتالی و ہوشیہ کا لکھنے کی قرآنی خبر سے اس کی بھی تصدیق نہیں ہوتی، لیکن مشہور یہی ہے کہ سیدنا امیرؓ پر یہ کچھ لیا جاتا ہے کہ عربوں میں جنگی فنوں کے سیکھنے سکھانے کا عام رواج ہوگا۔ مگر سیدنا الامام الکبیرؓ کے مذکورہ واقعہ کو سوچ کر اگر ذہن ادھر منتقل ہو کہ اللہ والوں کے ساتھ غیث تائید جو ہوتی ہے۔ یہ اسی کے مظاہر و آثار ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ سیدنا الامام الکبیرؓ کی پچھلی زندگی میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ شمشیر زنی، بٹا بٹ یا بانگ وغیرہ چیزیں آپ نے سیکھی ہوں۔ برواق تک کے متعلق آپ کی

مصنف امام کی شہادت سن چکے کہ قدر کے ایام میں پہلی دفعہ نشانہ بازی کا موقع آپ کو ملا تھا ۱۲

”چونکہ تھانہ نافوتہ سے زیادہ دور نہ تھا“

اس لئے نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ نافوتہ والوں کو میدان جنگ کی سرگرمیوں کے جاننے کا موقع مل رہا تھا، جن کو سن سن کر حضرت نافوتی کے والد اجد شجاع اسد علی صاحب جیسا کہ مولوی لیاہ صاحب نے لکھا ہے۔

”بہت روتے تھے اور فراتے تھے کہو بھائی! میرا بیٹا کہاں ہے، میرا بیٹا کہاں ہے۔“
بعض ہتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شامی کے میدان کی چھادی کشاکش ایک روز دن میں ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن پھر بھی رقت کی صحیح تعبیر کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔ اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ فاش ہزیمیت کے بعد انگریزوں کے آدمی شامی کی گڑھی میں قلعہ بند ہو گئے، اور مجاہدین نے گڑھی کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔

انگریزی فوج شامی کی جس گڑھی میں پناہ گزین ہو گئی تھی، اس کے صحیح محل وقوع

شامی کی گڑھی کا محاصرہ اور تھانہ بھون کی جہادی تحریک کا خاتمہ

کا اندازہ تو دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے، جس سے افسوس ہے کہ لکھنے والا محدود ہے، جی تو یہی چاہتا ہے کہ کچھ مشن! خود اپنی آنکھوں سے اس گڑھی اور اس کے ماحول کا مشاہدہ کر کے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، اسے لکھوں، لیکن موجودہ حالات میں میرے لئے یہ آسان نہیں ہے، تاہم پھر بھی میری آرزو اب بھی یہی ہے کہ یہ گڑھی اگر اب بھی موجود ہو تو اس کا فوٹو لے لیا جائے، اور اس کتاب کے ضمیموں میں اس فوٹو کو بھی شریک کر دیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر کی سیرت طیبہ سے اس گڑھی کا خاصہ تاریخی تعلق ہے۔ گڑھی کے چاروں طرف جو میدان تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ اس حال میں اب بھی ہوگا، لیکن کہنے والوں سے معلوم ہوا کہ اس میں رد و بدل نہیں ہوا ہے۔ یا کم ہوا ہے۔ تو فوٹو لینے والے کو چاہئے کہ کسی ایسے نقطے سے فوٹو لے جس میں کچھ نہ کچھ میدان کا حصہ بھی آجائے۔

بہر حال کتابوں میں جو کچھ مل سکا ہے، اس کی مدد سے نیز براہ راست اس خاکسار نے سیدنا

الامام الکبیر کے فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حیدرآباد میں جو روایت اس سلسلہ میں سنی ہے اس کو بھی پیش نظر رکھ کر تھانہ بھون کی جہادی تحریک کے اس دردناک خاتمہ کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔

حافظ صاحب مرحوم نے جن دنوں آپ سلطنت آصفیہ کی عدالت عالیہ (دہائی کورٹ) کے رکن بحیثیت منشی ہونے کے تھے۔ اسی زمانہ میں نواب عبدالباقر مرحوم کی کوٹھی حسینی علم میں ایک خانگی مجلس جس میں فقیر بھی شریک تھا، یہ بیان فرمایا تھا کہ شالی کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی رہ پوش ہوئے تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی کہ گڑھی کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے گڑھی سے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں، لایہ کہ ایک مختصر سی مسجد اسی سمت میں تھی، جس طرف گڑھی کا پھانگ تھا۔ محصوروں نے گڑھی کے پھانگ کو بند کر دیا تھا اور ”بچتے کا بچھا“ تھانہ بھون کے مجاہدوں کا جو گڑھی کے باہر والے بے پناہ میدان میں پتنگوں کی طرح پھیلا ہوا تھا، ان پر بند قوتوں سے گڑھی والے انگریزی فوج کے بند قوتی دیوار کی آڑ لے کر مسلسل فائر پر فائر کرتے چلے جاتے تھے۔ تاثر توڑ گولیاں برس رہی تھیں۔ وہ دیوار کے پیچھے محفوظ تھے۔ لیکن اس مختصر سی مسجد کے سوا جو میدان میں تھی غریب مجاہدوں کو گولیوں سے بچانے والی کوئی جگہ نہ تھی۔

اسی کا نتیجہ تھا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ

”انگریزی فوج تحصیل شالی میں قلعہ بند ہو گئی، اور ادا حمرے مجاہدوں پر بند قوتوں کی بارش ماری شروع کی، جس سے سینکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے۔“

یہ وقت بڑا افراتفری کا تھا، زحف (گھسانہ الی جنگ) کی صورت باقی نہ رہی تھی، اس لئے اظہار قرآنی حکم فلا تو لہوھ الا دبار دیں نہ پھیر و تم پیشوں کو، کا مکلف بھی مجاہدین کا یہ سرا سیمہ گزردہ باقی نہ رہا تھا، لیکن پھر بھی میدان سے پیٹھ پھیر کر ایسا معلوم ہوتا ہے بھلا گنہگار کوئی آمادہ نہ تھا۔ گولیاں ان کے جسم میں اترتی چلی جاتی تھیں۔ روصیں پرواز کر رہی تھیں، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، کسی نے

امام گریز اختیار نہ کی، مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

”اس وقت پریشانی یہ تھی کہ انگریزی فوج ظہر بندہ محفوظ تھی، اور مجاہدین ان کے سامنے کھلے میدان میں تھے، ان کا (یعنی انگریز فوج کی بند قیموں کا حملہ کار گرو کا میاب ہوتا تھا، اور مجاہدین کے حملے غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے تھے۔“

ظاہر ہے کہ مجاہدین زیادہ سے زیادہ ہندوؤں کا جواب ہندوؤں سے دے سکتے تھے۔ لیکن جو دیوار کی آڑ میں چھپے اور دیکھے ہوئے تھے۔ ان پر دیوار سے باہر والوں کی ہندوؤں کی گولیوں کا اثر ہی کیا مرتب ہو سکتا تھا، مولانا کا بیان ہے کہ

”اس طرح اپنی ایک طرفہ مار کی وجہ سے، مجاہدین کا کافی جانی نقصان ہوا۔“

تھانڈھون میں لاشوں کے مسلسل پہنچنے کے جس قصہ کا ذکر گذر چکا ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر صورت حال محاصرہ کے بعد ہی پیش آئی۔

بس لے دے کہ وہی ایک مسجد تھی۔ گھوم پھر کر اسی مسجد میں مجاہدین دم لینے کے لئے آجاتے، لیکن اس مسجد کی پناہ سے نکلنے کے ساتھ ہی اندر گولیاں برسنے لگتیں۔ تدبیریں سوچی جاتی تھیں لیکن کوئی تدبیر اس وقت مفید اور کار آمد نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت اپنے ہوش و حواس کے توازن کو قائم کرتے ہوئے سیدنا امام الکبیرؒ نے ایک غیر معمولی جرات آنا اقام کا عزم بالجزم فرمایا۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ مسجد اسی سمت میں واقع تھی، جس طرف گرٹھی کا دروازہ تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

”اسی دروازہ کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی، جو غالباً محافظ سپاہیوں کے سایہ نشین کے لئے بنائی گئی تھی،“

مسجد سے سیدنا امام الکبیرؒ کی نظر مبارک دروازے کے اس چھپر پر پڑی، اور اچانک ایک ”حربی مکیدہ“ یا ”جنگی چال“ کا گویا آپ کو الہام ہوا، سمجھ میں یہ آیا، کہ اس چھپر یا تک پہنچنے کی صورت اگر کوئی نکل آئے، تو اس کو اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں پر رکھ دیا جائے۔ اور چھپر یا میں آگ لگا دی جائے۔ جس سے

کو اثر بھی مل جائیں گے اور تحصیل کی گڑھی میں گھسنے کا موقع مجاہدین کے لئے بآسانی مل آئے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسجد سے چھپر یا تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ بند ذہن چھتیا لے انگریزی فوج کو سپاہی گڑھی کی دیواروں پر اور ان کی آگ میں زور سے نگرانی کر رہے تھے کہ گڑھی کے دروازے تک کوئی پہنچنے نہ پائے، نظر پڑتے ہی اس پر گولیاں برسائے گئے تھے۔ چھپر یا تک پہنچنا اس کو اکھاڑنا، اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں سے اس کا اتصال پیدا کر کے گنگ لگانا، اتنا لہا کا نہ ہا تھا کہ بمشکل ہی اس کا موقع برستی ہوئی گولیوں کے درمیان نکالا جاسکتا تھا۔ مگر اس کو کیا سمجھے کہ اولوالعزموں کے عزم اور ارادے کا مظاہرہ ان ہی نازک مواقع پر ہوا کرتا ہے، تجویز بھی سیدنا الامام الکبیرؑ نے دماغ میں آئی اور تجویز پر عمل کرنے کا عزم بھی خدائے آپ ہی کے نورانی قلب میں پیدا کیا اس سلسلہ میں روایتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیرؑ اپنی اس "آتشیں تجویز" پر عمل کرنے کے لئے تنہا آمادہ ہو گئے۔ کسی رفیق کو بھی رفاقت کی تکلیف نہ دی، اور دیکھا گیا کہ کوہنہ قی ہوئی بجلی کی طرح آپ گولیوں کی اسی بارش کے درمیان نکلتے ہوئے چھپر یا تک پہنچ گئے، اور حسب روایت مولانا طیب صاحب

"حضرت (نانا تو می) نے پھرتی سے بڑھ کر اس چھپر یا کو اپنی جگہ سے جلد جلد اکھاڑا اور اکھاڑ کر اسے تحصیل کے دروازے سے لالہ لایا، اور اس میں آگ دے دی"۔

خدا ہی جانتا ہے کہ گولیوں کی بوجھاڑ سے نکلنے میں اور چھپر یا تک صحیح و سالم پہنچنے میں وہ کیسے کامیاب ہوئے۔ مگر دیکھا ہی گیا کہ چھپر یا میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد بقول مولانا طیب صاحب۔

"اگل کاٹنا تھا، کہ گڑھی کے پہاڑ کے کواڑ بھی مل آئے۔"

صورت حال کچھ ایسی پیش آئی، کہ ان جلتے ہوئے کواڑوں کی آگ بجھانے کی ہمت گڑھی کے محصور فوجیوں کو نہ ہوئی۔ بجائے کلہی کے صرف کوئلہ اور لکھ کے کواڑ بن کر ورہ گئے، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے، کہ یوں گڑھی کا

"بند دروازہ مجاہدین کے لئے داہو گیا، اور ملغادر کرتے ہوئے تحصیل کے اندر مجاہدین جا گئے۔"

اس وقت چارہ کاری محصوروں کے لئے اس کے سوا اند کیا تھا، کر نیام سے تلواروں اور کرچوں کو نکال نکال کر مجاہدین کے سامنے آجائیں۔ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ مجاہدین اللہ "قلعہ بند فوج سے دست بردار جنگ ہونے لگی۔"

گڑھی کے اندر تو یہ دست بردار جنگ ہو رہی تھی، مجاہدوں کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا، کرایہ کے سپاہی ان کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتے تھے، ادایا معلوم ہوتا تھا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے لکھا، یہی ہے کہ

"پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہو گئی، تحصیل شالی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔"

لیکن پردہ غیب کی لاہوتی عملتوں کا قنا حنا کچھ اور تھا، اس موقع پر روایات میں کچھ اتنا اجمال ہے کہ قاضی کے بعض اجزاء کی ترتیب میں الجھن سی پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم جو معلومات مجھے تک پہنچے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے جو نقشہ میرے دماغ میں قائم ہو گیا ہے اسے پیش کر دیتا ہوں۔

مجاہدوں کا جو دستہ تحصیل شالی پر حملہ کرنے کے لئے تھانہ بھون سے روانہ کیا گیا تھا، اس دستہ کے ایمر الجیش جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن چار یاروں کی شرکت شالی کے اس وقت دھاوے میں قلمی طور پر ثابت ہے۔ عرض کر چکا ہوں، ان میں ایک یہ حافظ صاحب بھی ہیں، دیوبندی حلقہ کے واقف کاروں کیلئے تو کسی تعارف کی محتاج حضرت حافظ شہید کی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن جو نہیں جانتے ہیں، ان کی عایت بھی کرنی ہی چاہئے، حضرت حافظ شہید کا خاندانی تعلق تھانہ بھون کے نادرانی شیخ زادوں کو خاندان سے تھا، ارمح ثلاثہ میں ان ہی کے متعلق جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ

"حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سپاہی نش تھے، ۱۵۷۵ھ"

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ غالباً ابتدائی زندگی سے آپ کو مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی سے مناسبت تھی، اور گو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد مرشدیاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی میت سے سرفراز ہو کر طریقہ صابریہ چشتیہ کے سیر و سلوک کی تکمیل میں کامیاب ہوئے اور اس وجہ پر پہنچے کہ بقول مولانا طیب صاحب

”بوقت وفات حضرت میاں جی نور محمد صاحب نے حافظ صاحب کو وصیت فرمائی کہ دیکھنا اپنے چھوٹے بھائی امداد اللہ کا خیال رکھنا۔“

بہر حال آپ وقت کے خدام سیدہ اور برگزیدہ لوگوں میں تھے۔ لیکن فطری طور پر حد سے زیادہ دیر مزاج تھے، لیکن مزاج کی دیرستگی اور شگفتہ دلی کا حال یہ تھا کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد مرتے دم تک لگے شاید مرنے کے بعد بھی یہ شگفتگی ان کی باقی رہی، بڑے دل چسپ لطائف ان کی طرف منسوب ہیں، امیر شاہ خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ تمہارے بھون کی وہی مسجد جسے آخرین حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام نے ہندوستان کا ایک مرکزی مقام بنا دیا تھا، اسی مسجد میں ایک وقت وہ بھی گذرنا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شیخ محمد تھانوی حافظ صاحب شہید ان مینوں بزرگوں کی بیٹھک قریب قریب ہی رہتی تھی۔ حضرت حاجی صاحب اسی مسجد کی متعلقہ سردری میں بیٹھتے تھے، اور مولانا شیخ محمد صاحب کی نشست بھی وہیں قریب تھی اور حافظ صاحب مسجد کے قریب پلکھن تلے بیٹھا کرتے تھے۔ آٹنے والے جب آتے تو لگھا ہے کہ حافظ صاحب اس کو مخاطب کر کے فرماتے کہ

”بھائی کوئی مسئلہ پوچھنا ہو، تو وہ (مولانا شیخ محمد تھانوی) بیٹھتے ہیں، ان سے پوچھ لے، مرید ہونا ہے تو وہ (حاجی امداد اللہ) بیٹھتے ہیں، ان سے مرید ہونا اور اگر حقہ پینا ہو، تو یاروں کے پاس بیٹھ جا۔“ ۱۵۶

تفصص الاکابر، اردو ادب، علامہ غفر اللہ عنہ حافظ صاحب شہید کے تفصیلی حالات پڑھئے، اس اجمالی لٹے انداز تلاش میں اس لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک صاحب کشف بزرگ حافظ صاحب شہید کے مزار پر جلتے پیر کی قبر پر فاتحہ پڑھنے لگے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں سے پوچھنے لگے کہ بھائی! یہ کون بزرگ ہیں، بڑی دل گیری بات کی، میں جب فاتحہ پڑھنے لگا تو کہنے لگے جادو فاتحہ کسی مردہ پر پڑھو یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھو آئے ہو، ۱۵۷ لوگوں نے یہ اطلاع دی کہ شہید ہیں، تب اس لطیفہ کا مطلب ان کی سمجھ میں آیا۔

تعارف کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاعری کی گڑھی کے کوڑ کو کوڑ ملے اور رکھ بنا کر گر دیا گیا اور مجاہدین کو گڑھی میں گھس کر انگریزی فوج کے سپاہیوں سے دست بدست جنگ کرنے کا موقع ملا تو جیسا کہ چاہئے تھا کہ ایسا الجیش ہونے کی حیثیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شہید کو اندر داخل ہونے والے مجاہدین اور جو باہر تھے دونوں ہی کی نگرانی کی وجہ سے اندر سے کبھی باہر اور باہر سے کبھی اندر مسلسل آمد و رفت جاری رکھنے پر مجبور ہونا پڑا، بیان کیا جاتا ہے کہ آمد و رفت کے اسی سلسلے میں حافظ صاحب گڑھی کے باہر کھلے میدان میں گڑھی کی طرف رخ کئے کھڑے تھے۔ اب واللہ اعلم جان کہ مجاہدین کا فوجی افسر یہی ہے یا بے جا نے انگریزی فوج کے کسی سپاہی نے گڑھی کی فصیل کھنسنے یا دروازہ پر سے ٹاک کر ایک ایسی گولی چلائی کہ بقول مولنا طیب صاحب

”گولی ناف پر پڑی“

مولنا عاشق الہی کی روایت میں ہے کہ ”گولی زیر ناف“ لگی تھی، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سینے پر نشانہ لگایا گیا تھا۔ ٹھیک نشانہ پر تو گولی نہ بیٹھی اور ناف یا زیر ناف پہنچ کر حافظ شہید کے شکم مبارک میں اتر گئی۔ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ گولی گنے کے ساتھ ہی

”حضرت حافظ شہید اکدم اچھل کر زمین پر گرے“

اتنا ہوش اس وقت بھی باقی تھا کہ گرتے ہوئے اس حد تک سنبھال لیا کہ دیکھنے والوں نے دیکھا، (جیسا کہ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ)

”بہ ہیئت شہد زمین پر بیٹھے میں“

یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ اس وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ قبلہ رخ ہیں، جیسے کسی نے نماز کے قصد میں آپ کو بٹھا دیا ہے۔ ”حک جہادی مقالہ“

اس پاس جو لوگ کھڑے تھے دوڑ پڑے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت بھی اس زخم خمودہ بندہ حق کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہی تھا کہ

”مجھے مسجد لے چلو، مسجد لے چلو“

نماز کے تھکے کی ہیئت میں بیٹھے ہیں اور آنہ و صرف اس کی ہے کہ مسجد (مجدہ کی بیلہ) تک پہنچا دوں گا
نے صرف شعر کہا تھا کہ

سربوت ذن بحیران کے زیر پائے ہے

لیکن کر کے دکھانے والا اسی کو آج کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے دل کی آخری ترنا صرف یہی ہے
مولنا عاشق الہی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ "حافظ شہید" نے حضرت لانا گنگوہی کر شاہی کو جہاد
کے موقع پر با صراہہ وصیت کی تھی کہ

"میاں رشید میرا دم بچکے تو تم میرے پاس ضرور ہونا"

واللہ اعلم مولنا گنگوہی بھی ان لوگوں میں شریک تھے۔ جو حافظ شہید کے گوی کھانے کے بعد
ان کی طرف دفتر پڑے، یا امیر الجیش کے زخمی ہونے کی خبر آگ کی طرح مجاہدوں میں قدر تاحیب بھلی
اس وقت آپ مطلع ہوئے، کچھ بھی ہوا ہو، مگر جیسا کہ مولنا عاشق الہی صاحب کے بیان سے معلوم
ہوتا ہے "مسجد لے چلو، مسجد لے چلو" کے حکم کی تعمیل کا موقع سب سے پہلے مولنا رشید احمد
گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا، تذکرۃ الرشید میں ان کے الفاظ ہیں کہ

"حافظ صاحب کا زخم سے چور ہوا کر گزرتا تھا، اور امام ربانی (حضرت گنگوہی) کا لپک کر تڑپتی
نفس کو کاغذ سے پراٹھانا، قریب کی مسجد میں لائے، اور حضرت (حافظ شہید) کا سر اپنے
زانو پر رکھ کر تلاوت (قرآن) میں (مولنا گنگوہی) مصروف ہو گئے، ۱۵۱ھ

آگے ان ہی مولوی عاشق الہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ "دیکھنے والوں سے سنا ہے" آئندہ کی سرگذشت
کو ان الفاظ میں جو درج کیا ہے کہ

"حضرت مولنا گنگوہی، کی اس مردانگی پر تعجب تھا کہ کس اطمینان کے ساتھ منان مسجد
میں تنہا بیٹھے ہوئے اپنے نور دیدہ چچا (پیر) کے سفر آخرت کا سماں دیکھ رہے ہیں، اور اپنے
عاشق اور محبوب کے نزع کا آخری وقت نفاذ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے، اور
زبان پر کلام اللہ۔ یہاں تک کہ حافظ (شہید) رحمۃ اللہ علیہ کا آپ (یعنی مولنا گنگوہی) کے

زمانہ پر سر رکھے رکھے وصال ہو گیا ۵۵

اس بیان میں ”تنہا بیٹھے ہوئے“ کے الفاظ کچھ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ امیر الجیش کا زخمی ہونا، یقیناً ایسا واقعہ نہیں ہو سکتا، جو اس پاس کے مجاہدوں کی توجہ کو اپنی طرف منقطع نہ کر آتا، خود مولانا عاشق الہی صاحب کا یہ فرمایا کہ ”دیکھنے والوں سے سنا ہے“ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے دیکھنے والے ایک سے یقیناً زیادہ افراد تھے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے دیکھنے والے مسلمان مجاہد تھے جن کا امیر زخموں سے چور ہے، خون میں مشرب اور ہے، لیکن وہ صرف دیکھتے رہے۔ اس کی توفیق کسی کو نہ ہوئی کہ جب حافظ شہید کے خستہ و نزار جسد مبارک کو حضرت گنگوہی اپنے کندھے پر اٹھا کر مسجد لے جا رہے تھے۔ ان کا ساتھ دیتے۔ حافظ شہید تو حافظ شہید ہی تھے۔ حبش کے امیر بھی تھے۔ ایسے موقعہ پر عام انسانی فطرت ہے کہ لوگ دوڑ پڑتے ہیں۔ دیکھنے والوں کی یہ غیر فطری سنگدلی میری سمجھ میں نہیں آتی، اسی لئے میرا خیال ہے کہ مولانا عاشق الہی مرحوم سے بظاہر واقعہ کی تعبیر میں کچھ سماعت ہوئی ہے، اور حافظ شہید جب مسجد میں لائے گئے ہیں۔ اس وقت کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت گنگوہی تنہا مسجد پہنچے ہوں۔ لیکن واقعہ کے ان ”دیکھنے والوں“ میں مسجد تک پہنچنے والے کون کون لوگ تھے، ان ناموں کی تفصیل کا تو مجھے علم نہ ہو سکا، تاہم اور کوئی ہویا نہ ہو یہ ماننا بہت دشوار ہے کہ امیر الجیش کے زخمی ہو کر گر پڑنے کی خبر جب مجاہدین میں پھیلی، تو اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر کے گوش مبارک تک نہ پہنچی، یا پہنچی، لیکن دوسرے دیکھنے والے تو خبر سننے کے ساتھ دیکھنے کے لئے دوڑ پڑے لیکن ٹھیک اسی ساعت فرخ وقت سعید میں جس میں واقعہ یہ ہے کہ حبش کے امیر کی زندگی کی سب سے بڑی آندہ پوری ہو رہی تھی گویا ع

گرایا رے بر خند از وصل یا رے

۱۵ حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خود فقیر نے بھی سنا ہے ”ادقہ بعض الاکابر میں بھی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی یہ روایت شرب کی گئی ہے یعنی اپنے سیر و سواک کی آخری (باقی) تھکے سفر پر،

کا جان نواز، روح پرورد قدوسی، نظارہ پیش ہو رہا تھا، عین اسی مبارک گھڑی میں حضرت گنگوہی کے رفیق الدنیا والآخرۃ سیدنا الامام الکبیر نے رفاقت سے بلا وجہ اعراض کیا۔ اور زندہ ہونے کے لئے جو مر رہا تھا، اس کے بالین شہادت پر حاضر نہ ہو سکے، یا العجب

جائے نہ جائے گل ہی نہ جائے بارغ تو سارا جانے ہے

خیر اس قصے کو چھوڑیے، مولانا عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے کہ حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو

”گوئی کاری گئی، اللہ خون کا فوارہ بہنا مشروع ہوا“ ۵۵ تذکرۃ الرشید ج ۱

خواب کی شکل میں خون جس کے اندر سے ابل رہا ہو۔ اس کا جو انجام ہو سکتا تھا، اسی مسجد میں وہ انجیل ام پیش آیا۔ مولوی عاشق الہی صاحب کا بیان ہے کہ

”حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے (حضرت گنگوہی) کے زانو پر سر رکھے رکھے

وصال ہو گیا“ ۵۶

(گذشتہ صفحہ سے) منزلوں میں، حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جس کی تعبیر خود وہی ”تنائے موت“ سے کیا کرتے تھے۔ خود اس کی شرح ان الفاظ میں فرماتے کہ موت کی تمنا اس قدر غالب ہے کہ خوف ہے کہ میں خود کشی نہ کروں، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ ”شوق شہادت کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے تھے کہ میرے قریب کوئی ہتھیار یا پھری چاقو نہ رہے۔ کیس اپنی منکوب الحالی میں خود کشی نہ کروں؟“ ۵۷ حافظ محمد احمد صاحب فرماتے تھے کہ رات کو جس حجرے میں، ہمیشہ سوتے، اور ذکر و فکر تہجد وغیرہ پڑھتے تھے۔ اس حجرے میں ممانعت تھی کہ کوئی آکر جا رہ نہ رہ جائے۔ اندیشہ اسی کا تھا کہ غلبہ حال میں خدا جانے کیا کریں گے۔ حضرت حکیم الامت یہ بھی فرماتے تھے کہ اس حال پر ”ولایت کی بشارت بھی حافظ شہید کو ملی تھی، جب انہوں نے خود اس حال کو خلاف سنت ٹھہراتے ہوئے خوف کا اظہار کیا تھا، بھجایا گیا تھا کہ موت کی تمنا مصیبت اور تکلیف کے موقع پر ممنوع ہے، لیکن قادیانہ کی آرزو میں موت کی تمنا ولایت کی دلیل ہے، یہی اقتضائے اللہ ہے قرآنی آیت ان زعمتم انکم اولیاء اللہ من دون انبائنا فمنوا العودت کا۔ خاکسار نے بھی حیدرآباد کے غیر مشہور بزرگ مولانا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا جن پر ماسی ”تنائے موت“ کی حالت طاری تھی فرماتے تھے کہ خود کشی کو جواز کی کوئی شکل ہی نہیں آتی تو اپنا خاتمہ کر دیتا، اس فقرے کو اتنے جوش و خروش، اشتاہ و سرور سے سمور ہو کر ادا فرماتے کہ تھکادی دیر کے لئے سنے والوں میں بھی موت کی تمنا نے سرست اُترا پیدا ہو جاتی تھی، ۱۲

ی عجیب بات ہے کہ حافظ شہید کی شہادت کے بعد اسلامی دستور کے مطابق 'جیسا کہ چاہئے' تھا کہ کسی دوسرے امیر کا انتخاب مجاہدین کے جھٹھے سے کر لیا جاتا، خصوصاً جب مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے نقل بھی کر چکا ہوں، کہ تحصیل کے کوڑ کو جلا دینے کے بعد مجاہدوں کو گڑھی کے اندر گھس کر دست بدست جنگ کا مختتم موقعہ بھی بیستر آگیا تھا اور بقول ان ہی کے اس دست بدست جنگ میں

”پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہوئی، تحصیل شمالی پر مجاہدوں کا قبضہ ہو گیا“

گو بظاہر صرف ایک آدمی خواہ وہ امیر الحلیش ہی کیوں نہ ہو، اس کی شہادت کی وجہ سے اس جیتی ہوئی جنگ کے میدان کو چھوڑ کر مجاہدوں کے پراگندہ، یا تتر بتر ہونے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن بیان کرنے والے جو کچھ بیان کرتے ہیں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حافظ شہید جتہ اللہ علیہ کی شہادت کے ساتھ ہی مجاہدوں کی ہمت کچھ چوٹ گئی، ان میں فشل اور بددلی کی کیفیت پیدا ہو گئی، ”فرجی آرل“ کے زوال سے اس زمانہ میں فوجوں کی جس نفسیاتی کیفیت کی تعبیر کی جاتی تھی، گویا بکھٹنا چاہئے کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی طاری ہو گیا۔ عموماً فوج کے کسی غیر جمہونی افسر کے کام آجانے کے بعد ہی یہ صورت پیش آتی ہے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ حافظ شہید کے وجود باوجود، کا مجاہدوں کے حوصلوں اور دلولوں سے بھی شاید کچھ اسی قسم کا تعلق تھا۔ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں جو یہ خبر دی ہے کہ

”اس خبر یعنی حافظ شہید کی شہادت کی خبر نے مجاہدوں کی مکر توڑ دی، اور وہ اسید جو مجاہدوں کی مشعل راہ تھی ٹوٹ گئی جس سے قلوب میں سردی مہری کی کیفیات پیدا ہو گئیں۔“

ایسے موقعہ پر اپنے آدمیوں کو پراگندگی اور انتشار سے بچاتے ہوئے باہر نکال لینا، یہی سب سے بڑا فوجی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حافظ شہید کے بعد مجاہدین کے اس جھٹھے کی ذمہ دار ہستیوں کے لیے فشل کا یہ لفظ قرآن سے ماخوذ ہے، ”سورة الانفال میں یہ فرماتے ہوئے کہ جب مسلمانوں کی مٹ بھیڑ باقی اگلے صفحہ پر،

کے سامنے سب سے بڑا ہم سوال یہی ہوگا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، اس نازک موقع پر نزاکت کا صحیح اندازہ کیا گیا، جس طرح بھی ممکن ہوا، شکستہ خاطر طالع مجاہدوں کو کامیابی کے ساتھ باہر نکال لینے میں وہ کامیاب ہوئے۔ مولوی عاشق الہی نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ حافظ شہید کی آخری سانس جب ان کے زانو پر پوری ہوئی، تو ہوسے لت پت 'خون کے شراب' و جسد مبارک کو اپنے نانو سے ہٹا کر انہوں نے لکھا ہے کہ

”باطینان اٹھ کھڑے ہوئے“ ۴۵

”باطینان“ کی کیفیت کا ایسے مواقع میں دلوں کے اندر باقی رہ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بہر حال کہنے والے اب خواہ کچھ ہی کہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ تحصیل شامی کا یہ واقعہ جو اپنے نقاب کے لحاظ سے مختصر اور معمولی معلوم ہوتا ہے، لیکن ہاتھی کی سونڈ کو جس نے نہیں دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ مچھر کے سونڈ کو دیکھ کر اس کا خیال جاسکتا ہے۔ ملاقات کے کمروں کی میز پر تاج محل کی عمارت کے نمونے آج کل جو رکھے جاتے ہیں۔ یقیناً وہ تاج محل تو نہیں ہوتے۔ لیکن نمائندگی تو تاج محل ہی کے روضہ کی کرتے ہیں، بہر حال دل میں جو بات ہے اسے کھل ہی کر کیوں نہ کہہ دوں۔ خواہ اسے میرا ذاتی مایوسی یا ہی کیوں نہ ٹھہرایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے جس مقدس دور کی گنجینہ میں جذب و فنا ہونے ہی کو جن لوگوں نے اپنی ہستی کا آخری نصب العین قرار دیا تھا، ان کو شامی کے اس چھوٹے سے سریہ میں اس عہد پاک کے اہم سرکوں کا خواہ کسی پیمانے پر سہی مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید مشاہدہ اور تجربہ کرایا گیا تھا، ذرا سوچئے گڑھی سے باہر والے میدان میں انگریزی فوج کے باضابطہ تعلیم یافتہ فوجیوں کے مقابلہ میں جو اس زمانہ کے جدید افرنگی اسلحہ سے لیس تھے، ان ہی کے مقابلہ میں جو کامیابی اور فتح کی مسرت ہوئی، اگر بدر کے زخم شدہ صفحے سے کسی جگہ سے ہو، تو ثبات و استقلال کے ساتھ ذکرِ اشراف مشغول ہیں۔ اسی کے بعد ملاقات

اور ہم آہنگی کر کا میابی اور فتح کی کلید قرار دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ واطیعوا اللہ والرسول ولا تنازعوا فقیہکم، تو قنہب ساری محکمہ اشراف اور رسول کی اطاعت کر دے۔ آپس میں جھگڑا نہ کرنا، اور بد دل ہو جاؤ گے اور ہوا تمہاری اکٹرا جائے گی۔

تاریخی سرکہ کی تصویر اس میں جھلکتی ہو، اور قلعہ بند ہونے کے بعد احد کا نقشہ ان لوگوں کو سامنے پیش ہو گیا، جو کھلے میدان میں قلعہ بند سپاہیوں کی بندہ قوت کی گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے۔ پھر گڑھی کا بچھاؤنگ جب توڑا اور اکھاڑا گیا، اس وقت ”خیبر“ کے قلعہ کا دروازہ اکھاڑنے والوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ یا دیو پیکر انگریزی فوج کا سپاہی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، جب ند پارہ ہو کر گرا، تو دماغوں میں عرب کے اس سورما کا خیال اگر گھوم جائے جو کچھ اسی طرح دو ٹوک رہے ہو کہ خندق کے کنارے تڑپ رہا تھا۔ اب خواہ اسے خوش اعتقادی ہی کیوں نہ قرار دیا جائے۔ لیکن جس رنگ میں واقعات پیش آئے۔ قدر تاؤ ذہنی احتمال میں ان ہی سے مدد مل ہی ہے۔ اپنے اس اضطرابی احساس کا کیا کروں، آخری انجام مجاہدوں کی جدوجہد کا شاطی کے میدان میں جو ہوا۔ بظاہر ہزیمت شکست کے سوا اسے اور کیا سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن عہد سعادت میں موتہ کے میدان میں جو واقعہ پیش آیا، یعنی یکے بعد دیگرے اسلامی لشکر کے افراد شہید ہوتے چلے جا رہے تھے، پہلے حضرت زید، پھر جعفر طیار، پھر عبداللہ بن رواحہ شہید ہوئے۔ آخر میں خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھنڈا اٹھایا، مگر بائیں ہمد میدان جنگ کے چھوڑنے پر مسلمانوں کو مجبور ہونا پڑا تھا، اگر باوجود پسپائی کے چونکہ ابنزی دیر لگندگی سے بچاتے ہوئے دشمنوں کے زمرہ سے ان مسلمانوں کو حضرت خالد باہر کل لیویز میں کامیاب ہو گئے تھے، ان کی اسی کامیابی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

فتح لہ (بخاری) | پس فتح خالد بن ولید کی ہوئی

جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی کبھی پسپائی بھی بجائے ہزیمت اور شکست کے ”فتح و ظفر“ قرار پانے کی مستحق ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے اسی نمونہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاطی کے میدان سے تھانہ بھون کے مجاہدوں کی داپسی میں جنگ موتہ کی پسپائی کی جھلک محسوس ہو، تو آخر اس احساس کو قطعاً بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

آخر خود سوچئے، مجاہدین کی انگلیں مردہ ہو چکی ہیں، دلوں نے پست ہو چکے ہیں غنیم کی فوج

انتحای جذبات میں بھری ہوئی۔ ان کے پیچھے ہے لیکن اس قیامت خیز وقت میں جیسا کہ مولوی عاشق الہی نے لکھا ہے کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ شہید کی لاش کو چار پائی پر ڈال کر ”یکے بعد دیگرے تھانہ میں سمت مغرب، زمین کی گود کے حوالہ کیا“ ۷۷

جس کا مطلب یہی ہوا کہ مجاہدین کی یہ واپسی اس شان میں ہو رہی تھی کہ اپنے شہید امیر کھیش کے جسد مبارک کو چار پائی پر ڈالے، تعاقب کرنے والے دشمنوں سے مقابلہ نہ متاثر کرتے لڑتے بھڑتے تھانہ بھونٹ کر پہنچ گئے، ایسی صورت میں مجاہدوں کی اس پسپائی کو بھی اگر فتنہ قرار دیا جائے، تو واقعہ جس رنگ میں پیش آیا ہے مثلاً اس کے لحاظ سے یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔ جو روایت حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی خاکسار تک پہنچی ہے، اسی میں یاد آتا ہے، کہ اہل حقہ کا ذکر فرماتے ہوئے حافظ صاحب نے فرمایا تھا کہ جس وقت مجاہدین حافظ صاحب کے جنازے کو لے کر تھانہ کے قریب پہنچے، خیران کی شہادت کی تھانہ پہلے ہی سے آچکی تھی، ہر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، قصبہ سے باہر نکل کر جنازے کے استقبال کے لئے باجٹیم گریاں، دُقلب دریاں حاجی امداد اللہ دوسروں کے ساتھ انتظار میں کھڑے تھے۔ عاشق کا جو جنازہ مجاہدین کے کندھوں پر دھوم سے چلا آ رہا تھا، جوں ہی کہ حاجی صاحب کی نظر پڑی، بے ساختہ چیخ مچل گئی، اور اسی حال میں یہ فقرہ ان کی زبان پر جاری ہوا۔

”جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا، وہ بات پوری ہو گئی، دیکھنا قصہ بھی ختم ہو گیا۔“

صحیح الفاظ یاد نہیں رہے، بطور روایت، بالمشنی کہہ سکتا ہوں کہ حاصل یہی تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں اسی موقع پر یہ فقرے جو پائے جاتے ہیں، یعنی مجاہدین کی اس آخری پسپائی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں

”پابندگان اسباب و وسائل نے تو شکست پر محمول کیا۔ ادھار فین اور ادباب باطن نے اپنے

غیبی امداد سے بتایا کہ اس جہاد کا آخری نقطہ حافظ صاحب شہید کی شہادت تھی، مکمل مقصد

کے بعد مبادی کی گرم بازادی ختم ہو جاتی ہے، اس لئے حضرت شہید کی شہادت پر یہ سارا

”اسی سلسلہ میں حضرت (نانا توڑی) کو بھی گولی لگی تھی، اور وہ بھی پٹ پڑی پر، جو انتہائی نازک مقام ہوتا ہے، اس سے ڈاڑھی کے کچھ بال بھی جل گئے، لوگوں نے سمجھا کہ شہید ہو گئے، مگر ایک دم ہمت سے اٹھے، اور چہرے پر ہاتھ پھیرا، تو ایسا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔“ ص ۵۵

اسی واقعہ کا تذکرہ مولوی عاشق الہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں بایں الفاظ کیا ہے کہ
 ”حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ بیکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، بعض نے دیکھا کہ نیچی ہیں گولی لگی، اور دماغ یاد کر کے نکل گئی۔“

مزید اضافہ ان کے بیان میں یہ ہے کہ
 اعلیٰ حضرت و مراد حضرت مولانا گنگوہی سے ہے، انہوں نے) لپک کر زخم پر ہاتھ دکھا، اور فرمایا ”کیا ہر مایاں۔“

مولوی عاشق الہی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد
 ”عمارہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔“ ص ۵۶

مولانا طیب اور مولانا عاشق الہی کی توخیر سنی ہوئی روایت ہے لیکن ان سماعی روایتوں کے ساتھ ہم اپنے مصنف امام حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں بھی یہ پاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ
 ”ایک بار گولی چل رہی تھی، بیکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے، پوچھا کیا ہوا، فرمایا کہ سر میں گولی لگی، عمارہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔“ ص ۵۷

ہمارے مصنف امام نے جبکہ اس وقت کا تقنا تھا، اسکی تصریح تو نہیں کی ہے کہ یہ واقعہ کہاں کس موقع پر کیسے پیش آیا، لیکن ظاہر ہے کہ شاعری کے مہداں ہی کے اسی واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں، جس کا تذکرہ مولانا طیب اور مولوی عاشق الہی نے کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مصنف امام کی شہادت کے بعد،

واقعہ میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے، ان کے بیان میں ”ایک بھائی“ سے مراد حضرت مولانا گنگوہی ہیں۔ جن کے نام کی تصریح مولوی عاشق الہی نے کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا طیب اور مولانا عاشق الہی نے تو صرف ایک ہی واقعہ کی حد تک اپنے بیان کو اس سلسلہ میں محدود رکھا ہے۔ لیکن ہمارے مصنف امام نے اس واقعہ کے سوا یہ بھی لکھا ہے کہ

”انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بدوق ماری جس کے سنبھ سے ایک مونچھا اور ڈانچا (مولانا نور تو ہی) کی جل گئی، اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی، اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس پر سنبھ بھی بس تھا، مگر حفاظت الہی برسرِ تھی کچھ اثر نہ ہوا۔“

جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غدر ہی کے زمانہ میں یہ دوسرا حادثہ بھی سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پیش آیا تھا۔

بہر حال حاصل یہی ہے کہ گولی کھانے کے بعد جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔ یہی لوگوں کا مشاہدہ ہے، اب اس کی توجیہ کچھ بھی کی جائے۔ خواہ سیدنا الامام الکبیر کے باطنی تصرف کا نتیجہ اس کو ٹھیکر لایا جاسکے جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ یا حضرت مولانا گنگوہی کی توجہ کو اس میں دخل مانا جائے، جس کی طرف مولانا عاشق الہی کے بیان میں ایسا کیا گیا ہے۔ اب خواہ اسباب کچھ بھی ہوں۔ لیکن واقعہ بہر حال پیش آیا، سوال یہی ہوتا ہے کہ حافظ شہید کے ساتھ بھی اسی طرز عمل یا معاملہ

ملہ گئی گئے کے بعد حضرت دلا کے محفوظ رہنے اور بعض قدر سے خون نکل آئے اور دائرہ صحتی مونچھ کے کچھ بال اڑ جانے پر بس ہو جانے کے ظاہری سبب کے بارہ میں مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف امام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گولی کا بے اثر ہونا خود حضرت دلا ہی کا کرامت تھی۔ میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ حضرت حاجی امداد شاہ قدس سرود نے حضرت دلا کو قاتل ستم مزاج آزاد دہر خوش چہادیں جان سے قطعاً بے پرواہ دیکھ کر جہاں مولانا محمد منیر صاحب کو اٹھ کے پیچھے پیچھے بطور محافظ رہنے پر مامور کیا، وہیں ایک قویذ بھی دیا کہ اسے پکڑی بس رکھیں۔ بعض ثقات سے سونوا ہوا کہ حضرت حافظ صاحب شہید گئے انجلی سے اپنا صاحب دین جیانی پر لگا دیا تھا۔ مولانا عاشق الہی صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے تصرف کی طرف ایسا کیا ہے۔ بہر حال روایات مختلف ہیں۔ لیکن ان میں اختلاف ہے نہ ان میں سے کسی روایت کے انکشاف کی ضرورت۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت دلا کے بڑے اہم عصر و دست سب ہی ان کی طرف متوجہ اہل ان کی طرف سے نگر نہ تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں صیت سے وہ محفوظ رہیں (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کی باطنی تدبیر کے اختیار کرنے میں کون سی چیز مانع تھی، جراحی یا دوسرے عام طبی ذرائع کو ترجیح دینے کے اس بے سرو سامان بے نوابختی کی طرف سے مہیا ہونے کی صورت ہی کیا تھی، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے متعلق دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا، حافظ شہید کے ساتھ بھی چاہا جانا تو یہی کر کے دکھایا جاسکتا تھا، یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور شہید کے جنازے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ جس راز کا افشا، حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ہو گیا اس کے سوا آپ ہی سوچتے کہ معقول جواب اس سوال کا ادا کیا ہو سکتا ہے۔

بھی بات تو یہ ہے کہ مرنے ہی کے لئے جو تڑپ رہا تھا، برسوں سے تڑپ رہا تھا موت ہی کو جو اپنا مطلوب بنا چکا تھا جب اپنی اسی تمنا اور آرزو سے ہم آغوشی کا موقع اس کے سامنے آیا تو شاید اس میں غلغلہ اندازی اگر بدبختی نہیں، تو سودا دہی ضرور تھی، اسی موقع پر نہیں، تادم رخ کے مختلف قرون و داد دار میں اسی قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر حقیقت کی یافت سے لوگ محروم ہو رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جینے کے لئے جو جیتے ہیں، اند مرنے کے لئے مرتے ہیں، ان کی حیات و موت کے قصوں کو بھرجانہ مغالطہ ہو گا، اگر ان لوگوں کی حیات و موت سے ناپا اود جانچا جائے، جو جیتے بھی ہیں،

(سلسلہ صفحہ گزشتہ) کیونکہ ان کے علم و فضل اور قوت، باطنی سے آئندہ کے بہت سے دینی و ملی مہات کی تکمیل محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ہجرت فرمانے کے وقت جب یہ دونوں خلیفہ (حضرت نانوتوی) اور حضرت گنگوہی، آخری طور پر ملنے کے لئے پہنچا (پنجاب) پہنچے اور امرادرشوریا گیا کہ حضرت ہم بھی آپ کے ساتھ اس ملک سے ہجرت کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں بھی ساتھ ہی لے چلئے تو شیخ نے فرمایا کہ نہیں تم ہندوستان ہی میں رہو تم سے حق تعالیٰ کو بہت کچھ لینا ہے۔

محمد طیب غفرلہ

لے شا کر بلا کے تاریکی کا جہیز ہی کو دیکھئے۔ حق و باطل کی کش مکش میں بظاہر دیکھا گیا، کہ باطل ہی کا سرا دہ بچا ہوا، امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور زیدی کامیاب ہوئے۔ لیکن اب یہ کون بتائے کہ ایک دفعہ نہیں، تین تین دفعہ کلی تخلص کر کے جو کچھ اس کے پاس تھا، اللہ کی راہ میں لٹا چکا تھا، کر بلا میں روکنے کے باوجود وہ کس آرزو اور قسمت کے ساتھ کس کے سامنے آیا تھا، ایمان والوں سے ان کے سوال و انفس جو خرید بچا ہے۔ اگر خریدنے والے کے سپرد اس کے خریدے ہوئے سوال و انفس کو بیچنے والے کر رہے ہوں تو خرید و فروخت کے معاملہ میں بتایا جائے کہ اندھرتا ہی کیا ہے۔ بہر حال جن کے ہڈوں نے کر بلائی مشاہدات پیش کئے، ان ہی کے چھوڑنے کی طرف سے شانی کے میدان میں جو کچھ دکھایا اس پر تعجب کیوں کیا جائے۔ ۱۱

تو کسی مقصد کے لئے، اور مرتے بھی ہیں، تو اس سے بھی کسی نصب العین ہی کی تکمیل مقصود ہوتی ہے، سیدنا امام الکبیر زندہ رکھے گئے، کہ جس مقصد کے لئے ان کی زندگی تھی ابھی وہ سامنے نہیں آیا تھا، اور حافظ شہید اٹھائے گئے کہ جس لئے وہ جی رہے تھے ان کی وہی ترنا بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آجی تھی، میں بہت دور نکلا جا رہا ہوں، مجھے واقعہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ مولوی عاشق الہی کی اطلاع کے مطابق میدان کارزار سے دوش بدکش ادا لیتے بدلتے تھانہ بھونک شہید کی لاش پہنچا دی گئی۔ شہید ہونے کی وجہ سے شرعاً نہ کفن ہی کا سوال تھا، اور نہ غسل کا، نماز پڑھ دی گئی اور قصبہ کے باہر غالباً جہاں پر حافظ شہید کا جنازہ اتار دیا گیا تھا، زمین کھود کر ان کو سپرد خاک کر دیا گیا، اب بھی میری کے ایک درخت کے پاس خام قبر شہید کی موجود ہے جس پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت فقیر کو بھی حاصل ہوئی ہے۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں، لیکن ان کے لئے نہیں لوگ اپنے لئے ان پر فاتحہ پڑھنے کے عادی ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ مولانا طیب صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ

”ادھر حضرت (حافظ شہید) کی شہادت ہوئی، اور ادھر دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ دھلی گرفتار ہو گئے اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا“۔

دہلی کے آخری بادشاہ کی گرفتاری، اور ذوال اقتدار کے بعد دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ انتظامی اقتدار و قبضہ کیا تھا، ہندوستان کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً قیام قیامت سے پہلے جانے والے جانتے ہیں کہ گو یا قیامت قائم ہو چکی تھی۔

ان نا قابل بیان، جاں گداز، روح فرسا، ہوش ربا واقعات کی تفصیل سے تاریخ کے خونیں اوراق

پر کشف قبور رکھنے والے صاحب دل کے لطیفہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ امام خوافی رحمۃ اللہ علیہ کا شہداد کے متعلق کچھ اسی قسم کا نقطہ نظر تھا ”اسی لئے جنازے کی نماز کی بھی شہید کے لئے ضرورت نہیں سمجھتے تھے لیکن حدیثوں میں جب آیا ہے کہ جنازہ کی نماز کا قانوہ پڑھنے والوں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مغفرت کی بشارت بعض جملے کی نماز پڑھنے والوں کو دی گئی ہے اور پڑھنے والوں کیلئے اجمود خیر صاحب جنازہ خفا ہے یہی میرا مطلب ہے کہ فاتحہ پڑھنے والوں کی غرض بھی کچھ یہی ہو سکتی ہے جنہوں نے میں شہیدوں پر بھی جنازے کی نماز اسی لئے پڑھی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کا اس میں فائدہ ہے۔ ۱۲

لب ربز ہیں۔ کچھ نہیں اردو کے معنی غالب مرحوم کے خطوط کا جو مشہور مجموعہ ہے۔ صرف اسی کتاب کے چند خطوط کے بعض فقرہوں کا پڑھ لینا کافی ہے۔ دلی میں بیٹھ کر شاہی خاندان کو جس حال میں غالب نے پایا تھا اس کے ان فقرہوں کو نقل کرتے ہوئے قلم کا تپ رہا ہے۔ لکھا ہے کہ

”معزول بادشاہ کے جو یقینہ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ انماش جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوامیں کسبیاں“ ۳۲۳ اردو کے معنی

والعظمت للشیخوتی مسلمانوں کے دارالسلطنت کے متعلق دلی ہی میں بیٹھ کر یہ لکھتے ہوئے کہ

”جس شہر میں ہوں اس کا نام دلی اور محلہ کا نام بلیاردن کا محلہ ہے لیکن ایک دوست بھی اس جہنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا“

آگے قسمیں کھا کر غالب ہی کی گواہی یہ بھی ہے کہ

”دانش و خدمت سے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا“ ۳۵

ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے پاسپورٹ یا پرمٹ وغیرہ کے قصے تو سننے جاتے ہیں لیکن اس وقت دلی میں دیکھا جا رہا تھا خود مرزا غالب دیکھ رہے تھے کہ

”یہاں (دلی) باہر سے اند کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جاتے نہیں پاتا“

نگرانی میں تشدد اور قدغن کا حال یہ تھا،

”جو باہر کے گوردوں سے آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں دھماںبداں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں، یاد دو یہ جرم مان لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے، اور سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کر دے کون بے ٹکٹ متقیم ہے، اور کون ٹکٹ رکھتا ہے“ ۳۱۶

کون اندازہ کر سکتا ہے ان مصائب و آلام کا کہ اپنے گھر میں بھی کوئی ٹکٹ یعنی پرمٹ کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا، اور شہر سے باہر جنگلوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جھونپڑے ڈال ڈال کر جو پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق بھی حسب اطلاع غالب

”کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں، جو مکان بن چکے

ہیں انہیں ڈھادو، اور آئندہ ممانعت کا حکم متادو“ ۲۱۱

اسی دلی میں جہاں مسلمانوں کا لال قلعہ اور جامع مسجد ہے، اسی کے متعلق غالب اپنے خط مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء میں اپنے اس احساس اور اندیشہ کو قلم بند کرتا ہے،

”دیکھا چاہئے مسلمانوں کو آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں“ ۲۱۲

ان ہی خطوط میں دلی کے اسی شہر آشوب کے متعلق غالب نے اپنی ایک مامی نظم کے چند اشعار کا بھی تذکرہ کیا ہے،

بسکہ خیال مایہ ہے آج ہر کشور انگلستان کا

گھر سے بازار میں بکھتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آبِ انسان کا

جو کہ جسکو کہیں وہ قتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر و دی کا ذرہ ذرہ خاک تشہ خوں ہے ہر مسلمان کا

(۳۱۲ اردوئے معلیٰ)

غالب نے جو کچھ دیکھا تھا دلی میں دیکھا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں درحقیقت ملک کے اکثر حصوں کی تصویر کھینچ آئی ہے، دلی اور دلی والوں پر جو کچھ گزرتی تھی تقریباً سارے ماؤف آسیب رسیدہ علاقوں کا حال یہی تھا، اس پر پابہ ہونے والی قیامت کے ہنگاموں سے بچ بکھنے کی ایک مختصر راہ تو یہی تھی جو حافظ شہید کو میسر آئی۔ بندوق کی گولی، صرف ایک گولی نے سارے قصوں کو صرف ختم ہی نہیں کر دیا، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی وحی قرآنی سے علی ربط قائم کر لینے کے بعد جو کچھ دکھایا جلتا ہے اور دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے سے اس جاں نواز انتظار کے کوکون ٹھٹکتا ہے کہ مغلوں کی حکومت ہو، یا پٹھانوں کی، خلیجیوں کی ہو، یا غدیوں کی، الغرض دنیا کی کوئی حکومت مشرقی ہو، یا مغربی، جباری ہو یا جمہوری، فرعون ہو یا اشتراکی جسے مہیا نہیں کر سکتی، بلکہ مہیا کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتی، حافظ شہید امن و عافیت کی ان ہی لازوال راحتوں تک اور چین کی ان ہی نہ ختم ہونے والی

لذتوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ کے نہ حل ہوئے وہ بے سوال کیا یہ قلندری جواب تھا۔ جسے حافظ شہید نے اپنے مقدس اور پاک خون سے لکھ کر پورے چھنے والوں کو دیا تھا۔ جسم کو چھید کر اور پٹیوں کو نوذکر نکل جانے والی گریوں کی دشواریوں کو اپنے لئے حافظ شہید کی طرح جو بھی آسان بنا لئے گا۔ اس کے لئے قلندری راہ ہمیشہ کیلئے کھلی ہوئی ہے۔ لیکن کھانے سے پہلے پیچکا نے والوں کو بھی کیسے چھوڑا جاسکتا تھا، اور کن پر چھوڑا جاتا، دینے والے نے ان ہی کے لئے یہ قربانی دی کہ گری کھانے کی دشواری کو آسان بنا لیں۔ بعد میں اس قلندری راہ کو چھوڑ کر وہ واپس آگیا، ہائے اگر وہ واپس نہ ہوتا، تو جس ملک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو باہر نکل جانے کی دھمکی دی جا رہی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ چلے جانے کے بعد پھر اس ملک میں وہ واپس ہو سکتا تھا، صدق مولانا الکرم

ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سے اترے پھر بیٹھے نہ ان میں اور جو اپنی مذہبی کرپے۔ بیٹھے اور اس (شبابت کے) مشتاق ہیں اور اب تک انہوں نے ذرا تیر و تبدل نہیں کیا۔

من المؤمنین رجال صدقوا ما
عاهدوا اللہ علیہ فممنہم من قضی
نحبہ ومنہم من ینتظر و ما بدّلوا
تبدیلًا (الاحزاب)

یقیناً جو چلے گئے وہ بھی نیچے تھے اور اپنے مالک کو جو عہد کیا تھا اس میں سے کچے تھے لیکن انتظار کی سختیوں کو چیلنے کے لئے جو رک گئے یا روک لئے گئے۔ انہوں نے بھی اپنی بات پوری کی، یہ حافظ شہید کے رفقا رسیدنا الامام الکبیر اور قطب ربانی حضرت گنگوہی قدس اللہ اسرارہم وغیرہم حضرات تھے۔ بہر حال جو چلے گئے وہ چلے ہی گئے، لیکن منتظر بنا کر جو روکے گئے، ان پر کیا گذری، جہاں تک معلوم ہو سکتا ہے، اسے بھی سن لیجئے مولانا عاشق الہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید اور اس کے حاشیہ میں جو کچھ مصباح وقت کا خیال کر کے لکھا ہے۔ سب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ صحاح (ترمذی و سنائی) کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا مجاہد الشہید من مس القتل الاکمل یا مجاہد احد کھ من مس القرصہ (یعنی قتل کی تکلیف شہید کو اس سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی جتنی تکلیف کشش چھو وغیرہ جیسی چیزوں کے کاٹنے سے ہوتی ہے) ۱۲

شاعی کی تحصیل کے کوڑو کو توڑ کر جب گڑھی میں ملنا دکر کے مجاہدین پہنچے ان دست بدست جنگ انگریزی فوج کے سپاہیوں سے شروع ہوئی تو موقع کو غنیمت دیکھ کر بعض منچلوں کا ذہن تحصیل کے خزانے کی طرف منتقل ہو گیا۔ خزانے پر بھی ہلہ بول دیا گیا۔ اور جس وقت حافظ شہید کے جنازے کو کندھوں پر لئے ہوئے با چشم گریاں، دہل بریاں مجاہدین کا طبقہ تھانہ بھون کی طرف جا رہا تھا، اسی وقت ان ہی میں ملے جلے وہ لوگ بھی تھے جو تحصیل کے خزانے سے دست بردار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہاں جو تحصیل کے خزانے سے لوٹا گیا تھا، اس کا انجام کیا ہوا؟ مستقر تھانہ کے امیر پریش کر کے اس کو ”غنیمت“ کا قالب عطا کیا گیا و یا یہ لوٹا ہوا مال صرف لوٹا ہوا مال ہی ہو کر رہ گیا، اس کا تو پتہ نہ چل سکا، لیکن نتیجہ اس کا سب ہی کو جھگٹنا پڑا۔ مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ

”جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے جانے اور خزانے کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم (غالبا مظفرنگر کا ٹکڑا) شاعی پہنچا، اور چار طرف نعشوں اور قصبہ کی ٹیرانی دہرادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا۔“

لکھا ہے کہ غینہ و غضب کے اسی ارتعاشی حال میں زبان سے اسی انگریزی افسر کے یہ فقرہ نکلا کہ

”تھانہ بھون کو بھی اسی طرح سہا کر کر چھوڑوں گا۔“ ص ۷۲

اس وقت تو صرف اسی قول کو ساتھ مظفرنگر واپس ہو گیا۔ لیکن جوں ہی کہ (جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے)

”دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی۔“

ہر ایک کے سامنے اس کا قول ”فعل“ کی دھکیں تھانہ بھون والوں کو دینے لگا، مولوی صاحب کا بیان ہے،

”تھانہ میں خبر گرم ہوئی، کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچا چاہتی ہے۔“

تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی تو حکومت کے نزدیک اس ہنگامہ کے بانی ہی تھے لیکن خود مولوی عاشق الہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اسی عرصہ میں یعنی شاعی کو دیکھ کر

منظر نگر کا حاکم واپس ہوا اور دلی کی فتح کی خبر پہنچی اس درمیانی وقت میں سرکاری گوندوں نے حکومت تک یہ خبر بھی پہنچائی، مولانا کے الفاظ یہ ہیں

”کہ تمھانہ بھون کے فساد میں اصل الاصول ہی لوگ تھے“

یہی لوگ سے مراد تمھانہ بھون کی جہادی ہم کے امیر المومنین حضرت حاجی اماد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء مسجد نالامام اعلیٰ مولانا گنگوہیؒ وغیرہم حضرات تھے۔ لکھا ہے کہ رپورٹ میں مخبری کی گئی تھی کہ

”شامی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا بھی یہی گروہ تھا، بستی کی دو گانوں کے چھپرائیوں نے تحصیل کے دروازہ پر جمع کئے، اور اس میں آگ لگا دی یہاں تک کہ جس وقت آدھے کوڑا ہل گئے، ابھی آگ بجھ رہی نہ پانی تھی کہ ان بڑے ملافوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا“ مکتبہ تذکرۃ الرشید ج ۱

ادھر مخبری کی یہ کارروائی سرکار میں جاری تھی کہ حاکم منظر نگر جو شامی کے انتقامی غصہ کی آگ میں جل نہیں رہا تھا، دلی کی فتح کی خبر سننے کے ساتھ ہی، اس کے زیر اقتدار فوجیوں کا جو دستہ تھا، اسکو تمھانہ بھون

لے جیسا کہ پڑھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ تقریباً یہ وہی بات ہے جس کی تفصیل مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے پہلے نقل کر چکا ہوں بیان میں اختلاف صرف اسی حد تک ہے کہ مولانا کی یادداشت میں دو دہائے کو باہر کی کٹیا کہ چھپرائے کا ذکر کیا گیا ہے جس کو فوج کوڑوں کو چلائے کیلئے آگ لگا دی گئی تھی اور مولانا صاحب نے اپنی بجائے کٹیا کے فرماتے ہیں کہ بستی کی دو گانوں کے چھپروں سے یہ کام لیا گیا، خاک دار نے حافظہ محمد احمد صاحب مرحوم سے شامی کی ہم کی جو داستان براہ راست سنی تھی۔ جہاں تک خیال آتا ہے، اس سے مولانا طیب صاحب ہی کی یادداشت دلی روایت کے الفاظ کی تائید ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ چھپراؤ تحصیل سے باہر بڑا ہوا تھا۔ اس میں تحصیل والوں کی عام ضرورتوں کیلئے لوگ دکان بھی لگاتے ہوں۔ یوں کوئی چاہے تو دونوں روایتوں میں تطبیق بھی دے سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ مخبری کی اس رپورٹ میں ان بزرگوں کی طرف خزانے کی لوٹ کو جو منسوب کیا گیا ہے۔ میرزا خیال دہی ہے کہ مجاہدین میں بعضوں سے یہ فعل سرزد ہوا، جس سے مخبروں کو موقع مل گیا جو ان حضرات کی طرف اس کو منسوب کر دیا مگر یہ جنگ کے مواقع میں قانون حیات کی رو سے فہم کے مال کے ساتھ اس قسم کا تصرف غیر قانونی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن بحث یہاں واقعات سے ہے، اس رپورٹ کے بارہویں آج تک نہ کسی سے سنئے ہی میں آیا نہ کہیں پڑھا کہ ان بزرگوں نے کوئی مالی استفادہ بھی کیا تھا۔ ۱۲

کی طرف مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ منظر نگر سے تھانہ بھون کا فاصلہ ہی کتنا تھا، خیریں تو پہلے ہی سے آ رہی تھیں، مولنا عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

”صبح صادق نمودار ہوئی، تو بلائے بے درماں اپنے ساتھ لائی، تھانہ بھون کو سرکاری فوج سے گھیر لیا گیا“

لکھا ہے کہ

”مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہو گئی“

مولنا کے بیان میں تو اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، مگر قصبہ والوں نے اس گولہ باری کے مقابلہ میں کیا کیا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خاکسار نے یہ سنا تھا کہ شروع میں تھانہ والوں نے سرکاری فوج سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، فیصل کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے اور کوئی توپ جو تھانہ والوں کو کہیں سے مل گئی تھی، ممکن ہے کہ شامی ہی کی گڑھی میں ہاتھ آئی ہو، بہر حال حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ کسی بلند مقام پر اسی توپ کو چڑھا کر قصبہ والوں کی طرف سے جوابی فائر ہونے لگے، ایک دفعہ اتفاقاً یہ عجیب صورت پیش آئی کہ گولا جو قصبہ والوں کی توپ سے پھینکا گیا تھا، ٹھیک غلیم کی توپ کے دھانے پر جا کر پڑا، انگریزی فوج کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہاں یہ مشکل ایک آدھ توپ غریبوں کو میسر آ گئی تھی، گولہ بارود کی مقدار بھی ان کے پاس اتنی کہاں سے ہوتی، جو انگریزوں کی توپوں اور گولہ بارود کے ذخیرے کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتی، مولنا عاشق الہی صاحب کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ والے چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ٹوٹ سکے، ان کے الفاظ میں

”دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہو گئی“

پھر کیا ہوا؟ اختتام کی دہی جہنم جو منظر نگر کے کلکٹر کے سینے میں دبی ہوئی تھی، ابل پڑی، مولنا نے لکھا ہے کہ

”قتل و قاتل، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا، اور رات کی تاریکی کے چھائے سے پہلی پہلو، شہر بپاہ کے چاروں دروازے اڑا دئے گئے، اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ دسے دی گئی۔“

ان الفاظ پر اضافہ کی ظاہر ہے کہ ضرورت ہی کیلئے؟ تمہانہ بھون کا سامنا قصبہ دی جنم بن گیا جو منظر نگر کے کلکٹر کے اندر چھپی ہوئی تھی، ”ان زندہ انسانوں میں کے گھروں سے باہر نڈا انگریزی فوج کی گولیاں برس رہی تھیں، اور گھروں کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ عورتوں بچوں، بوڑھوں، معذوروں پر کیا گزری ہوگی یا ان حالات میں کیا گزر سکتی ہے، انسان تو اس کے سوچنے کی بھی تاب نہیں لاسکتا، لیکن منظر نگر کا انگریز عیسائی حاکم نہتوں اور بیکسوں کے ساتھ یہی کر رہا تھا اور کر کے دکھا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ گھروں کے اندر آگ تھی، اور گھروں سے باہر بندو قوں کی باڑھ تھی، بلکہ مولنا عاشق الہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ چھوڑ کر جہاں چاہتے تھے، ان پر بھی راہ گزرا اس لئے بند تھی، کہ ”عالم کس میری میں نواح و حوالی کے دیہاتیوں کی لوٹ مار اور بے جا حرکتوں کا زیادہ موقع ملا۔“

گویا ع جاے مانڈن ہرہ قتل شدہ، مسدود سفر تاہم واقعات بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے قصبہ کے رئیس بے چارے قاضی عنایت علی کو دیکھا گیا کہ وہ لاپتہ ہیں، مولنا عاشق الہی نے ان ہی کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ ”خدا جیسے کہاں گئے، اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہ چلا۔“ کہنے والے کہتے تھے جیسا کہ مولنا ہی نے لکھا ہے کہ

”آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے چند ہمراہیان کے تمہانہ بھون کو خیر باد کہی، اور بسمت نیچ آ یا دروازہ ہوئے۔“

اگر یہ صحیح ہے، تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ہالیہ کے کوہستانوں میں قاضی صاحب نے اپنے آپ کو شاید گم کر دیا ہو، نیچ آباد جو فامن ہال کی شہر آبادی ہے، اس کی طرف سرائی کا مطلب بظاہر ہی ہو سکتا ہے، مولنا علم بالصواب باقی تمہانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ بہا جو مکی رحمۃ اللہ علیہ

ایمان کے دونوں مرتبہ عزیزیدنا الامام الکبیر اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم ان بزرگوں پر کرا گدڑی
 معلومات جو ہم تک پہنچی ہیں ان کی روشنی میں ان سوالوں کا صحیح جواب دینا میرے لئے کافی دشوار ہے
 مطلب یہ ہے کہ شاعری سے واپس ہونے اور حافظ شہید کے وطن کو دینے کے ساتھ ہی حضرت
 منتشر ہو گئے، یا تھانہ ہی میں کچھ دن مقیم رہے، پھر حکومت کے نمائندے کی طرف سے جب تھانہ بھون
 پر انتقام کی جہتم اٹیٹنی گئی، اس وقت یہ حضرات کہاں تھے؟

مولانا عاشق الہی صاحب کی کتاب میں بھی کوئی واضح جواب ان باتوں کا نہیں ملتا، ان کے بیان پر جو کچھ
 بھی معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ گو مندوں کی بخبری کے بعد

”ان تینوں حضرات کے نام، چونکہ دارنشاہ گرجا کی جاری ہو چکے، اور گرفتار کنندہ نے
 لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا، اس لئے لوگ تلاش میں سامعی اور حراست کی جنگ دوہیں پھرتے
 تھے“ مکتدۃ الرشید ج ۱

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تھانہ بھون میں حکومت کی رسائی ان لوگوں تک نہ ہو سکی، اور دارنشاہ
 جاری کر کے حکومت کے کارندے ان کی گرفتاری کی فکر میں مشغول ہو گئے، ہمارے مصنف امام
 نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر و مردوسری دفعہ بندوق کی گولی جب چلائی گئی،
 جس میں سوچا اور وارثی کا کچھ حصہ فائز کے سفینے سے جل بھی گیا تھا، اسی سلسلہ میں ان ہی کے حوالہ سے
 یہ بھی نقل کر چکا ہوں کہ

”کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا“

آنکھ کے اس قدرے صدمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ
 ”اس زخم کی خبر اجالی، بعض دشمنوں نے جو شنی، تو سرکاری بخبری کی کہ تھانہ بھون کے
 قلعہ میں شریک تھے“ مکتدۃ

گویا اس ”زخم چشم“ کو مجرم کی شناخت کی علامت بنانے والوں نے بتائی ہوگی۔ بخبروں کی سامعی گواہیوں
 کے ساتھ اس ”یعنی شہادت“ کے قصے نے قہر تائب نسبت دوسروں کے سیدنا الامام الکبیر کے مسئلہ کو

زیادہ اہم بنادیا، لیکن اس اہمیت کا حال سنئے، جو نہیں ڈھونڈے جارہے تھے، مولنا طیب صاحب نے ”متوسلین و خدام“ کے عنوان سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”متوسلین اور خدام نے عرض کیا کہ احتیاط خلاف توکل نہیں، حضرت ردپوش ہو جائیں“

مگر اختتام کے نہر سے ملو و معرہ حکومت زہریلے، سانپ کی طرح بل کھانے والی جسے ڈھونڈ رہی تھی، خود اس کا حال کیا تھا مولنا طیب کی اسی یادداشت میں ہے کہ

”حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی نظری شجاعت اور بہت قلب سے کھلے بندوں پھر رہے تھے“

مگر ”ردپوشی“ کے مشورہ دینے والوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا تب جیسا کہ اسی یادداشت میں ہے،

”اپنی سسرال کے عالی شان مکان (دربان) میں ردپوش ہوئے“

لیکن یہ ردپوشی جو اصرار ملیخ کے بعد اختیار کی گئی تھی، جانتے ہیں اس کا سلسلہ کتنے دنوں تک جاری رہا، سال دماہ نہیں، دنوں کے حساب سے لے دے کہ حسب روایت مولنا طیب صاحب تین دن سے آگے نہ بڑھ سکا مولنا کے الفاظ ہیں

”تین دن پورے ہوتے ہی، اکدم پھر باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگو“

ظاہر ہے کہ ردپوشی کے سوا، حفاظت و نگہبانی کا کوئی دوسرا ذریعہ جن بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ چانک باہر نکلنے کی اس جسارت پر جتنے بھی سراپیمہ ہوتے، اپنی یافت و عقل کے مطابق اُن کی سرانگی یا نکل بجا تھی، مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

”لوگوں نے پھر بہت ردپوشی کیلئے عرض کیا“

اس موقع پر سیدنا امام الکبیر کی طرف سے حجاب میں جس عذر کو پیش کیا گیا تھا، اسی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، انصاف سے کام لینا چاہئے، شاعی کے میدان کی سطح پر ذاتیات کا جو تن لکھا گیا تھا، اور فقیر نے عرض کیا تھا کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پیش تر، تاریخ کے پاک ترین عہد میں جو واقعات

سرزمین عرب میں پیش آئے۔ اسی کی شرح مجھے شامی کے میدان کا یہ متن نظر آتا ہے۔ اس کو میری ذاتی خوش اعتقادی قرار دینے والوں کو چاہئے کہ مسیدنا الامام الکبیر کے اس جواب کو ذرا غور سے پڑھیں دوبارہ روپوشی کی طرف توجہ دلانے والوں سے فرمایا گیا کہ

”تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں“

دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے یاد دلایا گیا کہ

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں“

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے، اور دارالعلوم کے مقلدین حضرت دالہ کے اس جواب کا چرچا تقریباً صد تواریک پہنچا ہوا ہے، سوچنا چاہئے کہ اس جہادی مہم کے آغاز ہی سے امارت، بیعت، والدین کی اجازت وغیرہ ہر موقع پر تاریخ کے اسی مقدس دور کی طرف مڑ کر جو مسلسل دیکھتا رہا ہو، تاریک مہم جب ختم ہوتی ہے، تو دیوان کی ڈبڑ بھی کی روپوشی میں ”غار ثور“ کی تجلی جس کی نظروں کو سامنے تڑپ رہی ہو، الغرض غلام جو قدم بھی اٹھاتا ہو، یہ دیکھ کر اٹھاتا ہو، کہ اس کے آقا نے اپنا مبارک مسعود قدم کہاں کہاں رکھا تھا، کس طرح رکھا تھا، جس کے ادراک کی لطافت کا اس باب میں یہ حل ہو، کہ ”مطلق روپوشی“ کے جواز کا نتیجہ ”غار ثور“ کے واقعہ سے جو نکلتا ہے، نتیجے کے اس اخلاق پر اس کا دل راضی نہیں ہے، بلکہ جتنے دنوں تک غار ثور میں روپوشی کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا، دنوں کی اس اتفاقی قید کو بھی اتباع سنت کا لازمی جز رکھ اذکم اپنی ذات کی حد تک قرار دے رہا ہو، اور جن ہی کر اسکی روپوشی کی مدت غار ثور دالی روپوشی کے حدود سے آگے بڑھنے لگی، جان گسل روح گداز خطرات کی پروا کئے بغیر اپنی روپوشی کو ختم کر کے باہر نکل گیا ہو، کہنے والے لاکھ سمجھا رہے ہوں، لیکن تین دن سے زیادہ روپوشی پر آخر وقت تک آمادہ نہ ہوا، الغرض جو کچھ کر کے دکھایا گیا تھا، اس کے سوا جو کچھ دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا، اگر اسی کو شامی کے مختصر میدان میں وہ سب کچھ دکھایا گیا، جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا، تو جزا و وفا کے قدرتی قانون کا اقتضائے اس کے سوا خود ہی سوچئے کہ اصر کیا ہوتا، آخر جس راہ میں چلے والے

کو بشارت دی گئی ہو کہ ایک ہالٹ جوائے بڑھتا ہے، اس کی طرف بڑھنے والا ایک ہاتھ بڑھ جاتا ہے اور معمولی رفتار سے جو چلتا ہے، اس کی طرف آنے والا دوڑ کر (سر دلت) آتا ہے، ایک حصہ کو مواضع میں دس تک، ایک جہر دلت، کرات سرتک، بلکہ بیضا علف لمن یشاء (بڑھانا ہے اس کا مواضع جہاں تک چاہتا ہے) پہنچا دیتا ہے، وہاں جو کچھ ہو گا لوگوں کو اس پر تعجب ہے۔ حالانکہ حیرت تو اس وقت ہوتی جب یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

جو ہو سکتا ہے، اسے کر کے دیکھو، پھر بظاہر جو نہیں ہو سکتا ہے، وہ بھی دکھایا جاتا ہے اور اس کو سوچ رہا ہو یا نہ سوچ رہا ہو، لیکن جہاں نہیں دیکھا جاسکتا تھا، دیکھنے والوں کو وہیں بدرجہا دکھایا گیا اور احمد بھی، خندق بھی اور خیبر بھی، موت بھی اور ثور کا غار بھی، بلکہ تمھانہ بھون کے جہاد کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو بالآخر افتادارض میں "مہاجر مکی" کے نام سے مشہور ہوئے، ان کے دل میں جو یہ ڈالا گیا، جیسا کہ مولانا عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

"وطن کو خیبر یاد کہی، اور یہ نیت حرمین گھر سے باہر نکلے" مثلاً تذکرۃ الرشید

صرف کہ معظمہ نہیں بلکہ حرمین کی نیت ہندوستان سے ہجرت کے وقت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تھی۔ تو مدینہ منورہ کی طرف تاوانجی ہجرت تیرہ سو سال پیش تر ہوئی تھی، اس ہجرت کی پرچھائیں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت میں اگر دکھائی دے تو واقعہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا،

بہر حال تمھانہ بھون میں تو حکومت کی طرف سے آگ لگادی گئی، قصہ کے رئیس قاضی غلام علی ہمالیہ کی وادیوں میں گم ہو گئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تمھانہ کے جہاد کے امیر حرمین کی نیت کر کے عرب کی سمت روانہ ہو گئے، مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی گنگوہ کے سوا زیادہ وقت اس زمانہ میں رامپور نہیاران کے طبیب اور اپنے مخلص دوست حکیم ضیاء الدین کے یہاں گزارا ہے۔ تھے اور سیدنا الامام الکبیر قصہ دیوبند کی دیوان والی ڈیوڑھی میں تین دن وپوش رہنے کے بعد باہر نکل آئے۔ کیوں باہر نکل آئے۔ اس کی وجہ تو خود ان ہی کی زبانی سن چکے۔ لیکن

جس طرح نیکے، وہ بھی کم دل چسپ نہیں ہے۔ ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے، یہ لکھ کر کہ

”ایام بد پوشی میں ایک روز دیوبند تھے، زمانہ مکان کے کوٹھے پر“ ۱۷۵

کہ اتفاقاً یہ صورت پیش آئی کہ گھر میں اس وقت

”مردوں میں سے کوئی نہ تھا، زینہ پر آکر فرمایا، پردہ کر لو، میں باہر جاتا ہوں“ ۱۷۶

ظاہر ہے کہ بے چاری عورتوں میں آپ کے اس خطرناک ارادے سے کافی کھلبلی مچ گئی، روکنے کی ممکنہ کوشش ان کی طرف سے کی گئی، لیکن کارگر نہ ہوئی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

”عورتوں سے نہ رک سکے، باہر چلے گئے“ ۱۷۷

آجے مصنف امام نے واقعات کا ذکر ایسے بہم اچھل الفاظ میں احتیاط کیا ہے کہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عورتوں نے جب دیکھا کہ حضرت تو باہر نکل جاتے ہیں کامیاب ہو گئے، تو کسی ذریعہ سے گھر کے مردوں تک آپ کے نکل جانے کی اطلاع عورتوں نے پہنچائی، سرکاری جاسوس گھومتے ہی رہتے تھے، ان کو سن گن جو کچھ گئی، تو دیوبان کی ٹرور ٹھی پر دھاوا کر دیا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

”بعض مرد بازار میں تھے، ان کو اطلاع کی۔ وہ اتنے میں مکان پر پہنچے، دوڑ سرکاری آدمیوں کی

پہنچ گئی تھی، انہوں نے آکر تلاشی لی“ ۱۷۸

لیکن ایسے وقت میں تلاشی اس مکان کی کی گئی، جب سینہ الامام الکبیر اس مکان کے احاطہ سے باہر ہو چکے تھے۔ ناکامی اور تاراجی کے ساتھ سرکاری دوڑ کو واپس ہونا پڑا، خدا نخواستہ باہر نکلنے کے بجائے حضرت مکان کے اندر ہوتے، تو گرفتار ہو جانا آپ کا لگتی تھا، لیکن لطیف خیر کے لطف خفی کا اشارہ تھا کہ عین وقت پر اس مکان سے باہر ہو جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا، اور مردوں کے نہ ہونے کی وجہ سے نکل جانے کا موقع بھی باسانی مل گیا۔

عسی ان تکوہوا شیدا وھو خیر لکھ | قریب ہے کہ تم کسی بات کو کردہ سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو

کی قرآنی خبر کی تحریروں سے یوں ہی تصدیق ہوتی رہتی ہے۔

مصنف امام نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

”اس کے بعد سے (یعنی دہان مالوں کا گھر سرکاری مخبروں کی نگاہوں پر جب چڑھ گیا تھا)

مسجد میں رہتے۔“

مسجد سے مراد بظاہر چھتہ کی مشہور مسجد ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مسجد میں قیام کا یہ زمانہ بھی جس طریقہ سے گزرا، اس کا کچھ اندازہ مولانا طیب صاحب کی یادداشت کی اس اطلاع سے ہو سکتا ہے، یہ لکھ کر کہ

”مخبروں کی خبروں سے کہیں نہ کہیں پولیس حضرت کو پالیتی تھی، لیکن منجانباً سے حفاظت

ہوتی تھی۔“

اسی سلسلہ میں چھتہ کی مسجد کے قیام کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے وہی رقم طراز ہیں کہ

مخبر نے خبر دی کہ حضرت (نانوتوی) چھتہ کی مسجد میں ہیں، دوش آئی، مسجد کا محاصرہ کر لیا، کپتان پولیس مسجد میں آ رہا حضرت ٹہل رہے تھے۔“

یوں کپتان کی نظر آپ پر پڑی اور آپ کی کپتان پر، مولانا نے لکھا ہے کہ

”کپتان نے خود حضرت (نانوتوی) سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟“

سیدنا امام الکبیر کی طرف منسوب کر کے دارالعلوم دیوبند کے حلقوں میں ایک دل چسپ لطیفہ حاضر جوابی

کے متعلق جو مشہور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر اس لطیفہ کا ظہور ہوا تھا۔ لطیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ

اگر سوچا جائے تو جہادی سنن میں ایک سنت کی تعمیل کی سعادت اس ذریعہ سے حاصل ہوئی، بہر حال ہوا

یہ کہ جسے ڈھونڈ رہا تھا، خود اسی سے اس کا پتہ جب کپتان دریافت کر رہا تھا، گویا غالباً فی بات سے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کچھ بھی صورت جب پیش آئی تو عیاں کہ مولانا طیب نے لکھا ہے سیدنا امام الکبیر نے

”ایک قدم ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے دیکھ لیجئے۔“

حضرت ٹہل رہے تھے۔ ٹہلنے والے کا ہر دو سرا قدم ظاہر ہے کہ اس جگہ پر نہیں پڑتا، جہاں وہ پہلے

ہوتا ہے جس جگہ کو چھوڑ چکے تھے۔ اسی جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ ”یہیں تھے“ جو بالکل قطع کے مطابق بات تھی، ”دیکھ لیجئے“ یعنی جسے ڈھونڈ رہے ہو اسے تم دیکھ بھی سکتے ہو، لیکن جہاں تو راہم بنظر و ن الیہ و ہم لا یبصرون

تو دیکھتا ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوچ نہیں رہا تھا۔

کپتان غریب دیکھ رہا تھا، لیکن جسے ڈھونڈ رہا تھا وہ اسے سمجھائی نہ دیا، اور قبول ہو لانا طیب صاحب ”کپتان دیکھ بھال میں مصروف ہوا“

زور دیکھا ہوا تھا، اس کو کپتان کی نظروں سے اوجھل ہونے کا موقع مل گیا، اور یوں ”حضرت زانو توئی“ غایتِ اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے، اور پولیس کو گھیرے میں سے گزرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد شاہ رمزا الدین کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس عرصہ میں کپتان بھی مسجد سے باہر نکلا، اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، اور کس علامت سے اس نے پہچانا، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

”کپتان مسجد سے باہر نکلا، اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا کہ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں، جو جارہے ہیں، پولیس ادھر چلی، اور مسجد شاہ رمزا الدین کا محاصرہ کر لیا، آگے جو صورت پیش آئی، یعنی کھا ہے کہ

”حضرت وہاں (مسجد شاہ رمزا الدین) سے نکلے اور پولیس کے جتنے میں سے گزرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے“

کپتان کے یہ کہنے کے باوجود کہ ”مولانا یہی معلوم ہوتے ہیں“ پولیس کے جتنے میں سے گزرتے ہوئے نکل جانے کی توجیہ میں یحزاس کے کہ

اور ہم نے ایک آذان کے سامنے کر دی، اور ایک آذان کے پیچھے کر دی، جس نے (بہ طرف سے) ان کو پردوں سے گھیر لیا، سو وہ (کس چیز کو) نہیں دیکھ سکتے۔

و جعلنا من بین یدیہم سداً ومن خلفہم سداً فاعشیناہم فہم لا یبصرون

اور کیا کہتا جائے۔ اسلام کی تاریخ میں اس فرائی حقیقت کا تجربہ پہلی دفعہ نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ غلام تھلن ہی نعمتی سے نوازا جا رہا تھا جن سے آقا کو سرفرازی بخشی تھی لیکن غلامی کر کے ترکوئی دیکھے پولیس والوں کے ساتھ آنکھ مچنی کا یہ کھیل جو کیا آیا تھا، اور مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں آگے جو یہ الفاظ ہیں

”غرض پولیس کا چکر، اور حضرت کا یہ دورِ عرصہ تک جاری رہا، ”مگر“ بخدا ظلت الہی“ پولیس حضرت پر قابو نہ پاسکی“ منا

ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک آدھ بار ہی بصورت پیش نہیں آئی، بلکہ بار بار تہری کرتے والوں کے اشارے سے پولیس بھیجا کرتی تھی، لیکن یہی سین چار چکروں میں اسے پچھے چھوڑ کر چھڑانے والا اپنا چھپا چھڑا لیا کرتا تھا، اور قصہ دیوبند ہی تک محدود نہ رہا۔ مولنا طیب صاحب کی ہی یادداشت میں ”چکوالی“ کے گاؤں کی سرگزشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ خیال آتا ہے کہ کسی موقع پر اجماع کسی دوسری ضرورت سے اس کا ذکر گزر بھی چکا ہے، اسی اجمال کی اب تفصیل سنئے۔

مولنا طیب صاحب کا بیان ہے، کہ پولیس والوں کے بار بار آداب کی ہتھکنٹوں سے تنگ آکر آخر سیدنا امام الکبیر کے نسبتی بھائی شیخ نہال احمد مرحوم رئیس دیوبند جن سے ہماری اس کتاب کے پڑھنے والے کافی طور پر شناسا ہو چکے ہیں، ان ہی شیخ صاحب نے

”حضرت نانوتوی کو مجبور کیا کہ چند دن، ان کے گاؤں موضع چکوالی میں قیام فرمائیں“

اصرار اتنا شدید تھا، کہ ان کے مشورہ پر عمل کرنا ہی پڑا، اور حضرت چکوالی پہنچ گئے، چکوالی کے محل وقوع کو بتاتے ہوئے مولنا طیب نے لکھا ہے کہ یہ گاؤں

”نافرمانی اور دیوبند کی درمیانی مرگ پر واقع ہے“

لیکن زیادہ دن تک اس گاؤں میں آپ کے قیام کا واقعہ پوشیدہ نہ رہ سکا، پتہ چلائے والوں کو خبر ہو گئی، یادداشت میں ہے کہ

”مخبر نے اس قیام کی گورنمنٹ میں اطلاع کر دی“

جیسا کہ چاہئے تھا۔

”دش چکو الی پہنچ گئی، پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام ابراہیم کے ساتھ خود شیخ نہال احمد مرحوم بھی بطور رفاقت کے اسی گاؤں میں مقیم تھے۔ گاؤں کا محاصرہ پولیس والوں نے کر لیا ہے۔ اس واقعہ سے واقف ہونیکے ساتھ ہی جیسا کہ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے۔

”شیخ نہال احمد صاحب کے نو چھکے پھوٹ گئے، سخت خائف اور ہراساں ہوئے۔“

لیکن خوف دہراس کی اس کیفیت میں بقول مولانا طیب صاحب شیخ صاحب کے اس احساس کو زیادہ دخل تھا کہ

”مولانا (نافوتوی) کی گرفتاری میرے گاؤں میں ہو، جس میں میں ہی خود حضرت کو باصرار لے کر آیا ہوں۔“

لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی پریشان حالی کی وجہ کہ حضرت نافوتوی نے ذرا ہوشیاری میں فرمایا کہ

”اس طرح خوف زندہ صورت بنا کر تو آپ مجھے پکڑو اگر رہیں گے۔“

اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

”آپ بالکل مطمئن رہیں، میں اپنا بچاؤ خود کر لوں گا۔“

چکو الی میں شیخ صاحب کا جو مکان تھا، اس میں بھی زنانہ مردانہ دو حصے تھے۔ حضرت والا کو لیکر شیخ صاحب اسی زنانہ حصہ میں رہا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کو تو اسی زنانہ حصہ میں چھوڑ کر بدھڑک لکھا ہے کہ

”حضرت (نافوتوی) باہر نکل آئے۔“

سامنے پولیس کا کپتان کھڑا تھا، نظریہ پڑتے ہی، بغیر کسی اضطراب اور گھبراہٹ کے کپتان کو مخاطب بناتے ہوئے فرماتے گئے

”آئیے آئیے تشریف لائیے۔“

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ روایت میں یہ بھی ہے کہ کپتان صاحب کے لئے چار تیار کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ چار تیار ہو کر آئی، یلائی گئی، کپتان بھی آپ سے مانوس ہو کر پوچھتا رہا کہ ”آپ مولانا محمد قاسم صاحب راقف ہیں؟“

جواب میں یہ کہتے ہوئے کہ

”جی ہاں میں ان کو خوب جانتا ہوں“

مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”اپنی زبان سے اپنے مناسب وقت حالات بیان فرماتے رہے۔“

اس پر کپتان نے کہا کہ

”ہم زنانہ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں“

ظاہر ہے کہ تلاشی جس کے لئے کپتان صاحب لینا چاہتے تھے وہ تو ان کو ملا ہوا تھا، زنانہ مکان جن کو ان کا شکوکہاں ملتا۔ بخند چینی ارشاد فرمایا گیا

”شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں“

لکھا ہے کہ کپتان زنانہ حصہ میں داخل ہوا، اور

کو نہ کو نہ چھان مارا۔“

لیکن جو کھویا ہوا ہوتا، اسے البتہ پاسکتا تھا۔ مگر جسے پائے ہوئے تھا، وہ اس کو کھویا ہوا سمجھ کر ڈھونڈ رہا تھا۔ اس ڈھونڈتھ اور تلاش کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی ہوا، لطف یہ ہے، جیسا کہ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ

”حضرت (نانوتوی) کپتان کے ساتھ ساتھ تلاشی دلانے میں مصروف تھے“ عذرا

ناکامی اور نامرادی کے ساتھ غریب زنانہ مکان سے واپس ہوا، جب تلاش و جستجو کے سلسلے میں ختم ہو گئے، اور کپتان چکوالی سے رخصت ہونے لگا تو لکھا ہے کہ

”حضرت بھی اس سے رخصت ہو کر نانوتہ روانہ ہو گئے“

انتی ہنگ و دو کینج و کاڈ کے بعد یہ ناکامی دنا مرادی کپتان کے لئے کافی ہیجان انگیز اور تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ نزلہ کے گرنے کے لئے مجبر کا ضعیف و ہرداس کے ساتھ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ اسی "مضرب ضعیف" کو مشق کا تختہ بنا کر

"کپتان نے بہت ڈانٹا، کہ تو غلط خبریں دیا کرتا ہے"

مجبر نے اس وقت کپتان صاحب سے عرض کیا کہ

"آپ نے غم نہ نہیں کیا، کہیں مولنا سہی صاحب تو نہ تھے، جنہوں نے تلاشی دلوائی"

جب چنگ کر چڑیا کھیت سے اڑ چکی تھی، اس وقت مجبر صاحب بھی چوکنے لگے تھے، اور ان کی توجہ دلائل سے کہتے ہیں کہ

"کپتان نے وارنٹ حبیب سے نکال کر حلیہ پڑھا تو حضرت نانوتوی کے چہرے ہلے

پر منطبق پایا"

مگر نانوتہ اور اس کے گرد و نواح کے گھپ اندھیرے گھنے نخلستانی جنگل کو جس نے دیکھا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ چکوالی نے نکل جانے کے بعد راستہ میں گرفتار کرنا آسان نہ تھا۔ غصہ میں کپتان نے حکم دیا کہ دو مشن نانوتہ کی طرف راج کرے۔ مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ لوگ پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے، قبل اس کے کہ دو مشن نانوتہ پہنچے، مسید مالامام الکبیر کو اطلاع ہو گئی اور بقول مولنا طیب "دوسرے راستہ سے دیوبند پہنچ گئے"

پیدل چلتے پھرے کی عادت آج کام آ رہی تھی، ابھی چکوالی میں تھے، چکوالی سے نانوتہ پہنچے، ابھی سانس لینے بھی نہ پائے تھے، کہ وہاں سے بھی روانہ ہو گئے، اور دم کے دم میں چوبیس میل کے دراز فاصلہ کو طے کر کے حضرت والا دیوبند میں رونق افروز تھے

ہر پھر کر پولیس والوں نے پھر دیوبند ہی کی مسجدوں میں آپ کا سراغ لگانا چاہا۔ لیکن یہاں وہی ایک مسجد سے دوسری مسجد، دوسری مسجد سے تیسری مسجد کا چکر جاری رہا، پولیس بھی گھومتی رہی، لیکن گھومنے کے سوا کچھ نہ ہونڈھ رہی تھی اس کے پاسے میں آخر وقت تک کامیاب نہ ہوئی،

مولانا طیب نے لکھا ہے

”غرض پولیس کو چکر میں رکھا، اور گرفتار نہ ہوئے“

اس قسم کے قصوں کا سنانا بھی آسان ہے اور سن لینا بھی آسان ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کا قصہ سنا گیا خود وہ جس آسانی کے ساتھ ان جاں فرسا ہائلہ حوادث سے گزر رہا تھا، ہر شخص کے لئے گزرنا آسان نہیں ہے، یہ پناہ قوت رکھنے والی ملکیت کے سامنے سینہ تان کر انتہائی لاپرواہی کے ساتھ صحیح معنوں میں دہی ٹھہر سکتا ہے، جس پر السموات والارض کی ملکوت دیا دشاہت کا صحیح راز آشکارا ہو چکا ہو۔ پیار بھی اس کے قدموں کے نیچے پانی بن جاتے ہیں۔ اہل آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی کا تماشا کیا نہیں دکھایا جا رہا ہے، کچھ ٹھکانا ہے اس سکینٹ قلب، جمیعت خاطر کا کارڈنٹ جیب میں رکھے ہوئے گرفتار کرنے کے لئے جو آیا ہوا ہے، اسی کو چائے پلائی جاتی ہے اور جس کو گرفتار کرنا چاہتا ہے، دہی گرفتاری کی کارروائیوں میں گرفتار کرنے والے کی مدد کر رہا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن بظاہر جس کا کوئی پشت پناہ نہیں ہے، اس کی گرفتار کرنے میں دہی قطعاً ناکام ثابت ہوا جسے ظاہر میں فی الارض اہل ملک کی سب سے بڑی قاہرہ سیاسی قوت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

خیر سیدنا امام الکبیر تواتر دیر بند، تواتر اور چکوالی کے (رے) پھرے میں مصروف تھے، لیکن آپ کے پیرو مرشد امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”حریم کی نیبت سے گھر دھان، سر باہر نکل چکے تھے“ بقول مولانا عاشق الہی

”چند ماہ اجالہ، نگرے، پچھلا سہ وغیرہ مواضع و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، او

آخر راہ منہ کراچی عرب کا راستہ لیا“ تذکرۃ الرشید

یہی چند ماہ جو حضرت حاجی صاحب کے ان مقامات میں گزریے، اسی زمانے میں سیدنا امام الکبیر کے ساتھ پولیس کے تعاقب کے تذکرہ بالا قصبے میں آ رہے تھے۔ ہمارے مصنف امام نے بھی ان ہی اوقات کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

”اس زمانہ کی کیفیات عجیب و غریب گزری ہیں، لکھنا ان کا طول ہے“

”عجیب و غریب کیفیات“ غالباً وہی تھیں، جن کی تھوڑی بہت تفصیل مولانا طیب صاحب کی یادداشت کی مدد سے سنائی گئی۔

اسی سلسلہ میں مصنف امام نے علاوہ درویش، نانوتہ، چکوالی کے اعلیٰ نامی گاؤں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں سیدنا الامام الکبیر کا قیام دارنٹ کے ان دفین میں رہا تھا۔ آگے انہوں نے یہ بھی اطلاق دی ہے کہ

”بوڑیہ، گتھلہ، لاڈوہ، پنجلاسہ، جٹاپار کئی دفعہ گئے آئے“

کئی دفعہ آنے جانے کا ذکر جن مقامات کے متعلق کیا گیا ہے، بظاہر یہ اسی راستہ پر واقع ہیں جس سے گزرتے ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سندھ (کراچی) عرب جانے کے لئے پہنچے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کا جرم آپ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، یعنی وہی جہاد کے امیر تھے۔ اور بیعت جہاد کی ان ہی کے ہاتھوں پر کی گئی تھی۔ ایسی صورت میں دارنٹ کے بعد کھلے بندوں تو ان کے کراچی تک پہنچنے کی صورت ہی کیا تھی، بلکہ بقول مولانا عاشق الہی ان ہی آبادیوں میں چھپتے چھپاتے حضرت الامام سلمہؓ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے، جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حکومت ان کا تعاقب کر رہی تھی، جس جگہ پہنچ کر پناہ لیتے، حکومت کے نمائندے وہیں پہنچ کر آپ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہی ”حفاظت الہی“ گرفتار کرنے والوں کو ناکام بناتی رہی کہتے ہیں، اور قصص عام طور پر مشہور بھی ہے کہ مشرقی پنجاب کے قصبہ پنجلاسہ میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اپنے پیر بھائی پنجلاسہ کے رئیس ردو عبد اللہ مرحوم کے مکان میں تھا، اگر پولیس کو خبر ہو گئی، لکھا ہے کہ اس علاقہ کا انگریز افسر دریش کو لے کر راد عبد اللہ کے مکان پر پہنچ گیا اور اوصاف نے حاجی صاحب کو بنظر احتیاط اپنے اصطلح کی ایک ایسی کوٹھری میں جگہ دے رکھی تھی جس میں کسی شخص کے رہنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، جس میں گھوڑوں کا گھانس اور چارہ بھرا ہوا تھا، مگر اگر یہ ایک خبر اس تفصیل کے ساتھ پہنچی تھی کہ غلام کوٹھری میں مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ

ٹھیک اسی کو ٹھہری تک پہنچ کر انگریز نے کوڑا کھول دیا۔ رائد عبد اللہ کے تو ہوش اڑے جیسے تھے لیکن کوڑا کے کھلنے کے بعد جب دیکھا گیا، تو مصطفیٰ بچھا ہوا تھا۔ پانی کا ٹوٹا بھی تھا۔ لیکن کوٹھری میں کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ انگریز حیران تھا، اس نے پوچھا کہ یہ مصطفیٰ اور پانی کا ٹوٹا کیسا ہے؟ رائد صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ فرض نماز مسجد میں پڑھتے ہیں اور نوافل گھر آکر پڑھتے ہیں۔ بہر حال انگریز رائد صاحب سے معافی مانگ کر بعد نماز واپس ہوا، اس کی سمجھ میں کوئی صورت نہ آئی۔ رائد صاحب انگریز کو نصیحت کے لیے جب گھر میں لوٹے تو حیران تھے کہ حضرت حاجی صاحب اس غصہ میں کوٹھری سے کیسے باہر ہوئے اور کہاں تشریف لے گئے۔ کوٹھری کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حاجی صاحب بدستور اپنے مصطفیٰ پر تشریف رکھتے ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت آپ ابھی تلاشی کے وقت کہاں تھے؟ فرمایا، میں تو یہیں بیٹھا ہوا تھا، عرض کیا کہ انگریز نے تو آپ کو نہیں دیکھا، فرمایا، وہ اٹھا ہوا جائے تو میں کیا کروں؟ یہ سب ہی حفاظت الہی کے کرشمے تھے جو ان داصلین کی کراستوں کی صورت میں نمایاں ہو رہے تھے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ جناب پارکے ان قصبات اور مواضع تک سیدنا الامام الکبیر کی اس زانہیں آمد رفت اپنے پیرومرد شہد کی قدم بوسی و تعلقہ حال اور ان کی خیر و عافیت کی دریافت ہی کے سلسلے میں ہوتی رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے سوا ان گناہ آبادیوں میں تشریف لے جانے کی بظاہر کوئی دوسری وجہ نہ تھی۔ روپوشی کے لئے جناب کے اس پارکی آبادیوں میں کافی گنجائش تھی۔ نیز آپ بن چکے کہ حکومت کے نمائندوں سے بچنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر زیادہ کنج دکاؤ سے کام بھی نہ لیتے تھے۔ زیادہ مرغ ہوتا، تو اس مسجد سے اس مسجد کے چکروں ہی میں زبردالوں کا سانس پھول جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر میری عاشق الہی صاحب نے یہاں تک لکھ دیا کہ دیوان والوں کی حویلی میں روپوشی کے تین دن گزار لینے کے بعد جب سیدنا الامام الکبیر باہر نکل آئے۔

”تو مسجد میں رہتے، اور کوئی کسی قسم کا تعرض نہ کرتا۔“ تذکرہ ص ۷۹

باد و دارنٹ اور تفتیش کے تعرض نہ کرنے کا مطلب یہ تو ہوتا ہے کہ تعرض کرنے والے چشم پوشی سے کام لیتے تھے، بلکہ بظاہر کے اصطبل کی کوٹھری میں دیکھا گیا تھا کہ ڈھونڈنے والا انگریز آنکھیں

رکھتے ہوئے گویا آنکھوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ عدم تعرض میں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ کچھ اسی قسم کی کوششوں کو زیادہ دخل تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ایک مسجد سے نکل کر جب بجائے کسی دوسرے مقام کے مسجد ہی آپ کی قرار گاہ ہوتی تھی تو ”مسجد میں رہتے تھے“ اس کے سوا اور اس واقعہ کی تعبیر ہی کیا کی جاسکتی ہے بہر حال میرا صرف یہ خیال ہی نہیں ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری کے لئے مذکورہ بالا مقامات میں سینا امام الکبیر نے اپنی آمد و رفت کے سلسلہ کو جاری رکھا تھا۔ بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولوی عاشق الہی صاحب نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”اپنے ہادی برحق (حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی ہندوستان میں آٹری زیارت کے شوق سے بے تاب ہو کر انبالہ نگری اور پنچلا سے سفر کو اٹھے اور ستورہ محال مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن (گنگوہ) ہوئے“ مثلاً

اس خبر سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان مقامات کا سفر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش اختیار کیا جاتا تھا پیادہ پا چلنے کے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ زیادہ عادی نہ تھے۔ شاید اسی لئے آپ کو اس سلسلہ میں ایک ہی دفعہ سفری صورتوں کی زحمت برداشت کرنی پڑی۔ مشکلات ماہ کو عشق کی کشش نے آسان کیا۔ اس سفر کی دشواریوں کا اندازہ اسی سے کیجئے۔ دوسری جگہ مولوی عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

”راتوں کو چلتے، دنوں چھپتے، خاندان جنگل، پیدل قطع کرتے“ مثلاً

اذا ای سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جتنا پار کے ان ہی مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف امام نے سید امام الکبیر کے متعلق جو لکھا ہے کہ

”کئی دفعہ آئے گئے“

اس کئی دفعہ کے آئے جانے میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، مگر ابتدائے زندگی سے پیدل چلنے کے چونکہ آپ عادی تھے۔ کسی موقع پر لگے چکا ہوں کہ پیادہ پا چلنے کی اسی عام عادت کی وجہ سے آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی کے دل میں کافی گرائی بھی پائی جاتی تھی۔ لیکن اسی قسم کے نازک مواقع پر کام لینے

کے لئے قدرت شروع ہی سے انتظام کر رہی تھی۔ سواری نہ ہوتے ہوئے بھی اسی کا نتیجہ تھا کہ بیدل ہی چلنے کو آپ پسند فرماتے تھے۔

بہر حال رات کو ملتا، اور دن میں جنگلوں میں چھپنا، ادیروں میں تنہا، جنا پار کے ان گناہ اور دشوار گزار مقامات کو طے کرنا جن سے ان آبادیوں یعنی پنجلا سے وغیرہ تک پہنچنے کے لئے گزرنا ناگزیر تھا، اندر بار بار آمد و رفت کے اس سلسلہ کو قدرت کی غیبی تائید و نصرت کے بغیر کیا قابل تصدیق بھی کہا جا سکتا ہے، قرآن کا اقتضایہ بھی ہے کہ یہ سارے پیادہ پاسفراس عرصہ میں جو کئے گئے، تنہا طریق کے کسی رفیق کے بغیر کئے گئے، رنات پر کوئی آمادہ بھی ہونا تو احتیاطاً اس ارادہ سے اس کو روک دیا جاتا تھا، سمجھایا جاتا تھا کہ ہماری وجہ سے تم اپنے لئے کوئی خطرہ کیوں خریدو، مولانا عاشق الہی صاحب نے حضرت مولانا گنگوہی کے سفر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ پنجلا سے جاتے ہوئے نگری نامی مقام میں جب آپ پہنچے، جو دیوبندی حلقہ کا مشہور روحانی مستجاب الدعوات صاحب دل بزرگ مولانا عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا آبائی وطن تھا۔ رائے پوری میں جو کو آپ نے قیام اختیار فرمایا تھا۔ اس زمانہ میں جب مولانا عبد الرحیم رائے پوری اپنی عمر کے تیسرے سال میں تھے، نگری کی نگری حضرت گنگوہیؒ کے قدم بیعتِ اردو سے مشرف ہوئی۔

اس گاؤں کے رئیس مولانا عبد الرحیم صاحب کے پد بیڑہ گواراؤ اشرف علی خاں مرحوم تھے۔ وہاں کے خوش حال زمینداروں میں گئے جاتے تھے حضرت گنگوہیؒ کو راؤ صاحب نے اپنا مہمان بنایا، اعلاص و موت کا ظہور غیر معمولی طور پر ان کی طرف سے جب ہوا، تو حضرت گنگوہیؒ نے سفر کے نصیب العین کو نہاتے ہوئے جو کچھ گزری تھی، اس سے ان کو آگاہ کیا۔ راؤ صاحب حالات کو سن کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ، وجودِ نور جانی کے بوڑھے راؤ صاحب حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے آرزو مند ہوئے، لیکن حضرت کے یہ فرماتے سے کہ میرے پیر و مرشد تو آپ کے قریب ہی پنجلا میں مقیم ہیں، بیعت کی تمنا ہے تو بجائے میرے اپنی آزدان ہی سے بیعت کر کے پلوری کر سکتے ہیں۔ راؤ صاحب اس پر راضی ہو گئے، اور خواہش ظاہر کی کہ اپنے ہاتھ مجھے پنجلا سے چلو،

سفارش کر کے مرید کرا دیجئے لیکن مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ اپنی

”اندیشہ ناک حالت ظاہر فرما کر سمجھایا کہ معیت قرین مصلحت نہیں، البتہ اگلے دن

آپ آئیں، اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے سفارش کا میں ذمہ دار ہوں“

صلیٰ تذکرۃ الرشید

الغرض اصرار مبلغ کے باوجود رفیق سفر بنائے پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اور جیسے اب تک نن تنہا سفر کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے، پچھلا سہ بھی تنہا ہی پہنچے۔ حالانکہ نگری کے پچھلا سہ کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ غالباً ایک منزل کا سفر تھا۔ لیکن ایک دن کیلئے بھی رفیق طریقی بنانے کو خلاف مصلحت جب قرار دیا گیا، تو سمجھا جاسکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر جن کے آنے جانے کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل جاری تھا، اس میں کسی دوسرے کو فریق بنانے پر کیسے آمادہ ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ اس زمانہ میں جتنا پار حضرت دالانے جو سفر کئے ان سفرؤں کے حالات اور تفصیلات سے کوئی دوسرا واقف نہ ہو سکا۔ اسی لئے کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے حالانکہ کافی دلچسپ اور عبرت آموز حالات ہوں گے۔

بہر حال اب واقعہ کی صورت یہ تھی کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو حجاز کو منزل تصود بنا کر کراچی تک پہنچنے کے لئے ایک آبادی کو چھوڑ کر دوسری آبادی اور دوسری آبادی سے تیسری آبادی کی طرف منتقل ہو رہے تھے، اور آپ کے دونوں دفاتر کیش خدام، راست بازار اور جاں باز مرید سیدنا الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہا انتقام کے غصہ سے بھری ہوئی حکومت کے نشانہ بنے ہوئے تھے جس طرح ممکن تھا، دن کاٹ رہے تھے۔ مولوی عاشق الہی صاحب نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ پچھلا سہ پہنچ کر اپنے پیر و مرشد حاجی صاحب کی خدمت میں

”اصرار کیا کہ بندے کو ہر کاب لے چلیں“

مگر ہندوستان سے جو غور تو ہجرت کا فیصلہ کر کے اسی کی نیت سے سفر کر رہا تھا، مولوی صاحب کی شہادت ہے کہ اسی نے ہجرت ہی کی اس درخواست کو جو مرید رشید کی طرف سے پیش ہوئی تھی،

صاف لفظوں میں ستر کر دی، لکھا ہے کہ

”اعلیٰ حضرت (عاجی صاحب) نے نہ مانا، اور فرمایا کہ جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا۔“

صرف یہی نہیں بلکہ جس الہی الہام کے تحت حاجی صاحب نے ہجرت کا تہیہ فرمایا تھا۔ حضرت گنگوہی کے متعلق اپنے اسی لاہوتی احساس کے زیر اثر رخصت کرتے ہوئے اس بار کا بھی انشاء فرمایا کہ

”اسی طرح خدا کا حکم ہے۔“

اور فرمایا کہ

”میاں رشید احمد تم سے حق تعالیٰ کو ابھی بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت۔“

ایک دفعہ حاضری کے بعد جرد واپس کیا گیا تھا، جب خدا کے حکم کا اظہار اس کے متعلق ان الفاظ میں فرمایا گیا، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بار بار حاضری کے بعد مختلف مقامات سے جسے وہ ایسی کا حکم دیا جاتا تھا، اور وہ واپس ہی ہوتا چلا گیا۔ میرا اشارہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ ان کی وہ ایسی بھی کیا صرف عقلی مشوروں اور ذہنی دوسوں کی بنیاد پر یہودی تھی مائیکہ کیف تھکھون؟

رہا یہ کہ تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو راہی عرب ہوئے اور اس کے سوا بظاہر ان کے لئے کوئی چارہ کار بھی عالم اسباب میں نہ تھا۔ صحیح طور پر اس کا معین کرنا تو دشوار ہے کہ حاجی صاحب کب ہجرت کے اس سفر پر روانہ ہوئے، اتنی بات تو یقینی ہے کہ دلی پرائگریزوں کا قبضہ حافظ ضامن شہید کی شہادت کے بعد ہی ہو گیا، اور تھانہ پر اس کے بعد جو مصیبت ٹوٹی۔ درد کی اس داستان کو بھی آپ سن چکے۔ تھانہ کو تو حاجی صاحب جہاں تک قیاس چاہتا ہے اسی زمانہ میں چھوڑ چکے تھے۔ اس کے بعد کہاں کہاں رہے، پس اس سلسلہ میں ان ہی مقامات کا لوگ ذکر کرتے ہیں جن کا تذکرہ سیدنا الامام الکبیر کی آمد رفت کے سلسلے میں گذر چکا ہے، کراچی تک اس طریقہ سے پہنچنے میں چاہئے تو یہی کہ کافی مدت گزری ہوگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست ہندوستان پر ملکہ کٹوریہ کے قبضہ کا اعلان انگریزی پارلیمان کی طرف سے

۲۔ راکست شہداء کو ہوائیں سینے کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء میں بمقام الہ آباد لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کے اس تمام معافی نامہ کو پڑھ کر سنایا، جس کے بعد عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غدر کے مجرمین کو بخش دیا گیا۔ ہنگامے میں جو شریک تھے، حکومت کے دائرہ گیر کا کھٹکا ان کے لئے باقی نہ رہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ معافی نامہ باوجود عام ہونے کے عام نہ تھا، بلکہ اس میں ان خاص امور کا اشنا بھی تھا کہ

’انگریزی رعایا کے قتل میں بذاتہ جو شریک ہوئے ان کو رحم کا مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔ مزید بہ چند قیدیں بھی تھیں۔

(۱) جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو۔

(۲) یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں۔

(۳) یا جنہوں نے ترغیب بغاوت دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامہ میں یہ الفاظ درج کئے گئے تھے کہ

’ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی، لیکن ایسے لوگوں کی تجویز

سنرائیں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل

غور کیا جائے گا۔‘

اسی زمانہ میں ملکہ کے اس معافی نامہ کا انگریزی سے اردو میں جو ترجمہ ہوا تھا، بہ مجسمہ اسی کے الفاظ ہیں، ’مطلب یہی تھا کہ جان کی حد تک، مسدود با اقلینوں جرائم کے مجرمین کو مطمئن کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے سوا حکومت اندھ کوچہ بھی کر سکتی تھی، اس کا خطرہ موجود تھا، اور حکام کی صوابدید پر ان کی سزا کی نوعیت متعلق کر دی گئی تھی۔

تھانہ بھون کی جہادی ہم میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے، انگریزی رعایا ہی نہیں بلکہ انگریزی فوج کے ملازمین بھی شامل قتل کئے گئے تھے خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاعری کے سر پہ میں موجود نہ تھے، لیکن اس کا ثبوت آسان نہ تھا اس لئے جان تک کے خطرے سے وہ محفوظ نہ تھے۔ کم از کم

قاتلوں کے پناہ دینے، باغیوں کی سرداری، بغاوت کی ترغیب ان الزاموں سے بری ہونے کی صورت کیا تھی، خدان پر بھی یہ سارے الزامات تھے، اور جو فرد جرم آپ کے جہاں باز دست گرفتوں سیدنا الامام الکبیر اور محدث روشن ضمیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی پر لگائی گئی تھی، اس کی فہرست بھی بجسنہ ہی تھی۔

ایسی صورت میں ہاں بھی لیا جائے کہ عرب روانہ ہونے سے پیش تر اس "عام معافی نامہ" کا اعلان ہو بھی چکا ہو، جب بھی نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مطمئن ہونے کے لئے کافی تھا اور نہ ان کے دونوں نوجوان خدام رفیقوں کے لئے۔ اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگاہوں سے ہٹے اور ملے رہنے کا سلسلہ تینوں صاحبوں کے لئے معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی جاری رہا۔ حاجی صاحب تو کسی نہ کسی طرح کراچی سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے، مولوی عاشق الہی صاحب نے بغیر کسی تعین تارخ کے صرف یہی لکھا ہے کہ

"اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے چند ماہ انبالہ انگریزی پنچنامہ وغیرہ موضحہ و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، اور آخر براہ سمدھ و کراچی عرب کا راستہ لیا، ہندوستان کو خیر باد کہی، اور ہوائی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچے"۔

ہوائی جہاز بادبانی جہاز کی عاشقانہ تعبیر ہے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ پانی سے بے تعلق ہو کر صرف ہوا پر چلنے والا جہاز بھی سامنے آنے والا ہے۔

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے حاجی صاحب کی روانگی جس خاص طریقہ سے اس زمانہ کی سست و قتا سولہ یوں پہنچی تھی اور جن حالات میں ہوئی تھی چاہئے تو یہی کہ ہند کے ان مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے عرب تک پہنچنے میں مدت صرف ہوئی ہو۔ سال ڈیڑھ سال بھی یہ مدت اگر فرض کی جائے، تو قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ زیادہ نہ ہو۔

رہے ان کے صاحبین (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ) تو ان میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے حعلق اگرچہ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ اس عام کے اعلان کے بعد ہی حکومت نے اپنی

مگرانی آپ سے ہٹالی تھی، غدر کے ہنگامہ کے فرد ہو جانے کے بعد حضرت والا جن خدمات کی طرف متوجہ ہوئے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ

”یہاں تک کہ ملکہ دکتوریہ کی طرف سے اس عام کا مشہور اعلان ہو گیا، اور ہر شخص آزادی سے چلنے پھرنے لگا۔“ ص ۱۱

بظاہر اس سے بھی کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ دو سرور کے ساتھ سیدنا امام اکیبرؑ کو بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقعہ گویا مل گیا تھا، اور یوں بغیر کسی روک ٹوک کو ان مہات میں مشغول ہوئے، جن کی باق غد نے بعد آپ کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مصنف امام نے حضرت والائی سوانح عمری میں آپ کے حج اولیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے قلمی طور پر اس کی تردید ہوتی ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ لوگوں میں یہی بات کیوں پھیلی رہی، کہ ملکہ دکتوریہ کے اس اعلان کے بعد ان خطرات سے محفوظ رہے، تھے جنہیں حکومت کے وارنٹ نے آپ کے لئے پیدا کر دیا تھا۔

میرا مطلب یہ ہے، کہ سیدنا امام اکیبرؑ کے پہلے حج کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سفر میں وہ بھی آپ کے ساتھ تھے، مصنف امام نے ہندوستان سے روانگی کی تاریخ ۱۲۷۵ھ، جمادی الثانی بتائی ہے۔ گویا سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۶ء دسمبر کا مہینہ تھا، حساب کریں دیکھ بیٹے اب اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حج کے اس سفر کی

”رد پوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دے دی۔“ ص ۱۵

جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۲۷۵ء کے آخری مہینہ دسمبر تک ”رد پوشی کی بلا“ سیدنا امام اکیبرؑ کے پیچھے لگی ہوئی تھی، اگرچہ تین دن کی اختیاری ”رد پوشی“ کے بعد آپ کی ”رد پوشی“ بھی ختم ہو گئی تھی، اور وہ بھی بقول مصنف امام جیسے کہ اس موقع پر بھی انہوں نے لکھا ہے کہ

”مولانا کی ”رد پوشی“ محض عزیز واقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیالی نہ تھا۔“

کچھ بھی ہو، مصنف امام کی اس تحریری شہادت کی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے معافی نامہ کی استثنائی دفعات کے زیر اثر اس عام معافی نامہ سے مستفید ہونے کا مرتبہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نہ ملا، اسی نئے امن عام کے اعلان کے بعد بھی آپ کا سفر عرب کی طرف جاری رہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیدنا الامام الکبیر کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی تھی۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امن عام کا اعلان جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، لارڈ کیننگ کی طرف سے ۱۸۵۷ء کی پہلی نومبر کو ہو چکا تھا، لیکن مسیدنا الامام الکبیر کا نام ان مجرموں کی فہرست میں منشاء کے آخر تک باقی تھا، جن کو حکومت کے رحم و کرم کو سلوک کا تعلق نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ اسی لئے میرا خیال تو یہ بھی ہے کہ حج کا یہ پہلا سفر گو حضرت دلائے تو خاص حج ہی کی نیت سے فرمایا تھا، لیکن آپ کے اعزہ و اقرباء خصوصاً والدین کے سامنے یہ صلیت بھی تھی کہ حکومت کی داد و گیر سے بچنے کی بھی محفوظ ترین شکل یہی ہو سکتی ہے۔ ہمارے مصنف امام نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے۔ کم از کم اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے

مصنف امام بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے، لکھا ہے کہ،
”کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے، کراچی سے جہاز میں بیٹھے۔“ ۳۵

دیکھئے اور پڑھئے میں تو یہ چند الفاظ ہیں۔ لیکن حکومت اور حکومت کے نمائندوں اور جنرل خورگوندوں کی تجسس نگاہوں سے بچتے ہوئے براہ پنجاب کراچی تک پہنچنے کی دشواریوں کا صحیح اندازہ وہ نہیں کر سکتے، جن کو اس قسم کے اسفار کا اہر وہ بھی خاص حالات میں سابقہ نہیں پڑا ہے۔ اسی راستے سے کئی سال بعد حضرت قطب ربانی مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حج ہی کے لئے تشریف لے گئے تھے، ان کے سفر نامہ کی تفصیلات کو درج کرتے ہوئے مولوی عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے کہ
”فیروز پور تک چھکڑے میں بیٹھے اور وہاں سے کشتیوں میں بھادپور کے نیچے گزرتے ہوئے جید آباد سندھ پہنچے، وہاں سے بنگلہ میں سوار ہو کر کراچی بندر آئے۔“ ۳۶ تذکرۃ الرشید

۳۵ بقدری تشریح مولانا عاشق الہی صاحب نے یہ کی ہے کہ بقدری چالیس آدمی اس ریکی کشتی بوند نامی میں دیا قی اٹھو سفر پر

فیروز پور تک چھکارے کی سواری میں مسافروں پر کیا گذرتی تھی۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ
 ”ہچکوں سے بڈیوں کا چوراہا ہوتا ہے“

اور بڈیوں کو چور کرنے والی اس سواری میں بقول ان ہی کے ”بفتوں بیٹھا پڑتا تھا“ حیدر آباد سندھ
 سے کراچی تک پہنچنے کے لئے بنگلہ کی بحری سواری میں کیا ہوتا تھا، مولوی صاحب ہی نے اطلاع دی
 ہے کہ

”مرطوب ہوا کے جھونکوں سے دوران سر میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے پر جا جا پڑتے تھے،
 اٹھتے تو چکر اور استغراغ بے ہوش بناتا، اور پڑتے تو غشی کا بادل چھاتا چلا جاتا تھا“

جلد ۲ ج ۱ تذکرۃ الرشید

سفر کی ان صعوبتوں سے تو ان کو بھی دو چار ہونا پڑتا تھا، جو آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ لیکن
 ہر چار طرف سے حکومت کی داد و گیر کا خطرہ جس کے لئے ہو، سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کی دشواریوں کا کیا
 ٹھکانہ ہو گا؟

لیکن شیخ ادریس (حضرت حاجی صاحب رح) نے جس راہ سے عشق کی یہ دادی ملے گی تھی، اسی راہ
 سے سعادت مند مرید (حضرت نانوتوی) بھی اللہ کے گھر پہنچا، مصنف امام نے لکھا ہے،
 ”کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے“

یعنی شہید سے شہید عینک ہندوستان میں حکومت کی اسی تیز نظر کے نیچے گزار کر گزرے ہیں آپ
 حج کے لئے روانہ ہوئے، اہل طح شہید کے بعد شہید کے تمام سنیں حضرت والا کے لئے حقیقت
 اعلان آزادی سے مستفید ہونے کے نہ تھے۔ اور گویا سمجھنا چاہئے کہ جہاد کی جس ہم کا آغاز شہید
 میں ہوا تھا، سیدنا الامام الکبیر ستادین، اٹھاؤں، انسٹھ، ساٹھ بلکہ بقول مصنف امام
 ”بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ کم زیادہ میں وطن آئے“ ۳۵

(گذشتہ صفحہ سے) گنجائش ہوتی ہے۔ بادبانوں کے ذریعہ طالع ہوا کے رخ پر چلا تے تھے۔ دن بھر جلا کر شام کے وقت
 کسی بستی کے قریب کنارے پر باندھ دیا کرتے تھے ۱۷

یعنی سترہ اے میں دلچسپی ہوئی گویا پانچ سال تک مسلسل بغیر کسی انقطاع کے جہاد ہی میں مشغول رہے۔ اور جہاد کے ساتھ ساتھ فریضہ حج سے بھی سبکدوشی اسی مدت میں آپ کے لئے حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے آسان کی گئی۔

حفظ قرآن کی نعمت عظمیٰ | صرف حج ہی نہیں، بلکہ انزاد یعنی فی الجملہ (روپوشی) کے ان ہی مبارک و مقدس ایام میں جب

حکومت کھلے ہوئے مشاغل میں حصہ لینے سے مانع تھی، فریضہ حج کے ساتھ ایک ایسے عمل کی توفیق میسر ہوئی جس کا دجوبی مطالبہ تو بندوں سے ان کے پیدا کرنے والے نے نہیں کیا ہے۔ لیکن سید الانبیاء و الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کے توفیق یا نتوں کو بشارت سنائی ہے کہ

کانما ادرجت النبوۃ فی جنبہ | گویا کہ اس کے (یعنی حفظ قرآن کرنے والے کے) پہلو میں نبوت بیٹھ دی گئی۔

یعنی قرآن پاک کے حفظ کی دولت گراما یہ سے بھی ان ہی جہادی دنوں میں آپ سرفراز ہوئے اگرچہ آپ کے حفظ قرآن کے متعلق یہی مشہور بھی ہے کہ آپ اسی پہلے حج کے موقع پر جہاز میں رمضان ایک ایک پارہ یاد کر کے ترمذی میں سنا دیا کرتے تھے۔ خاکسار نے بھی بعض کتابوں کے حوالہ سے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں یہی نقل بھی کر دیا ہے۔ لیکن واقعہ کی صحیح و تفصیلی شکل وہی ہے جس کا ذکر مصنف امام نے فرمایا۔ انہوں نے براہ راست حضرت کا بیان نقل کیا ہے۔

”فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے، لہذا جب یاد کیا، پاؤں سپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا۔“

بظاہر رمضان کے یہ دونوں مہینے اسی زمانہ کے ہیں جب حکومت کے وارنٹ کی وجہ سے انزوائی زندگی کا موقع آپ کو مل گیا تھا۔ اس زمانہ کا بہترین مشعل یہی ہو سکتا تھا کہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جلا ہوا تھا اس سے مکالمہ و مناجات کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اسی عرصے میں حج کا سفر پیش آگیا جہادی الثانی میں گھر سے روانہ ہوئے، مصنف امام نے یہ لکھتے ہوئے کہ کراچی میں باد بانی جہاز میں ہم سب سوار ہوئے

خبر دی ہے کہ ہم لوگوں کا سوا ہوتا

”رمضان کا چاند دیکھ کر“

ہوا تھا گویا کیم رمضان کو جہاز میں داخل ہوئے اور وہی قرآن جو دو سال سے یاد کیا جا رہا تھا۔ تراویح میں اسی کے سنائے کا پہلا موقعہ اسی جہاز میں ملا تھا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں

”مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا، اول دہان (جہاز میں) سنایا،“ ۳۵

ختم تراویح کے موقع پر مٹھانی کی تقسیم کا جو عام دستور ہے، ظاہر ہے کہ جہاز میں اس کا کیا سامان ہو سکتا تھا، لیکن یہ بادیانی جہاز عرب کے ساحلی مقام حضرموت کی راج دھانی کے سامنے جس کا نام مکہ ہے کچھ دن کے لئے لنگر انداز ہوا، تو مصنف امام راوی ہیں کہ سیدنا امام الکبیر نے

”بعد عید مکہ پہنچ کر حلوائے مسقط خرید فرما کر بطور شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمایا،“ ۳۶

ازرا اور عام لوگوں سے علاحدگی کے ان دنوں میں حفظ قرآن کا یہ پاک مشغلہ حضرت والا کا جو جاری تھا، اس کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

”مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کا اس سے پہلے (یعنی جہاز میں قرآن منانے سے پہلے)

قرآن یاد کرنا۔ کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے،“ ۳۷

اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

”حافظوں کے نزدیک ٹھہرا ہوا ہے کہ (قرآن) بلند آواز سے یاد ہوتا ہے،“ ۳۸

لیکن سن رسیدہ ہونے اور آہستہ آہستہ یاد کرنے کے باوجود ان کی یہ شہادت ہے کہ

”جب سنایا، ایسا صاف سنایا، جیسے اچھے پرانے حافظ،“ ۳۹

قرآن آپ نے کس لئے یاد کیا تھا، قطع نظر دوسرے اسباب و وجوہ کے فقیر نے جو یہ عرض کیا تھا کہ

۱۰ روزوں بعد تو میں کوئی تدارع نہیں ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف یاد در رمضان میں کیا ہو جو مفاد ہے، مصنف امام کی روایت کا اندر روزانہ ایک ایک پارہ صاف کیا ہو، اس رمضان میں جس میں تراویح جہاز میں سنائی ہو مفاد ہے مشہور روایت کا۔ محمد طیب غفرلہ

جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا، اسی سے مکالمہ اور مناجات کا رشتہ قائم کرنا بھی مقصود تھا۔ یہ کوئی میرا صرف خیالی حسن ظن نہیں ہے، بلکہ ”القرآن العظیم کا جو تعلق سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک سورہ فاتحہ سے تھا، جس کا تفصیلی ذکر تو انشاء اللہ ان کے تحقیقی معارف اور لدنی مواہب کے ذیل میں آئے گا۔ لیکن اسی موقع پر مصنف امام نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

”پھر تو (قرآن) اکثر بہت بہت پڑھتے“ ۳۸

آگے یہ دل چسپ کہنے، یا دل دوزا اطلاع دی ہے کہ

”ایک بار یاد ہے کہ تائیس پارے ایک رکعت میں پڑھتے“ ۳۹

یہ یاد تو مصنف امام کی ہے۔ اور فقیر نے یاد پڑتا ہے کہ اپنے اساتذہ میں سے کسی استاد گرامی سے سنا تھا کہ پہلی رکعت میں تائیس پارے اور باقی تین پارے دوسری رکعت میں پڑھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ ”ایک دفعہ تو اھلنا الصراط المستقیم کے کامل جواب کو ایک ہی دم میں سن لو“ دل کی اسی ترنا کی تکمیل اس طرز عمل سے مقصود تھی۔

ایک ہی دم گانہ میں کامل تیس پاروں کو ختم کرنے کے سوا، مصنف امام ہی کی جو یہ اطلاع ہے کہ

”اکثر بہت بہت پڑھتے“

اس سے بھی مراد ان کی بظاہر یہی ہے کہ قرآن کی کافی مقدار نمازوں ہی میں حفظ کے بعد پڑھنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا، کیونکہ اسی کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

”اگر کوئی اقتدار کرتا تو رکعت کر کر اس کو منع فرما دیتے، اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے“ ۴۰

شاید رات کے پچھلے حصہ میں تہجد کے وقت ”بہت بہت“ پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا، اور گوشتی مذہب میں بھی ندای کے بغیر نوافل یعنی تہجد وغیرہ میں جماعت کی ممانعت نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص بلا اطلاع آپ کے ساتھ شریک ہو جاتا تو یہ خیال کر کے کہ ہر شخص کیلئے اتنی طویل قرأت اور طویل قیام کا تحمل نشاط کے ساتھ آسان نہیں ہے اس رکعت کو مختصر کر کے نماز کو ختم کر دیتے اور اقتدار کر لیا کہ شرک سے منع فرما دیتے۔

۴۱ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دروان محمد تسبیح صاحب مرحوم نے ایک دفعہ حضرت کی رقیہ لکھی صفحہ ۱

بہر حال خلقت سے علم و ہمتی کا اضطرابی مرتبہ وارث کے زمانہ میں آپ کو جو اتفاقاً میسر آ گیا تھا، بذات خود تو آپ کے جہاد ہی کا وہ تہہ تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن اور فریضہ حج کو سبکدوش بھی ان ہی دنوں میں ارحم الراحمین کی طرف سے آپ کے لئے آسان کی گئی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ معاشی حیثیت سے آپ کی جو حالت تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یوں ہی سفر حج کے مصارف کی فراہمی دشوار تھی، خصوصاً ان دنوں میں تو ”معاشی مشاغل“ کا وہ قصہ بھی ختم ہو چکا تھا، لیکن باایں ہر اسی زمانہ میں بادبانی جہاز واسے سفر کو آپ نے پورا کیا، اور جس طرح سے یہ سفر پورا ہوا، مصنف امام جو اس سفر میں حضرت کے ساتھ تھے، خود اپنے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”اخر بے سامان تھا، تھلیل سا زاد راہ بہم پہنچایا تھا۔“

اسی کے بعد اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں کہ

”مگر مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی۔“

حالانکہ وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

”ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے۔“

پھر یہ طویل سفر اور بقول ان ہی کے جہاد الثانی میں جو شروع ہوا تھا، اور جب شعبان و رمضان

شوال کے کامل چار مہینوں کے بعد جیسا کہ وہی لکھتے ہیں کہ

”آخر ذیقعدہ میں کہ معظمہ پہنچے۔“ ۳۸

گویا کم و بیش چھ ماہ میں یہ سفر پورا ہوا، سواری کے کرائے، خورد و نوش کا انتظام اس لمبی اور دیراز مدت میں

آگہ شدہ سفر سے، اقتدا کرتے ہوئے نیت باندہ لی جیب پانچ چھ پارے ہو گئے تو انہوں نے ٹانگیں بدنی شروع کیں اور آخر کار سات آٹھ پادوں پر بیٹھ گئے۔ دم لیکر پھر کمرے ہوئے اور چند پارے سن کر پھر بیٹھنے اور پھر بیٹھنے ہی بیٹھے اقتدا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت دلائے ۲۵-۲۶ پاروں پر ایک رکعت کی اور پھر دوسری رکعت ذرا مختصر کر کے سلام پھیر کر اُن سے فرمایا، تمہیں کس نے کہا تھا کہ اقتدا کرو؟ یہ سنتے ہی دیوان جی صاحب خفیف ہو کر یہاں سے اٹھے۔ محمد طیب غفرلہ

کیسے ہوتا رہا۔ افسوس ہے کہ بجائے تفصیل کے مصنف امام نے اس کے جواب میں صرف یہ اجمالی الفاظ درج کئے ہیں کہ

”بدولت توکل سب راہ بخیر فزونی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہو گئے۔“

اپنے اس توکل میں بنائے دلسے نے جسے اپنا دکیل بنایا تھا، اس نے اپنی وکالت کا حتی کس طرح پرور کیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کافی ایمان افراد واقعات ہوں گے، لیکن دیکھنے والے ہی نے جب بیان نہیں کیا تو جس نے نہیں دیکھا وہ کیا بتائے۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے، کہ کافی خوشی اور حشری انبساط و نشاط ہی کے ساتھ یہ سفر پورا ہوا تھا۔ جہاز میں ترادرج کا ستانا مکملاً پہنچ کر قتل حلوٰ خریہ کراچیا میں ختم ترادرج کی مشیرینہ کے طور پر تقسیم انبساط و انشراح طلب کی غمازی کر رہی ہے پر اگندہ دلی و افسردگی میں ان باتوں کی بھلا کیا گنجائش؟ بلکہ اسی موقع پر بے ساختہ یہ جملہ معترضہ ان کے قلم سے جو ٹپک پڑا ہے، یعنی ”جہاز میں کیا سیر تھا؟“ خود اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافی سرور و نشاط کے ساتھ سفر پورا ہو رہا تھا۔

بہر حال جیسا کہ مصنف امام کے حوالے سے نقل کر چکا ہوں کہ حج و زیارت کے اس مقدس سفر میں کم و بیش ایک سال کی مدت صرف ہوئی، ششہ کو فتنہ پرگیا سمجھنا چاہئے تقریباً چار پانچ سال گزر چکا تھے۔ منہجس حضرت کی مردانگی ہندوستان سے ہوئی تھی اور ششہ عین واپسی ہوئی۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی سیاسی حالت روز بروز بدلتی چلی جا رہی تھی، انتقام کی آگ حکومت کے سینے میں روز بروز جھپک رہی تھی۔ بیسیوں مجرمین جن کے نام عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی استثنائی فہرست سے نہ نکلے تھے۔ نذر بجا نکلتے چلے جا رہے تھے۔ اب کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا واقعہ پیش آیا، کہ حجاج کا وہی قافلہ جو پنجاب والی خشکی و ذری کی ماہ سے کراچی اور وہاں سے بلوچانی جہاز پر جہاز پہنچا تھا، اسی کے پاس کس قسم کی اطلاعیں ہندوستان سے پہنچی تھیں، کہ اسی قافلہ کو یعنی سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء سفر کو دیکھتے ہیں کہ واپس لوٹتے ہوئے، بجائے کراچی کے بندر کے مصنف امام کا بیان ہے کہ

”مراجعت براہِ مبہمی اور ناسک ہوئی، ریل ناسک تک تھی، وہاں سے گاڑیوں میں آئے۔“

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ

”زیج الادل کے آخر میں مبہمی آئے۔ جمادی الثانی تک وطن پہنچے۔“

گر یا مبہمی سے وطن تک پہنچنے میں دو ڈھائی مہینے صرف ہوئے،

اگرچہ قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ مبہمی کی راہ سے یہ واپسی بھی ”ردِ پوشی“ ہی کی شکل میں تھی، یا یہ قصہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن قرائن کا اتنا تضاد معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگرانی میں اضمحلال اور لاپرواہی کی کیفیت ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ اسی حج کے سفر سے واپسی کے تذکرے کو ختم کر کے مصنف امام نے لکھا ہے کہ:

”پچھلے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبہ عام اٹھا دیا تھا، چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکل

کاشبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا۔“

واللہ اعلم بالصواب ”پچھلے“ کے لفظ سے ان کی کیا مراد ہے، بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کے پچھلے جب وہ عرب میں تھے حکومت کی طرف سے تحقیقات کے بعد ”مطالبہ“ کی گرفت ڈھیلی کر دی گئی تھی، اور صرف چند مخصوص شخصیتوں کی حد تک قصہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

مصنف امام کے اس بیان کے سوا اس وقت تک مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جس میں صراحتاً اس کا ذکر کیا گیا ہو کہ سیدنا الامام الکبیر کے اہم گرامی کو استثنائی مجرموں کی فہرست سے نکال دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے بیان کے غور سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حج کے سفر سے واپسی کے بعد سیدنا امام الکبیر کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حج سے واپس ہونے کے بعد حضرت والا

”پھر گھر پر اپنے رہے۔“ ۳۹

سمجھنا چاہئے کہ اسی نقطہ پر مشاء کے جہاد کی ہم آپ کی ختم ہو گئی۔

باقی رچ حضرت حاجی صاحب کے صاحبزادے صاحب یعنی قطب ربانی حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو جہاں تک میرزا خیال ہے ملکہ دکتوریہ کے عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی اپنے رفیق سیدنا الامام الکیہ کی طرح آپ کا شمار بھی ان ہی استثنائی مجرموں میں تھا، جو اس معافی نامہ سے مستفید ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے حضرت گنگوہی کو حکومت نے گرفتار بھی کر لیا تھا، اور حالات میں ڈال کر چھ مہینہ تک آپ پر باضابطہ مقدمہ چلتا رہا، غیبی اعداد و گرام کا رتھی نہ بڑے بڑے وکیل تھے اور نہ بیرسٹر۔ لیکن اس آفت ناگہانی سے بخیر و خوبی آپ سالم و غانم ہو کر مکمل آئے۔ جس کی تفصیلات تذکرۃ الرشید میں پڑھنا چاہئے۔ یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت گنگوہی کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

”تختیہ سے یہ زمانہ ۱۲۵۵ھ ہجری کا ختم یا ۱۲۵۶ھ کا شروع سال ہے۔“ ص ۵۵

اگر یہی واقعہ ہے تو عیسوی سن کے حساب سے یہ ۱۸۵۵ء کا آخر اور ۱۸۵۶ء کی ابتدا کا زمانہ ہے اور عرض کر چکا ہوں کہ ۱۲۵۵ھ کے نومبر ہی میں عام معافی نامہ کا اعلان حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں کیا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر مقدمہ عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد چلا یا گیا۔

حضرت مولانا گنگوہی کی گرفتاری کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے جن کا ذکر مولوی عاشق الہی صاحب نے کیا ہے۔ آج بھی ان کو پڑھ کر دو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ستر سواروں کو ساتھ لے کر ایک مسلمان غلام علی نامی کی مخبری اور راہ زانی میں کرنل گارڈن نے گنگوہی پر دھاوا کیا، مولانا گنگوہی میں موجود نہ تھے۔ لیکن ان کے اشتباہ میں حضرت کے ماسوں زاد بھائی مولوی ابوالنصر صاحب رحمہم کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جو مسجد کے کسی گوشہ میں گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ مولوی عاشق الہی کی روایت ہے کہ سواروں میں سے ایک سوار نے مولوی ابوالنصر

”کی گردن پر زور سے ہاتھ مارا اور پکارا کہ چل کھڑا ہو، گردن جھکائے کیا

بیٹھا ہے۔“ ص ۵۵

مولوی ابوالنصر حالانکہ جانتے تھے کہ مولانا گنگوہی کے مشبہ ہیں مجھے گرفتار کر رہا ہے لیکن اس مرد خدا

اشتر کے بندے کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ

”میں رشید احمد نہیں ہوں“

احساسِ دردِ فانی یہ مثالیں سلف میں تو سنتے ہی آئی ہیں۔ لیکن روح القدس کا فیضِ خلف میں بھی ایسی دھجی کو پیدا کرتا رہا ہے۔ ایک زندہ شہادت تو اس کی یہی ہے۔

بہر حال کہا جاتا ہے کہ حضرت گنگوہی ایک مسلمان حکیم احمد امیر بخش کی منجبری سے رابہ نہنیا مان میں گرفتار ہو گئے اور بقول مولانا عاشق الہی سہارنپور جیل کے اندر

”تین چار یوم کالی کوٹھری اور پندرہ دن جیل خانہ کی حوالات میں مقید رہے“

سہارنپور سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کر دیا گیا، لکھا ہے کہ

”مظفر نگر کے جیل خانہ میں حضرت کو کم و بیش چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا“

قرآن مجید کے حفظ کا کام تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی پورا کر چکے تھے جیل میں تلاوت و ذکر و شغل کے ساتھ ساتھ وعظ و تہذیب کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، لکھا ہے کہ

”حراست کے زمانہ میں آپ کی نماز ایک وقت کی بھی قضا نہ ہوئی“

نماز صرف قضا ہی نہیں ہوئی، بلکہ

”مجھ سے کی کوٹھری میں بھی نماز باجماعت ادا کرتے رہے“ حاکم تذکرۃ الرشید ج ۱

سیرت و کردار اور تقویٰ کی زندگی کا آخر جیل خانہ میں بھی یہ ہوا کہ قیدیوں میں

”بہتیرے وہیں آپ سے بیعت ہوئے“

اس سلسلہ میں ہماری کتاب کے موضوع کے لحاظ سے قابل ذکر اس واقعہ کا اہم ترین جزو وہ ہے جس کا

لے بلقات ابن سعد میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی گرفتاری کا حکم حجاج مشہور ظالم امیر نے دیا، وہ درپوش تھے، کو فہی میں ایک دوسرے سلم و دوا غطا، ابراہیم نخعی بھی تھے۔ حجاج کے آدمیوں نے ابراہیم نخعی کے اشیاء میں ابراہیم نخعی کو گرفتار کر کے حجاج کے دربار میں پہنچا دیا، حجاج نے چلی نہ بھی ان کو بھرا دیا، ابراہیم نخعی جانتے تھے کہ میں نخعی کے مشہد میں پکڑا گیا ہوں۔ لیکن اس حقیقت کو آخر وقت تک ظاہر ہونے نہ دیا۔ تاہم جیل ہی میں وفات بھی ہو گئی۔

تذکرہ مولوی عاشق الہی صاحب نے فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس وقت سہارنپور سے پانچویں
منظر نگری پولیس کی نگرانی میں حضرت گنگوہی جا رہے تھے راستہ دو دن میں طے ہوا تھا سڑک سہارنپور سے
منظر نگری جملے والی دیوبند ہو کر گذرتی تھی، وہی دیوبند جہاں ان کے رفیق الدنیاء الآخرۃ عاشق زاد، یار
وفادار سیدنا الامام الکبیر مسجدوں میں اپنے انٹر کی پناہ میں زندگی گزار رہے تھے۔ حضرت گنگوہی کو دیوبند
کی سڑک سے گزرنے کی خبر کسی طرح آپ تک پہنچ گئی۔ دل زلزلہ اٹھا، تانے والی آنکھیں حالانکہ
چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے بیان کیا جاتا ہے، کسی ایسی
جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے، جہاں سے ان کی نظر اپنے محبوب رفیق پر پڑ سکتی تھی۔ اچانک ہاتھوں میں
بیڑیاں پاؤں میں زنجیر پہنے ہوئے، ہندوستان کا محدث اعظم ان کے سامنے آگیا۔ پولیس کا پہرہ
لگا ہوا تھا۔ بات تو بات شاید اشارے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ زبان حال سے حضرت گنگوہی کی طرف سے
روح کی فضاؤں میں یہ آواز گونج رہی تھی

بجرم عشق تو ام می کشند غوغا نیست

تو نیز بر سر بام آکر خوش تراشا نیست،

گویا بغوائے شاعر مذکور یہ سارا قصہ کچھ بھی بیش آیا تھا، گزر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر کی کے اقدام و اصرار
کا نتیجہ تھا مولوی عاشق الہی صاحب نے کھا ہے کہ

”سناسے کہ دیوبند کے قریب گزرنے پر رولناقا سم العلوم نظر براہ راستہ سے کچھ ہٹ

کر بغرض ملاقات پہلے سے آکھڑے ہوئے تھے۔ گو خود بھی مخدوش حالت میں تھی

مگر بے تابی شوق نے اس وقت چھپنے نہ دیا، دور ہی دور سے سلام ہوئے۔ ایک نے

دوسرے کو دیکھا۔“

گویا، ”باہم نگرستیم و گزشتیم، کی صورت بجلی کی طرح سامنے کو ند گئی، یہ مصرعہ عربی کا
ہے جس میں نگرستیم کے بعد گزشتیم کا اس نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مولوی عاشق الہی صاحب نے
جس راوی سے یہ خبر سنی تھی، اس کا بیان تھا کہ باہم ایک دوسرے کو دیکھ کر ”مسکرائے“ بے ساختہ

ٹوٹکی شاعر کثیف مرحوم کا شعر یاد آتی تصرف یہاں یاد آ رہا ہے۔

ملنے ہی آنکھ رنج نہ تھا ظلم غیر کا
کیا جانے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے کچھ کہا، جانے والا مظفر نگر جیل میں داخل ہونے کے لئے مظفر نگر کی طرف روانہ ہو گیا، اور دیکھنے والا، جب تک دیکھ سکتا تھا، دیکھتا رہا۔ پھر ان ہی آنکھوں پر کیا لکھی ہوئی جو دیکھنے سے بھی محروم کر دی گئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں صاحبین کے شیخ نے تو خیر کہ معظمہ ہی کو وطن بنالیا، اور یہی ان کے لئے مفید بھی تھا، پیدا ہوئے تھے ہند میں، لیکن قدرت ان کو شیخ العجم والعرب بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس فیصلہ کی تکمیل اسلام کے قبلہ اور مرکز میں قیام کے بغیر ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ باقی صاحبین تو دیکھ چکے کہ معافی عام کے اعلانی کے بعد بھی دونوں پر حکومت کی نگرانی قائم رہی، حضرت گنگوہیؒ پر تو مقدمہ بھی چلا۔ جو خطرہ ان کے لئے تھا۔ وہ معمولی نہ تھا، تذکرۃ الرشیدی میں مولوی عاشق الہی نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک کا احساس تھا کہ حکومت حضرت گنگوہیؒ کو پھانسی دے دے گی، ایک دفعہ اپنے رفقاء سے فرمایا بھی کہ

”میاں کچھ سنا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا“ ۵۷

اور جب پھانسی تک کی سزا کا اندیشہ حضرت گنگوہیؒ کے متعلق پیدا ہو چکا تھا، اور اس قسم کی خبریں اڑنے لگی تھیں، تو پھر جس نے شاعری کے دو اوازے کو جلایا تھا، جس کے جل جانے کی وجہ سے خدا ہی جانتا ہے کہ حکومت کی فرج کے کتنے آدمی مارے گئے۔ جنہو کا ہاتھ چلا کر عفریت پیکر فرجی کو جس نے دو پارہ کیا تھا۔ اس کے سوا خود اس کی تلوار نے کتنوں کو ٹھکانے لگایا تھا، زخم چشم کی عینی شہادت سے جس کا جرم پہچانا بھی جاسکتا تھا، سزا سزا کیا جاسکتا ہے، کہ وہ خطرات کی کتنی گہری تاریکیوں میں گھرا ہوا ہوگا، جو کچھ بھی سوچا جاسکتا ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ سب ہی کی گنجائش تھی لیکن حضرت

گنگوہی پر مقدمہ چلنے، اور جیل میں رہنے کے باوجود اور بقول مولانا عاشق الہی سپارنپور میں بھی،
 ”تحقیقات پر تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی“ ۷۷

اور مظفر نگر میں بھی حاکم کے سامنے بار بار پیش ہونے پر جس کا حال یہ رہا ہو کہ
 ”جو کچھ وہ دریافت کرتا، بے تکلف اس کا جواب دیتے تھے، کبھی کوئی کلمہ دبا کر زبان
 کر مڑ کر نہیں کہا، کسی وقت جان بچانے کے لئے تقیہ نہیں کیا، جوابات بھی سچ کہی“ ۷۸
 یا این ہمہ پچا نشی تک کا خضرہ کیا بلکہ گونہ یقین تک کی کیفیت جس کے متعلق پیدا ہو چکی تھی، دیکھا گیا کہ
 حاکم اس سے پوچھتا ہے کہ

”رشدیہ احمد تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا، اور فساد کیا؟“

جواب میں صرف چند الفاظ

”ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی“

اور کچھ نہیں کہا گیا، پوچھا گیا

”تم نے سرکار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے؟“

بچائے زبان کے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پہلے ہاتھ اٹھا، جس میں تسبیح تھی، اسی تسبیح کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے فرمایا جا رہا تھا

”ہمارا ہتھیار تو یہ ہے“

”ہاتھ کا یار“ یا ہاتھ کی یاری جس سے تھی، اسی کو دکھا دیا گیا، گویا ہاتھ کے اشارے سے حافظ کی غزل
 سنائی جا رہی تھی

بادشاہان ملک صبح گیم

گرچہ مابند مکان بادشیم

جام گیتی نرا، و خاک راہیم

گنج دہستانیں دیکھ تہی

اور یہ کہ ع روی بہت بہر کجا کہ نہیم

دوستان را قبائے فتح دہیم

دشمنان را از خون کفن سازیم

کچھ مصنوعی بندر بھیکیوں کے بعد دیکھا گیا، ردا بیت ستار ہے، 'مصدق بالشاہدہ' ہے کہ
 "پھانسی کے حکم کا انتظار جس کے لئے کیا جا رہا تھا" اسی کے متعلق فیصلہ سنائے والا فیصلہ یہ سنار ہا
 تھا، یا اس سے سنوایا جا رہا تھا، کہ

"مرشد احمد ہا کئے گئے" ۵۵

اور یہاں تو خیر گرفتاری بھی ہوئی، مقدمہ بھی چلا، پیشی بھی ہوئی۔ پوچھ تاچھ سے بھی کام
 لیا گیا، لیکن جس کا جرم بھی سخت تھا، اور اپنے جرم کی عینی شہادت جس کی پیشانی پر چمک رہی تھی،
 اپنے تمام ممکنہ وسائل کے ساتھ حکومت کی لا محدود آنکھیں اسے ڈھونڈھتی رہیں، عدالت ہی آنکھوں
 کے نیچے چلتا پھرتا رہا، ان ہی کے درمیان سے گزرتا ہوا، 'پنجاب پیسچا'، پنجاب سے سندھ، سندھ
 سے عرب تک سمندر بھلانگ کر پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس بھی لوٹا، دیکھنے والے دیکھتے بھی رہے،
 لیکن وہ کسی کو نہ سوچا، اور آج تک یہ سمریدرجہ اسباب معترہ ہی بن رہا کہ ڈھونڈھنے والوں کی
 اقدار ہند میں بھگری ہوئی لگا ہیں اپنا تک کیوں سمٹ گئیں۔ جو مجرم اور سخت مجرم تھا، وہ مجرم
 سے بری کیوں ٹھہرا دیا گیا۔ کم از کم میری جستجو اور تلاش کے لئے تو یہ سوال اب تار میں بھی
 چیتاں ہی تھا، اور سب کچھ اس لئے پلٹنے اور اسباب کے سارے دفاتر ممکنہ کے کھنگال
 دلنے کے بعد بھی، اب تک وہ چیتاں ہی بنا ہوا ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے سمعوں کا حل ان نرٹھی اسباب و مسببات کے پر پیچ سلسلوں
 میں تلاش کرنا ہے بھی نادانی۔ ایسے حیرت ناک امور اور ان کے حیرت افزا نتائج کا حل
 صرف ان غیبی میدانوں میں دستیاب ہو سکتا ہے جن کی سرحد عالم محسوسات کے مادہ سے
 شروع ہوتی ہے۔ یقیناً وہ مختوم القلوب انہیں سمجھ سکتے جو ہمہ وقت محسوسات
 ہی کے دائروں میں تروبالا اور غلطان و بیجان ہوتے ہوئے بالآخر ایک دن اسی ناگہبی کے
 ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم کر غ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
 اس جیتاں کا حل کہ حکومت کی نگاہوں میں ایک سخت ترین مجرم اس کی ساری کھانسیوں کے

بعد بھی صاف بچا رہا ہے اور وہ کہ جسے خود حکومت کا فیصلہ بری قرار دے رہا ہو، اسی کے ہاتھوں ۶ ماہ جیل میں بند رہا ہے۔ مستاروں کے پیچھے ان ہی عرشی انسانوں کے واقعات کے مبادی میں تلاش کر دو تو بآسانی مل جائے گا۔ خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ایک جملہ سے یہ سارا محمل تن حل ہو جاتا ہے۔ مولانا گنگوہیؒ نے جیل سے رہائی کے بعد فرمایا کہ جہت ادشاملی کے مسئلہ میں مجھے ابتداؤں کچھ تامل تھا۔ شاید اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مجھے ۶ ماہ جیل میں رہنا پڑا اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو کسی وقت بھی کوئی تامل نہیں ہوا تو وہ اس استوار سے نہیں گزارے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ جس سہمہ کو دالستگان اسباب کا دشوں کے بعد بھی حل نہ کر سکے، ایک دالستہ غیب نے اسے چنگیوں میں حل کر کے حیرتوں کا پردہ چاک کر دیا۔ یعنی معاملہ کا تعلق حتیٰ اسباب سے زیادہ باطنی شغلیوں سے نکلا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن تنگ چشمانِ عالم محسوسات کے لئے یہ مسئلہ پھر بھی حیدستان ہی رہے۔ جنہیں غیبی مقامات پر وحیاً دینے کی نہ فرصت ہے نہ اہلیت، لیکن ان کی تنگی چشم و دامان سے عالم روحانیات کی لامحدود دستوں اور ان سے دالستہ رہنے والوں کے وسیع ترین حوصلوں اور ذہنی دستوں میں اس سے فرق ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے اور اگر اس تقدیری حقیقت کو تہ سیر کے سلسلوں میں نمایاں کرنے کے دسائے کسی کے سامنے نہ آئیں تو اصل حقیقت پر اس سے کیا غبار آ سکتا ہے؟

ذوق و وجدان کی راہ کو چھوڑ کر جو لوگ خواہ مخواہ اصول اور استدلال ہی کی راہ پر بیانی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے بھی آخر اس قدرتی اصول میں تامل کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کہ جسکی راہ میں سو جان سے جان دینے کے لئے کھڑا ہونے والا کھڑا ہوا، اسی نے اس کی جان تک کسی تنجس کسی جاسوس اور کسی دوش کو نہ پہنچنے دیا۔

اگر اس اصول کے نیچے اس لمبی چوڑی تاریخ کو رکھ لیا جائے جو اس اصول کے لئے دلائل ادا مظارہ کی حیثیت رکھتی ہے تو اس میں سہمہ کی کیا بات رد جاتی ہے۔ جان سپاردی کی جائز کو ملائکہ مسوئین کے ذریعہ محفوظ کر دیا جائے۔ رجال غیب کے ہاتھوں جلادوں کے ہاتھ شل کر دیئے جائیں۔

اور حکام کے قلم پھیر دئے جائیں۔ خلیل کے ہاتھ کی چھری ذبح کے گئے پر اگر کند کر دی جائے۔
 راہ ہجرت میں حبیب کے بچاؤ کے لئے دیکھتی آنکھوں سرافقہ ابن مالک کے گھوڑے کی ٹانگیں
 زمین میں دھسادی جائیں، جو غیبی طاقت ان مخالف میں بلا توسط اسباب بلکہ خلاف اسباب اپنے
 جاں بازوں کے لئے یہ کرشمے دکھا سکتی ہے۔ اسی قوت نے اگر شاعلی کے میدان اور میدان
 کے مابعد اپنے سچے جاں نثاروں کی جانوں کے تحفظ کے لئے دویشوں کی کھلی آنکھوں کو نابینا،
 حکام کے ہمالیوں کو شکستہ اور ان کی بولتی زبانوں کو گنگ بنا دیا تو یہ کوئی نیا سانحہ اور
 حیرت ناک چیتاں کب ہے کہ اسے عقدہ لایخل بنایا جائے، بلکہ ہر دور ہر قرن کا ایک عام اصول
 ہے۔ جسے تاریخ دہراتی چلی آتی ہے۔ بہر حال ذوق و وجدان، اصول و اسناد لال اور تاریخ
 و مشاہدات سب ہی اس پر ایک زبان ہیں کہ من کان للہ کان اللہ لاہ (محمد طیب غفرلہ)

۶۵۶ھ میں جو طوفان اٹھا تھا، وہ اردن کے لئے کسی وقت بھی ختم ہوا ہو۔ لیکن سیدنا
 الامام الکبیر کی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ نشیب و فراز کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے صحیح
 مسنوں میں اس وقت تھا، جب ۶۵۱ھ کا سال گزر رہا تھا، اور پہلے حج کے سفر سے براہمبشی
 آپ نالوتہ واپس ہوئے، اسی کے بعد جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے
 ”پھر گھر پر اپنے رہے“ ۳۵۹

حضرت دالاک زندگی مبارک کے یہی چند سال (پانچ چار سال کے قریب) وہ ہیں جن میں
 جہاد کے فرض کفایہ اور حج کے فرض عین سے بھی سبک دوشی آپ کے لئے آسان کی گئی،
 اور اسی محدود مدت میں حفظ قرآن کی سرمدی دولت و سعادت سے بھی سہرا فرمایا میرا آئی جو
 مصائب و آلام کا دباؤ آپ پر ڈالا گیا۔ ان کے یہ ثمرات و نتائج تو وہ ہیں جنہیں دیکھنے والوں
 نے دیکھا اور جاننے والوں نے جانا، لیکن عالم شہادت اور عالم عروس کے پیچھے غیبی
 میدانوں کا لامحدود سلسلہ جس کے سامنے ہو، اس کے مدارک کو کوئی کیا بیان کر سکتا ہے کہ
 پانے والے نے ان مصائب کا صلہ کیا کچھ پایا۔ قرب و دوصال کی کتنی کتنی بلند منزلیں طے کر ڈالیں

ادمان جاں باز یوں میں اس کے سلف کو جو کچھ ملتا تھا اسے اس میں سے کیا کچھ مل گیا؟۔

شرح صدق کی نعمت پائے والوں کے لئے یقین مانئے کہ مصیبت کا ہر دباؤ غیبی صبر کا چڑھاؤ بنتا چلا جاتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک چڑھائی کی جو صورت اسرار کی رات میں پیش آئی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ شعیب ابی طالب کے ہر ناک تاریخی دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

فاتبعونی کی پکار پر چل پڑنے والوں کے سامنے کیسے بتایا جائے کہ اپنے اپنے طرف اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کسی نہ کسی رنگ میں وہ سب کچھ پیش آتا ہے، جس سے خود فاتبعونی کا پکارنے والا گذر اٹھا، یا اسے گذرا گیا تھا۔ **فصلے اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔**



خِدَا تِ جَلِیْلَہ

شاہکار

حد سے زیادہ تاریک اور مہیب مستقبل جس سے اچانک سرزمین ہند میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ دو چار ہو گئی تھی، اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اترنے والے میدان میں اتاری آپ دیکھ چکے، مگر ایک طبقہ تو ان ہی میں ان لوگوں کا تھا جو بے یک جست قلندرا نہ کہنے یا شہیدانہ دوسروں کو نہ ہر لیکن خود اپنے آپ کو، ایسے ”رودن مستقبل“ تک پہنچا دینے میں کامیاب ہو گیا، جس کے بعد تاریکی کا خطرہ ہی باقی نہیں رہتا، تھانہ بھون کی جہادی مہم میں اس طبقہ کے سرگروہ حضرت حافظ ضامن شہید نور اللہ مرقدہ تھے۔

لیکن فتنہ من قضیٰ فجبہ کے فرض سے سبکدوش ہونے والے اس گروہ کے مقابلہ میں ومنہم من ینتظر کی قدرتی کمند نے جن کو ”تاریک مستقبل“ ہی کے ساتھ کش کش کرنے کے لئے روک لیا تھا، کیا آگے بڑھنے سے وہ رک گئے؟ بجائے گشتے کے تاریکی بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، لیکن مرزا غالب جس زمانہ میں گارہے تھے کہ

موج خوں سے گزری کیوں نہ جائے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

اس زمانہ میں دیکھنے والوں نے چشم سر سے دیکھا کہ واقعی کسی کے سر سے خون کی موج اُبل رہی ہے

لے اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف ہے جس میں ارشاد ہوا ہے

ایمان والوں سے کچھ ٹوٹ وہ ہیں کہ سچ کر دکھایا جس کا خدا سے
عہد و پیمان کیا تھا پھر ان میں بعضوں نے اپنا ذمہ پورا کر دیا اور بعض
ان ہی میں انتظار کر رہے ہیں عہد کی تکمیل کا۔

میں المؤمنین رجال صدقوا ما
عادلوا اللہ علیہ فتنہ من قضیٰ فجبہ
ومنہم من ینتظر (الاحزاب)

پڑ چھنے والے پر چھ رہے ہیں، کہ کیا ہوا؟ اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ کچھ نہیں ہوا، کچھ نہیں ہوا،
 زور دے ہو کر اس کے چہرے پر گر لی چلائی گئی، 'بند دق کی کوئی چلائی گئی'۔ سو پنجہ اور دار بھی کا بھی کچھ
 حصہ مل گیا۔ آنکھوں کو بھی چشم زخم پہنچا، لیکن سو آسے بڑھنے ہی کے لئے میدان میں اترا تھا، اس کے
 اسی طرف بڑھا چلا ہوا، جدھر جانے کا وہ فیصلہ کر چکا تھا، 'خوفان کا رخ پھیرا جائے گا'۔ تو
 اندھیرا پھیلا ہے، اس کی روشنی سے بدلا جائے گا، اس کا یہ عزیمت اب بھی ترقی نازہ تھا، اس کی
 آسٹوں کا جوش اب بھی باقی تھا، بلکہ شاید کچھ زیادہ تیز، زیادہ قری ہو گیا تھا، 'شعبہ تک تو اس
 کے ہاتھ میں تنوار بھی تھی'، اس ہنگامہ کے فرد ہو جانے کے بعد تو یہ تلوار بھی چھن گئی، اور غالب ہی
 کے الفاظ ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اسے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آہنی اور نقرئی و طلائی العرض ساسے، ہتھیار جن سے کام لیا جاتا ہے، وہ سب ہی سے نہشتا ہو چکا
 تھا، لیکن اس کے ارادے کی بلندیاں اب بھی باقی تھیں، حالانکہ وقت تنگ ہو چکا تھا، لیکن
 اسی تنگ وقت میں اس سے کچھ ہو سکا کہ گزرا، اس کی بھی کوشش بار آور سی مشکور ہوئی، یوں
 اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ دہری دینی و علمی تحریک ہے،
 جو ضلع سہارنپور کے قصیدہ دیوبند کی طرف منسوب ہو کر "دیوبندیت" کے نام سے عوام و خواص میں
 موسوم و مشہور ہوئی۔

یہ دینی و علمی تحریک جس کا عرفی نام "دیوبندیت" ہے، اور اپنے بانی کے نام کی نسبت سے
 اس کی تعبیر چاہئے تو یہی کہ

”قاسمیت“

سے کی جائے۔ حقیقت کی آئینہ دار سچ پوچھئے تو یہی تعبیر ہو سکتی ہے۔

بہر حال دہ بدیت کہنے یا قاسیت کی تحریک، اپنی اصل حقیقت کی روش سے کیا ہے، کیا یہ کوئی
بسیط حقیقت ہے؟ یعنی اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے کسی خاص عصری نظام ہونے کے سوا یہ اور کچھ
نہیں ہے؟ بظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے، لیکن حقائق آگاہ دیدہ دروں سے پوچھئے، وہ آپ کو متلنگہ
کہ جیسے یہ ایک تعلیمی نظام ہے، اسی طرح ملکہ اس سے بھی زیادہ خاص قسم کی دینی و روحانی تربیت کا
ایک ایسا معتدل سانچہ اور قالب بھی ہے، جس میں دفعل کر نکلنے والوں میں اسلامی مطالبات کے
اعتقادی و عملی، ظاہری و باطنی، عناصر کا استخراج کچھ ایسے رنگ میں ہو جاتا ہے، جس کی تفسیر
کم از کم اس زمانہ میں ہندوستان، قریب ہندوستان، شاید بیرون ہند کے کسی اسلامی ملک میں بھی
یامانی نہیں مل سکتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ اس تحریک کے قیام میں ابتداء ہی سے کچھ ایسی چیزیں گھٹی ملی
ہوئی ہیں، جو ایک طرف خود ہندوستان کو بھی اپنے صحیح سیاسی مقام تک انشاء اللہ تعالیٰ پہنچا کر
رہیں گی، اور دوسری طرف عام عالم اسلامی سے بھی رشتہ اتحاد و اخوت کے استحکام میں ان سے کافی
مدد ملتی رہی ہے، آئندہ بھی انشاء اللہ ملتی رہے گی۔ اور خواہ اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن
ہندی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں بھی اس تحریک سے غیر معمولی انقلاب ہوا، بلکہ انصاف سے
اگر کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس قوم کے پس ماندہ طبقات کی معاشی حالت کے سدھانے
میں بھی اس تحریک سے کافی تقویت پہنچی ہے۔ اور حتیٰ قریب ہے کہ حالات کی ناموافقت اگر آڑے نہ
آجائی، جس کی وجہ سے اس تحریک کے بعض اہم اجرائی عمر مختصر ہو کر رہ گئی، تو ہمارا وطن شاید آزاد بننے سے
پہلے بہت پہلے آزادی کی ایک بڑی منزل طے کر لیتا۔ کم از کم حکومت مصلحت کی تعمیر کا ایک اہم غیر معمولی

لہذا کیونکہ اس نظام تعلیم سے زیادہ تر استفادہ کامو قہ مسلمانوں کے ان پس ماندہ طبقات ہی کے بچوں کو ملا جو اپنی سماجی و
حالیہ کی وجہ سے حکومت کے قائم کئے ہوئے کجوائع یا غیر برائیوں کی اس تعلیم کو حاصل نہیں کر سکتے تھے جس سے سرکاری ملازمت
کا انتخاب پیدا ہوتا ہے، جو کہ انہیں بہت سیدھا مساجد میں نظام جن اکبر و جرم کی پرورش و فراغت بھی حاصل ہو، لیکن جس مدد سے ہم
گذر رہے ہیں عربی و اردو کی تعلیم کی عمریت سے غریب مسلمانوں کی معاشی سطح کے بلند کرنے میں ضرور مدد ملی ہے۔ اسے ایک مستقل
مستادین فیرنے اس پر تفصیلی بحث کی ہے جو شاید مجھ و انا العلوم کے دوا دل میں خارج ہوا تھا۔ ۱۲

ستون تو یقیناً گر جانا، آئندہ اوراق میں ان ہی باتوں کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آپ کے سامنے آئے گی۔

امرض ہم کے لحاظ سے تو میں نہیں کہتا، لیکن کام جو انجام پایا اسکو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی و فنی تحریک کے ساتھ ساتھ دیر بندیت ایک قسم کی معاشرتی تحریک بھی ہے، اور سیاسی بھی، بڑی ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے پس ماندہ طبقات کی دنیاوی فلاح و صلاح، بڑی ہی اس کا کافی حصہ ہے، اور ہونچا ہے کہ گونا گوں پیلوں والی اس تحریک کا سرچشمہ نہ تو باضابطہ کوئی سرسائی تھی، نہ انجمن، بلکہ سیدنا امام الکبیر اپنے چند راستہ بار غفلت و غفارت کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے، پھر جس کے ہاتھ میں ہر کام کی آخری باگ ہے، وہ اس کو آگے بڑھاتا چلا گیا، واللہ مقم فوراً ولو کہہ کا لکھنؤ۔

جنا چکا ہوں کہ ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۱ھ ہجری میں سیدنا امام الکبیر سفر حجاز سے واپس ہوئے اور ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۷۹ھ ہجری میں کل (۳۶) سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا، گویا ۱۸۷۱ء کے فتنہ کے بعد اٹھارہ سال سے زیادہ وقفہ آپ کو خاندان ارضی پر قیام کا نہیں ملا۔ اٹھارہ سال کے اس وقفہ میں بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ یک سوئی کے ساتھ آپ کی سرگرمی اور مشغولیت کی مدت کم و بیش ایک عشرہ یا دس گیارہ سال کے قریب قریب ہے، لیکن اسی مختصر زمانہ میں اس ہمہ گیر تحریک کی صرف بنیاد ہی قائم نہیں ہوئی، بلکہ ہر جہتی حیثیت سے وہ اپنے تمام شعبوں میں ترقی کے خاص حدود تک آپ کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ ان ہی چند گنے چنے سالوں میں ہندوستان کے ایک بد بختانہ شغاتی و اختراقی سیلاب کے مقابلہ میں بھی آپ کو سینہ سپر ہونا پڑا، یعنی مناظرے کے نام سے مشائخ و مسابہ کا جو بازار سیاسی بازیگروں کی اندرونی دسیہ کاریوں کی بدولت اس ملک میں گرم ہوا تھا۔ اند پادریوں کے بعد یا ان کے ساتھ ساتھ ایک نیا محاذ پنڈت، دیانند سروسوتی جی نے کھول دیا تھا۔ جیسا کہ آئندہ بتفصیل معلوم ہوگا، اپنی افتاد طبع کے برخلاف واقعات و حالات نے اس محاذ پر بھی آپ کو لا کر کھڑا کر دیا، کھڑے ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا تھا، اس کی یاد دلوں کو اسی وقت تک محو نہیں ہوئی ہے، اصرار تو نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کی ساری تصنیفیں و نگاریں

بھی وقفہ کی اسی قلیل مدت میں تیار ہوئیں۔ لیکن اکثر و بیش تر حصہ یہ واقعہ ہے کہ اسی مختصر زمانہ میں قلم بند
ہوا ہے 'قدرتی کارفرائیں کے ان ہی استثنائی مظاہر کو دیکھ کر کہنے والے نے کہا تھا کہ

لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

وَبَلِّغْهُمْ رُكَّاتِ الْيُسْرَىٰ کی تفسیر سچ پوچھے تو اسی قسم کی ناقابل فہم سہولتیں اہل آسمانیاں
ہیں جن کی صحیح ترجیح عام واقعات و حوادث کی روشنی میں ہم نہیں کر سکتے۔ اور اب آپ کے سامنے
اسی اجمال کی تفصیل انشا اللہ پیش ہوگی۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دارالعلوم دیوبند

سنہ ۱۳۰۵ اور اسکے

آغاز و تاسیس کی داستان

دیوبندیت کے نام سے اسلامی ہند کی جو تحریک جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مدرس تعلیم کے مستقل اور خاص نظام ہونے کی حیثیت، بھی اس تحریک کا سب سے زیادہ نمایاں، مشہور اور عام پہلو ہے، جس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کی مشہور عالم تعلیم گاہ پر قائم ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دارالعلوم کے قیام و بناء کی ابتداء کا مسئلہ جب کبھی عوام ہوں، یا خواص کی مجلسوں میں چھڑا، یا چھیڑا جاتا ہے، تو ایک عمومی روایت جو زبان زد عام ہے، اسی کا تذکرہ کر کے سمجھ لیا جاتا ہے، کہ جو تاریخی سوال اٹھایا گیا تھا، اس کا یہی کافی و مشافی جواب ہے میرا اشارہ

انار و محمود

والی مشہور روایت کی طرف ہے، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی ہوگا، جو انار و محمود کی اس داستان سے واقف نہ ہو، اور مزے لے لے کر اس قصہ کا ذکر نہ کرتا ہو۔

اگر سر افاضہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو خیال آتا ہے کہ پڑھنے کیلئے مسند و طاقین ۱۳۰۵ء میں خاکسار حبیب الدارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو رحمت کی مسجد میں یا وہاں ہے مشرقی دیوار سے متصل انار کا ایک درخت تھا۔ پرانے طلبہ اسی درخت اتار کی طرف اشارہ کر کے بتاتے تھے کہ اسی کے نیچے مدرسہ پہلی دفعہ کھلا تھا۔ مگر انار اس کے پہلے مدرسہ چنڈہہ مشہورے ماہوار پر مقرر ہو چکے تھے اور محمود (یعنی ہمارے زمانہ کے شیخ الحدیث و صدر دارالعلوم شیخ الہند حضرت ائمہ علیہ السلام) اس کے پہلے طالب علم تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

دلہند کی اس اسلامی درسگاہ کی ابتدا رکب، برنی، اسی کا جواب دیتے ہوئے ہزاروں محروم و محترم قاضی گزرمی، قدروں، ناسید محمد میانی صاحب ناظم جمعیت الانار اپنی متہیر و مقبذ کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں یہ درخشاں فرمایا ہے کہ

"۵۱۱ھ محرم الحرام ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء تقریباً یوم پنجشنبہ، اسلامی ہند کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے۔"

آگے "انار و محمود" والی حکایت، لذیذ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ چند جمع کیا گیا، اور مسجد چمٹہ کے فرش پر

درخت انار

کی ٹہنیوں کے سائے میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا۔"

"درخت انار کی ٹہنیوں کے سائے" کے بعد یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"چند کار و مال پھیلائے والا، اور سب سے پہلے چند دیئے والا عابد تھا۔"

یہ "عابد" کس ذات گرامی کی تعبیر ہے۔ اس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی، اس وقت تو حکایت لذیذ

کے اس دوسرے جز "لفظ محمود" کا تذکرہ مقصود ہے، مولانا نے اسی جز کا ذکر ان الفاظ میں کیا

"سب سے پہلا مُتلم محمود، اور متعلم بھی محمود" ۶۵ حصہ پنجم (علماء ہند کا شاندار ماضی)

(گذشتہ صفحہ سے) ایک نوگرا نوجوان طالب علم ہونے کے باوجود خیال آتا ہے، دل میں اس وقت بھی دوسرے ہوا

تھا کہ تقریباً نصف صدی تک انار کے درخت کا باقی رہ جانا، کیا عام حالات میں ممکن ہے، کیونکہ اس وقت تک تقریباً

(۱۷۷۰ سال) مدرسہ کے قیام پر گزری تھی۔ نصف صدی کے لئے کن تین سال کی ضرورت تھی، واللہ اعلم یہ وہی درخت

درخت تھا، یا کوئی نیا درخت اس کی جگہ لگا دیا گیا تھا، جسے طلبہ تاریخی درخت حوض کے ہوئے تھے معلوم نہیں اب بھی یہ درخت آیا

چمٹہ کی مسجد میں موجود ہے یا نہیں۔ جذباتی خشیت سے جی تو یہی چاہتا ہے کہ کاش انار کے اس درخت کو محفوظ رکھا جاتا،

لیکن پورے کے مقدس درخت کے انجام کو دیکھ کر اب کچھ میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے بیعت و ضمان والے

درخت کو کیوں کٹوا دیا تھا۔ ۱۲

(نوٹ) یہ درخت انار بنسب وہی ہے جس کا ذکر اس روایت میں کیا گیا ہے اور آج تک محفوظ ہے۔ (محمد طیب غفرلہ)

ابھی اس سے بحث نہیں کہ بجائے خود اس روایت "کہنے" یا "مکاتیت" کی تاریخی قدر و قیمت کیا ہے، واقعات سے کس حد تک اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن جہاں تک میرا احساس ہے، سننے والوں پر ابتدائی اثر اس قصہ کا یہ مرتب ہو گا کہ شروع میں شاید کسی مقامی مکتب کی شکل میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، پھر رفتہ رفتہ کچھ سازگار موافق و مساعد حالات پیش آتے چلے گئے، تو جیسے دنیا میں بہت سی چیزیں جو ابتدائیں چھٹی تھیں، ان کو بڑا بن جانے کا موقع ملا، گیا۔ کچھ ہی صورت حال دارالعلوم دیوبند کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔ ماسوا اس کے اس "نذیر حکایت" کی دلچسپیوں میں لوگ کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں، کہ "دارالعلوم دیوبند" اور اس کے تعلیمی نظام کے خصوصی پہلوؤں کے متعلق جن سوالوں کو اجاگر کر کے اٹھانا اور ان ہی کی روشنی میں جو باتوں کو حاصل کرنا چاہئے ان ہی سے توجہ آدمی کی بہٹ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بذات خود "تعلیم و تعلم" "دین و تدريس" کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے نہ کوئی نیا مسئلہ ہے، اور نہ عجیب بات، جس امرت کے دین کی فیلولی آسانی کتاب "القرآن الحکیم" کی اجرائی وحی میں افرء (پڑھ) سے خواندگی کا مطالبہ کیا گیا ہو، اور سب سے پہلے اترنے والی اسی وحی میں علمہ بالقلہ (سکھایا ظلم سے) کی نعمت کا ذکر خدائی نعمتوں کے سلسلہ میں قراۃ اور خواندگی کے مطالبہ کے بعد کیا گیا ہو، انسانی فطرت کی سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ترین امتیازی خصوصیت علمہ الانسان (عالمہ یعلمہ) یعنی سکھایا خدا نے "الانسان" کو وہ جسے وہ نہیں جانتا، دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ انجانی باتوں کے جانتے اور جانتے چلے جانے کی فطری استعداد اور صلاحیت جو آدمی میں پائی جاتی ہے اسی ابتدائی وحی میں اس پر بھی تنبیہ کی گئی ہے، الغرض نوشت و خواندہ کی ابتدائی منزل سے تعلیمی ارتقاء کے آخری مراتب و منازل اور ان کے امکانات ہی پر جس دین کا گویا سنگ بنیاد رکھا گیا ہو، بھلا اس دین کے ماننے والوں کے لئے یہ بھی کوئی اچھے کی بات ہو سکتی ہے کہ ان ہی کے بعض افراد نے کسی خاص مقام میں پڑھنے پڑھانے کا نظم شروع کیا تھا، مسئلہ مسلمانوں کی تعلیم و تدريس کا دامن تو اس تعلیمی چوہترے کے ساتھ وابستہ ہے جو مسجد نبوی میں آج سحر

تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ”صفہ“ کے نام سے قائم ہوا تھا، بھلا اللہ اسی کا سلسلہ دنیا کے طول و عرض میں بغیر کسی انقطاع کے جاری رہا، اور امید ہے کہ قیامت تک انشاء اللہ تعالیٰ جاری رہے گا، اسی طرح تعلیم پانے والے طلبہ کے ساتھ مواساتہ و ہمدردی اور ان کے طعام و قیام کا نظم بھی اسلامی دنیا کا قدیم رواج ہے، ”صفہ“ میں داخل ہونے والوں ہی سے اس رواج کی بھی ابتدا ہوئی اور بعد کو مسلمانوں نے جہاں کہیں وہ گئے کسی نہ کسی شکل میں اس رواج کو قائم رکھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ”انار و محمود“ کی اس مقبول و مشہور بیرونی عزیز و لذیذ حکایت میں جو کچھ بھی بیان کیا جاتا ہے، اس کا حاصل یہی تو ہے کہ تعلیم: تدریس کا انتظام دیوبند میں مختصر ترین پیانے پر کیا گیا تھا۔ لیکن کیا دیوبند کا تعلیمی نظام صرف اسی قدر ہے؟ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ یہ جانتے ہیں کہ یوں تو تاریخ کے طویل و وسیع دور میں اس امت نے دنیا کے ان تمام حصوں میں جہاں وہ آباد اور توطن پذیر ہوئی، بڑے سے بڑے پیانے پر تعلیم کا نظم کیا۔ اور گو تعلیم و تدریس کے لئے مدارس کی مستقل عمارتوں کی تعمیر کو مسلمانوں نے ضروری تو کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں قرار دیا تھا، بلکہ بڑی بڑی مسجدوں یا خانقاہوں کے سوا سچی بات تو یہ ہے ابتدائی تعلیم کے منازل عموماً آباد کاروں کے مکانات، اور ٹیڑھ جیوں ہی میں طے ہو جاتے تھے، ”دور کیوں جائیے، دیوبندی نظام تعلیم کے بانی اعظم و اکبر سیدنا امام الکبیر کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ جیسا کہ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں عرض کر چکا ہوں، اسی دیوبند کے ایک امیر و شیخ کرامت حسین دیوبندی یعنی حضرت دلا کے خسر، کی ڈیڑھ سی ہی پر تو گزرا تھا۔ وہی ڈیڑھ سی جو آج بھی دارالعلوم کے مشرقی گوشہ میں ”دیوان کی ڈیڑھ سی“ کے نام سے کسی نہ کسی شکل میں کھڑی ہے، اسی ڈیڑھ سی کے کسی حصہ میں ”مہتابی مکتب“ قائم تھا۔ جہاں دوسرے بچوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے باقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایام طفولیت مصروفیت میں ابتدائی تعلیم اپنے استاذ مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم سے حاصل کی تھی اور اسی مکتب خانے میں عربی کی ابتدائی تعلیم آپ کو شروع کرائی گئی تھی۔

بہر حال باوجود اس اطلاقی نقطہ نظر کے بھی کسی خاص شکل و صورت کے عمارتی قالب کے ساتھ تعلیم و تدریس جیسی عام اہم ترین ضرورت کو متعین کرنا مسلمانوں نے کسی زمانہ میں ضروری قرار نہیں دیا، بلکہ اس جس جگہ بیٹھ گئے بس وہی میخانہ بنا

ہاں ہر تادمیج ہی آپ کو بتائے گی کہ اسی قدیم نے تعلیم گاہوں کے لئے بھی بڑی بڑی عمارتیں دنیا کے مختلف حصوں میں تعمیر کیں۔ آج بھی ان کی کچھ کچھ یاد گاریں دنیا کے مختلف حصوں اور گوشوں میں پائی جاتی ہیں۔ خاکسار نے بھی اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں ہندوستان کے بعض اہم تعلیمی اداروں کا ذکر کیا ہے۔ بعضوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تاہم جہاں تک تلاش و تحقیق کا اقتدار ہے، عہد حاضر کا تعلیمی نظام جس سے مغرب نے دنیا کو روشناس کیا ہے اس میں جامعیت بندی، امتحان خصوصاً تحریری امتحان، طلبہ کی حاضری کے رجسٹر، ان ایزم، قیبلہ و سرگرمی، لوازم و خواص جن کے ایک بڑے حصہ کو دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں نہ صرف قبول ہی کر لیا گیا ہے، بلکہ پوری قوت و احتیاط کے ساتھ تعلیم کی ان جدید خصوصیات کی نگرانی بھی کی جاتی ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں جتنا لحاظ و پاس ان امور کا کیا جاتا ہے، دارالعلوم میں بھی ان پر زیادہ نہیں تو کچھ کم توجہ نہیں کی جاتی، بلکہ کہا جاسکتا ہے، کہ امتحانی سوالات کے انشاء (اؤٹ ہو جانے) کا حادثہ غموں بڑی سی بڑی یونیورسٹیوں میں کبھی کبھی جو پیش آجاتا ہے، دارالعلوم کو تقریباً اپنی صد سالہ عمر میں اس حادثہ سے جہاں تک میں جانتا ہوں کبھی دوچار ہونا نہیں پڑا، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم کی جدید خصوصیات جو عصری تھانوں کی بنیاد پر دیوبندی نظام تعلیم میں جذب ہو چکی ہیں، ان کے آثار و لوازم کی حفاظت میں جو کامیابی دارالعلوم دیوبند کو میسر آئی ہے شاید وہ اپنی آپ نظر سے، جس میں زیادہ دخل اس خلوص و دلہیت کو ہے جو دارالعلوم کو کارکنوں کے کاروبار کی روح ہے۔ حتیٰ قویہ ہے کہ کرایہ اور بھارت سے پر کام کرنے والوں کو دارالعلوم کے کام کرنے والوں پر قیاس بھی نہ کرنا چاہئے۔ اللہ حبیب رجال و اللقصۃ رجال

لے عربی کی مشہور ضرب المثل ہے، یعنی کچھ لوگ جاں سپاری اور جنگ کیلئے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ صرف پیائے کیلئے

پس اصل سوال یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں موجود عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کی نئے دھیات کے شریک ہونے کے اسباب کیا ہوئے؟ کیا نیکہ کچھ بھی کہا جائے ہیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ دارالعلوم سے پہلے مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کا جو عام طریقہ مروج تھا۔ ان جدید خصوصیتوں کو ہم اس میں نہیں پاتے۔ افادیت و عدم افادیت کی بحث جداگانہ ہے۔ اس بحث سے اگر آپ کو دلچسپی ہو، تو خاکسار کی کتاب ”مسلمانان ہند کا نظام تعلیم و تربیت“ شائع کردہ مدوۃ المصنفین کا مطالعہ کیجئے۔

بہر حال جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے متعلق اس قسم کی باتیں کہ ابتداء میں کہاں کس حال میں قائم ہوا، جس کا جواب ”انارو محمد“ کی حکایت کو دہر دہرا کر دینے والے دے دیا کرتے ہیں، ان سے زیادہ اہم یہی سوالات ہیں، شروع ہی سے ان کی طرف اشارے کرتا چلا آ رہا ہوں، آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان کی نئی قائم ہونے والی حکومت نے جو مدرسہ عربک کالج کے نام سے دلی میں قائم کیا تھا، مدرسہ سے زیادہ کالج ہی کی خصوصیات و لوازم پر مشتمل تھا اور ان ہی عناصر پر اس کا شکل ہونا، قدرتی بات تھی۔ اسی عربک کالج کے صدر و الاقد مولانا ملوک العلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہمارے سیدنا الامام الکبیر بانی دارالعلوم نے تعلیم حاصل کی تھی، اور کیسی تعلیم؟ بجز علم حدیث کے عمومی علم پر عربی کی اعلیٰ نصائی کتابوں کے مولانا ملوک العلوی ہی اُن کے استاد و حید تھے، الایہ کہ مفتی صدر الدین سے بھی کچھ پڑھا ہو، جنہوں نے قرآن کی تصریح بھی کی ہے۔ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں خاکسار نے بھی قرآن و قیاسات کی بنیاد پر مفتی صاحب کے استاد ہونے کی طرف اپنے ذاتی رجحان کو ظاہر کیا ہے، کچھ بھی ہو، سچی بات تو یہی ہے، جیسا کہ عربی کا مشہور مقرر بھی ہے کہ

الاب واحد و الاحصاء مشہدی | باب توادی کا ایک ہی ہوتا ہے، اور چچا بہت سے ہوتے ہیں۔

۱۵ مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جزیۃ العلماء، اپنی کتاب ”علامہ ہند کا شاندار ماضی“ میں فرماتے ہیں کہ ”حجۃ الاسلام دینی سیدنا الامام الکبیر مولانا رفیع الدین اور امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب“ کے دوسرے استاد جناب مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے۔“ ص ۵

اس متولہ کی رو سے علمی اب اور علمی پدر ہونے کی خصوصیت حضرت نافوتوی کے اعتبار سے مولانا ملوک العلوی ہی کو حاصل ہے، یہ بات کہ مولانا ملوک العلوی سے سیدنا الامام الکبیر نے کالج میں شریک ہو کر تعلیم حاصل کی تھی، یا کالج سے باہر ان کی تکمیل ہوئی تھی، اپنا خیال اس باب میں جو کچھ تھا، اسے پیش کر چکا ہوں، لیکن کالج کے اندر ہو، یا باہر تعلیم تو آپ نے کالج کے استاد ہی نہیں، بلکہ صدر سے حاصل کی تھی، اور اسی زمانہ میں حاصل کی تھی، جب وہ یعنی مولانا ملوک العلوی عربک کالج کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر جیسی وقتاً و فطرت اور اخاذ طبیعت والے آدمی کے لئے اس تعلیم کے لحاظ اور خصوصیات کا کچھ لینا بھلا کوئی بڑی بات ہو سکتی ہے۔ کھیل کود کے قصوں میں جس کی نظر ان کے بھتیجا دی اصول پر پڑتی تھی ان صبیانی ملاعب میں بھی طفولیت ہی کے ایام میں جو کئی قواعد پیدا کرتا ہو جس کی تفصیل مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکی، پھر ہر گیر وہم پذیر دماغ کے ساتھ ساتھ حضرت الامام کے سینے میں جو درخشاں دل تھا، مسلمانوں کی زبوں حالیوں جیسے خون کے آنسو راہی تھیں، آج کون بتا سکتا ہے کہ اس درجہ سے بچکنے کے امکانی تصورات کے سلسلہ میں ان کی نظروں کہاں کہاں کن کن چیزوں پر پڑتی ہوں گی، تعلیمی تصورات کے سلسلہ میں کسی موقعہ پر حضرت والا کے اس حکیمانہ نظریہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی اس زمانہ کے علماء درس کی تعلیم کے انفرادی طریقہ تدریس کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ علم کی کیفیت میں تو ترقی اسی طریقہ سے ہوتی ہے، لیکن علم کی وسعت، اور علماء کی مقدار و کثرت کے بڑھانے میں کامیابی کی واحد صورت یہی ہے کہ تعلیم کے قدیم شخصی و انفرادی طریقہ کی جگہ درس و تعلیم کے اجتماعی طریقہ کو اختیار کیا جائے۔ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا، سیاسی مرکز ان کا ٹوٹ چکا تھا، ان کی اجتماعی شیرازہ بندی کے سلسلے میں اپنے تعلیمی نظریہ کے مطابق کوئی وجہ ہو سکتی تھی، کہ عربک کالج میں اجتماعی درس و تدریس کے جس طریقہ کا آپ مشاہدہ فرما رہے تھے، اس سے استفادہ کی تدبیریں آپ کے دماغ مبارک میں نہ آئی ہونگی، سیدنا الامام الکبیر کے دست مبارک سے لکھی ہوئی ایک تحریر کا عنوان مذکورہ کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کو ختم کرنے

میں یہ تحریر اس وقت تک محفوظ ہے۔ بد قسمتی سے براہ راست اس کی زیارت کی سادت اس فقیر کو میسر نہیں آئی ہے لیکن بہر حال بزرگوں سے یہ سنتا رہا ہوں کہ اس تحریر خاص میں سیدنا الامام الکبیرؑ بطور وصیت نامہ کے ان بنیادی کلیات کو قلم بند فرمایا ہے جن پر آپ نے اس دارالعلوم کی بنیاد قائم فرمائی تھی اور وصیت فرمائی گئی ہے کہ آئندہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں دارالعلوم کے نظم و نسق کی باگ آئے وہ ان کلیات کی روح کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجلہ ”الفا سسم“ کے دارالعلوم نمبر مجریہ ۱۳۴۸ء کے حوالہ سے اسی ”تحریر خاص“ کے حشمتات و مضامین کو نقل کرتے ہوئے، ناظم مرکزی جمعیتہ العلماء (دہلی)، مولانا سید محمد میاں صاحب نے ”علماء ہند کے شاندار ماضی“ میں مجلہ دوسری دفعت کے ایک دفعہ سوا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

”اس کا دینی دارالعلوم کا تعلق عام مسلمانوں سے زائد سے زائد ہو، تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھو میں معین ہو“

آگے اسی مقصد کی تفصیل فرماتے ہوئے آخر میں ارقام فرمایا گیا ہے کہ دارالعلوم کا مسلمانوں سے ”جمہوری تعلق ہو، جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے“

اسی بنیاد پر آپ نے دارالعلوم کے لئے آمدنی کے کسی مستقل ذریعہ کے قائم کرنے کے خلاف یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ عام مسلمانوں سے چاہئے کہ اس مدرسہ کا احتیاجی رشتہ ہمیشہ قائم رہے، حکومت یا کسی رئیس کی دوائی ادائیگی مستقل جائداد کی صورت میں عام مسلمانوں سے احتیاجی رشتہ دارالعلوم کا باقی نہ رہے گا۔

سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بعض مینے والوں نے یہ الفاظ سنے تھے یعنی فرمایا کرتے تھے کہ

دارالعلوم اس وقت تک مستقل رہے گا جب تک اس کی آمدنی غیر مستقل رہے گی۔ لیکن جس وقت

اس کی آمدنی کا ذریعہ مستقل ہو جائے گا اسی وقت دارالعلوم کی بنیاد غیر مستقل ہو جائے گی۔“

مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ نے بھی اصل ملے کے غزلیں سے یہ فقرہ نقل کیا ہے جسے حضرت علامہ کی طرف (باقی اگلے صفحہ پر)

خود براہ راست اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمد الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے خاکسار نے بھی بنار دارالعلوم کے متعلق قریب قریب کچھ اسی قسم کے الفاظ اس وقت سنے تھے جس زمانہ میں یہ اختلاف رونما ہوا تھا کہ تعلیمی کاروبار کے سوا سیاسیات سے بھی مدرسہ کا کون تعلق رکھا جائے یا نہ رکھا جائے۔ تنفیلاً اس قصہ کا ذکر مجلہ دارالعلوم کے اس مضمون میں کر چکا ہوں جو

احاطہ دارالعلوم کے بیٹے ہوئے دن

کے عنوان سے متعدد شماروں میں مسلسل شائع ہوا ہے اور شیخ کے متوالی حتمی اسکا تذکرہ ان اوراق میں بھی آگیا ہے اور سچ تو ہے کہ سیدنا الامام الکیسریؒ کو "دلی عربک کالج" کے ماحول سے گزرنے اور تعلیم جدید کے لوازم و خصوصیات کے تجربہ و مشاہدہ کا موقعہ اگر نہ بھی ملتا تو ان کی "عبقریت" اور فکر و نظر کے جس قدرتی "ملکہ فائزہ" سے وہ فطرتاً سرفراز کئے گئے تھے۔ خود وہی پیش آنے والی مشکلات سے عہدہ بگڑھونے کی کافی ضمانت تھی، مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی اور آئندہ ان کو دینی زندگی اور دینی علوم سے منحرف کرنے کی کوششیں اس ملک میں جو ہو رہی تھیں، ان کے مقابلہ کے لئے مسلمانوں میں دینی علوم کی عبوریت کے لئے کیا کرنا چاہئے، اور نئے حالات کی رو سے تعلیم و تدریس کے نظام میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے، ان مسائل کے حل کے لئے خود ان کا داغ کافی تھا، اسے قدرتی تیسری کی ایک شکل سمجھنا چاہئے کہ "دلی عربک کالج" کے ماحول میں "نظریات" کو "عملی قالب" میں دیکھنے اور برتنے جانے کے مواقع بھی ان کے لئے آسان کئے گئے۔

جس وقت "شامی" کے میدان سے وہ خود اور ان کے رفقاء کا رنڈا ہر ناکامی کے ساتھ واپس

وگشتہ سفر سے، براہ راست منسوب کیا گیا ہے یعنی اسی وصیت نامہ میں ہے کہ

"اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ شرط قبولہ الی اللہ ہی طرح چلتا رہیگا"

اللہ کو کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگی جیسے جائیداد کا خزانہ تجارت، یا کسی اور حکیم القول کا دوسرا نظریہ یا کہ خود بڑا

جو سرایہ جوع الی اللہ ہو، یا تھ سے جاتا رہیگا اور ادا دینی موقوف ہو جائیگی، مگر کون ہی، ایم نزع پیدا ہو جائیگا۔" ۱۱

اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ احتیاجی برشتہ کا واقعی مطلب کیا تھا۔ کچھ پوچھئے تو بزرگ الی اللہ کامی واحد ذریعہ اور اسی کی یہ ایک گونہ تفسیر ہے۔ ۱۲

ہوئے۔ توفیق ثانی کی یہ دلیپسی یاس اور نامرادی کی دلیپسی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ ایران و سکینت اقیان
و طہ نیست کی جن لاہرتی خشکیوں سے خود نکال اور نکلے ساتھ ہی کو سینے اور دل فب ریزہ سمور تھے، ان لاہرتی
خشکیوں کے ساتھ بھلا قنوطا دیا س کے غیر ایمانی جد ہات کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے، واپس تو وہ پیشک
ہوئے تھے، لیکن یقیناً یہ دلیپسی

متحرقات القتال اور متحیزات الی | جنگ ہی کے لئے کتراتے ہوئے، یا کسی ٹولی سر
فۃ اور قتال

... ہو سکتی تھی، یقیناً اسی کے لئے تھی بھی، جس کی تصدیق آپ کے آئندہ اقدامات اور قافی
مجاہدات سے ہوتی ہے۔

شہر کی کش مکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آدرش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری
میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اسی لائحہ عمل کا سب سے زیادہ
نمایاں اور مرکزی وجہ ہری عنقرض تھا، وہ مشہور روایت یعنی شاعلی کے میدان کے امیر جہاد میدان حاجی لدلا
الہا جوالکی رحمۃ اللہ علیہ کی اس زمانہ میں جب آپ مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ اور ہندوستان میں دارالعلوم
دیوبند کا افتتاح ہو چکا تھا، عرض کرنے والے نے جب یہ عرض کیا کہ

”ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اسکے لئے دعا فرمائی جائے“

بیان کیا جاتا ہے کہ سینے کے ساتھ شاعلی کے میدان کے امیر جہاد یہ فرماتے ہوئے کہ

”سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے“

اس اطلاع سے سر فرید فرمایا تھا کہ

”یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں، اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑ گڑاتی رہیں، کہ خداوند اچھڑتا“

میں بقادر اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔“

اور اسکے بعد اصل واقعہ کا اظہار حاجی صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا کہ

”یہ مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) ان ہی بحر گاہی دعاؤں کا ثمر ہے۔“ (اور اوج ثلثہ و طہار ہند کا شاندار ضمن)

جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ شامی کے میدان سے دایبسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ فرمایا اس پر کوسو چٹا ہی چھوڑ دیا تھا، اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے، بلکہ "بقادر اسلام اور تحفظ علم دین" کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و نظر تھے، اور ان کے قلوب، ان کی کائنات کی مرکزی قوت سے ڈانگے۔ "غیبی لطیفہ" کے ظہور کا انتہائی راز ہے، سو امانت اور قیادت (لیڈری) میں ہی اصولی فرق ہے۔ کہ تیاریات میں صرف دماغ کام کرتا ہے، اور امانت میں دماغ کے ساتھ دل پر بھی زور دیا جاتا ہے، بلکہ کامیابی کی "حقیقی کلید" دل ہی کے کاروبار کو یقین کیا جاتا ہے۔ "ہر" کے میدان میں صف بندیاں بھی ہو رہی تھیں، ہر قسم کے ہتھیار کو استعمال کے مواقع اور مقامات بھی متعین کئے جا رہے تھے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اسی کے ساتھ خدا کے سب سے بڑے بندے کی پیشانی مبارک خاک پر بھی پڑی ہوئی تھی، سننے والے سن رہے تھے کہ السموات والارض کی ملکوت و بادشاہت جس کے ہاتھ میں ہے، جس کے حکم اور اذن کے بغیر اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کوئی چیز شریک ہی نہیں ہو سکتی تھی، اسی سے عرض کیا جا رہا تھا۔

اللہم ان تہلك هذا العصابة من
 اهل الاسلام لا تعبد في الارض (صحابہ) } اے اللہ اہل اسلام کی یہ ٹولی اگر تباہ ہو گئی، تو زمین پر
 آپ پھر بدجے نہ جائیں گے۔

بہر حال لوگ سوچتے نہیں ہیں، اور نہ ہی واقعہ جس کا ذکر کچھ دیر پہلے کر چکا ہوں، یعنی شامی کے میدان سے دایبسی کے بعد امیر بیوت حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ، اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں منتقل ہوتے ہوئے جس زمانہ میں عرب پہنچنے کی کوشش فرما رہے تھے، تو جیسا کہ مصنف امام نے یہ اطلاع دی تھی کہ دہشت نوردی کے ان ایام میں بھی سیدنا امام الکبیر اپنے امیر و پیر و مرشد سے، صرف مراسلاتی ربط ہی نہیں قائم رکھتے تھے، بلکہ ان سے شفا پانے کے لئے ایک دفعہ نہیں، بلکہ قبول مصنف امام "بوڑیہ گمٹھلا لاڈوہ پنچلا سرہ جمن پار کئی دفعہ گئے آئے" ۳۱

ظاہر ہے کہ فتنے کے ان تاریک دنوں اور نازک ترین ایام میں حضرت والائی آمد و رفت کا یہ سلسلہ صرف

پیر و مرشد کی قدم پوسی کے حصول پر کثرت و سعادت ہی کی حد تک کیا محدود تھا؟ یا محدود رہ سکتا تھا؟ بظاہر ایسی فاش شکست کے بعد مامور کی اپنے امیر کے ساتھ بار بار کی یہ ملاقاتیں، یقیناً صرف گونگی بہری خشک ملاقاتیں بن کر رہ سکتی تھیں، اور نہ واقعہ میں ان ملاقاتوں کی یہ نوعیت تھی۔ دعا ہائے سحر گاہی اور نالہ ہائے نیم شبی جنہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک ”پیشانی“ کی طرف نہیں، بلکہ ”پیشانیوں“ کی طرف منسوب کر رہے تھے، ان ”پیشانیوں“ میں کم از کم ان دونوں ”امیر و مامور“ ”پیر و مرید“ کی ”پیشانیوں“ کو بہر حال شریک ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

سیدنا الامام الکبیر اس کے بعد جبکہ آپ سن چکے، روپوشی کے ایام میں خود حجاز پہنچ جاتے ہیں۔ ”امیر اور مامور“ کے باہمی اجتماع کی یہ صورت، کیا صورت ہی بن کر رہ سکتی تھی، جس کے اندر ہم فرض کر لیں، بلاوجہ فرض کر لیں کہ کوئی ”سننے“ نہ تھے۔

الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا تو کسی نئے محاذ ہی کے قائم کرنے اور اس ”قوت“ یا جماعت سے رشتہ اتصال و ربط کو درست کرنے ہی کے لئے واپس ہوا تھا۔ جس کے اجتماع شیرازے کو درہم و درہم کر کے چاہا جا رہا تھا کہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے، جس کتاب کو اس نے خدا کی کتاب مانا تھا، اور اس کے احکام کو خدا کا حکم یقین کرتا تھا، اس کا مطالبہ بھی یہی تھا، اور جن لوگوں کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا، ان کے بڑوں اور چھوٹوں کے متعلق بھی ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتے کہ اس قرآنی مطالبہ کی تعمیل دیکھیں ہی کے لئے وہ واپس ہوئے تھے۔ خود اس کے بلند عزائم، اور وسیع حوصلوں کا اقتضا بھی یہی تھا۔

پس واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے شہر کے ہنگامہ رست دخیز کے دھیمے پڑ جانے کے بعد اس کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا، بذات خود اس کے لئے اور واپس ہونے والے ساتھیوں کے لئے یہ سب کچھ دیکھا بھلا تھا، ایک طے شدہ لائحہ عمل تھا۔ اپنے اپنے وقت پر اسی کے فیصلے علیٰ غالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحت الہیہ اور اجل سنی کا اعلیٰ قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کر دیتا، تو

دیکھنے والوں کو خدا ہی جانتا ہے، وہی کیا کیا کر کے دکھاتا، جس کا تعہدِ مابہت تذکرہ آئندہ اوراق میں بھی کیا جائے گا۔

تاہم اس نے دکھانے کی ابتدا اس انداز سے کی اس کا زہنی خاکہ اس واقعہ سے ذہن میں آسکتا ہے جو خاکہ اس نے ملا واسطہ سیدنا امام الکبیر کے سچے وارث اور جانشین الاستاذ الحکیم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، اور اس کا اجمالی تذکرہ پہلے بھی اسی کتاب میں کسی موقع پر کر چکا ہوں کہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے نائب، متم تھے) کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا صحیح سیاسی مسلک کیا ہے؟ یہ پیغام سناتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے، اور ارشاد فرمایا: "حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، شہد کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ شہد کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"

آخر میں ارشاد فرمایا

(صرف) تعلیم و تعلم درس و تدریس جن کا مقصد انفس العین ہے۔ میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں۔ لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔

مدرسہ دیوبند کی یہی وہ اساسی خصوصیت تھی جس نے اس مدرسہ کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پر وہ خصوصیات پیدا کیں، اور وہ دینی اور مذہبی حیثیت و غیرت کا ہند گہری نہیں، عالمگیر جامعہ اور اقاسی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا، اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص بلا جلا اور مرکب نصب العین لیکر باہر نکلے جس میں سب پر چھاپا نیکی

اس واقعہ کی مزید تفصیل میں نے اپنے مضمون احوال دارالعلوم میں پیش کی ہے۔ متعلقہ قسط باہتمام دارالعلوم بابت ادارہ جاری اتالی شائع ہوئی ہے۔ ۱۱

اسپرٹ موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اس اسی خصوصیت حضرت دالا کے سوا کسی کے سامنے نہ تھی، اور نہ ہی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اس وقت سامنے تھے، ہر ایک سے اتنی بلند نظری کی توقع ہی کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس انس کے سب سے پہلے اور اہم رکن حاجی سید محمد عابد صاحب تھے جن کی بزرگی ہی کا نہیں دانشمندی اور اصابت طئے کا بھی اس زمانہ میں خاص شہرہ تھا۔ جیسا کہ آگے آرہے ہیں وہ بھی باوجودیکہ اجراء مدرسہ میں سیدنا الامام الکبیر کے دست راست ثابت ہوئے، مگر اس تصور سے خالی تھے مولانا محمد سیاں صاحب ناظم جمعیتہ اعلیٰ ہند نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

”اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالعلوم کے پرشکوہ تصور سے حضرت حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحب) کا ذہن خالی تھا۔ (علما، ہند کا شاندار ماضی ص ۱۰۰)

کسی موقع پر بلااستاذ اکبر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے خود سنا ہوا فقرہ اس کتاب میں نقل کر چکا ہوں جو افواج ملتہ میں بھی مقبول ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی موجودہ پرشکوہ عمارتوں کے متعلق حضرت مدظلہ

۱۔ دیکھو سوانح قاضی جلال دہلوی ص ۱۹۹

نے مولانا محمد سیاں صاحب نے اس دفعہ کی ریل میں جو افتخار شاندار ماضی میں پیش کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے جو میں نے اپنے چند بزرگوں سے سنی ہے کہ مدرسہ جاری ہو چکا تھا، لیکن اس کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی کرایہ کے مکانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ جب سلسلہ تعلیم بڑھنے لگا اور مکان کی تنگی محسوس ہوئی تو حضرت نافوتوی مدظلہ کے راءے یہ ہوئی جس کے مؤید مولانا محمد یعقوب صاحب، حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری بھی تھے کہ مدرسہ کی کوئی نئی مستقل جگہ اور عمارت ہونی چاہئے۔ (جیسا کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ نے ضمیمہ ردوداد مدرسہ بابت ملت الیہ میں ظاہر فرمایا ہے) حاجی صاحب نے اس کی شدت سے مخالفت فرمائی کہ کیا ضرورت اتنے مصارف کی، مسلمانوں کا پیسہ ضائع ہو گا۔ جامع مسجد کی سر دریاں اور حجرے اس کے لئے بالکل کافی ہیں، لیکن قبول حضرت شیخ الہند کے کہ حضرت دالا کے سامنے مدرسہ کا دشمن مستقبل تھا، اس لئے انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب مدرسہ کے لئے اگلی جگہ مناسب ہے۔ مسجد میں مدرسہ کا پونا بہت سے مشکلات اور دشواریوں کا باعث ہو گا۔ یہ طلبہ کی قوم آزاد قوم ہوتی ہے۔ کبھی شکایت ہو گی کہ مسجد کے کونے ٹوٹ گئے کبھی فریاد ہو گی کہ مسجد کی صحنیں گم ہو گئیں، لاشیں زمین میں غرض اس قسم کی سیڑیوں مشکلات پیش آئیں گی۔ اس لئے مدرسہ کا مسجد سے الگ اپنے ہی رہائے (مجھے صفحہ پر دیکھئے)

نے فرمایا کہ

”حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحب) کے سانسو دارالعلوم کا یہ مستقبل نہ تھا جو حضرت اشاذ (حضرت نانوتوی)

کو نظر آ رہا تھا۔ انکی فراست کے سانسو یہ کتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دارالعلوم ہونے والا تھا۔“

بہر حال مدرسہ کے اجراء و قیام کی حقیقت وہ اپنے اور اپنے رفقاء کار کے ہی طے شدہ لائحہ عمل کے ساتھ نئے محاذ کے کھلنے کیلئے صرف صالح اور قابل زمین کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری

(گذشتہ صفحہ سے) مکان میں رہنا مناسب ہے۔ مگر حاجی صاحب نے اس رائے کو تسلیم نہ کیا۔ آخر کلا حضرت الالہ نے

لوگوں سے فرمایا کہ مکان مدرسہ کیلئے اشتہار جاری کر دیا جائے۔ اس اشتہار میں اس کا تذکرہ نہ ہوا کہ مدرسہ کا مکان الگ بنے گا یا مسجد

میں رہے گا۔ یہ وقت پر طے ہونا چاہیگا۔ اتنے عرصہ میں حاجی صاحب بھی اشاذ اور شفقت فرمائیں گے۔ چنانچہ اشتہار جاری ہو گیا اور

اس میں عام مسلمانوں کو دعوت دی گئی۔ جو کہ وہ سنگ بنیاد رکھنے کا طے ہوا اور پروگرام یہ تھا کہ بعد نماز جمعہ حضرت والا وعظ

فرمائیں گے اور ختم وعظ پر مسلمان بھی شہری اور بیرونی حضرات کا جائے مقررہ پر پہنچ کر سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کریں گا

چار آدھ گز کے حساب سے زمین کا معاملہ طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسب پروگرام عمل ہوا۔ اطراف و اکناف کے لوگ جمع

ہوئے اور حضرت کے وعظ کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ وعظ ہوا اور ختم وعظ پر حضرت نے فرمایا کہ چائے

بنیاد پر سب حضرات چلیں تاکہ سنگ بنیاد رکھ دیا جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت حاجی صاحب نے غصہ کی آواز میں زور

سے فرمایا، ”ہائیں؟ یہ کیا؟“ حضرت نے فرمایا کہ حاجی صاحب بول ہی مناسب ہے۔ آپ تشریف تو لے چلیں

فرمایا کیوں چلوں؟ کیا ضرورت ہے اس اسراف کی؟ اذ کیوں؟ بیکار اتنا بڑا بار اٹھایا جا رہا ہے؟ یہ الفاظ حضرت

حاجی صاحب نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں فرمائے۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب آپ وہ چیز نہیں دیکھ رہے

ہیں جو مجھے نظر آ رہی ہے۔ یہ مدرسہ بڑھنے والی چیز ہے۔ اس پر حاجی صاحب نے پھر زور سے انکار ہی میں جواب

دیا۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب کو اختیار ہے۔ حسب صاحب چلیں اور سنگ بنیاد رکھیں۔ حاجی صاحب تو

جامع مسجد سے روانہ ہو کر جتھہ کی مسجد میں اپنے حجرہ میں جا بیٹھے اور یہ مجمع اور ہجوم حضرت کے ساتھ مدرسہ کی طرف

روانہ ہوا۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں مشرک پر مدرسہ کا موجودہ بلادہ وارہ ہے۔ مجمع کو روک کر حضرت والا نے فرمایا کہ

آپ لوگ یہاں ٹھہریں۔ میں ابھی حاضر ہوا اور سیدھے جتھہ کی مسجد میں پہنچے اور حاجی صاحب کے حجرہ میں پہنچ کر فرمایا۔ ابھی

حاجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور بزرگ ہیں اور ہم سب آپ کے چھوٹے ہیں۔ بھلا ہم آپ کو کیا آپ بھی چھڑ سکتے ہیں؟

اور یہ کہ حاجی صاحب کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس ملازمت کا حاجی صاحب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بے اختیار رو پڑے اور اتنا کہ

آواز مل کر نکل گئی۔ انتہائی کفری سے فرمایا کہ انا میرا قصہ خاف فرمادیجئے۔ بات دہری حق ہے جو آپ فرماتے ہیں حضرت حاجی صاحب

کو اٹھا کر چلے گیا اور دیکر جانے بیٹھ گئے۔ مجمع ان دنوں بزرگوں کو آتے ہوئے دیکھ کر بے حد سرور و مسرت میں خوشی کی

ایک لہر دوڑ گئی اور پھر سب نے ملکر درگاہ نورہ کی بنیاد رکھی جو دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت ہے۔ مختلفا طیب غفرلہ

افتخاؤں کی تکمیل کا بھی سامان کیا جائے۔ اس کے اسی لائحہ عمل کا اہم ترین جز، بلکہ قالب کے لحاظ سے سب کچھ وہی تھا کہ نئے محاذ کا یہ نیا قالب یا ”عملی مرقع“ کہاں قائم ہو۔ یہ سوال تھا جس کا جواب ڈھونڈھا جا رہا تھا۔ بیعت جہاد کے امیر حضرت حاجی صاحب نور اللہ ضریحہ کی جس اطلاع کا تذکرہ ابھی گذرا، راوی کا اسی روایت کے سلسلہ میں یہ بیان بھی تھا کہ آخر میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ

”یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانہ کو یہ سروزمین لے اڑی“ چیلو (علماء ہند کا شاندار ماضی)

اسی روایت کے بعض طریقوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے، اگر بجائے دیوبند کے ”نئے محاذ“ کے لئے دونوں میں تمنا نہ ہوں، ”نانوتہ“ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات کے ترجیحی خطرات بھی گذرتے تھے۔ اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا، ”دیوبند میں اس ”نئے محاذ“ کی بنیاد ڈالنے کے بعد علامہ دیوبند کے مراد آباد، نگینہ، تمنا نہ بھون وغیرہ میں اس کی شاخیں میں مدللہام الکیہری کے منشاء کے مطابق کھلتی چلی گئیں۔ ناظم جعیتہ العلماء حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے مراد آباد کے ایک بزرگ مولانا سید غالب علی کے حوالہ سے یہ فقرہ اپنی اسی کتاب ”علماء ہند کے شاندار ماضی“ میں جو نقل فرمایا جو کہ ”دارالعلوم دیوبند“ مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر العلوم سہارنپور کو آپ ان اسکولوں اور مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں جن کو اتفاقہ طور پر قائم کر لیا جاتا ہے۔“

اس کے بعد اپنے پیر و مرشد قاضی محمد اسماعیل رحو اپنے وقت کے ارباب کشف والہام میں شمار ہوتے تھے، کا یہ قول بھی مولانا سید غالب علی دہراتی کے

”یہ مدارس خاص الہامات کے بموجب قائم کئے گئے ہیں“ ج ۵

۱۵۔ بے مجرب آثار پیر اصل اللہ علیہ وسلم کی راہوں پر چلنے والے نیکر ان ہی پر مرٹنے والے راستہ باز و فائز عماموں کے ہیں واقعہ کر رہے ہوئے اگر آفاقی وہ بات یاد آجائے کہ مکہ کو چھوڑ دینے کے بعد کہاں جائے گا مکہ دیا جائے گا خیال کسی یارِ مسافر کی طرف جاتا تھا لیکن معلوم ہو کہ طابہ و طیبہ و مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنے کے لئے شرب کی سہولت کا انتظام ہو چکا تھا، فذہب وھلی الی اجمالیہامہ اوھجو فاذاھی المدینۃ یثرب (بخاری)

دل کے لحاظ سے ”الہامات“ اہل دماغ کے اعتبار سے چاہئے تو ”عمل کے لائحہ“ سے بھی اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عرض ہی کر چکا ہوں کہ قیادت و امانت کی راہ نمایوں میں بھی جو ہماری فرق ہے۔

اہل بھی میرا مطلب سمجھو ہے کہ ”نئے محاذ“ کا کسی تعینی و تدبیری نظام کے تحت کمر لے کر ارادہ تو فیصل شدہ ارادہ اور الہامی محرکات کے زیر اثر قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا اور بقول حضرت حاجی صاحب دیوبند کی سرزمین کی قسمت تھی کہ قدرت کی طرف سے اسی کا انتخاب سب سے پہلی دفعہ ہی نئے محاذ کے افتتاح کے لئے ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ قسمت کہنے، یا لازمی تقدیر کا ظہور ہمیشہ اسباب و علل کے پردوں ہی میں ہوتا ہے دیوبند کی سرزمین کے لئے یقیناً یہ ایک تقدیری فیصلہ تھا، مگر ”منصہ شہود“ پر بھی تقدیر تدبیر کے کس رنگ میں جلوہ گر ہوئی، اس کی حد سے زیادہ تشدد قطعاً نامکمل تفسیر ہوگی۔ جسے لوگ انا راہ بخود کی روایت کی حد تک محدود کر دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے، عرض ہی کرتا چلا آ رہا ہوں، کہ اس نئے محاذ کے بانی سعید ناالام الکریم دیوبند والوں سے قرابت قریبہ کے مودوثی تعلقات پشتہا پشت سے قائم تھے، یہ بھی آپ سن چکے کہ آج جس مقام پر دارالعلوم کی طویل و عریض عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے اسی کے قریب دیوان کی ڈیوڑھی میں حضرت والکی تعلیمی زندگی کا ابتدائی زمانہ گزرا تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ آپ کی طرف سے شہداء کی ناکامی کے بعد ”نیا محاذ“ دیوبند کے جس قطعہ اراضی پر کھلنے والا تھا، خاص اسی قطعہ اراضی اور خطہ پاک سے بچپن ہی میں مانوس بننے کا قدرت نظم کر چکی تھی، آج جہاں دارالعلوم ہے وہی میدان اس کے باغ، تالاب، آپ کی بازیگاہ اور سیرگاہ تھی، پھر دیوبند کے دیوان کی یہی ڈیوڑھی آپ کی سسرال بھی بنی، اور جیسا کہ تفصیل بتایا جا چکا ہے، شہداء کے ہنگامہ کے بعد سید ناالام الکریم کی دیوڑھی کی کافی مدت دیوبند ہی میں گزری، حالات ہی ایسے تھے کہ نانوہ سے اپنے اہل و عیال کو اس زمانہ میں دیوبند ہی منتقل کرنا پڑا، بلکہ سوانح مخطوط کے مصنف نے جو یہ خبر دی ہے، جس کا پہلے بھی ذکر کر چکا

ہوں کہ سیدنا الامام الکبیرؑ نے دیوبند کو بجائے نافوتہ کے جب اپنا وطن ثانی قرار دیا تو
 ”شمس الاسلام کی رونقِ افرقی ہوئی“

ان ہی الفاظ کو بعض لوگوں نے آپ کی اس نئی وطن پذیری کا مادہ تادمِ رخ قرار دیا تھا جس کے اعداد
 ۱۳۵۷ھ میں جو عیسوی سن کے حساب سے ٹھیک وہی ۱۹۳۸ء کا سال ہے، جس کے معنی
 یہی ہوئے کہ ۱۳۵۷ھ میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ بجائے نافوتہ کے حضرت دالا کے اہل و عیال کا مستقل
 قیام دیوبند ہی میں رہے گا، اور ہوا بھی یہی نہروپشی کے زمانہ کا پڑا حصہ حضرت الاکابر ان کی دیوبند ہی
 کی سفری پشت پر چھتہ کے نام سے جو ایک مسجد تھی اہاں اس وقت تک محمد اللہ موجود ہی میں گذرا۔ زمانہ دراز
 سے اس مسجد کے حجرے صاحبِ دل بزرگوں کی قیام گاہ بننے کی سادت حاصل کرتے چلے آتے
 تھے اور اس زمانہ میں بھی دیوبند کے دو مشہور و معروف بزرگوں یعنی حاجی سید محمد عابد حسین صاحب
 اور مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہا کی قیام گاہ بھی چھتہ کی مسجد کے ہی حجرے تھے، ہم جنسی اور ہم مذاقی
 کے رشتہ کا اقتضائے ہوا کہ اس زمانہ میں ”خلوت گاہ حق“ بننے کا شرف چھتہ کی مسجد کے ایک حجرے کو
 سیدنا الامام الکبیرؑ کے قیام کی وجہ سے حاصل ہوا۔

چنانچہ صاحبِ سوانح مخطوط نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”اسی زمانہ میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب و جناب حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی
 جن کی تعریف ذیل میں مفصل درج کی جاوے گی، چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے“

آگے اطلاع دی ہے کہ

”مولانا سیدنا الامام الکبیرؑ نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا اور ان دونوں

علیہ السلام کے خندم و محترم الحاج مولوی سید علی الدین صاحب بی۔ اے (علیگ) و پیر اسٹریٹ لا، جو حکومتِ اصفیہ
 جید آبادکن میں ایجوکیشن اور ریٹیری میں تعلیم و تربیت کے محکمہ کی محتوی (سکرٹری) کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہو کر اب
 پہلے ایبٹ آبادی و الحیدر آبادی کے ”اپاکستانی“ بنے ہوئے کراچی میں مقیم ہیں، ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ چھتہ کی مسجد کے
 اس ”کمرے“ کی فرسودہ و پروردہ حالی کو دیکھ کر اپنے ذاتی مصارف سے آئندہ دست کر دیا کہ اگر ایک نیا کمرہ ہی بن گیا،
 جس سے طلبہ مستفید ہوتے ہیں اور سید صاحب کے حق میں دعاگو ہیں“

بزرگوں سے کمال درجہ کا انس اور ربط ضبط قائم ہو گیا ۵

برپوشی کے زمانہ میں سرکاری دوش کا رخ اس مسجد کی طرف اگڑتا، تو آپ سن چکے ہیں کہ اس مسجد سے نکل کر دیوبند ہی کی دوسری مسجدوں میں آپ منتقل ہو تے رہتے تھے۔ ہندوستان سے مکمل کریمیت راج اسی زمانہ میں آپ جواز پہنچے، اور ”عام معافی نامہ“ کے ساتھ حکومت کی طرف سے نگرانی جب اٹھالی گئی، تو حجاز کی واپسی کے بعد بھی وطن کی حیثیت گویا دیوبند ہی کی رہی، گو اس کے ساتھ ساتھ نانوتہ بھی آتے جاتے رہتے تھے، پھر جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ مطالبہ عام کا سلسلہ حکومت کی طرف سے جب ختم ہو گیا تو

”منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا، مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کو پرانی دوستی کے سبب بلایا، وہی تصحیح کی خدمت تھی“ ۳۹

تصحیح کتب کی اسی خدمت کی وجہ سے میرٹھ ہی گویا اس زمانہ میں آپ کا مستقر تھا، لیکن خدمت کی جو تہمت تھی، اس میں کافی گنجائش تھی، کہ اپنے وطن ثانی دیوبند میں آپ کی آمد و رفت کا سلسلہ باقی رہے، اور حالات و واقعات سے یہی معلوم بھی ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ باقی تھا۔

بس یہی سوچنے کی بات ہے کہ جس ”نئے محاذ“ کے کھولنے کا دلولہ آپ کے سینہ، صداقت گنجینہ میں جو شس زن تھا جس کے لئے مناسب و صالح و قابل زمین کی تلاش میں جیسا کہ چاہئے، جب آپ سرگردان تھے تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اس عہد تلاش و جستجو میں آپ کی نظر مسلمانوں کی کن کن آبادیوں پر پڑتی تھی، یہ واقعہ تھا کہ ”مطالبہ عام“ کے اٹھ جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو اس کا اطمینان نہ تھا کہ حکومت نے ان کا تعاقب ترک کر دیا ہے۔

اللہ اللہ! مسلمانوں کی سلطنت و سیاست، تہذیب و معاشرت، علم و فن، صنعت و حرفت کا مرکز و حید مرحوم دلی تک کے متعلق غالب بے چارے کا جب یہ احساس تھا شاید پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں، مگر

”دیکھا چاہئے مسلمانوں کو دلی میں، آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں؟“ (اردوئے معلیٰ ص ۱۱۱)

خود بھی دیوبند جو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی پناہ گاہ تھی۔ اور بقول مصنف سوانح مخطوطہ
آپ کا وطن ثانی بھی وہ قرار پا چکا تھا، وہاں کے مسلمانوں کی بھی حالت جب یہ تھی جس کے دادی ہمارے
مخدوم و محترم مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیت العلماء (دہلی) ہیں کہ

”دیوبند کے ایک بڑے میاں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں تہجد سے فارغ ہو کر انگریزوں
کے لئے بد دعا کیا کرتا ہوں، مگر بد دعا سے پیش تر سارے مکان پر اور در و دیوار پر نظر ڈال
دیتا ہوں کہ کوئی اجنبی شخص تو یہاں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ علماء ہند کا شاندار ماحضی

ایسی صورت میں یہی سمجھنا چاہئے، کہ آج کل کرفیو کے نام سے کبھی کبھی خاص مواقع پر آرڈر حکومت کی
طرف سے چند خاص گھنٹوں کے لئے جو سر ہوتے رہتے ہیں، لفظاً نہ ہی، لیکن ہندوستان کے
سارے مسلمان ”کرفیو آرڈر“ کے اسی ددای حکم کے زیر اثر گویا زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔
کسی مقصد اور کسی غرض سے بھی چند مسلمانوں کا اجتماع گویا اس ”کرفیو آرڈر“ کی خلاف ورزی کا رنگ
اختیار کر لیتا تھا، جس پر حکومت کی سخت اور کڑی نگرانی قائم تھی۔

ماسوا اس کے وہ نیا محاذ جسے سیدنا الامام الکبیر شاطی کے میدان سے واپس ہونے کے بعد
کھولنا چاہتے تھے۔ اس ”نئے محاذ“ اور اس کے دودرس مضمرات و کمونانات خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن
ظاہری قالب تو اس کا یہی تھا کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی حفاظت کے لئے دینی تعلیم کا ایک ایسا نظام
قائم کیا جائے جس کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں جہاں تک ممکن ہو، بڑی سے بڑی تعداد دینی علوم
کے علمبرداروں کی پھیل جائے۔ اس جدید دینی نظام کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے قدیم علماء کی
تدریس و تعلیم کا آزاد اور انفرادی طریقہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک قطعاً ناکافی تھا، اور شاہد ہے
سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی، اپنے اسی اصولی نقطہ نظر کے زیر اثر آپ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام
قائم کرنا چاہتے تھے جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمونے اور
جذب کرنے کی صورت چاہا جاتا تھا کہ نکالی جائے۔ آج تو کالجوں اور اسکولوں کی کثرت، بلکہ دینی تعلیم
کے اجتماعی نظام کے تحت چلنے والے عربی مدارس کی بھی اتنی کافی تعداد ملک کے طول و عرض میں

کچھ بھی ہو، دینی علوم کی تعلیم و تنظیم کا کام علماء ہی سے لیا جاسکتا تھا۔ لیکن ان کی عمریت سے اس مسئلہ میں کسی قسم کی مدد کے ملنے کی توقع نہ تھی۔ ماسوا اس کے اس قسم کے اجتماعی نظام کے تحت قائم ہونے والی ”تعلیم گاہ“ کے نظم و پرداخت کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ انتظامی سلیقہ رکھنے والی کوئی بیدار سفر، استیلاز، مخلص شخصیت، ہر قسم کے معاشی مشاغل سے بے تعلق ہو کر ”ہمدوقی“ نگرانی کے لئے آمادہ ہو مگر جن معاشی زبوں حالیوں کو شکار اس زمانہ میں مسلمان ہر چلے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے بھلا اس کی امید کیا باندھی جاسکتی تھی۔

اب اس کو اتفاق سمجھئے، یا ازنی تقدیر کے ظہور کا تشکیلی قالب، کہ دیوبند جہاں کے باشندوں میں سیدنا الامام الکبیر کو اپنے دل کی گئی آگ کے پھیلانے کا موقعہ بہ نسبت دوسری اسلامی آبادیوں کے زیادہ آسان لگایا تھا، اسی دیوبند میں ٹھیک اسی زمانہ میں جب ”نئے محاذ“ کے لئے زمین کی تلاش کی ہم میں سیدنا الامام الکبیر سرگرم و مہنک تھے۔ دیکھا گیا، کہ ایک طرف اجتماعی تعلیم کے لوازم و خصوصیات کی ایک سے زیادہ عملی تجربہ رکھنے والی ہستیاں جمع ہو گئی ہیں، جن میں ایک تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب تھے، اور دوسرے صاحب مولانا فضل الرحمن صاحب تھے جو مفتی عزیز الرحمن و مولانا حبیب الرحمن و مولانا مشیر احمد صاحب نور اللہ صریحہم کے پدروالہ تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی جیسا کہ معلوم ہوا ہے، مولانا ملوک الاعلیٰ صاحب کے شاگرد تھے، یوں دئی عربک کالج کے تعلیمی نظام کے مشاہدہ و تجربہ کا مودتہ بھی ان کو ملا تھا، اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حکومت کے تعلیمی محکمہ میں ڈپٹی انسپکٹر ہو کر وظیفہ (پنشن) پانے کے بعد اپنے وطن دیوبند میں خاندان نشین ہو چکے تھے۔ اور خانہ نشینی کے بعد ہی غالباً یہ دونوں بزرگ مسجد چھتہ کی مجلس امن کا جزو ہوئے ہیں۔ اس ماحول کو ابتدائی دور میں جب سیدنا الامام الکبیر کی دیوبند میں رونق افروزی ہوئی، جس کا تفصیلی تذکرہ آچکا ہے، ان بزرگوں کا نام نہ آنا شاید ان حضرات کی سرکاری ملازمتوں کی پابندی اور وطن میں مسلسل قیام نہ ہونے کی وجہ سے ہوگا، دور مابعد میں ان کے اسماء کا تذکرہ اسی کی علامت قرار دی جاسکتی ہے، کہ

اس وقت بزرگ پنشن لے کر دیوبند آچکے تھے اور خاندان نشین ہو گئے تھے۔

شاید اسی لئے سوانح مخلوط کے مصنف کے کلام میں سیدنا الامام الکبیر کے عہدِ روتی افروزی و قیامِ دیوبند کے بارے میں جو ”عہدِ قدیم“ کا لفظ پایا جاتا ہے اور اس قید ”عہدِ قدیم“ کے ساتھ جن خواص مجلس کے ناموں کا ذکر انہوں نے کیا ہے ان میں ان دونوں بزرگوں کا ذکر نہیں ملتا، سوانح مخلوط کے الفاظ یہ ہیں۔

”اس عہدِ قدیم“ (زمانہٴ دور و حضرت نانوتویؒ یعنی ۱۲۸۰ھ) کے مجمع کے خاص لوگ یہ ہیں۔ حاجی دیوان محمد حسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوار الحق صاحب عرف حافظ کٹو، میر جی ماجد علی صاحب، حاجی ظہیر الدین صاحب، حکیم مشتاق احمد صاحب (ایک جگہ ذیل کے دو نام اور اضافہ کئے ہیں، شیخ منظور احمد صاحب، منشی نہال احمد صاحب)۔

گورائیں مجلس انس کی ابتدا چھتہ کی مسجد میں حاجی محمد عابد صاحب اور مولانا رفیع الدین صاحب کی رہائش سے ہوئی اور رفتہ رفتہ اس میں دیوبند کے مختلف محلوں کے یہ جید اور سرمد اور وہ لوگ شامل ہوتے گئے، جن سے ”عہدِ قدیم“ کی مجلس کی قدرتی تشکیل ہوئی، اور قصبہ کی اصلاح اور نئے محاذ کی زمین ہموار کرنے میں اور انہی حضرات سیدنا الامام الکبیر کے دست و بازو ثابت ہوئے، جن کے احوال پر صاحبِ سوانح مخلوط نے بھی اجمالی روشنی ڈالی ہے۔ ”عہدِ قدیم“ کی قید کو سامنے رکھ کر جس کی ساتھ ان مخصوص ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دے دو رکوں میں یہ دونوں بزرگ مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمن صاحب بھی آئے۔ مسجد چھتہ کی مجلس کا ”عہدِ جدید“ کہنا چاہئے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ”عہدِ قدیم“ نئے محاذ کے لئے تہیہ استعداد اور زمین ہموار کرنے کا دور تھا اور ”عہدِ جدید“ اس کی عملی تشکیلات اور فعلیت کے ظہور کا زمانہ تھا۔

اس ”عہدِ قدیم“ میں جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں چھتہ کی مسجد کے گوشہ گزینوں میں حاجی سید محمد عابد و مولانا رفیع الدین دو ایسے بزرگ تھے، جن کو سیدنا الامام الکبیر کے بساطِ قرب و انبساط میں علاوہ ظاہری و باطنی فوائد کے جو حضرت والا کی مجالس انس و دانش کی خصوصیات تھیں۔ سب سے زیادہ

آپ کی لولہ العزائم انگلوں اور بلند حوصلوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر اثر پذیر ہونے کی کچھ ایسی قدرتی صورت پیدا ہو گئی، کہ وہ چاہتے یا نہ چاہتے۔ لیکن اس آنچ کے تاثری عمل سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے تھے، جو اندر ہی اندر ان کو کھلاتی اور نئے سانچے میں ان کے جذبات و عواطف کو ڈھالتی چلی جا رہی تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”عظیم غریبش یدری بر د موج“ کے جس طبقہ سے ان کا تعلق تھا، اس طبقہ کے عام حدود سے نکل کر ”غریب گیری“ کے نئے سودے کو لے کر یہ لوگ بھی میدان میں کود پڑے، مولانا فیض الدین صاحب کی باقی زندگی جیسا کہ معلوم ہے اسی ”غریب گیری“ کی جدوجہد میں بسر ہوئی، حقیقی معنوں میں دارالعلوم کے مہتمم اول وہی ہوئے۔ اقد اسی شغل پاک میں شاید آخری سانس ان کی پوری لے ہوئی۔

اس شغل میں سیدنا الامام الکبیر سے ان کے تاثر یا باطنی استفادہ کا عالم یہ تھا کہ ان کا قلب بھی قلب قاسمی کا دوسرا رخ بن گیا تھا، انہوں نے اپنے زمانہ ”اہتمام دارالعلوم میں جیسا کہ کسی موقع پر مذکور آچکا ہے۔ خود ہی فرمایا ہے کہ دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا، حضرت نانوتوی فرماتے ہیں، جو کچھ حضرت کے

لے۔ مولانا حبیب الرحمن مرحوم جو اپنے عہد میں دارالعلوم کی مداح مدائ کی حیثیت حاصل کئے ہوئے تھے، اپنے تدریر پیش بینی ”مردم شناسی کے دانش مندانہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کم از کم فیران کی فلیت و اخلاص سے زیادہ متاثر تھا، وہی غیر سے براہ راست مولانا فیض الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اجتماعی کارناموں کا ذکر کرتے کرتے کبھی کبھی ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیا کرتے، کہ مجھ جیسے عقلیت زدہ آدمی کے لئے اس کا ماننا دشوار ہو جاتا تھا۔ فرماتے کہ بسا اوقات مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے کہ دارالعلوم کے معلق کوئی مفید تجویز میرے دماغ میں آئی، لیکن عمل کرنے کے وقت اس کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا فیض الدین صاحب اپنے ایام اہتمام میں اس کی بنیاد ہوا کر چکے تھے۔ بہات ہی کی حد تک نہیں بلکہ مجھے خوب یاد ہے مولانا حبیب الرحمن فرماتے کہ درم کی عمارت میں کسی ترمیم و تجدید کا خیال آیا، کام جب شروع کر آیا تو دیکھا کہ بھئی پہلے اس ترمیم کی گنجائش تصداید کر کے مولانا فیض الدین جا چکے ہیں۔ فرماتے کہ کسی بھت میں مجھے نالی بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، جب ہوا لے لگا تو دیکھا کہ پہلے ہی سے نالی اسی مقام پر بنائی جا چکی تھی، چونکہ اس وقت ضرورت نہ تھی اس لئے چپا دی گئی تھی، گویا مجھے صرف اسی بنی ہوئی نالی کے کھلوا دینے کا کام کرنا پڑا، جس کا مطلب اسکی سراو کیا ہو سکتا ہے کہ سررشتہ اہتمام کو ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی بصیرت و ماضی و قطبی ہر قسم کی قوتوں کو دارالعلوم ہی کی تلاح و پیروی میں مولانا فیض الدین رحمۃ اللہ علیہ سے غرق کر دیا تھا۔ کا تو ہے کہ مولانا فیض الدین کے جو حالات ہیں نے سنے ہیں ان کا متخلہ ہے کہ کسی متعل سراج عمری کے ذریعہ ان کی زندگی کے عملی مسہات اور فنون کو محفوظ کر دیا جاوے ۱۳

قلب پر زار ہو تا ہے دہری بعینہ میرے قلب میں منو کس ہو جاتا ہے ابر میں وہ کر گذرتا ہیں چنانچہ میرے کر لینے کے بعد حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا الشاہ کو جزاء خیر عطا فرمائے میرے دل میں یہی آ رہا تھا جو آپ نے کر لیا۔ فرمایا کہ بارگاہ نہیں تقریباً میرے تمام کاموں میں حضرت سے ہم آہنگی کی یہی نوعیت قائم رہی تھی اور حضرت نانوتوی اسی طرح اسے ظاہر فرما دیا کرتے تھے۔

رہے ہمارے سید مغفور و مرحوم حاجی سید عابد حسین صاحب، انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کے اس ”نئے محاذ“ کی افتتاحی ضرروں میں جو کد نائے انجام دیئے ہیں، ان سے والہ ستگان دارالعلوم کے عوام نہ سہی خواص اچھی طرح واقف ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ممدوح کی اس جدید پرہیز اور ”غربی گیری“ کی مخفی روح مولانا فضل الرحمن صاحب مرحوم نے عواطف قاسمی ہی کو ٹھہرا پا جو ”دہ پنے ایک مشہور قصیدہ میں ان کے مناقب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

مرد حق ”عابد“ صداقت کیش ادبیں گستر اندر و مالش

ہم باخلاص دل دریاں بہناد چیزے از لطیبات اسوالش

گوئیا میں ہمہ فتوح کشیر در رسیدہ ہمہ بافضالش

آگے اس مخفی روح کا ذکر کر رہے ہیں کہ

ایک ایں ”طائر ہایوں“ قال شد ز قاسم عطا پر و بالش

یہاں عجب حاجی صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ باطنی معرفت و سلوک کا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے حاجی صاحب ممدوح کو نو عمری ہی سے شوق تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتی طریقہ کے ایک بزرگ جن کا نام نامی میاں جی کریم بخش تھا، اسی پر پیہار ان کو رہنے والے تھے۔ ان ہی سے حاجی صاحب مرید ہوئے، کسب و سلوک کے مراتب ان ہی کے زیر تربیت ملے گئے۔ خلافت بھی حاجی صاحب کو میاں جی کریم بخش ہی سے شروع میں حاصل ہوئی تھی۔ اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ سید صاحب

لے میں حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

”جناب میان جی کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رام پوری چشتی کے خلیفہ ہیں۔“
 اسی کتاب میں اس کی معاصرانہ شہادت بھی مصنف کتاب نے ادا کی ہے کہ
 ”اہل دیوبند کو آپ سے دینی سید محمد عابد صاحب سے کمال درجہ عقیدت ہے۔“

ظاہر ہے کہ ایک سالک مسلک معرفت و حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ جب اپنے پیرو مرشد
 میان جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ چشتی کے خلیفہ مجاز بھی سید صاحب ہو چکے تھے، تو اس زمانہ کے
 لحاظ سے مسلمانان دیوبند کی عقیدت کیشیوں اور نیاز مندوں کی مرکز ان کی ذات گرامی بن گئی ہو،
 تو اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، بلکہ اسی کے ساتھ اسی کتاب میں سید صاحب مرحوم کی
 ایک خصوصیت جس کے گونہ مشاہدہ کا موقعہ خود اس فقیر کو بھی اس زمانہ میں ملا ہے جب دارالعلوم
 میں زیر تعلیم تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ دیوبند سے باہر حتیٰ کہ صوبجات متحدہ سے بھی آگے بڑھ کر بہار
 و بنگال تک سید صاحب کی اس امتیازی خصوصیت کا چرچا اور شہر و پھیلا ہوا تھا، اسی کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے سوانح مغلطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ سید صاحب کے دیگر ظاہری و باطنی کمالات
 کے ساتھ ساتھ

”ان میں ادنیٰ تعویذ و گنڈہ ہے، جس کے سبب اہل دیوبند اور نواح دیوبند کے ہر قسم
 کے دکھ درد و دلزدہ دور ہوتے ہیں۔“

اسی کا نتیجہ تھا کہ سید حاجی صاحب کی ہر دل عزیز زبان خواص ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھیں، بلکہ
 بقول مصنف کتاب

”دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی ایسا بچہ ہو گا جس کے گلے میں آپ کا دینی حاجی سید
 عابد صاحب کا، تعویذ نہ ہو گا، اور کم تر ایسی عورتیں ہوں گی، جن کے باند پر آپ کا نقش
 نہ ہو۔“

سید صاحب کے اسی ”نقش“ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت نے ثنوی میں جو دارالعلوم
 کے متعلق کسی زمانہ میں آپ نے نظم فرمائی تھی، یہ مصرع بھی لکھا،

ع نقش و توہیدش مثال نقش قدس، منقول از حصہ پنجم علماء ہند کا شاندار مثنوی،

واقعہ یہ ہے کہ جسکی جھاڑ پھونک، توہید گنڈوں کی قبولیت کا حال جب یہ ہو جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

”آپ کا مطب (توہیدی) بڑے بڑے (دوائی) طبیبوں سے زیادہ گرم رہتا ہے، خصوصاً دوائی و موسیقی امراض میں غریب علاج کم کرتے ہیں، آپ ہی کے توہیدوں پر قناعت کرتے ہیں“

خواص و عوام کی فیض رسانی کی اس نشانہ میں یہ ایک صورت ایسی تھی کہ مصنف کتاب کو یہ گواہی دینی پڑی کہ

”آپ کی (سید صاحب کی) ذات فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہو“
”خلافت“ کے اس لفظ میں اسی کتاب کے مصنف کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں ہی تک اس باب میں آپ کی فیض رسانیاں محدود نہ تھیں، بلکہ وہی لکھتے کیا اپنی عینی شہادت نقل کرتے ہیں کہ

”غیر مذہب والے بھی آپ کے توہیدوں کے متفق ہیں“

الغرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نشانہ میں حاجی سید محمد عابد صاحب کی ذات بابرکات پر گویا دیوبند ادھاس کے باشندے کھٹے ہوئے تھے، جن میں مسلمانوں کے ساتھ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں غیر مسلم بھی شریک تھے، علاوہ درویشی کے حالات کے شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی میں ان کے رسوم و استواری کا یہ حال تھا کہ بقول مولانا سید محمد میاں صاحبنا علماء کے مشہور سربراہ درود عالم

”المدائح ثلثہ میں حضرت تھانویؒ کی طرف یہ دوا بت خوب کی گئی ہے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب کے ساتھ عہدوں کی عقیدت کا یہ رنگ تھا کہ ایک بیوی صاحبہ جن کا دو پٹہ چوری گیا تھا، کہتی تھیں کہ کچھ پر جانیں، حاجی محمد عابد سے کہلا بھیجو۔ دو پٹہ میں آجائے گا۔ چنانچہ حاجی صاحب سے کہلا بھیجا گیا، انہوں نے توہید دے کر فرمایا کہ اگنی جس پر دو پٹہ چوری گیا ہے، اسی پر آجائے گا۔ چنانچہ درپٹہ دہرا گیا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ شاید کوئی جن وغیرہ تاج ہے۔ مثلاً قصص الاکابر“

دن نظر مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم یہ کیفیت بیان فرماتے تھے کہ

”ایک روز آپ کو دہی حاجی محمد عابد صاحب کی بہت رنجیدہ دیکھا گیا، کبیدگی اور اندر کی یہ حالت تھی، کہ جیسے کسی جواں مرگ..... پر ہو، جب سبب دریافت کیا گیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریر ہو کر فوت ہو گئی یا مشہور ۵۶

اب صحیح طرز پر تو میرے لئے یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ کس زمانہ کی بات ہے، چھتہ کی مسجد میں سیدنا الامام اکبرؒ نے جو آتش دان روشن فرمایا تھا، اور بجائے ”عظیم بری“ کے ”غریبی“ کے ذوق کا شعلہ آپ کی دہرے دلوں میں بھڑک اٹھا تھا اس کے بعد کا یہ واقعہ ہے یا پہلے کا، یعنی سوانح محظوظ کے مصنف کی روایت ہے کہ حاجی عابد حسین پر ایسا حال طاری ہوا کہ

”گھر، باہر، زمین، باغ، جس قدر آپ کی ملک میں تھا، سب کا سب داہ خدا میں دیکر محض خدا پر تکیہ کیا“ ۵۷

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے قالب میں ”نئے محاذ“ کے اقتراح کے لئے تعلیم کے اس جدید نظام کے چند عملی تجربہ کاروں کے ساتھ ساتھ کام کو ہاتھ میں لینے، اس کو پروان چڑھانے، آگے بڑھانے کے لئے ایک ایسی ”ہمدہ دہی توانائی“

کا جو اہم سوال تھا، یعنی ہر طرف سے سمٹ سٹا کر کامل یک سوئی کے ساتھ اسی کا جو ہو کر رہ جائے، اسی سوال کا عجم زندہ جیتا جاگتا جواب بن کر حاجی محمد عابد کی ذات گرامی نگاہوں کے سامنے دیوبند میں گریا کھڑی ہو گئی تھی،

”دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرامیہ کو یہ سرزمین لے اڑی“

حضرت حاجی امداد اللہ الہا جرائی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اجمالی ارشاد کا یہی تفصیلی مطلب یا قسمت و تقدیر کے ظہور کی یہی تدبیر کی شکل تھی، زمین بھی مل گئی، زمین پر کام کرنے والے بھی مل گئے، تو جس قالب

میں "نئے محاذ" کے کھولنے کا ارادہ کیا گیا تھا وہ کھول دیا گیا۔

یہی دارالعلوم دیوبند ہے، جو بعد ازاں اس وقت تک اپنے تاریخی وجود اور تاریخی نتائج و ثمرات کے ساتھ ہم سب کے سامنے ہے، دیوبند کی خوش قسمت سرزمین میں درخت انار کی چھاؤں کے نیچے محمود مسلم و متعلم ناسیوں کو بٹھا کر کھولنے والوں نے "نئے محاذ" کے اس تبلیغی قالب کے کھولنے کی توفیق جس زمانہ میں توفیق یافتوں کو کئی کئی تھی کھول دیا، اسی زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر سنائی ہے کہ

"وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، اور مولوی فضل الرحمن اور مولوی ذوالفقار علی

اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں" ۳۹

اس سے پہلے خود ہی یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ اس زمانہ میں خود وہ اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نورانیہ ضرر کما بھی میرٹھ میں مقیم تھے، اور مطبع مجتبائی جو پہلے میرٹھ ہی میں قائم ہوا تھا، اسی مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کی خدمت دونوں حضرات انجام دیتے تھے، بطور خود میرٹھ میں انفرادی درس و تدریس کا سلسلہ بھی سیدنا الامام الکبیر نے جاری کر رکھا تھا، جس زمانہ میں قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی بنیاد پڑی، پڑھنے والے آپ سے صحیح مسلم پڑھ رہے تھے۔ پڑھنے والوں میں خود ہمارے مصنف امام بھی شریک تھے۔

۱۔ ایک بات یاد آگئی، بانی مذکورہ العلماء حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری دین کا آبائی وطن دیوبند ہی کے قریب ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں بھی الدین پور نامی متصل ایشیٹن کھا تو لی ہے، اس زمانہ میں حبیب حضرت والا مونگیری کی خانقاہ رحمانیہ میں جلوہ افروز تھے۔ براہ راست اس قصبہ کو تقریباً بیان کیا کرتے تھے کہ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بھام میرٹھ میسر آئی تھی۔ غلطی یہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، مولانا مونگیری قدس سرہ العزیز فرماتے تھے حدیث پڑھی گئی، حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع و مدلل تقریر کی، جس سے کلیۃً شافعی نقطہ نظر کی تائید ہوتی تھی، سلیہ حیران ہوئے کہنے لگے کہ آپ کی اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعی ہی کا مسلک صحیح ہے، اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے۔ مولانا مونگیری فرماتے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ مولانا ناؤ تری نے رنگ بدلا، اور فرماتے۔ لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ (باقی اگلے صفحہ پر)

دیوبند کا دہریہ مدرسہ اور دارالعلوم جس کے اہل تآخراً ظاہر و باطن، اندر و باہر، بلکہ جس کی اینٹ اینٹ اور ذرہ ذرہ پر "قاسمیت" کی اسٹ چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ زمین والوں میں بھی قاسمیت ہی کے "امیازی چھاپ" سے دو بیچا نا اور اسی نام سے بچا راجا تا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آسانی غفلتوں کی یہ صدائے بازگشت نہیں ہے، جسے زمین کے رہنے والے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے دہرا رہے ہیں، الفرض یہی جانی بیچانی، خراس کی سلسلہ اور عوام کی مانی ہوئی حقیقت کے زیر اثر زندگی گزارنے والے جب سنتے ہیں، مصنف امام دارالعلوم دیوبند کے صدر اہل کی زباناً قلم سے سنتے ہیں کہ جس وقت دیوبند میں دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور انار کے تاریخی درخت کے نیچے اس کا افتتاح ہوا، تو یہ "نیا محاذ" جس کے لئے کھولا جا رہا تھا، وہی اپنے "نئے محاذ" پر موجود نہ تھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ اس "نئے محاذ" کا تعلیمی قالب جس وقت سرزمین دیوبند میں واقعیت کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ تو واقعہً اس "قالب" کا "قلب" اور اس مرئی و دیدہ جسد کی جو روح تھی، وہ دیوبند میں موجود نہ تھی؟ "عقل" تو نہیں مانتی، لیکن جو واقعہ ہے، آخر اس کے انکار کی صورت ہی کیا ہے؛ نکتہ تراشیوں کا وہ سلسلہ اس سے بھی زیادہ عجیب تر ہے۔ جب نہ ماننے والی عقل کو تھپکیاں دیتے ہوئے لوریاں سٹائی جاتی ہیں، انار کے خیت کے نیچے چھتہ کی مسجد میں پندرہ روپے ماہوار کے ایک مدرس کا تقرر کر کے کھولنے والوں نے جس مدرسہ کو کھولا تھا، وہ مدرسہ ہی نہ تھا، ایک قصباتی مکتب مقامی بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا تھا، گویا دارالعلوم کی تاریخ کا جو سلسلہ انار والے درخت کے ساتھ بانڈھا جاتا ہے، چاہا جاتا ہے، کہ اس تاریخی رشتہ ہی کا انکار کر کے عقلی بیچینیوں کا ازالہ کر دیا جائے۔ اس سے بھی زیادہ دور کی کوٹریوں کے

دگرشتہ صفحے، کہنے والے اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں، جو تم سن چکے، اب سنو! امام ابو حنیفہ کے مسلک کی بنیاد یہ ہے۔ اس کے بعد مولانا نو تو نے پھر اسی تقریر کی کہ لوگ بہت بنے ہوئے سن رہے تھے۔ ابھی جس مسلک کے مشنری ان کا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حدیثوں کے مطابق کوئی دوسرا مسلک نہیں ہو سکتا، اچانک معلوم ہوا کہ درحقیقت صحیح حدیثوں کا عقاد دہریہ ہے جسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے منع فرمایا ہے۔ مولانا نو نگیری اس کے بعد دیر تک مولانا نو تو ہی کی خدا داد و فہانت و ذکاوت کی تعریف فرماتے رہے۔ ۱۲

لانے والوں کا یہ سیاسی نکتہ ہے کہ اپنے خاص حالات کے لحاظ سے قصداً دارادۃ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے آپ کو اس مقام سے غائب کر دیا تھا۔ جہاں بہر حال ان کی حاضری عموماً ضروری اور ناگزیر رہی تھی۔ یعنی اشتباہی نظر حکومت کی جو آپ پر تھی، یہ عدم حاضری اسی مصلحت سے تھی۔ الغرض یہ یا اسی غیبت کی ”فیل شناسیوں“ اور ”دقیقہ آفرینیوں“ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہوتا رہتا ہے۔

حالانکہ ”درخت انار“ کی چھاؤں میں ایک استاذ والا یہ مدرسہ، اس مدرسہ کے مستقبل کو اعتبار سے خواہ جس حد تک بھی مختصر نظر آ رہا ہو، تقطیع اس کی اس زمانہ میں جتنی بھی چھوٹی ہو، لیکن بہر حال وہ عربی ہی کا دینی مدرسہ تھا، جیسے اپنے اس طویل و غریض سیکل میں بھی دیوبند کا یہ دارالعلوم اس وقت بھی عربی ہی کا دینی مدرسہ ہے شروع میں جس وقت وہ قائم ہوا تھا، اس وقت بھی وہی تھا، درمیان میں بھی وہی رہا، اور اس وقت تک وہی ہے۔ اس سے بڑھ کر حکم و استوار شہادت اس دعوے کے ثبوت کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ درخت انار کی چھاؤں میں اس مدرسہ کا منسلک ہونا میں اقتطاع ہوا، مدرسہ کے اسی پہلے سال کی پہلی مطبوعہ روداد میرے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ روداد کو ان الفاظ سے شروع کر کے کہ

”الحمد للہ کہ ۱۲۸۳ھ ہجری بخیریت تمام ہوا“

آگے اسی میں یہ اطلاع دی گئی کہ

”یہ وہ سال مبارک ہے جس میں بشار

”مدرسہ عربی“

کی دیوبند میں قائم ہوئی“

نام ہی نہیں، امتحانی کتابوں کے ناموں کی فہرست بھی ہیں جب یہ ملتی ہے یعنی لکھا ہے کہ شرح وقایہ شرح ملا، میبذی، قطبی، اصول شاشی، سراچی وغیرہ کتابوں میں طلبہ کا امتحان لیا گیا، اسی سے اس

”مدرسہ عربی“ کے پہلے سال کے کاموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کو کیا، اس وقت تک ”دارالعلوم“ کے وسیع تدریسی احاطہ میں چند ابتدائی کلاسیں بھی مقامی ضرورتوں کے پیش نظر قرآن ناظرہ و حفظ، اردو فارسی حساب وغیرہ کی بھی ہیں، لیکن آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ عربی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد جیساکہ دوسرے سال کی روداد میں لکھا ہے، ان تحتانی کلاسوں کا اضافہ بعد میں ہوا۔ ۱۲۸۴ھ کی روداد جو دوسرے سال کی روداد ہے، اس میں یہ لکھتے ہوئے کہ

”جب دیکھا گیا کہ طلبہ مبتدی بیرونجات و دیوبند کی کارروائی، بددن پڑھنے کتب فارسی کے نہیں ہوتی، اردو فارسی تعلیم، عربی میں ابتداء داخل تمام رکھتی ہے، اور نیز خیال کیا گیا کہ اگر کتب فارسی ابتدا سے پڑھائی جاوے گی تو بالضرورت لوگ اپنے چھوٹے لڑکوں کو مدرسہ بھیجیں گے، اور اس میں امید تھی ہے کہ رفتہ رفتہ شوق تعلیم عربی ہو گا۔“

جس کا حاصل یہی تو نکلا کہ عربی زبان کی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد فارسی ادب کی کتابوں کے لئے گنجائش مدرسہ کے نصاب میں پیدا کی گئی، اسی روداد میں آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ تعلیم قرآن کا درجہ بھی اسی کے بعد کھولا گیا، اور اس سلسلہ میں

”افاضل ماہ ذی الحجہ سے حافظ نامدار خاں جن کی تعلیم اور حفظ قرآن شہید رہے، بہت خواہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔“

ہمارے مصنف امام نے بھی دیوبند میں قیام مدرسہ کی خبر دینے کے بعد جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ ”چند ہی روز گزرے کہ چندہ کو انفرادی ہوئی، اور مدرسہ بڑھائے گئے، اور مکتب فارسی حافظ قرآن مقرر ہوئے۔“

دیکھ رہے ہیں کہ قائم جب ہوا تو ”مدرسہ عربی“ ہی کے نام سے قائم ہوا، مکتبی کلاسوں کا اضافہ اس ”مدرسہ عربی“ میں بعد کو ہوا، ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ چھتہ کی مسجد میں دارالعلوم کی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی، اور اسی لئے کہ وہ ایک مقامی قصباتی مکتب خانہ تھا، سیدنا امام الکبیر اس کی اقتحاجی تقریب میں

شریک نہ تھے۔ خود ہی سرچشمہ توجیہ واقعات کے مطابق کس حد تک ہو سکتی ہے، پھر مدرسہ کے پہلے سال کی اسی روداد میں

”نام ہمتان“

کے عنوان کے نیچے حسب ذیل ناموں کو حجب ہم پاتے ہیں، یعنی
 ”حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نافو توی، مولوی مہتاب علی صاحب مولوی
 ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمن صاحب، منشی فضل حق، شیخ نہال احمد“
 بظاہر ارکان مجلس شورٰی کی تعبیر ”ہمتان“ کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہو کہ دیوبند
 میں ”مدرسہ عربی“ جو قائم ہوا تھا، اس سے اپنے تعلق کو سیدنا الامام الکبیر قطعاً پوشیدہ رکھنا نہیں
 چاہتے تھے۔ جب ”مجلس شورٰی کے ارکان“ میں آپ کا نام شریک تھا۔ وہی طبع بھی ہوا اشاعت بھی
 ہوا، تو یہ کہنا کہ ابتدائیں حضرت الامام اس مدرسہ سے سیاسی مصالح کے پیش نظر اس تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے،
 جس پر حکومت کی نظر پڑ سکتی ہو۔ ہر ایک خود تراشیدہ مفروضہ کے اور بھی کچھ ہے، اسی سال کی روداد میں

اس حصہ کے خیال ناقص ہیں مصلحت تاسیس دارالعلوم حضرت والہ کے کھل کر سامنے نہ آئے کہ وقت کی سیاسی مصلحت پر محمول
 کر لیا جاتا بھی کوئی ایسی بے سرو پا توجیہ نہیں کہ اسے خود تراشیدہ مفروضہ کہہ کر کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے، اس وقت کے بزرگ
 حالات، حضرت دالاکادداشت، مدد پرشی، سرکاری دواشنوں کا پیچھے پیچھے نگار ہوا، پھر حضرت الامام کے ان جذبات نظریات کا
 ماحول کو متنبہ کیلئے جو تا جو اس وقت اجراء و درسی روح اور آج ایک مستقل مکتب خیال اور ملت کی تالیف بنی ہوئے
 ہیں، جن کی مد سے یہ مدرسہ تعلیمی ہونے کے ساتھ ساتھ گویا اہل اللہ کی سیاست کا ایک مرکز بھی تھا، کچھ ایسی باتیں نہیں
 جو کلیۃً پردہٴ خفا میں ہوں یا کم از کم بحیثیت غیر علنی حکومت وقت کی نگاہوں سے باطل اور چھپ ہوں، لیکن ہر بات میں حضرت
 دالاک بحیثیت باقی یا بحیثیت کسی ذمہ دار عہد یدار کے سامنے آنے والا مشہد مدرسہ کو خطرات و مہلک کامنکار بناسکتا تھا اور
 ابتدا ہی سے حکومت وقت کی نگاہیں اس پر کڑی ہو جاتیں جس سے دو حریت پرور مقاصد بروئے کار نہ آسکتے جن
 کے لئے یہ تاسیس عمل میں آئی تھی، ان حالات میں حضرت دالاک کسی رسمی ذمہ دار کی صورت سے سامنے نہ آنا
 اور مدرسہ کے حق میں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ ہونے کو نمایاں رکھنا ایک اچھی خاصی سیاسی مصلحت کی صورت
 ہو جاتی ہے۔ رہا حیران یا حنین کی فہرست میں حضرت دالاک کا نام شائع ہو جانا ان کی کسی رسمی ذمہ داری کو ظاہر نہیں کرتا
 اگر اس میں ذمہ داری نمایاں ہوتی ہے تو ایک جماعت کی ذمہ داری بھی اعزاز کی جس کا کسی مسئول یا قی منصب سے تعلق نہیں
 ہوتا پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جن کا کہ الذیادہ مسجد نشین بزرگ تھے، جنہیں (باقی اگلے صفحہ پر)۔

”امتحان سالانہ“

کا عنوان قائم کر کے یہ رپورٹ درج کی گئی ہے کہ

”ماہ شعبان ۱۲۸۸ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم نانوتوی نے بشمول مولوی جتتاب علی

مولوی ذوالفقار علی صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا۔“

کام کرنے کیلئے ’میرٹھ‘ جو دیوبند مجلس شوریٰ میں شریک ہونے ’طلبہ کا امتحان لے کر کیلئے آسکا تھا اسی مدرسہ کا سنگ بنیاد جب کھاجا رہا تھا افتتاح مدرسہ کی اس تاریخی مجلس پر بجائے حاضر ہونے کے غائب ہو گیا اور غائب ہوا کہ اس مدرسہ کے اہل اقتدار کو اس کے تعلق کی کیا نوعیت تھی؟ یقیناً مذہب ’الامارات‘ کے پیش نظر ایک دلچسپ ال بن جاتا ہر خدا جانے یاغیوں میں اس کی اور کیا کیا وجوہیں آئی ہوں یا آسکتی ہیں، لیکن جن کی عرض کر دوں۔ اتنے

دگنہ صفحہ سے) سیاسیات سے تو بیکے خود، عمامہ شہری مصلحت سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور یا ایسے بزرگوں کی جی جگہ نشا کے قیوم لازم اور حال پشتر سے جن کے بارہویں گورنٹ کو شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایسے سلسلے نامور ہیں تا کسی خاص شخصیت پر مجاہدہ عادی نہیں ہو سکتی۔ اس پر بھی مبالغہ نہیں ہے حضرت ہی کے تعلق کو خیال دہرا دیکر مدرسہ کو حکومت وقت کی نگاہوں میں مشتبہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بنیاد کے الزامات بھی لگائے اور غیر مالک سے سازش کی تہمتیں بھی تراشیں، حتیٰ کہ گورنٹ کو تحقیقات کرانی پڑی اس وقت بھی حضرات آگے بڑھے اور اپنے سرکاری اہلکار کو سامنے دکھا کر مدرسہ کی طرف سے صفائی پیش کی جو کارگر ہوئی، حد اکثر شخصوں پر عہدہ دارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت اللہ آگے آئے ہوئے تو ظاہر ہے کہ مدرسہ کی طرف سے ان بزرگوں کی یہ صفائی اور یقین دہانی کبھی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔ گویا حضرت دلا کا کایوں پر وہ ہتھ پڑا جس مصلحت سے تھا، عمل اس کا خوشگوار نتیجہ ظاہر بھی ہوا۔ اسلئے حضرت دلا کی حکمت عملی کہ مدرسہ کے سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ ہونا ہی دکھانا چاہتے تھے اور نہ صرف تاسیس مدرسہ ہی کی حد تک بلکہ آخر تک اسی کو نہا ہوا۔ بلاشبہ تہمتی معالج کے لحاظ سے ایک حکیمانہ دانش تھی جس کو سیاسی مصلحت کے سوا اللہ کس نام سے قیہ کیا جالے؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس افتاد و ستر میں حضرت دلا کی عقلی افتاد اور روحانی کفایت اور تواضع کو بھی کافی دخل تھا اور کوئی مشبہ نہیں کہ جس طرح وہ امانت خطابت، زعامت، مشیخت، افتاد، تمام امتیازی مواقع سے گھبراتے تھے اسی طرح کارہائے مدرسہ کی قیادت سے بھی یقیناً گریز فرماتے، یہ جیسا کہ حضرت مصنف دمام مجدد کا نظریہ ہے اور واقعہ بھی ہے لیکن ان دونوں باتوں ’یعنی سیاسی مصلحت اور عقلی تواضع میں کوئی منافات نہیں۔ اگر کبھی افتاد کے ساتھ عقل کی انگیز بھی شامل ہو جائے تو اہل ائمہ کے لئے یہ جمع افتاد کچھ مشکل نہیں۔ ایسے لوگوں کے قلب سلیم کی متامنی ترقی میں عقل میں ہوتی ہے اور عقل کے اونچے اونچے نظریات میں قلب کی سلاستی مددگار ہوتی ہے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ قلب نے اپنے راستے سے اور دماغ نے اپنے طریقہ سے حضرت دلا کو اس باہر دے ہر حکمت عملی پر قائم کیا ہو، مغز میں ہم اسے اعلیٰ ترین تواضع بھی کہہ سکتے ہیں اور بہترین سیاسی مصلحت کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔

محمد طیب غفرلہ

اور کڑے اپنے بھائی بھائی اور قریب حاصل کر کے کاغذ و سیاہی کا عید کے ہی جوڑے کو جس پھونک کر رکھ دیا تھا۔
 طفولیت کو ایام بیہوشی میں جو ہوش کی ایسی باتیں کرتا تھا کہ بٹنے بٹنے ہوشیاروں کی بھی جھکی ہم توقع نہیں کر سکتے، لکھے
 پڑھے حتیٰ کہ کھیلنے کو بڑے تک کے مشغلوں میں کام کو انتہائی منزلوں تک پہنچانے میں کامیاب ہونے کے ساتھ
 ہی نام اور شہرہ عام کے سوتھ پر جس کا جلی سمیٹہ 'اور دوا می و طیرہ بجلے' حاضری کے غائب ہو جانا
 ہی قرار پانچکا ہو، ساری بلندیاں جن پر چڑھ چڑھ کر بجانے والے اپنے اپنے فضل و علم کی ڈگڈگیان
 پہلے جاتے تھے، 'یا آج تک بجا رہے ہیں، کیا ہمیشہ ان سے اترنے ہی پر اصرار کرتے ہوئے اسے
 نہیں پایا گیا، حکومت کی ملازمت یا دکانت جیسی باتوں کو تو خیر دور رکھئے، آپ سن چکے کہ جس زمانہ میں
 اس کے دیوان علم کے رفقاء و مسیح صحرائوں کی طرف بگٹ بھاگے چلے جاتے تھے، ٹھیک ان ہی
 دنوں میں وہ دہائی کے کوچہ چیلان نامی کے ایک مکان میں جھلنگے پر بڑا ہوا تھا۔ اسی طرح امامت،
 خطابت، افتاء، دراست، تصنیف و کتابت، حتیٰ کہ ارشاد و بیعت تک کی راہوں میں آپ دیکھ
 چکے کہ کبھی وہ خود آیا نہیں، بلکہ لایا گیا، علم و دین کی ان زائش گاہوں پر چڑھا نہیں، بلکہ چڑھایا گیا، ہندو جبر
 چڑھایا گیا، پھر کام کے بعد آج ہی نام کے مقام پر وہ کیوں ڈھونڈھا جا رہا ہے، جو اس مقام پر پہلے
 کب اور کہاں پایا گیا تھا۔ ان ہی پینانیوں میں تو عرض کر چکا ہوں۔ اس کی 'پیدائشوں' کارزار پر رشید
 ہے، آج اس کے ظہور کی شدت ممکن ہے، بعضوں کے لئے ناقابل برداشت بنی ہوئی ہو۔
 سرگرمشیاں ہو رہی ہیں کہ وہ تو غائب تھا۔ پھر ہر جگہ وہی وہ آج کیوں پایا جا رہا ہے، شاید قرآنی
 قانون واللہ مخیر، جو ماکنتھ تکتھون اور اس کی تفسیر جو انہیں سنائی گئی تھی، اسے وہ بھول
 گئے، حالانکہ چاہئے تھا کہ بجائے اس کے ان معلومات کا جائزہ لیتے، اور ان میں اپنے اس حال
 کا جواب تلاش کرتے جو ان کے "حافظہ" سے امید ہے کہ ابھی غائب نہیں ہوئے ہوں گے،
 کچھ بھی ہو، سچی بات یہی ہے، یہی واقعہ ہے، اور اسی کو واقعہ ہونا بھی چاہئے کہ "جامعہ قاسمیہ" یا
 "دیوبند کے دارالعلوم" کی جب بنیاد پڑی تھی تو سیدنا الامام الکبیر اس وقت دیوبند میں موجود نہ تھے
 اسی لئے قیام دارالعلوم کی ابتدائی داستان میرے دائرہ بحث سے سچ پوچھئے تو خارج ہے۔

ان جزئیات کی سراخ رسانی یعنی مقامی طور پر مدرسہ عربیہ کے نام سے دیوبند کے قصبہ میں اس تعلیم گاہ کا افتتاح کب اور کن مقامی بزرگوں کی تحریک و تجویز سے ہوا۔ ان باتوں کی تحقیق کا صحیح مقام سیدنا الامام الکبیر کی سواغ عمری نہیں، بلکہ دارالعلوم کی تاریخ ہو سکتی ہے، لیکن آئندہ کی کڑیوں کی حلقہ بندی کے لئے یہاں بھی ضرورت ہے کہ ذیلی طور پر ان معلومات کو اس کتاب میں بھی درج کر دیا جائے جو ان امور کے متعلق اب تک سیدنا الامام الکبیر کے اس ظہور و جہول سواغ نگار تک پہنچے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاعلی کے میدان کا رخم خوردہ مشیر، اس میدان سے واپس ہونے کے بعد نئے داؤ اور نئے گھات کے لئے کسی نئی "کین گاہ" کی تلاش میں جب سرگردان تھا، تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا تو دشوار ہے کہ اس زمانہ میں ان کی نظر میں کہاں کہاں کن کن لوگوں پر پڑ رہی تھیں تاہم قرآن و قیاسات کا اقتضاد ہے کہ سہارنپور تھا نہ بھون مراد آباد میرٹھ وغیرہ جیسے مقامات جہاں سے آپ کے خاص تعلقات تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ کوئی وجہ نہ تھی کہ دیوبند اور اس کے امکانات آپ کے سامنے نہ آئے ہوں، جواب بجائے نافوتہ کے آپ کا وطن ثانی بھی بن چکا تھا، بلکہ بیج تو یہ ہے کہ اپنے اس

”کچھار“

کے پروردہ شیریں بچوں سے جو آپ ہی کی آغوش تربیت میں پل رہے تھے، آپ کے طبعی رجحانات و میلانات، خور و کو آپ کی مجلس انس میں شریک ہو ہو کر شعوری و غیر شعوری طور پر جو چسپے تھے ان ہی شیریں بچوں سے توقعات کی لہریں آپ کے قلب مبارک سے زیادہ ٹکراتی ہوں، ان ہی سے آپ کا دل زیادہ امیدیں باندھتا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ لیکن بایں ہمہ اس کا کوئی تاریخی وثیقہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ قیام مدرسہ کی تاریخ و منہ یا اس کے ابتدائی مبادی طے کرنے کیلئے بقید وقت صاف صاف دو ٹوک اتفاقا میں ”دیوبند“ کے باشندوں کو کوئی واضح تصریحی حکم آپ نے دیا تھا۔ اگرچہ آپ کی ہر حرکت اور ہر سکون ساری زندگی اس میں شک نہیں کہ محکم سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی، لیکن اس ال کا جواب کہاں ہی آئیگا؟ اور کون لوگ لبیک کہینگے؟ اسی کے انتظار میں ن پرن ہمدین پرمیزو سال پر سال گزرتے چلے جاتے

تھے، ایک سال دو سال، تین سال، تاہم کہ قریب تھا کہ سالوں کا ایک دہایا عشرہ بھی گزر جائے اسی سوال کا جواب زمین پر بھی ڈھونڈ رہا تھا اور عرض کر چکا ہوں، کہ تلاش کرنے والا آسمانوں میں بھی اسی سوال کے جواب کو تلاش کر رہا تھا، کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب میرٹھ کا شہر اور اس کے مطیع مجتہدائی میں انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں کہ دیوبند سے یہ "بشارت نامہ" موصول ہوا، یعنی حاجی عابد حسین صاحب نے سیدنا الامام الکبیر کو میرٹھ خط لکھا، جس کا اقتباس تذکرۃ العابدین میں دیا گیا ہے۔ حاجی نذیر احمد صاحب مصنف تذکرۃ العابدین یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ حاجی عابد حسین صاحب نے مدرسہ کے سلسلہ میں چندہ شروع کر دیا، خود بھی دیا، اور دوسروں سے بھی لیا اور جمع کیا۔ آگے لکھتے ہیں

"اگلے روز حاجی صاحب (حاجی عابد حسین صاحب) نے مولوی محمد قاسم صاحب کو میرٹھ خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آئیے۔ فقیر نے یہ صورت (فرائی چندہ) اختیار کی ہے۔" (تذکرۃ العابدین ص ۶۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

اس خط کے بارہ میں جو بیان مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیادی استاد دارالعلوم دیوبند کا شامل مواد سوانح قاسمی ہے اس میں اس خط کے کچھ اور فقرے بھی ملتے ہیں۔ جن سے بعض دوسری پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا محمد رح لکھتے ہیں

"حاجی عابد حسین صاحب کا یہ خط میں نے حاجی نذیر احمد صاحب کے پاس بچشم خود دیکھا ہے اور مجھ اس کا مضمون بجنہ قریب قریب اسی کے الفاظ میں پوری طرح محفوظ ہے اس خط میں حاجی صاحب نے مولانا مرحوم کو لکھا ہے، کہ وہ جو آپ کے ہمارے دریاں مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک ایک سوال پوچھنے کے لئے ہمارا نپوہ آدمی بھیجنا پڑتا ہے۔ فقیر کے دل میں اک دم خیال آگیا اور چندہ کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر مغرب کے دریاں تین سو روپے ہو گئے۔ اب آپ تشریف لے آئیے۔ (فائل مسودات مواد سوانح)

یہ سوال کا جواب اذلیک کی پہلی آواز تھی جو خوش قسمت دیوبند اور اس کے خوش نصیب، توفیق یافتہ باشندوں کی طرف سے تقریباً دس سال کی "سافین عام" کے بعد پہلی دفعہ سیدنا الامام الکبیر کے "قلب غنظر" سے ٹکرائی، سب پیچھے رہ گئے، دیوبند سب سے آگے بڑھ گیا اور اذلیک لائق الاحترام "کا" قدرتی حق "ضلع سہارنپور کے اس گناہم قصبہ" دیوبند کے طالع ارجند کے لئے ہمیشہ کے واسطے محفوظ ہو گیا، سبقت اور پیش قدمی کا ایراج تو جو کہ فی اس سے اب ہمیں نہیں سکتا۔ ذلک فضل اللہ یختصہ من یشاء

مندرجہ بالا "بشارت نامہ" حضرت سید حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اتمام فرمودہ تھا جو چھتہ کی مسجد کی "مجلس انس" کے رکن رکین تھے

بشارت نامہ کے ان دونوں اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسال بشارت نامہ تک حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب کی ماسخی صرف فراہمی چندہ تک محدود رہیں۔ تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا، اسی کے لئے انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کو یاد فرمایا۔ اور ان مذاکرات کا حوالہ دے کر یاد فرمایا جو اجراء مدرسہ کے سلسلہ میں ان میں اور سیدنا الامام الکبیر میں ہوا کرتے تھے۔ گویا یہ اقدام ان مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر ایک باہمی سمجھوتہ یا ایک معہود فی الذہن منصوبہ کے تحت عمل میں آیا تھا۔

ابتدائی مراحل کی اطلاع بشارت نامہ کے ذریعہ میرٹھ پہنچی جس کے قلب میں شہداء کے بعد سے ایک اسامی مقصد کی آگ لگی ہوئی تھی، اور جس کے برہ لئے کار آنے ہی پر نظر ہر باب سلمانوں کی آئندہ نسلوں کی تعمیر جوئے والی تھی جس کے لئے شہداء ہی سے دیوبند کی آمد و رفت مسجد چھتہ کی مجلس انس اور مذاکرات و تصرفات کا ایک لمبا سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ آج جبکہ اسی مقصد کے بارہ میں

لحمہ اقتباس ان آیت واذن فی الناس باحزابہم واذلوا علی کل ضامہم یاتین من کل فج عتیق۔ اور اقتباس بنارہم العلم کے سلسلہ میں اسی آیت کے مضمون سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اقتباس کر کے اپنے استاد حضرت نانوتوی کے بارہ میں شعر لکھا ہے۔ اس کی آواز تھی یا بانگ خلیل الہی + کہہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم۔ اسی سافین اور اس کی لبیک کی داستان کی طرف حضرت مصنف لفظ سافین سے اشارہ فرما رہے ہیں۔ شیخ طیب غفرلہ

عملی لبیک کی خوش خبری سامنے آئی تو سیدنا الامام الکبیر کی خوشی و مسرت کا آج کون اندازہ کر سکتا ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جلد سے جلد اصل مقصد کی عملی تکمیل کا دلولہ کس مدد تک قلب مبارک میں جوش زن ہوا ہوگا۔ اس بشارت نامہ کے جواب میں آپ نے جو دالا نامہ تحریر فرمایا اس کا یہ متعلقہ حصہ صاحب تذکرۃ العابدین نے نقل کیا ہے جس کے الفاظ بجنسہ یہ ہیں۔

”مولوی محمود قاسم صاحب نے جواب لکھا کہ میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں۔ وہ پڑھا دینگے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔“ (تذکرۃ العابدین ص ۶۹)

سیدنا الامام الکبیر کے اس رازن اور عملی پیش قدمی پر جو تعمیل صورت دیو بند میں نمودار ہوئی اس کے بارہ میں صاحب تذکرۃ العابدین ہی نے یہ اطلاع دی ہے

”چنانچہ ملا محمود صاحب آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کیا۔“

(تذکرۃ العابدین ص ۶۹)

حاجی محمد عابد صاحب کے اس بشارت نامہ اور سیدنا الامام الکبیر کے جوابی دالا نامہ سے یہی معلوم ہوتا ہے اور سچہ دالے اس کے سوا اور سوج ہی کیا سکتے ہیں کہ دیو بند میں تعلیم کی اجتماعی شکل میں ”نئے محاذ“ کا افتتاح سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و صوابدید کے مطابق اور آخر کار ان ہی کے رازن صریح بلکہ افتتاح مدرسہ کے بارہ میں عملی پیش قدمی سے عمل میں آیا تھا۔ جس کے لٹریچر سراہ کار حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب تھے، گو یا سیدنا الامام الکبیر نے اگر ابتداء ہی سے انہیں اس کام کے لئے نگاہ میں رکھ کر چھتہ کی مسجد کا قیام اختیار فرمایا تھا۔ جیسا کہ سوانح مخطوط کی عبارت اس بارہ میں ہمیشہ کی جا چکی ہے۔ پھر مذاکرات کی داغ بیل ڈالی تھی، جیسا کہ حاجی صاحب کے اس بشارت نامہ کی عبارت سے واضح ہے تو حاجی صاحب ہی اس سلسلہ میں آگے بڑھے انہوں نے ہی قیام مدرسہ کے ابتدائی مراحل (فراہمی چندہ) طے کئے اور انہوں نے ہی حضرت دالاکو بشارت نامہ بھیج کر گویا مستفیدان کیا اور بالآخر حضرت دالاکو کے اذن اور مدرسہ بھیجنے پر چھتہ کی مسجد میں

مدرسہ کا افتتاح عمل میں آگیا۔

باقی یہ جو لوگ پوچھتے ہیں کہ مقامی طور پر مدرسہ کے افتتاح کی دیوبند میں کیا صورت پیش آئی؟ تحریک تجویز میں کس نے پہل کی؟ وغیرہ سو میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ دیوبند کے بعد سہانپور، مراد آباد، تھانہ، کیرانہ، نگینہ، گکلاوٹھی، مظفرنگر، روٹکی، انبہٹ وغیرہ آس پاس کے قریب و امصار میں سیدنا امام الکبیر ہی کے منشاء دارا، کے متعلق مقامی درسگاہیں وقتاً فوقتاً جیسا کہ آگے معلوم ہوگا کھلتی رہیں، ان کے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ مقامی طور پر ان مقامات میں سب سے پہلے کس نے ”درسگاہ“ کے قیام کی تجویز پیش کی؟ تجویز کو کن کن لوگوں نے پہلی دفعہ قبول کیا؟ اور اہتمام و انتظام کا بار کن بزرگوں نے اپنے اوپر لیا؟ میرے نزدیک کوئی قابل توجہ بات نہیں۔

تاہم اس وقت مسجد چہتہ کی مجلس انس کے سربراہان و دروہ داران اکیس میں حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب اپنے تقدس اور درویش کی حیثیت سے مقبول خلائق اور دیوبند میں مرجع عوام و خواص بنے ہوئے تھے جن کے بارہ میں مولانا ذوالفقار علی صاحب کا یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ مدرسہ دیوبند کو سلطان روم بھی بغیر حاجی محمد عابد صاحب کی مدد کے نہیں چلا سکتا اور مولانا فضل الرحمن صاحب نے اپنی مشہور نظم میں انہیں ”مرد حق“۔ ”عابد صداقت کیش“ اور ”طائر ہایوں نال“ وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر کے اپنی گہری عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے، اور ادھر یہ دونوں نامبروہ بزرگ یعنی مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمن صاحب جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں اپنی علمی حیثیت اور تعلیمی تجربہ کے لحاظ سے قصبہ میں ممتاز تھے۔ بقول مصنف امام ان تینوں حضرات نے تجویز کی اور گویا ارادہ کیا کہ دس سال کے جس کام کے لئے قلوب مستعد ہوتے چلے آ رہے تھے اب وہ کام بروئے کار لایا جائے پھر کیا مبارک کام کو چھڑنے کے لئے تحریک ان میں سے پہلے کس نے کی؟ سو تذکرۃ العابدین کی روایت کے مطابق حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے اور سوانح مخطوطہ کی روایت کے مطابق مولانا فضل الرحمن صاحب نے، ہمارے نزدیک یہ دونوں روایتیں متعارض نہیں ہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ دونوں بزرگوں نے کی۔ کیونکہ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ مسجد چہتہ کی مجلس انس کی تاثیر کا فرمایوں سے

جبکہ یہ کام ان سب ذہنوں کی مشترک پکار بن چکا تھا تو عزربان بھی پہلے ہی۔ اُس نے اپنی ساتھ دوسرے کی ترجمانی بھی کی، اسلئے ہم اس پہل کو تذکیر سمجھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ صد اکبھی کسی کی زبان پر اصد کبھی کسی کی زبان پر آتی رہی جو دوسروں کو ابھارنے اور یاد دلانے کے لئے ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو، بہر حال اچانک دیکھایہ گیا کہ حاجی محمد عابد صاحب تن تنہا گلے میں جھولی ڈال کر چندہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کی تفصیلی روایت آگے آ رہی ہے، اور وہ یہ جمع کر کے اصل مقصد یعنی افتتاح تعلیم و اجراء مدرسہ کے لئے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں میرٹھ بشارت نامہ بھیج دیا، اور وہاں کی تصریح تاذین اور مدرس کا تقرر کر کے بھیج دینے پر افتتاح مدرسہ عمل میں آگیا، جیسا کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ اسی کے ہاتھوں اس کام نے عملی قالب اختیار کیا۔ جس کے طلب کا یہ جذبہ تھا، اور جس نے دوسرے قلوب کو بھی اس تپش سے تیار رکھا تھا۔ یعنی اجراء مدرسہ حضرت اللہ نے کیا گو پس پردہ میرٹھ میں بیٹھ کر کیا۔ لیکن عملاً اس کام کو چلانے اور آگے بڑھانے کے لئے بہر حال ایک ایسی مقامی شخصیت کی ضرورت تھی جو اپنے اثر و اقتدار سے "مافی سرماہ" کے فراہم کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتا ہو، اور اسی کے ساتھ بڑا کام مسئلہ یہ تھا کہ ہر وقتی نگرانی کے لئے دوسرے مشاغل سے وہ آزاد بھی ہو، کہہ چکا ہوں کہ ان دونوں خصوصیتوں یعنی اثر و اقتدار اور ہمہ وقتی توانائی کی جو ضرورت اس ادارہ کو عملی گردش میں لانے کے لئے تھی۔ ان دونوں جوہری خصوصیتوں کی جامع ذات اس زمانہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ کے سوا جہاں تک معلومات کا تعلق ہے، وہی بند میں اس وقت شاید کوئی دوسری ہستی نہ تھی، حاجی صاحب کا اثر اور کافی گہرا اقتدار مسلمان مردوں اور عورتوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا، بلکہ تقصیر کی غیر مسلم آبادی میں بھی جیسا کہ سن چکے، اپنے خاص حالات کے لحاظ سے وہ کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے، اور صرف یہی نہیں بلکہ سوانح مخطوطہ کے باخیر مصنف نے حاجی صاحب کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ

لے پہلے قرین کی شخصیت کھجول ہی تھی لیکن معلومات ان کے متعلق جو فراہم ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں تو دارالمسلم و ہند کی تاریخ میں ان کی ہستی کافی ممتاز و ادا ہم بن جاتی ہے۔ مولانا طیب صاحب کے (باقی اگلے صفحہ پر)

”آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے“

آجگے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

”پابندی وضع، استقلال طبع، اور العزیز، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے۔“

اور گو کہنے کے بعد اپنے مسودہ میں ان الفاظ کو نہ معلوم کیوں قلم زد کر دیا گیا ہے۔ لیکن بہر حال میں یہ قلم زدہ الفاظ بھی ان ہی کے قلم سے نکلے ہوئے، اور وہ یہ ہیں کہ

”باجو دیکھ (حاجی عابد صاحب نے) دنیا کو ترک کر دیا، مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے، تو اس

میں بھی ایسی اچھی صائب رائے ہوتی ہے، جیسے بڑے ہوشیار دنیا دار کی۔“

شاید آخری الفاظ میں کچھ تعبیری خامی محسوس ہوئی، اسی لئے وہ کاٹ دیئے گئے، مگر میرے سامنے جو سوال ہے،

اسکے حل میں ان کے قلم کے نکلے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کافی اہمیت کو حامل ہیں سمجھ میں آتا ہے کہ ”آزاد“ فرصت کے سوا

حاجی صاحب وہ ساری خوبیاں صحیح تھیں جن میں کسی اجتماعی نظام کے تحت چلا کر جانے والے افراد کی فلاح و بہبود، بھار د

ارتقاء کی ضمانت پوشیدہ ہے، حاصل یہی ہے کہ صاحب دل ہونے کے ساتھ حاجی صاحب ”صاحب بارغ“ بھی تھے۔

(گزشتہ صفحہ سے) بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف دیوبند ہی کے ایک رنگ نشی فضل حق

تھی ہیں، ایہ ہی نشی فضل حق صاحب ہیں، جن کا اسم گرامی دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان کی

اس فہرست میں درج ہے جو مدرسہ کے پہلے سال ۱۲۸۴ھ کی روداد میں شریک ہے، گویا ابتداء ہی سے مجلس شوریٰ کے

”مکین“ منتخب ہوئے اور آخر تک رہے۔ دارالعلوم کی بعض قدیم رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۸۲ھ عریضوں حاجی شید

عابد حسین صاحب کی تحریک اور نقیب ربانی حضرت گنگوہی کی توفیق سے نشی فضل حق دارالعلوم کے بہتم بھی مقرر ہوئے تھے،

حاجی عابد حسین صاحب نے اپنی تحریک مجلس شوریٰ میں جن الفاظ میں پیش کی تھی ان کا کی خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے تحریک کے

انفاک پر تھے۔ ”نشی فضل حق ابتداء مدرسہ سے داخل اہل شریعت میں اور پہلے عرصہ تک اہتمام کا کام کر چکے ہیں، اور استعداد

تحریر و تقریر کی ذاتی رکھتے ہیں، اور تدبیر و وقت انتظام میں بھی ماری نہیں ہیں، نشی صاحب کا خاندان اوپر کی پشتوں کو صاحب کو حاجی عابد حسین

صاحب کے مل جاتے ہے، خود سید نالام لکیر بھی سسرالی بیٹہ آپ کا تھا۔ نشی صاحب کے ایک صاحب زادے مولانا ظہار الحق صاحب

مدرسہ نظام العلوم بہار پور میں مدرس ہیں، اور دیگر شفیق احمد صاحب نشی صاحب منور کے نواسے ہیں، جماعہ کل دیوبند کے

متاز صاحبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ نشی صاحب کا مکان دیوبند کے محلہ سرائے میں

اب بھی موجود ہے، ان کے خاندان والوں سے مولانا کے گھرانے سے خوش گوارا گہرے تعلقات ہیں۔ واقعہ یہ ہے

کہ اس اکتشاف کے بعد ”سوانح مخطوطہ“ اور اس کے مشتملات کی قدر قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ۱۲

بلکہ صاحب دل و صاحب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب کے متعلق اس قسم کے معلومات ہم تک جو پہنچے ہیں۔ مثلاً ارداح ثلاثہ میں حضرت تمھانوی کی یہ روایت پائی جاتی ہے، حضرت والا اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب کے حوالے سے بیان فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا فتح محمد صاحب جب زیر تعلیم تھے، تو کسی ضرورت سے وہ حاجی سید محمد عابد صاحب قبلہ کی خدمت میں پہنچے، اس وقت وہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت کوئی ڈپٹی صاحب بھی حاجی صاحب کی ملاقات ہی کی غرض سے آدھکے۔ حاجی صاحب نے حد سے زیادہ لاپرواہی سے گویا کام لیتے ہوئے ڈپٹی صاحب سے سرسری گفتگو کی، ادا شدہ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ مولانا فتح محمد جن کی حیثیت اس زمانہ میں مدرسہ کے ایک معمولی طالب علم سے زیادہ نہ تھی، دیکھا کہ وہ آرہے ہیں، ان پر نظر کا پڑنا تھا کہ پلٹ پڑے انداطینان کے ساتھ بیٹھ کر مولوی صاحب سے آتے کی وجہ دریافت فرمانے لگے، مولوی فتح محمد صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حاجی صاحب جا رہے تھے، خواہ مخواہ میری وجہ سے ان کو روکنا پڑا۔ ادباً عرض کرنے لگے کہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ پھر کبھی عرض کر دوں گا، مگر ان کو حیرت ہو گئی، جب وہ حاجی صاحب کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو سن رہے تھے۔

”تم اپنے کو ڈپٹی صاحب پر قیاس کرتے ہو گے، کہاں وہ دنیا دار اور کہاں تم نائب۔“

رسول :- ارداح ثلاثہ ۲۶۹

اسی کتاب ارداح ثلاثہ میں ایک دوسری روایت بھی پائی جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدرسہ کے کسی طالب علم اور حاجی صاحب کے درمیان باہمی بخشش کی کوئی صحبت پیش آگئی تھی، طالب العلم نے منہ پر حاجی صاحب کو کچھ سخت و سست بھی سنا دیا تھا، طالب العلم ایک مسجد میں رہتا تھا، لکھا ہے کہ حاجی صاحب اسی مسجد میں بنفس نفیس پہنچے، دیکھا جا رہا تھا کہ طالب العلم کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا صاف کر دیجئے۔ آپ نائب رسول ہیں، آپ کا نادم رکھنا مجھے گوارا نہیں ۲۶۹

”ملا اور صرفی“ کے تعلقات جن کی طرف کتاب کے تہیدی مقدمہ میں بقدر ضرورت بحث بھی کی گئی ہے۔
 اصرار جانتے ہوئے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب پر درویشی ہی کا پہلا ابتداء سے غالب تھا گو شریعت
 کے ظاہر احکام کی پابندی میں بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ خاص امتیازی شان رکھتے تھے،
 لیکن بجائے انقباض کے غریب ملاؤں کی، حاجی صاحب کی درویشی میں اتنی گہری جگہ جس کا اندازہ
 مذکورہ بالا مثالوں سے ہوتا ہے۔ اب خواہ یہ رنگ جس راستہ سے بھی آیا ہو، شہدائے بعد
 دیوبند کو وطن ثانی بننے کی عزت سیدنا الامام الکبیر کی بدولت جو حاصل ہوئی، اور چھپنے کی مسجد میں جو
 حلقہ درویشوں کا اس کے بعد قائم ہوا، بظاہر تو یہی اسی حلقہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ
 میں جیسا کہ گذر چکا اس رنگ کے سب سے بڑے علمبردار حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب
 سے بھی حاجی صاحب کا رشتہ قائم ہوا، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خلافت کی سعادت بھی آستانہ
 امدادی کو حاجی محمد عابد صاحب کے حاصل ہوئی تھی۔ لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ بظاہر یہ قصہ
 اس وقت کے ہیں جب دیوبند میں عربی کالمدرسہ شروع شروع میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت تک
 حاجی عابد حسین صاحب میں یہ رنگ اس زمانہ کے لحاظ سے اگر منتقل ہو سکتا تھا تو مسجد چھپتے کی قاسمی
 محفل ہی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ شاید اسی کی طرف مولانا فضل الرحمن صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔
 جو ان کے ایک قصیدہ کے شعر میں پایا جاتا ہے۔

لیک این طائر ہمایوں قال شد ز قاسم عطا پر دبالش

بہر حال صاحب دل، صاحب دماغ ہونے کے ساتھ علما و ادر علماء کے علم کی عزت و احترام
 اور اس پر قاسمی تصرفات سے پیدا شدہ غیر معمولی جذبہ جو حاجی صاحب میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سارے
 اسباب و وجوہ تھے ہی ایسے کہ مدرسہ کے افتتاح کی تجویز کو عملی شکل میں لانے کے لئے
 نظر انتخاب دیوبند میں حاجی صاحب کو سوا آپ خود سوچئے، اور کس پر پڑتی؟ سارے

لے شہدائے بعد دیوبند میں معلوم ہوا ہے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خلافت حاصل ہوئی، یعنی قیام مدرسہ کے پسندیدہ
 سال بعد ۱۲۰۰ھ میں حاجی محمد عابد صاحب ۱۲

سازو سامان جن کی اس ہم کی سرانجامی میں ضرورت تھی یا ہو سکتی تھی، ان سے وہ لیس تھے۔
 بہر حال حاجی عابد صاحب جب کام ہاتھ میں لینے کے لئے آمادہ ہو گئے، تو جیسا کہ سوانح
 مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے، اور ان کا یہ بیان کافی اہمیت رکھتا ہے، لکھا ہے کہ
 ”ایک دن برقت اشراق سفیدرومال کی جھولی بنا، اور اس میں تین روپیہ
 اپنے پاس سے ڈال، چھتہ کی مسجد سے تین ہنہاموون ہنہاب علی صاحب کے حرم
 کے پاس تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ
 روپے عنایت کئے، اور دعا کی، اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمن صاحب نے
 اور چھ روپے اس مسکین (یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب
 دیوبندی) نے دیے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ
 اللہ تعالیٰ کے پاس آئے۔ مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں، فوراً
 بارہ روپے دیے، اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی ثانی
 دیوبندی وہاں موجود تھے، ان کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کئے،

اس سلسلہ کی تاریخ میں مالی اعداد کے ساتھ پہلی دفعہ پیش قدمی کرنے والوں کی اس تاریخی فہرست میں جن جن
 بزرگوں کے گرامی اسماء درج ہیں، ہماری کتاب کے پڑھنے والے علماء ان سے روشناس ہو چکے ہیں۔
 مولانا ہنہاب علی صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تالیفات قدوسی بزرگ ہیں، جن کے ہتائی مکتبہ جوہر
 میں سیدنا امام الکبیر نے عربی شروع کی تھی۔ مولانا فضل الرحمن صاحب اور مولانا ذوالفقار علی صاحب کے
 علاوہ مصنف سوانح مخطوطہ کے حال سے بھی آپ آگاہ ہو چکے ہیں۔ السبتہ ڈبٹی ذوالفقار علی صاحب
 دیوبندی مولانا محمد طیب صاحب کی یہ اطلاع ہے، کہ دیوبند کے مشاہیر میں ان کا شمار تھا۔ تلمذ پر ان کی شاندار
 جوئی اب تک موجود ہے، جس میں اب اسلامیہ ہائی اسکول کول دیالیا ہے۔ لاہور کا سب سے پہلا نسائی محلہ
 ”تہذیب النساء“ ڈبٹی ذوالفقار علی صاحب کوڑے صاحبزادے مولوی ممتاز علی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا مولوی ممتاز علی صاحب
 نے قرآنی مضامین کی ترویج کر کے چار جلدوں میں ”البيان في مقاصد القرآن“ کے نام سے شائع
 کی تھی۔ عہد جدید کے ممتاز انشاد یرد اذوں میں مولوی ممتاز علی کے صاحبزادے منشی امتیاز علی تاج

وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت (یعنی حاجی محمد عابد صاحب) محمد
ابوالبرکات میں پہنچے ۱۱

آگے کے الفاظ مخطوطہ مسودہ میں کچھ کٹ گئے ہیں، جو صاف طور پر پڑھے نہیں گئے، بظاہر کچھ
ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ محلہ کی اس مسجد میں بیٹھ کر حاجی عابد صاحب مرحوم نے چندے کی اپیل شروع
کی، الفاظ اس کے بعد چڑھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں،

”دو سو روپے جمع ہو گئے، اور شام تک تین سو روپے۔ پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا
ہوا، اور جو پھیل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں ۱۲

ابتدائی چندے کی اس لطیف سرگزشت کو درج کرنے کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ
”یہ قصہ بروز جمعہ دوم ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا ۱۳

ذی قعدہ کے بعد ۱۲۸۲ھ ہجری کا ایک ہی مہینہ ذی الحجہ کا باقی تھا، ان ہی دو مہینوں میں کوشش
کی گئی اور اثنا سربا یہ فراہم ہو گیا، کہ مدرسہ کھول دیا جائے، اور اسی مبارک تاریخ فیصلہ کے مطابق
ان ہی کا بیان ہے کہ

”اور مدرسہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ میں جاری ہوا ۱۴

سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۶ء ماہ اپریل کی غالباً ۱۴ تاریخ ہوگی، گویا بہار کا موسم ختم ہو رہا
تھا، لیکن ختم ہوا نہیں تھا، اور دیوبند کے علاقہ میں آموں کا موسم شاید شروع ہو چکا تھا، یا شروع
ہونے والا ہی تھا۔

غرض سیدنا الامام الکبیرؒ کی ”ماذین عام“ اور آخر میں میرٹھ والی ”ماذین خاص“ کے مقابلہ میں
لیکھ کلہ پہلا جواب سرزمین دیوبند سے جو بلند ہوا، اور ان ہی کے منشا کے مطابق مجوزین کرام نے
”نئے محاذ“ کی اس قطعی غالب کو دیوبندی میں قائم کرنے کی صورت پیدا کر کے جو مدرسہ کو کھول دیا، تو واقعہ
یہ ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے ان بزرگوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے
والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے عربی الفاظ میں دیوبند کے مدرسہ کے

کے افتتاح اور اس وقت کے ماحول کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

وان لم یساعده النہ مان والمكان ولم یوافقہ الحین والاوان	اگرچہ اس مدرسہ کے قیام کے لئے نہ زمانہ کے حالات ہی سازگار تھے اور نہ وہ جگہ جہاں مدرسہ قائم ہوا اس کا ماحول ہی مناسب تھا۔

الغرض وقت بالکل ناموافق تھا۔

ایسی صورت میں اس کام کو اٹھانے والے اس کی تحریک کو قبول کر کے اسے عملی شکل میں لانے والے، مالی امداد میں پیش قدمی کرنے والے، الغرض اس راہ میں داسے، درمے قدمے، سنبھلے جس منزل میں بھی جن سے یکمہ بن پڑا، حد سے زیادہ ناموافق حالات میں کر گزرنے والے سچ تو یہ ہے کہ اس سنت حسنہ کی راہ دکھونے میں جو بھی جس منزل میں بھی شریک ہوئے وہ صرف اپنے ہی عمل کی حد تک نہیں، بلکہ دارالعلوم دیوبند کے وجود کے سارے ثمرات و نتائج جو اس وقت تک سامنے آچکے ہیں، اور آئندہ جب تک خدا کی مرضی ہو، سامنے آتے رہیں گے، ہر ایک میں ان کے اجر و صلہ کا حق نبوی و شیعہ کی بنا پر دیاں محفوظ ہو چکا ہے، جہاں وہ پہنچ چکے ہیں، اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس دنیا میں بھی دارالعلوم ان "آباد صالحین" کے "ابنا صالحین" کی فلاح میں کافی معاون ثابت ہوا ہے۔ آج ان اسلاف کا وجود ان کے اخلاف کے لئے سرمایہ تازہ افتخار ہے۔

۱۰ جتہ کی مسجد کے مجلس اس کے ہی تین اساطین جنہوں نے حضرت نانوتری رحمہ اللہ کے ذہن کو سب سے پہلے عملی صورت دی اور جن کا ذکر حضرت مصنف الام نے مجوزین کے نام سے کیا ہے، یعنی حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب نور اللہ مرقدہم ان ہی کو دیکھئے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کی براہ راست اولاد میں حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب حضرت مولانا شعیب احمد صاحب رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں علم و دین کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اسی زمانہ میں مولانا مطلوب الرحمن صاحب مدنیہم جو ان ہی مولانا فضل الرحمن صاحب کے صاحبزادے ہیں، مسلمانوں کی دینی اور دنیائی تربیت جس دستِ بیاض پر کر رہے ہیں، یقیناً اس کو بھی دارالعلوم ہی کے فیوض و برکات میں شہلہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کے صاحبزادے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ تو ہند کے شیخ اکمل ہی بن کر رہے اور بہرہ ہی کیا، کرن گن سکتا ہے کہ آپ کے تلامذہ اور شاگرد (باقی اگلے صفحہ پر)

باقی دارالعلوم کی تاسیس و آغاز کے سلسلہ کی "حکایت لذیذہ" یعنی قصہ "انار و محمود" یہ عجیب بات ہے کہ سوانح خطوط نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، مگر ان الفاظ کے ساتھ

دگڑ مشہور سے، ایشیاء و افریقہ کے کن کن علاقوں میں پھیلے ہوئے علم و ہنر کی خدمت میں مصروف رہے اور ہیں، علمی و ادبی پہلوؤں کے سوا ملک کے سیاسی انقلاب میں آپ کا جو حصہ ہے، کیا اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے؟ بقیدنا آج جن قربانیوں، جان فروشیوں، کی قیمت ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس قیمت میں کافی اور مقبول سرمایہ شیخ الہند کی غیر معمولی اور اولوالعزما قربانیوں کا بھی شریک ہے۔ حضرت شیخ الہند کے حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن رحمہ اللہ کی پوری زندگی دارالعلوم کی علمی خدمات کے ساتھ اس ... کے شعبہ طلب کی سہرقت خدمت میں صرف ہوئی اور اساتذہ دارالعلوم میں اپنی خصوصیات کے ساتھ علمی میلان میں ان کی شخصیت نمایاں رہی۔ شیخ الہند کے داماد مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کو آج دارالعلوم کے شعبہ افتاء کی خدمات میں زندگی کھپا دینے کی توفیق ملی ہوئی ہے۔ مجلس الش کے تیسرے اور نمایاں رکن جن کی عقیدت و عظمت کے سامنے ساقی ہر دکن بھی جھکے ہوئے تھے، یعنی حضرت اقدس حاجی سید محمد عابد صاحب قدس سرہ کے تعلق رہی کیا کم ہے کہ مرکزی جمعیت العلماء ہند کے ناظم مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ دیوبند کے اسی خاندانہ سادات کے چشم و چراغ ہیں جس کے ایک رکن حضرت حاجی صاحب بھی تھے۔ اپنے اس تعلق کا اظہار مولانا موصوف نے اپنی مشہور کتاب "علاء ہند کا شاندار ماضی" میں فرمایا ہے۔

علاوہ براہ راست ادلاء کے ان حضرات کے احفاد و اسباب کو دارالعلوم کی برکات کا ہماری و باطنی سے مستفید ہونے کے جو مواقع میسر آئے، ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کے پوتے یعنی حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمن صاحب ادارہ "ندوة المصنفین" اور علامہ ترمذی کے ذریعہ جن علمی بہات کو انجام دے رہے ہیں، وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی قاری حسان طیل الرحمن صاحب دارالعلوم کے شعبہ تجزیہ کی قابل قدر خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے نواسے مولانا محمد عثمان صاحب دارالعلوم کی تدوین کے ساتھ ملک کی سیاسی خدمات اور شہری معاملات کی تنظیم کے سلسلہ میں کافی متعارف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے دوسرے نواسے یعنی مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد ہارون صاحب بھی دارالعلوم دیوبند کے دائرہ تدریس میں کام کر رہے ہیں، اور انہیں علمی وائس کی خدمات کی اہمیت نصیب ہوئی ہے، اور پھر ان تمام علمی قابلوں کی روح رواں یعنی حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس اللہ سرہ جن کے فکر و جذبہ آتش دان سے شکل نکلی کر یہ گرمی اس سارے ماحول کو گھسانے ہوئے تھی، اور آج تک یہ تیش اپنے کام میں مصروف ہے، ان کی ردعانی اور معنوی ذریت کے ساتھ جو پورے عالم اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے سب کو دیکھا جائے تو براہ راست ان کے خلف اکبر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ، تمام دارالعلوم دیوبند سے جو پھیل پھول اس چمنستان قاضی کو لگے آج ان کا کون انکار کر سکتا ہے؟ باقی انکو صفحہ

”سب سے پہلے اس مدرسہ کے مدرس ملاں محمود صاحب ہیں اور چائے مدرسہ فرش مسجد چھتہ ملا، مولوی عبدالحی صاحب ہیں۔“

حکایت کی اس تعبیر کو عجیب اسلامی قرار دے رہا ہوں، جیسا کہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اس میں مستعلم کا تو نہیں مگر مستعلم کا نام ”محمود“ ہی بتایا گیا ہے اور جگہ کے سلسلے میں بھی خبر دی گئی ہے کہ چھتہ ہی کی مسجد کے فرش پر پہلی دفعہ اس مدرسہ کا افتتاح ہوا، لیکن انار کے مشہور زبان ذرعام درخت کے ذکر کو ہم اس کتاب میں نہیں پاؤ۔ اور اس سے بھی حیرت افزا جز ان کی اس اطلاع کا یہ ہے کہ مدرسہ کے پہلے مستعلم کا نام بجائے ”محمود“ کے وہ مولوی عبد الغفر بناتے ہیں، درخت انار کے عدم ذکر کے متعلق اگرچہ یہ مولویانہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ عدم الذکر عدم الوجود کو مستلزم نہیں، تاہم اس کا

(گدشتہ صفحہ سے) ”ان کا چالیس سالہ دور اہتمام دارالعلوم کا تاجناک دور اور یاد گار زمانہ عہد کہا جاتا ہے جس میں دارالعلوم نے ہر جہتی ترقیات کے علاوہ طے کئے اور وہ مدرسہ سے ایک بڑے دارالعلوم کے قالب میں ڈھلا، تیسری ترقیات ہوئیں، ملی حیثیت اونچی ہوتی گئی، ”حلقہ“ آخر کو ”سیح“ سے وسیع تر ہوا، اور بالآخر وہ مرکزیت جو اس ادارہ کی بنیاد میں چھپی ہوئی تھی۔ اسی دور میں مشائخ درشاخ ہو کر نمایاں ہوئی۔ پھر ان کی وہ سی خدمات ان ہر گیر خدمات کے علاوہ ہیں۔ آگے کی اولاد میں حضرت والا کے نواسے ابو حامد مولانا محمد میاں رحمان اللہ مہاجر کابل رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ احاطہ دارالعلوم سے علم و سیاست کے میدان میں کام کرتے ہوئے کابل پہنچے تو انہوں نے دارالعلوم کے بنیادی مقاصد کو وہاں کی حکومت اور چلیک میں روشناس کرائے اور وہاں کے لوگوں کو تقرر و تصنیف کے ذریعہ ان مقاصد سے ہم آہنگ بنائے، ۳۰ برس تک جو کردار ادا کیا، اس سے عوام اگر زیادہ واقف نہ ہوں، تو خواص سے ان کی جانب ازانہ سماعی مخفی نہیں ہیں، جو اسی دارالعلوم کے فیوض و برکات کا ثمرہ تھیں۔ حضرت نانوتوی کے پڑ پڑتے اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے پڑتے مولوی حافظ قادری محمد سالم سلمہ بھی مجھ اور دارالعلوم دیوبند میں فرائض درس و تدریس انجام دے رہے ہیں تصنیف میں بھی ان کاظم بزرگام ہے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں تقرر و خطابت بھی امید افزا انداز سے سامنے آ رہی ہے۔ پھر عام افادیت کی لائن پر ”ادارہ تاج المعارف قائم کر کے اشاعت دین کی جو قابل قدر خدمت وہ انجام دے رہے ہیں، وہ بلاشبہ اسی احاطہ قاسمی کا فیض اور ان کی جدی نسبت کا مظاہرہ ہے۔ بہر حال مدرسہ کی تاسیس و افتتاح کے سلسلہ سے یہ اسلاف اور ان کی سماعی جس حد تک مقبول ہوئیں۔ اسی حد تک ان کے اخلاف و رشید بھی اس سلسلہ میں ان کے ساتھ مشرف الحاق سے محروم نہیں رکھے گئے اور ”أَلْحَقْنَا بِهٖمُ ذُرِّيَّتَهُمُ“ کے خدائی قانون نے ان کی نسبتوں کے راستہ سے انہیں بہت کچھ ادخا کر کے دکھایا ہے، فَتَقَعْنَا بِاللّٰهِ بِأَنَّا لَهُمُ وَتَقَعْنَا بِأَنَّا لَهُمُ۔“

یہ ضرور چلتا ہے کہ ”شعور عام“ میں انسان کے اس درخت کا مقام وہ تھا جہاں کچھ دنوں سے ہم اس کو پائے گئے ہیں، انسان کے اس درخت کو تو چھوڑیے، ایک اتفاقی واقعہ تھا جس پر کچھ دنوں سے بیان کرنے کا اتفاق ہو گیا ہے، لیکن مدرسہ کے ”پہلے معلم“ کے متعلق ان کی روایت میں ہم جو کچھ پڑھ رہے ہیں، اس میں تو مذکورہ بالا موبیہ توجیہ کی بھی گنجائش نہیں، کیونکہ ذکر مدرسہ کے ادبیات کا وہ کر رہے ہیں، روایت میں آئندہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ ”سب سے پہلے“ کے تہیدی الفاظ کے نیچے درج ہے، یہ کہنا کہ ”سب سے پہلے“ کا تعلق صرف مدرسہ کے مدرس سے ہے، اس توجیہ کو تو ہمارا موبیہ باندھیں بھی شاید رواشت نہیں کر سکتا، پھر قصہ کیا ہے؟ اگر انار، محمود دلی، حکایت صرف انواراً منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچتی، تو ”انوار“ کے مقابل میں سوانح مخلوط کے مصنف جیسے گواہ کی تحریری گواہی کی ترجیح پر شاید ہم مجبور ہو جاتے، لیکن کیا کیجیے کہ ”انار و محمود“ دلی حکایت کا اعادہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی تاریخی ”مختصر“ میں لکھ کر کیا گیا ہے، میں نے خود تو نہیں دیکھا ہے، لیکن مولانا طیب الحفید صاحب حال صدر مہتمم دارالعلوم سے معلوم ہوا کہ ”دارالعلوم“ کے عظیم الشان جلسہ دستار بندی معقدہ ۱۳۲۸ھ میں ”زین ماضی و مستقبل“ کے نام سے ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریری بیان دارالعلوم کے ہزار ہا ہزار فارغ شدہ عملدار و اراکین کے آگے پیش کیا تھا، جن میں خود وقت کے صدر دارالعلوم حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک اور موجود تھے، اسی تحریری بیان میں منجملہ دوسری باتوں کے علی رؤس الاشهاد ”انار و محمود“ دلی حکایت بھی بایں الفاظ دہرائی گئی تھی کہ

”مدرسہ دیوبند کا افتتاح دیوبند حبیبی گنام بستی میں چھتہ کی مسجد کے اندر انار کے درخت کو نیچے ہوا، جناب مولانا علامہ محمد صاحب دیوبندی مدرس تھے، اند مولانا محمود حسن صاحب پہلے طالب علم تھے، جنہوں نے کتاب کھولی، مدرسہ دیوبند نے اس سادگی کے ساتھ وجود میں قدم رکھا۔“

مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ مطبوعہ شکل میں یہ تحریری مقالہ اس وقت دارالعلوم کے دفتر میں محفوظ ہے اور اس کے صفحہ ۲۲ پر مذکورہ بالا فقرات کو آج بھی پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں، حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جن کی حیثیت دارالعلوم کے لحاظ سے ”صاحب المبیعت“ کی تھی،

علماء کرام کی بھری مجلس میں ان کے اس تحریری بیان کے متعلق یہ خیال تو یقیناً بیہودہ خیال ہوگا کہ ایک زبانِ زوہد عام، سنی سنائی انوارِ روایت جو لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی، اسی کا ذکر بطور ”حکایتِ لفظ“ کے آپ نے بھی فرمادیا۔ چونکہ دارالعلوم سے قلعہ سکھنے والے براہِ علم و ادنیٰ کے کان اس حکایت سے مانوس تھے اور سوانحِ مخطوط کے مصنف کی نوشتہ شہادت سے لوگ واقف نہ تھے، اسی لئے خاموشی کے ساتھ سننے والوں نے اس کو سن لیا۔ کسی طرف سے کسی قسم کی تنقید اس پر نہیں کی گئی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس قسم کا دوسرہ وہی بچا سکتا ہے، جو حضرت مولانا حافظ محمد احمد علیہ الرحمۃ و العزیزان کی ذمہ دارانہ ہستی ادا ان کے صحیح منزل و مقام سے ناواقف ہے، یہ صحیح ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اس ابتدائی تقریب میں حضرت حافظ صاحب خود موجود نہ تھے، اور سوانحِ مخطوط کی عصری شہادت کے مقابل میں ان کی روایت کی حیثیت یقیناً سماعی روایت کی ہے۔ لیکن سماعی روایت ہی ’یہ دارالعلوم کے رکنِ رکنین‘ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ”صاحبِ الہیت“ کی روایت ہے۔ ماسوا اس کے یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اس تاریخی ”مجلس کبیر“ میں جس وقت دارالعلوم کے صدرِ مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی یہ نوشتہ تحریر پڑھ رہے تھے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس وقت مجلس میں دارالعلوم کے صدرِ مدرس یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود نہ ہوں، یہ دعویٰ کہ ”سب سے پہلے جنہوں نے کتاب کھولی“ خود ان ہی کی ذاتِ اقدس سے براہِ راست تعلق رکھتا تھا، اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا کچھ میں آنے کی بات ہے کہ بجائے تصحیح کے آپ اس غیر واقعی امر کے متعلق خاموشی سے کام لے سکتے تھے۔

دونوں روایتوں میں تطبیق کا امکان جب باقی نہیں ہے، تو یقیناً حضرت حافظ صاحب کا بیان ہی ہر لحاظ سے ترجیح کا مستحق ہے۔

۱۔ یہ حد سے زیادہ لمبی اصداد کا رنگہ نوازی ہوگی، کہ طالبِ علم ہر نے کی حیثیت سے اول طالبِ علم مولوی عبدالغنی کو قرار دیا جائے جیسا کہ سوانحِ مخطوط کی روایت کا اقتضا ہے، لیکن اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے کتابیں مولوی عبدالغنی کے پاس نہ ہو گئی۔ کتاب لانے والوں اور استاد کے آگے اس کو کھول کر پڑھنے والوں میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب سب سے پہلے طالبِ علم تھے۔ اور دونوں روایتوں میں تطبیق کی صحت پیدا کر دی جائے (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر واقعہ کچھ بھی ہو، پہلے متعلم مدرسہ کے حضرت شیخ الہند مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، یا مولوی عبدالعزیز جس زمانہ کی یہ بات ہے، اس وقت کے اعتبار سے یہ دونوں باتیں مسادی ہیں۔ ہاں حضرت مولانا بعد کو جو کچھ ہوئے، اس کے لحاظ سے دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس بڑے مدرسہ کا آغاز بھی مولانا جیسے بڑے آدمی سے ہو، کیونکہ باوجود تلاش کے سوانح مخلوط والے مولوی عبدالعزیز کی شخصیت میرے لئے اس وقت تک عجیب ہے، مگر کیا کیجئے کہ متعلم محمود تو نہیں مگر ”معلم محمود“ کی بڑائیوں کے متعلق بھی ہمارے معلومات حد سے زیادہ محدود ہیں۔ کم از کم ”معلم محمود“ اور دارالعلوم کی بڑائیوں میں جو مناسبت ہے، اس مناسبت کا دعویٰ معلم محمود کے متعلق مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

غالباً میری دل چسپیاں اس ذیلی مسئلہ کے متعلق کچھ حد سے زیادہ بڑھ گئیں، لیکن ایک عام اور مشہور روایت کے ساتھ ساتھ سوانح مخلوط میں بعض ایسی چیزیں مل گئیں، کہ دل ان کے قلم انداز کرنے پر راضی نہ ہوا، آئندہ دارالعلوم کی تاریخ پر قلم اٹھانے والوں کے لئے بحث کا یہ ”جدید پیلو“ بھی پیش نظر رہے گا، ”اد“ انار و محمود“ والی حکایت کی تحقیق میں امید تو یہی ہے کہ آئندہ لوگ کافی غور و خوض سے کام لیں گے۔ خیر اب اس قصہ کو ختم کیجئے، اپنے ”موضوع بحث“ کے لحاظ سے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دیوبند میں مدرسہ جس وقت ابتدا میں قائم ہوا، حسب تحریر مصنف امام وہ خود ادہ ہمارے سیدنا الامام اکیسر اس زمانہ میں بدستور ملازمت مطیع مجتہبیٰ میرٹھ، میرٹھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند میں خواہ جس بیٹانہ پر بھی ہو، مدرسہ قائم ہو گیا، مدرس اور طلبہ بھی آگئے۔ چندہ بھی فراہم ہوا۔ اس کے بعد سیدنا الامام اکیسر

دو گزشتہ صفحے، میرے خیال میں تو کتاب کھولی، ”کے القان طالب علم ہونے کی یہ عام تعمیر ہے۔ اس عام ادہ اتفاق تعمیر سے خواہ خواہ ناجائز نفع اٹھانے کے سوا یہ اندک کچھ نہیں ہے۔“

”نہیں ماضی مستقبل کے حوالے سے جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں ان کے نام کے ساتھ مولانا ہی نہیں بلکہ علامہ کے لفظ کو ہم پاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم و تجربہ کا اچھا خاصہ ذہن اسلمین دارالعلوم کے قلب میں تھا، لیکن اسی کے مقابل میں سوانح مخلوط کے مصنف نے ملا ہی نہیں بلکہ ”امان ذنون“ ملاں“ ہی کے لفظ کو ان کے لئے کافی قرار دیا ہے، دارالعلوم کی تاریخ مدعی کرندالوں کے فرائض میں ہے کہ دارالعلوم کے ان پہلے مدرس و معلم کے صحیح حالات کا پتہ چلا نہیں ۱۲

یہ بشارت بھی پہنچائی گئی، کہ ان کے حسب مشاء دیوبند والوں نے دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کو افتتاح میں سہقت کی مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن وہ بھی قرار دیے گئے، ۱۲۸۳ھ جس میں مدرسہ قائم ہوا۔ اس کی روداد سے نقل کر چکا ہوں کہ طلبہ کے امتحان لینے والوں میں بھی دوسروں کے ساتھ آپ کا ذکر بھی خاص طہ پر کیا گیا ہے، چندہ دہندوں کی فہرست میں آپ کے اسم گرامی کے آگے رقم درج ہے، جو آخر وقت تک جاری رہی۔ اتنی بات تو یقینی ہے، کہ حاجی سید محمد عابد صاحب مرحوم کے بشارت نامہ میں دیوبند تشریف آوری کی دعوت آپ کو جودی گئی تھی، اس وقت یہ دعوت دعوت ہی بن کر رہ گئی۔ صحیح طہ پر یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ صورت حال کب تک قائم رہی، بس مصنف امام ہی کا ایک یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے، اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔“ ملا

میرٹھ سے دیوبند حضرت والا کی یہ تاریخی تشریف آوری جس کے بعد بقول مصنف امام ”ہر طرح“ اور ”ہر پہلو“ کے لحاظ سے آپ مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔ کچھ اتنے دے بے پاؤں، خاموشی کے ساتھ ہوئی، کہ تلاش کے باوجود اس کی چونکہ صحیح تاریخ معین نہ ہو سکی، اس لئے یہ بتانا بھی سخت دشوار ہے کہ قیام مدرسہ اور ہر طرح سرپرست بن جانے والی اس تشریف آوری کی درمیانی مدت کا وقفہ کتنے دنوں پر مشتمل ہے، ایک مطبوعہ حائل تشریف جو حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ کے ساتھ مطبع مجتہائی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ شاید کہیں پہلے بھی اس کا ذکر گزرا ہو، اس حائل میں بجائے عام دستور کے ترجمہ زیر سطور نہیں، بلکہ ہر صفحہ کی آیاتوں کا ترجمہ نمبر لگا کر حاشیہ پر چھاپا گیا ہے، شاید اب بھی ملتا ہو، اس حائل کی آخر میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابتداء سے نسخہ خاص طریقہ سے میرٹھ کے مطبع مجتہائی سے ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں

۱۲۸۳ھ کے طبع کے طبع کی تاریخ بھی سید ملا امام اکبر کی بحال ہوئی، اما لا مثل له ولا مثالی کا ذکر بھی کیا ہے اس سے بھی ۱۲۸۳ھ کے بعد لکھتے ہیں، اگرچہ ہے تو ایک تاریخی مادہ اور لیس کٹشلہ شیئ (باقی اگر مفہوم)

یہ اطلاع بھی درج کی گئی ہے کہ میرٹھ کے مطبع مجتہائی میں شائع ہونے والی اس حائل کی
 ”قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ البانی مدرسہ دیوبند نے اس
 کی تصحیح فرمائی“

اس کا اقتضاء بہر حال اتنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۳ھ جس میں دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا، اس کے تین سال
 بعد یعنی ۱۲۸۶ھ تک میرٹھ کے مطبع مجتہائی میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کا کام سیدنا الامام الکیبر
 انجام دیتے رہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے براہ راست میرٹھ میں قیام ضروری نہیں۔ اور
 تین سال تک اگر اسی بنا پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میرٹھ ہی میں آپ کا قیام رہا، تو مصنف الامام کی
 اطلاع میں

”شروع مدرسہ میں دیوبند آئے“

اس میں ”شروع“ کے لفظ کی پھر کیا توجیہ کی جائے گی؟ کیا تین سال کے بعد تشریف آوری کے واقعہ کی
 تعبیر ”شروع مدرسہ“ کے لفظ سے کسی حیثیت سے صحیح ہو سکتی ہے؟

پیشکل ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ ”لفظ شروع“ سے حقیقی آغاز وابتداء
 مدرسہ تو ہم مراد ہی نہیں لے سکتے کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے اور تین سال کے وقفہ کی بھی گنجائش ”شروع“
 کے لفظ میں نہیں، کچھ اوسط ہی بھگانا پڑے، لیکن وہ اوسط بھی کیا ہو؟ اور تو کوئی بات ملی نہیں، البتہ ۱۲۸۶ھ
 جو قیام مدرسہ کا دوسرا سال ہے، اس کی جو روداد شائع ہوئی ہے، اس میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ مدرسہ کی

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) کے کلام کی تاریخ کے لئے مخدود ترین مادہ ”تاریخ“ ہو سکتا ہے۔ لیکن یوں بھی جب
 ہم خود کرتے ہیں، کہ قرآن جو سورتوں اور آیات کے ساتھ ساتھ رکوعوں میں تقسیم شدہ ہے، لیکن ہندوستان کے
 شائع شدہ قرآنی نسخوں میں ہر رکوع کے آیات پر نمبر اندازی کا رواج نہیں تھا۔ غالباً سیدنا الامام الکیبر
 کی یہ جدت طراز ہی تھی کہ ہر صفحہ کی آیتوں پر آپ نے نمبر لگائے اور ان ہی نمبروں کے حساب سے حاشیہ پر ہر
 آیت کا اردو ترجمہ اس طرح سے درج ہو گیا ہے کہ سابقہ ولاحقہ آیتوں کے ترجمہ سے کسی قسم کا اشتباہ ان لوگوں
 کے لئے بھی باقی نہیں رہتا، اور براہ راست قرآن کی عربی عبارت سمجھنے سے معذور ہیں۔ نرسطری ترجموں میں اگلی اور پچھلی آیتوں
 کے ترجموں کے الفاظ میں ان غریبوں کو جو دشواری تھ، ٹائپس آتی ہے۔ نمبر اندازی کی اس تدبیر سے یہ فتنہ رفع ہو جاتی
 ہے، کچھ پوچھتے تو اس لحاظ سے یہ اچھوتا کام تھا۔ جس کی تعلقہ نہیں کی گئی ۱۲

عمر کے اسی دوسرے سال میں

”ایسا امر عظیم اور حادثہ فحیم پیش آیا، کہ جس سے تمام اہل دیوبند اور جملہ مدرسین و طلبہ کو گمان

غالب تھا کہ اب قائم رہتا اس مدرسہ کا مشکل ہے“

آگے اسی امر عظیم ”اور“ حادثہ فحیم ”کی تفصیل یہ درج کی گئی ہے کہ

”حاجی عابد حسین صاحب جو بہتم مدرسہ، بلکہ اصل اصول اس کام کے تھے، اور باشندگان

دیوبند و اطراف و جوانب کے دلوں میں ان کی عظمت و توقیر بدرجہ کمال تھی۔ ان کے لحاظ

پاس سے بہت سے طلبہ بیر و نجات کے واسطے کھانا مقرر ہوا، اور چندہ بھی بہت آب

تاب سے تحصیل ہوا، یکا یک عزم بیت اللہ کا کیا، اور قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ

پھر ہندوستان تشریف نہ لائیں گے“

ایک ایسے الہامی کام کو شروع کر کے اچانک حاجی صاحب قبلہ کا یہ ٹکڑی طرز عمل اور انقلابی اقدام

اس کے ظاہری و سنوئی اسباب کیا تھے؟ اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتے ”اب خواہ اسباب کچھ

ہی ہوں، اسی رد و ادائیگی کا ہے کہ حاجی صاحب کے اس فیصلہ نے دلوں میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ

”بنیاد مدرسہ از بیخ کندہ ہو جاتی تو عجیب نہ تھا“

یہاں پر ہمہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور جس مدرسہ کی باگ الہام کے

زیر اثر چھٹا کر کہا جاتا ہے، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا، اس کے ”از بیخ کندہ“ ہو جانے کے نتیجہ

سے بے پروا ہو کر وہی کر گزرے جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا، اور شاید ہی مطلب ہے ان لوگوں کا جو

کہتے ہیں کہ دیوبند کا مدرسہ جس بیان پر بھی شروع میں قائم ہوا تھا، حج کو چلے جانے کے اس ارادہ کے

بعد ہی کم از کم اپنی ذات کی حد تک حاجی عابد حسین صاحب نے صرف یہی نہیں کہ اس مدرسہ کو ختم ہی کر دیا

تھا بلکہ رد و ادائیگی میں جو رکھا ہے کہ

”قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان تشریف نہ لائیں گے“

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے طرز عمل سے مستقبل میں بھی لوگوں کو اس مدرسہ کی جانب سے مایوس

بنا چکے تھے، لیکن واقع میں یہ مدرسہ جس کا تھا "اور جو پیدا ہی کیا گیا تھا" اس مدرسہ کے لئے مدرسہ کے ختم ہونے کا یہی خطرہ یا حادثہ اسی حقیقت اور واقعہ کے ظہور کا ذریعہ بن گیا "اور اب اسی مسئلہ پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مدرسہ میں مستقل قیام

اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے بہر حال اتنی بات عیاں ہو چکی کہ دیوبند میں مدرسہ عربیہ سیدہ الامام الکبیر کی چشم و ابرو کے اشاروں، بلکہ صریح اذن اور عملی پیش قدمی کا زمین منت تھا۔ شہرہ کی ناکامی کے بعد اس "نئے عمارت" یا گھات کی "نئی کمین گاہ" کے کھولنے میں پیش قدمی بھی ان ہی کے کچھلے کے پروردہ شیر بچوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اور فراہمی چندہ کے بشارت نامہ ہی میں آپ کو دعوت بھی دی گئی کہ براہ راست اپنے ہاتھ سے تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجراء کریں۔ اور اس میں بھی کوئی مشتبہ نہیں کہ قیام مدرسہ سے پہلے بھی "اور قیام مدرسہ کے بعد بھی رنج اور قلب تو دیوبندی میں، لیکن جسم کئے یا قالب جس پر دیکھتے والوں کی نظر پڑ سکتی تھی، کچھ خاص اسی موقع پر نہیں بلکہ اپنی فطری عادت اور دائمی وطیرے کے مطابق آج بھی نگاہوں سے وہ مخفی تھا۔ مگر عوام یہ بھی "خواص کی آنکھوں سے بھی دیوبند کے مدرسہ سے آپ کا واقعی تعلق کیا غفلت تھا، یا مخفی رہ سکتا تھا۔ غفلت یہ تھی، لیکن چھتہ کی مسجد کی "مخمل" میں جو کچھ ہوتا تھا "وہ دماز بن کر ہوتا تھا، آخر میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں، دیوبند، جو عرض کر چکا ہوں، ضلع بہار پور کے دوسرے بھول انحال والا کم قصابات کے ساتھ ساتھ جس زمانہ میں دیوبند نہیں بلکہ عوام کا صرف دینٹر تھا۔ اسی دور افتادہ مقام میں مدرسہ قائم ہوتا ہے، مانا کہ حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو قصبہ اور اس کے گرد و نواح میں غیر معمولی ہر دل عزیزی حاصل تھی، ان کا ان لوگوں پر کافی اثر و اقتدار بھی تھا، اسی لئے جیسا کہ رواد کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں، بیرونجات کے طلبہ کے قیام و طعام کے نظم میں سہولتیں بھی ہوئیں۔ یوں بھی "طلبہ نوازی" مسلمانوں کا موردی ذوق تھا، اس زمانہ میں بھی اور اس سے پہلے بھی میں تو یہی جانتا ہوں کہ شہروں اور قصبوں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ دیہاتوں تک میں بسنے والے

مسلمانوں کے یہاں ”طالب علم کی جاگیر“ ہندوستان کے اربابِ بخت و ثروت کے لوازمِ زندگی میں داخل تھی لیکن اسی کے ساتھ آپ آئندہ سالوں کی نہیں، بلکہ دیوبند کے اس ”مدرسہ عربی“ کے پہلے سال کی سطح پر روداد اٹھائیے۔ اس کے ابتدائی اوراق میں آپ کو بیرونِ نجات کے طلبہ کے متعلق یہ خبر بھی ملے گی:

”فقط قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع مالک مغربی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ

پنجاب و کابل و بنارس

تک کے لوگ جمع ہو گئے تھے“

جس کا مطلب یہی تو ہوا کہ مغرب میں پنجاب سے گذر کر کابل تک طلبہ کو دیوبند کا یہ مدرسہ دہن کشاں اپنے احاطہ میں لئے چلا آ رہا تھا اور مشرق میں ”بنارس“ تک کے طلبہ پہلے ہی سال میں اس مدرسہ کے طالب علم بن چکے تھے۔ بنارس کے نام کی تو روداد میں تصریح کی گئی ہے۔ طلبہ کے خانے پر سیری نظر جب اسی روداد میں پڑی تو دوسرے ناموں کے ساتھ ”مولوی بدر الدین عظیم آبادی“ کا نام بھی دیکھا کہ پہلے سال کی اسی روداد میں شریک ہے، مولوی صاحب کی شخصیت سے تو واقف نہیں ہیں، لیکن ”عظیم آبادی“ کی نسبت بتا رہی ہے کہ بنارس سے آگے بڑھ کر عظیم آباد، پٹنہ (بہار) تک کے طلبہ اس مدرسہ کی آغوشِ تعلیم و تربیت میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔

اسی طرح مالی امداد کے سلسلہ میں ذرا ملاحظہ فرمائیے پہلے سال کی اسی روداد کا اور جائزہ لیجئے۔ ان ناموں اور مقاموں کا جن سے ضلع سہارنپور کی گنام آبادی دیوبند میں چندے آئے گئے تھے میری آنکھیں تو بھٹی کی بھی رہ گئیں جب چندہ کے خزانے میں ایک طرف راجپوتانہ کی پہاڑی ریاست ٹونک سے حکیم عبد الحمید نامی کے چندے کا اور دوسری طرف سینکڑوں میل دور داتا پور (بہار) کے باشندوں کے نام سے بھی پچاس روپے کی رقم کا ذکر کیا گیا ہے۔ سوچتا ہوں تاریکی، دہشت و خوف کے ان بھیاں دونوں کو سوچتا ہوں، چند ہی سال تو گذرے تھے کہ مشرق میں بزن و یکش، گیر و دار کے ہنگاموں سے ہندوستان کی زمین خصوصاً مسلمانوں کی آبادیاں کاتپ رہی تھیں۔ اس خوفی سمندرِ ادا کشیں و درخ

میں نہ دہلا ہونے کا تراشہ جنھوں نے کیا تھا، ان کی آنکھوں کے سامنے سے تو یہ تراشہ ضرور ہٹ چکا تھا لیکن وہ مرے بھی تو نہ تھے۔ جو اپنے حلقے اور یادداشت کی قوتوں سے ان خوئیں، جگر خراشیں، روح گسل، مہیب وہولناک، انسانیت سوز نظاروں کی یاد کو مٹانا بھی چاہتے تھے تو مٹا نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں عزیزوں، جگر پاروں، دوستوں، ہمسایوں کی پھانسیوں پر لٹکی ہوئی لاشوں، اصرار پابز خمیر دست بطوق سسکتے ہوئے جسموں کو بھولنا ہی چاہتے تھے جو ان ہی کے ساتھ جیل خانوں اور دیارے شور کے دیران جزیروں کو بھرنے کے لئے لگھسیٹے جا رہے تھے، لیکن بھول نہیں سکتے ظلم و ستم کے اس طوفانی تلاطم میں گونہ سکون کی کیفیت، نو دس سال کے اس عرصہ میں یہ واقعہ ہے کہ پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن یہ تو جو کچھ تھا، باہر میں تھا، اندر میں تو اب بھی تہلکہ ہی مہلکہ تھا، باطن تو اب بھی ان ستم دیدوں کا غیر مطمئن لڑانہ و ترسان ہی تھا، پھر مراسلات و مواصلات کے ذرائع بھی اس وقت تک حد سے زیادہ نامکمل تھے، غلط فہمیوں اور شاغب بازیوں کے عام ذرائع اخبار اور پریس کی قوت سے ملک اس وقت تک گویا کچھ نا آشنا ہی تھا تو ٹھٹھے پھوٹے شکستہ درپردہ، حال میں کچھ ماہوار یا ہفتہ وار اخبار نکلتے بھی تھے۔ یا گنتی کے چند مطالع ملک کے مختلف گوشوں میں جاری بھی ہوئے تھے۔ سو شہ کی افروز فری میں ان کا نظام بھی دہرم دہرم ہو چکا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے دہسارے اسباب و وسائل جن سے کسی چیز کے مشہور کرنے میں کام لیا جائے یا اس وقت جن سے لوگ کام لے رہے ہیں، اس زمانہ میں ہم ان کا شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ پنجاب و کابل اور چوتانہ، بہار، جو اس زمانے کے لحاظ سے یقیناً دیوبند کے لئے دردمست علاقے تھے۔ ان علاقوں سے طلبہ بھی، اور چندے بھی اس تھباتی مدرسہ میں قائم ہونے کے پہلے سال ہی سے کیسے اور کیوں آنے لگے تھے۔ کیا دیوبند کے مقامی بزرگوں کے وجود اور ان کے وجود کے اثر و اقتدار سے ہم اس کی سن مانی نہیں، دل نشین اور واقعی صحیح منطقی توجہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

دیوبند میں جس کا جسم دیوبند سے غائب تھا، لیکن روح اس کی بہترین ابتداء ہی سے اس مدرسہ کی بنیاد میں جذب تھی، اس کے تعلق کے سوا کوئی صحیح جواب اس سوال کا دل کو یاد داغ کو مل سکتا ہے؟ اور سچ تو ہے کہ مدرسہ کی پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان اور مدرسہ کے پہلے امتحان تک کے کاموں میں روح کے ساتھ اسکے

جسم مبارک کو ہم جب حاضر ہی پاتے ہیں، تو قالب کی یہ مجازی غیر حاضری بھی مجازی ہونے کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ جن کی نظر مجاز پر تھی، وہ نہ سہی، لیکن ملک کے طول و عرض میں حقیقت شناسوں کا طبقہ بھی تو تھا۔ مسلمانوں کے دینی تعلیم کے اس سب سے پہلے اجتماعی نظام کے عملی قالب ”مدرسہ عربی دیوبند“ سے سیدنا امام اَلْکبیر کا جو تعلق تھا، ان کی نگاہوں سے بھی کیا یہ تعلق اور جیل رہ سکتا تھا؟ ”غیب“ کے ”لا یحیی“ قوانین کے نتائج و آثار کا جنہیں تجربہ نہیں ہے، وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ظاہری اسباب کی مدد سے بھی ضلع بہار پنڈر کی اس قصبائی آبادی میں قائم ہونے والے مدرسہ میں، پنجاب، کابل، بنارس، غلیم آباد، ٹونک (راجپوتانہ)، دانا پور (بہار) سے طلبہ اور مالی امداد کے سلسلہ کا شروع ہو جانا عمل حیرت و مستعجاب نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ دیوبند و اطراف دیوبند کی آبادیوں پر حاجی عابد حسین صاحب کا جاذبہ و اقتدار تھا، سیدنا امام اَلْکبیر کی اس زمانہ تک تقریباً سارے ہندوستان کی اسلامی آبادیوں کے یہی نسبت قائم ہو چکی تھی، اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ دیوبند کے جس مقامی مدرسہ کے لئے ہندو گریہ کیا سارے اسلامی ممالک کا محالگیر جامعہ ”بن جانا مقدر ہو چکا تھا“ اسی تقدیر کو تدبیر کے قالب میں لانے کیلئے کہ ایک طرف بظاہر شر کی صورت میں یہ حادثہ پیش آیا کہ ازلیج کندرہ ہو جائے کا خطرہ حاجی عابد حسین صاحب کے قطع تعلق کی وجہ سے مدرسہ کے لئے پیش آیا، اور دوسری طرف جیسا کہ اسی رد و داد میں لکھا ہے کہ

”باشندگان دیوبند میں بظاہر ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا کہ اس کام کا تکفل ہوتا“

یہ صورت حالی ہی ایسی تھی کہ مجاز کا جو پردہ حائل تھا، وہ بھی سامنے سے ہٹ جائے اور وہ ہٹ گیا، قلب کے ساتھ ساتھ قالب بھی اس کا دیوبندی پہنچ گیا، جسے ابتدا و قیام مدرسہ کے وقت تاریخ کی آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ اور تھک تھک کر واپس ہوتی ہیں کہ آخر جس کا یہ مدرسہ تھا اندہ جو اس مدرسہ کے لڑکے تھا ابھی آج کیوں غائب ہے؟

صحیح تاریخ متعین ہو سکتی ہو یا نہ ہو سکتی ہو، اور جس شخص کی ولادت کی تاریخ تو تاریخ کا مہینہ تک کو اس کی طفولیت و شباب و کھولت کے رفیق ہمارے مصنف امام تک متعین کرنے سے اپنے آپ کو قاصر و معذور بتا رہے ہوں تو ایسی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق دارالعلوم کی دوامی خدمت کیلئے

دیوبندیوں میں مستقل قیام کی تاریخ ہم جیسے دور افتادوں کے لئے کچھ بہم ہو کر اگر وہ جانے تو اس پر تعجب کیوں کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ مدرسہ کے کاروبار کا جو حاکمکل ہو، جب دیوبندیوں کوئی ایسی ہستی بظاہر باقی نہ رہی، یا نظر نہ آئی، تب لانے پر دیوبند والے اور آنے پر سیدنا الامام اکیبرؒ بھی مجبور ہو گئے۔ اسی کے بعد مدرسہ سے آپ کا وہ عجیب و غریب باہر دے بہرشتہ نفس واپس جس تک قائم رہا کہ ایک طرف مصنف امام توسیدنا الامام اکیبرؒ کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ

”ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔“

اور دوسری طرف سنانے والے سلسلہ ہی سناتے چلے آ رہے ہیں کہ

”دارالعلوم دیوبند میں مولانا محمد قاسم نے مدرسہ دیا، اور نہ اس کے انتہائی دانشور شیوہ سے بظاہر بحیثیت عہدہ کے کسی قسم کا کوئی تعلق آپ کا بھی قائم ہوا۔“

”باہر اوسے ہمہ“ کا یہ حیرت انگیز رشتہ اس لئے بھی عجیب تھا کہ ”ہر طرح سرپرست“ بن جانے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ آپ دارالعلوم تھے اور دارالعلوم آپ ہی کا وجود باوجود تھا، لیکن پھر ہی سے آپ سن چکے کہ مدرسہ کی دوات کی سیاحت کے ایک قطرہ کا بھی بلا معاذہ صرف کرنا، فقط اسی کو اپنے لئے کبھی آپ نے جائز نہیں قرار دیا۔ جس میں سیاحت کے چند قطرات ہی ہیں، کچھ خرچ تو ہوتا تھا، بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ ”سرد خانہ“ سے صفاتی استفادہ جس سے نہ سرد خانے کی ذات میں کوئی کمی پیدا ہوتی تھی، اور نہ صفات میں اس استفادہ کا بھی حقدار اپنے آپ کو نہیں خیال کیا، اور خدیو طبیعی حرارت مزاج کے باوجود موسم گرما کی تپش اور ٹوکی تکلیف کے برداشت کرتے ہی کو اپنی دلی راحت کی ضمانت ٹھہراتے رہے۔ قل میں

اللہ سترہ و دفعتاً اللہ بمائتہ الطیبہ الطاہرۃ النزهۃ الباہرۃ۔

بہر حال میرٹھ میں قیام مدرسہ کے بعد آپ جتنے دنوں بھی رہے ہوں، لیکن مصنف امام کے بیان کی مطابق اتنا ماننے پر بہر کیف ہم مجبور ہیں کہ

”شروع مدرسہ میں آپ دیوبند رہے اور ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔“

اب ”شروع“ کے لفظ کو سامنے رکھتے ہوئے ”قالب“ کی دوری کے ان دنوں کی نوعیت جتنی بھی جی چاہی

متعین کر لیجئے، ان دنوں میں مدرسہ میں کیا کیا ہوا، ہندوستان کے عربی، عربی تعلیم کے قدیم نظام کے مقابلہ میں، دیوبندی سلسلہ کے اس جدید نظام میں جن امتیازی خصوصیات کو ہم پاتے ہیں، ان میں کتنی باتوں کا اضافہ سیدنا الامام الکبیر کی مستقل تشریف آور ہر طرح سرپرست بن جانے کے پہلے اس مدرسہ میں ہوا، ان امور کی تفصیل جیسا کہ کتا چلا آرہا ہوں، دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والوں کا علمی فریضہ ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ جامعہ بندی راجہ شہر حاضری، امتحان تحریری جیسی باتیں جن سے حکومت کا نمرہ کے نئے نظام تعلیم نے ملک کو روشناس کیا تھا، شروع ہی سے ان کی افادیت اور ضرورت کو محسوس کر کے قبول کر لیا گیا ہو، آخر حاجی سید عابد حسین صاحب مرحوم جن کے ہاتھ میں مدرسہ کے اہتمام و انتظام کی باگ ابتدا میں سپرد کی گئی تھی۔ وہ اجتماعی تعلیم کے ان عصری لوازم و خصوصیات سے بانا کہ کوئی قطعی نہ رکھتے ہوں، لیکن مولانا فضل الرحمن اور مولانا ذوالفقار علی طالب شراہا کی تو عمر ہی ان چیزوں کے عملی تجربوں کی دشت نمائی میں گزری تھی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی، اور ملازمت کے ایام میں بھی، دونوں دینی عربک کالج کے صدر مولانا مملوک علی سے تلمذ کا تعلق رکھتے تھے، اور حکومت کے محکمہ تعلیمات میں منسلک ہو کر ڈپٹی انسپکٹر کے عہدوں تک پہنچے تھے۔ ان نئے اصلاحات کے لئے ان ہی دونوں بزرگوں کا وجود کافی تھا، پھر سیدنا الامام الکبیر بھی سکافی یعد کے باوجود حقیقتاً اس مدرسہ سے جتنے قریب تھے، ان کے مشوروں سے بھی اثر پذیر ہونے کی راہیں اس زمانہ میں بھی کھلی ہوئی تھیں، لیکن برادر است حضرت فلاحا کا قیام چونکہ مدرسہ میں ابھی نہیں ہوا تھا، اس لئے وقت کی اس مدت کے متعلق جو کچھ بھی عرض کیا گیا، اپنی بحث کے حقیقی دائرہ سے تجاوز کے بعد ہی عرض کیا گیا، لیکن میرٹھ چھوڑ کر دیوبند میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے کے بعد جب مدرسہ کے کاموں سے آپ کا وہ عجیب و غریب اچھوتاہہ انوکھا رشتہ ”باہمہ اور بے ہم“ وثلاً قائم ہوا، یعنی سب کچھ ہونے کے باوجود دیکھنے والے یہ بھی دیکھ رہے تھے، کہ آپ ”کچھ نہیں“ ہیں۔ اس ”عہد“ کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے، کہ جن جن سوالوں کے جوابوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں جس نوعیت کی ”معلومات“ کو دل ڈھونڈنا چاہئے، جیسا کہ چاہئے، ان کی فراہمی میں تو کامیاب نہ ہو سکا، تاہم تلاش و جستجو سے اب تک جن امور تک

رسائی میرے لئے آسان کی گئی ہے، انہیں پیش کر دیتا ہوں، جن سے اس کو بھی پڑھنے والوں کو اندازہ ہوگا کہ دینی نظام تعلیم کے اس نئے قالب و بیگل میں جن کا مرکز دارالعلوم دیوبند ہے، اس میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے منہار کے مطابق کتنی باتیں پوری ہو چکی ہیں، اور کتنی اس وقت تک تشنگیل ہیں، و اللہ ولی الامور والتوفیق۔

دارالعلوم کا نصاب تعلیم

سب سے پہلا مسئلہ "نصاب تعلیم" کا ہے۔ دارالعلوم میں جو کچھ پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ یا پڑھ پڑھ کر اب تک جو لوگ اس مدرسہ سے فارغ ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر عام مانے ہی قائم ہو سکتی ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں "نصاب تعلیم" کے مسئلہ پر شاید کبھی غور نہیں کیا گیا، اور نہ "درس نظامیہ" کا جو نصاب تھا اسی کو قبول کر لیا گیا ہے، الزام لگایا جاتا ہے، کہ زمانہ کے جدید تقاضوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کی گئی، اس میں شک نہیں کہ جو دیکھا جا رہا ہے، اس کو دیکھ کر کہنے والے آخر ادا کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کا نقطہ نظر اس باب میں کیا تھا، اس کا اندازہ حضرت دالاک اس تقریر سے کر سکتے ہیں جو خوش قسمتی سے سنہ ۱۲۹ھ کی ردا میں شریک کر دی گئی ہے، وہی مطبوعہ شمکلی میں میرے سامنے ہے۔ طلبہ جو فارغ ہوئے تھے، ان کو سند انعام دینے کے لئے ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۸۷۴ء میں یہ جلسہ دیوبند میں منعقد ہوا تھا، گویا عصری یونیورسٹیوں میں کانفرنس کے اجلاس کی جو نوعیت ہوتی ہے، کچھ اسی طرز کا یہ جلسہ تھا، اطراف و جوانب سے بھی کافی تعداد مہانوں کی اس تعلیمی تقریب میں شریک ہونے کے لئے دیوبند پہنچی تھی، فارغ ہونے والے طلبہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت اس "تعلیمی حلقہ" کی یہ بھی نظر آتی ہے، کہ جن علوم و فنون کی تعلیم فارغ ہونے والے طلبہ کو دی گئی تھی، ان میں سے کسی فن اور علم کے کسی خاص موضوع پر امتحانی مقالے لکھوائے گئے تھے، یہی مقالے لوگوں کو

سنائے گئے۔ یہ مقالے بھی روداد میں شائع کر دیئے گئے تھے، جن کے پٹھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں دیوبند کے اس مدرسہ کا تعلیمی معیار کتنا بلند ہو چکا تھا، گو یا سمجھنا چاہئے، کہ مختلف یونیورسٹیوں کے آخری مدارج مثلاً ایم۔ اے یا ریسرچ وغیرہ کی کلاسوں میں جیسے مقالے (Research) لکھوائے جاتے ہیں، امداد العلوم کے نظام تعلیم میں اتنی سال گویا ایک صدی پہلے یہ سنت جاری ہو چکی تھی، جو افسوس ہے کہ بعد کو جاری نہ رہی، اور کہہ سکتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کے ”کانوڈیشن“ کے جانچوں خطبوں، یا ایڈریسوں کا جو عام رواج ہے، تقریباً کچھ اسی رنگ میں سیدنا الامام الکبیرؒ نے ایک تقریری خطبہ عطا ئے اسناد و انعام کے اس جلسہ میں ارشاد فرمایا تھا، خطبہ کافی طویل ہے، اور جیسا کہ چاہئے گوناگوں حقائق و معارف سے لب ریز ہے، سارے الفاظ جن پر اس خطبہ میں بحث کی گئی ہے، ان کے پیش کرنے کا نہ یہ موقع ہے، اور نہ ضرورت، بلکہ نصاب تعلیم کے متعلق اپنی اس تقریر میں حضرت دالائے جن اصولی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، صرف ان ہی کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

لیکن اصل تقریر کے الفاظ کو پیش کرنے سے پہلے چاہئے کہ ایک بات سمجھ لی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے، کہ ہمارے عربی و دینی مدارس کے تعلیمی نصاب کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہی ہے کہ عصر حاضر کے عام علمی حلقوں میں اتنا زور و قاریورپ کے جن جدید علوم و فنون اور اسناد یا زبانوں سے آگاہی حاصل کئے بغیر علمی کاروبار کرنے والے حاصل نہیں کر سکتے، ان کا پیوند اپنے دینی علوم، اور دوسرے عقلی و ذہنی تعلیم و فنون سے کیسے قائم کیا جائے۔

اب تو تقریباً علماء کی اکثریت اس سوال کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے، لیکن یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پیوند قدیم و جدید علوم و فنون میں کیسے قائم کیا جائے۔ کیا دینی علوم اور قدیم تعلیمی فنون کے ساتھ ساتھ جدید علوم و اسناد کی کتابیں بھی نصاب میں شریک کرنی چاہئیں؟ یا جدید علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کا موقع طلبہ کے لئے فراہم کیا جائے؟ یہ دونوں صورتیں تو ایسی ہیں جو ہندوستان کے بعض تعلیمی و تدریسی اداروں میں زیرِ تجربہ بھی آچکی ہیں، امداد العلوم ندوۃ العلماء (دکن) اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہٴ دینیات میں مشترک نصاب کے طریقہ کو اوسلم یونیورسٹی میں

بی۔ ٹی۔ ایچ۔ کی کلاسوں کو کھول کر دوسرے طریقہ کو عملاً آزمایا جا چکا ہے جس کے نتائج بھی لوگوں کے سامنے آچکے ہیں، لیکن اسی سلسلہ میں ایک تیسرا احتمال بھی عقلاً پیدا ہوتا ہے۔ یعنی پہلے مسلمان بچوں کو دینی و اسلامی علوم سے کم از کم وقت میں قدر ضرورت کی حد تک واقف بنالینے کے بعد ان کو جدید علوم و فنون کی یونیورسٹیوں میں شریک کیا جائے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انفرادی طور پر اس ترتیب سے بھی تعلیم پانے والے چند گنے چنے اشخاص ہندوستان میں جدید یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد ضرور پیدا ہوئے ہیں، لیکن تقریباً ایک صدی کی طویل مدت میں اتنے طویل و غریض ملک جیسا کہ ہندوستان ہے اس میں شاید اتنی تعداد بھی اس قسم کے تعلیم یافتوں کی نہیں مل سکتی، جن کو گنتے کے لئے دس انگلیوں کے استعمال کی ضرورت ہو، مگر باوجود اس کے شاید یہ کہنا واقعہ کا اعتراف ہوگا، کہ اسی تیسرے نہج پر تعلیم پانے والوں میں علم و عمل کے جن نمونوں کا اس وقت تک مشاہدہ کیا گیا ہے، شاید ان کی مثال مذکورہ بالا دو طریقوں پر تعلیم حاصل کرنے والوں میں ہم نہیں پاسکتے، الا ما شاء اللہ وقلیل ما ہمد۔

بہر حال جدید و قدیم علوم کے ”پیوند“ کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے، عملی تشکیل کی یہی تین عقلی صورتیں ممکن ہیں، اب دیکھئے کہ سیدنا الامام الکبیر کا زاویہ نگاہ اس باب میں کیا تھا، ”مجلس عطلے اسناد و انعام“ کے اسی جلسہ میں تقریر فرماتے ہوئے، دوسری باتوں کے ساتھ آخر میں یہ فرماتے ہوئے کہ ”اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے کہ دو باب تحصیل، یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا“

طریقہ خاص سے مراد یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں جدید علوم و فنون اور اسناد کی کتابیں کیوں شریک نہیں کی گئیں، خود ہی اجمال کی تفصیل آگے ان الفاظ میں قرآنی گئی ہے کہ ”اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا“

سب سے پہلی بات تو صرف اسی سوال سے یہ سمجھ میں آتی ہے، کہ جدید علوم و فنون کے سوال سے جو یہ باور کر لیا گیا ہے، یا اب بھی باور کرایا جاتا ہے، کہ ہمارے علماء قطعاً خالی الذہن تھے، افتراء یا قہام کو سرا

وہ کچھ نہیں ہے۔ کم از کم دیوبندی حلقہ کے علماء کی ذمہ دار بہتوں کا دامن تنگ خیالی اور جمود کے اس داغ سے پاک تھا۔ اس کے لئے تو یہی کافی ہے، کہ اس طبقہ کے سب سے بڑے پیشوا، امام اکبر کے سامنے ہی نہیں کہ صرف سوال ہی تھا، بلکہ جو جواب اس سوال کا دیا گیا ہے، اسے سنئے، اور انصاف سے کہئے کہ تقریباً ایک صدی پہلے حضرت دلا کا ذہن جن اشتباہی پہلوؤں کو پاک کر کے نتیجہ تک پہنچ چکا تھا، کیا اس وقت تک فراخ چشموں کے مدعوں کا گردہ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے؟

اس سوال کی جوابی تقریر سیدنا الامام اکبر کے ان الفاظ سے شروع ہوئی ہے، فرمایا گیا تھا کہ ”منجملہ دیگر اسباب کے، بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے۔“

”دیگر اسباب“ جن کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا گیا ہے، ان کا ذکر تو بعد میں کروں گا، پہلے ”سب سے بڑے سبب“ کی تفصیل ان ہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں، ٹھنڈے دل کے ساتھ فکر معقول سے کام لیتے ہوئے، ان گرامی ارشادات کا مطالعہ کیجئے، سب سے پہلے ایک کلی قاعدے کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا تھا کہ

”تربیت عام ہو، یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہئے، جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔“

مطلب یہ ہے کہ افراد ہوں، یا جماعتیں، ان کے اٹھان، اور جن کمالات تک ان کو پہنچانا مقصود ہو، سب سے پہلے توجہ کے تحت اس سلسلہ میں وہی معاملات ہوتے ہیں، بلکہ چاہئے کہ وہی ہوں، جو سب سے زیادہ کس پرسی اور لاپرواہی کا شکار ہو چکے ہوں، ایک شخص جس کے بدن پر کھادی ہی کا کرتہ کیون نہ ہو، لیکن کرتہ کے ساتھ یہ دیکھا جاتا ہو کہ نیچے کا بدن اس کے بالکل منگنا ہے، تو ظاہر ہے کہ کھادی کے کرتہ کی جگہ ریشم قمیص کی فکر سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہو گا کہ بے ستری سے محفوظ کرنے کے لئے لنگی یا پانچماں کا نظم اس غریب شے کے لئے کیا جائے۔

جس زمانہ میں یہ تقریر ہو رہی تھی، اس وقت تعلیمی رواد سے مسلمانان ہند کی تربیت و اصلاح کے

مسئلہ کی نوعیت مذکورہ اصول کی روشنی میں کیا ہونی چاہئے، اسی کا جواب دیتے ہوئے پہلا فقرہ یہ فرمایا گیا تھا

”سواہل عقل پر مدش ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی“

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی تھا کہ علوم جدیدہ کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے، اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم و فنون سے الگ تھلگ رہنا چاہئے، جن سے ملک کو نئی قائم ہونے والی حکومت نے روشناس کیا ہے۔ توجہ صرف اس پر دلائی گئی، کہ خود حکومت کی طرف سے جن علوم و فنون کو بڑھانے پڑھا نے کا نظم و سنج پیا نے پر کیا جا چکا ہے اور آئندہ کیا جائے گا۔ اور کیسا نظم و سنج؟ کہ بقول حضرت امام اتنی سرپرستی قدیم علوم، اور اسلامی فنون کو گذشتہ سلاطین اور مسلمان بادشاہوں کی طرف سے بھی کبھی میسر نہیں آئی تھی،

علوم جدیدہ کی عام اشاعت و ترقی کے اس تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا کہ
 ”ہاں! علوم تعلیم (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ منزل ہوا کہ ایسا منزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا“

علوم جدیدہ، اور علوم اسلامیہ دنیویہ دونوں کے باہمی تعامل کی تصویر جو حقیقت اور واقعہ کی عکاسی تھی، اس کو پیش کرنے کے بعد نتیجہ کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا تھا کہ
 ”ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا، تحصیل حاصل نظر آیا“

گویا مثال اس کی دی ہوئی، مگر جو کرتے ہی نہیں ریشیں قمیص پہنے ہوئے ہے، اس کی قمیص میں قمیصوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے، لیکن جس درجہ سے غریب رنگا رنگ لگاتا ہے، اور عریانی و بے ستری کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے، اسی سے لاپرواہی برتی جا رہی ہے۔

بہر حال جس چیز کی تکفل غیر محدود ذرائع رکھنے والی حکومت ہو، اسی کے اضافہ میں محدود ذرائع رکھنے والے حکومتوں اور رعایا کی آمدنی کو خرچ کرنا، اور اس کے لئے امدادی چندوں کا باران ہی غریبوں

کے سر ڈالنا، حضرت والا کا خیال تھا کہ تحصیل حاصل کے سوا اسے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

آپ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ پبلک کے عام چندوں، اور مالی امداد سے استفادہ کی اسی ٹھو قرین مچھل و دانش یہی تدبیر نظر آئی، مگر حکومت جن علوم کی سرپرستی کر رہی ہے، ان کو تو حکومت کے سپرد رکھا جائے۔ لیکن مسلمان جس علم سے محروم رہ جائے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے، اور نئی حکومت اپنے خاص حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے صرف دست بردار ہی نہیں ہو گئی ہے بلکہ واقعات بتا رہے تھے کہ نئی حکومت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں زبونی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں، ان علوم کے احیاء و بقا کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے، اور یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو آگے اسی تقریر میں پائے جاتے ہیں، یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب میں اسی لئے ارشاد ہوا کہ

”صرف بجانب علوم تعلیمی (یعنی خالص اسلامی و دینی علوم)، اور نیز ان علوم کی طرف جن کے

استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (و انطاف)، ضروری سمجھا گیا۔“

آپ دیکھ رہے ہیں، دارالعلوم کے نصاب میں خالص دینی و اسلامی علوم (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) کے ساتھ ساتھ عقلی و ذہنی فنون کی شرکت کی توجیہ کرتے ہوئے، حضرت والا نے جہاں اس عام اور مشہور غرض کا تذکرہ فرمایا ہے، یعنی مسلمانوں کے ”علوم مروجہ“ کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، قبل و قال، جواب و سوال سے فکری و دندش کر کے طلبہ میں دقتہ سنجوں، موٹسگانیوں کے ملکہ کو ابھارا جاتا ہے، استعداد علوم مروجہ“ سے یہی مراد ہے۔

خیر یہ تو عام بات ہے، بیان کرنے والے عموماً اس کو بیان بھی کرتے ہیں، لیکن خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھنے کا سختی توجیہ کا دوسرا پہلو ہے، یعنی یہ جو فرمایا گیا ہے کہ

”اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے“

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، مگر دارالعلوم کے مروجہ نصاب میں حضرت والا نے سمجھانا چاہتے ہیں، ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں ”علوم جدیدہ“ کے

محاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، مگر یا معلوم جدیدہ کی تعلیم کا مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے، اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا جاسکتا ہے، دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب کے متعلق حضرت دالاکا یہ جدید نقطہ نظر ہے، جس کی طرف آپ نے صرف اسی اجمالی اشارہ سے ہی توجہ نہیں دلائی ہے، بلکہ خالص دینی و اسلامی علوم کے مقابلہ میں مدرسہ کے نصاب کے عقلی و ذہنی فنون کا "علوم دانش مندی" کے عنوان سے تذکرہ کرتے ہوئے اپنے صحیح تعلیمی نصاب العین کو سید الامام الکبیر نے کھلے کھلے واضح الفاظ میں پیش فرمادیا ہے، آگے اسی تقریر میں اس کا اعادہ کرتے ہوئے لکھیں:

"علوم نقلیہ" اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا ۱۱

اپنی اس تجویز سے اسی زمانہ میں سننے والوں اور سمجھنے والوں کو آگاہ فرمادیا تھا کہ

"اس کے بعد دینی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ

مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں باس

زیادہ مؤید ثابت ہوگی ۱۲

خدا سوچے کہ غم و غصہ، بے زاری، اور دل انگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان صیر

اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنایا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے زمین پر چمک دیئے گئے تھے،

ان کے قلوب میں جیسا کہ چلے گئے تھے، قدرتنا اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو

جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی، فطرتاً

اس سے مسلمان بھڑکتے تھے، بلکہ چڑھتے تھے۔ اگر یزی مدارس اور ان مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا

تھا، اس کے تصور سے بھی وہ لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے۔ "جو اگر بڑی پڑھے گا وہ کافر ہو جائیگا۔"

مورہروں کی طرف اس تکفیری لطیفہ کو مسخروں نے جو منسوب کر رکھا ہے، بجائے خود افترا و بہتان کی

یہ جتنی بھی شہرتاںک مثال ہو، لیکن اس کا شاید انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ اسلامی آبادیوں کی نفاکچہ اسی قسم

کی صداؤں سے معروضہ درجہ کس نے فتویٰ دیا، کب دیا، ان سوالوں سے بے تعلق ہو کر کہنے والے کچھ

ہی قسم کی باتیں کہہ رہے تھے، اور اسی نوعیت کے چرچے عموماً پھیلے ہوئے تھے۔

لیکن امی مسموم نفا، اور غلط فہمیوں سے بھرے ہوئے ماحول میں سیدنا امام الکبیرؑ یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جوازی کا فتوئے دے رہے ہیں، بلکہ بغیر کسی حجب کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرما رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم علمی کمالات کے چمکانے، اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ ہشتاد ایک طرف اسی زمانہ میں مولویوں کا ایک طبقہ تھا، بلکہ ان کی اکثریت یہ بارگئے بیٹھی تھی کہ جو کچھ انہوں نے پڑھ لیا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے، جسے سیکھا اور پڑھا جائے۔ ان ہی مولویوں کو درمیان پکارنے والا پکار رہا ہے، کہ مولویوں میں اپنے علمی کمالات میں جو مزید فروغ، اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چاہئے کہ یورپ کے جدید علوم و فنون کا مطالعہ کرے، ان کی علمی زبانوں کو سیکھے، جو سرکاری مدارس میں سکھائی جاتی ہیں، یقیناً حضرت دلا کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے، اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ یورپ کے جدید علوم و فنون کی اہمیت و ضرورت کا انکار جسے اُس زمانہ میں عموماً ہمارے علماء و سائنس دان اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ یہی نہیں، کہ صرف انکار ہی کی حد تک بات محدود تھی، بلکہ

”رہبندی نظام تعلیم“

کے امام اول و اکبرؑ نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت ہی کو تسلیم کر لیا تھا، بلکہ جن الفاظ میں حضرت دالائے اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ اس سے آگاہ ہونے کے بعد بلا خوف و تردد باسانی یہ دعوے کیا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامیہ کے ساتھ ہمہ پہلو کے جدید علوم و فنون، دالائے کے چونکہ لگانے کے سلسلے میں مذکورہ بالا تین عقلی شکلوں یعنی دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ دلائی جائے، یا عصری علوم سے تاریخ بننے کے بعد جو پڑھنا چاہتے ہوں ان کے لئے اسلامی علوم کے پڑھنے کا نظم کیا جائے۔ یا مسلمانوں کو دینی و مروجہ علوم میں بقدر ضرورت بصیرت حاصل کر لینے کے بعد مسلمان بچوں کو دانش نو سے مستفید ہونے کو موقع فراہم کئے جائیں، ان ہی تین شکلوں میں تعمیری شکل کو اپنے نصب العین میں حضرت دالائے شریک کرنا چاہتا تھا، اپنی اسی تقریر میں آپ نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ بجائے قدم و تاخر کی اس ترتیب کے

قدیم و جدید علوم کا مشترک نصاب دارالعلوم دیوبند میں کیوں جاری نہیں کیا گیا، یعنی ہر دو صنف کے علوم کی کتابیں ساتھ ساتھ پڑھائی جائیں، ایسا کیوں نہ کیا گیا، جواب میں فرمایا گیا ہے کہ

”زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعدا درستی ہے۔“

ایک مطلب تو اس کا ظاہر ہے کہ اسلامی و دینی علوم کی صحیح بعیرت حاصل کرنے کے لئے جن فنون کی تعلیم بطور مقدمہ دی جاتی ہے، صرف دشو، ادب، معانی، بیان، اصول فقہ، کلام اور علوم دانش مندی جن سے ذہنی ورزش کا کام لیا جاتا ہے۔ ان سب کو چھوٹے سے چھوٹے مختصر ترین نصاب کے لئے بھی، اتنی کتابوں کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ علوم جدیدہ کی کتابوں کی گنجائش بہ شکل شکل سکتی ہے۔ اور طلبہ پر کسی نہ کسی طرح اس ناقابل برداشت بوجھ کو لا دیا جائے تو ”طلب الكل فوت الكل“ کے سراغوں کا کوئی دوسرا نتیجہ سامنے نہیں آئے گا۔ پوری محنت اور توجہ جس کے بغیر صحیح استعداد طلبہ میں پیدا نہیں ہو سکتی، سیدنا امام الکیبیریؒ فرمانا چاہتے ہیں۔ قدیم و جدید دونوں علوم اس سے محسوس رہ جائیں گے۔ آپ کے بیان کا یہ تو خیر کھلا ہوا پہلو ہے، اسی کے ساتھ اگر اس کو سوچا جائے کہ جس زمانہ میں یہ تقریر کی گئی تھی، یعنی آج سے ستراتی سال پہلے حالت یہ تھی کہ مشرقیات کے پڑھنے پڑھانے والے ہمارے علماء اور مغربی علوم کے معلمین، پروفیسروں اور محققوں کا طبقہ دونوں کے پڑھنے پڑھانے کا صرف طریقہ ہی مختلف نہ تھا، بلکہ مشرقیات کو اساتذہ پر عوامی عقیدت و یقین واجب سلف کے احترام کے جذبات غالب تھے اور اس کے برعکس مغربی علوم و فنون کی تعلیم جو دیتے تھے، وہ شک وارتیاب، بے اعتمادی، مطلق العنانی کی ذہنیت کے دباؤ کے نیچے دبے ہوئے تھے اور مرض سعدی کی طرح ان سے پڑھنے والوں میں اسی ذہنیت کے جراثیم قدرتاً منتقل ہوتے رہتے تھے اب تو مختلف اسباب و وجوہ کے کسرو انکسار کی بدولت ایک صدی کی طویل مدت میں دونوں طبقوں کے رجحانات میں اتنا بعد و تخالف باقی نہیں رہا ہے

لیکن جس عہد میں قدیم و جدید نصاب کے پیوند کے اس مسئلہ کو سیدنا امام الکیبیریؒ اٹھایا تھا، اس وقت یہ واقعہ ہے کہ ان دو مختلف، قطعاً مختلف احکامات و رجحانات والے اساتذہ کو ایک ہی

زمانہ میں تعلیم پانے والوں کے متعلق اگر تخمینہ کیا گیا تھا کہ قدیم ہو، یا جدید دونوں ہی سے صحیح مناسبت نہ پیدا ہو سکے گی، تو جو واقعات تھے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح بصیرت کسی اور نتیجہ تک شاید پہنچ بھی نہیں سکتی تھی، 'الغرض' نقصان استعداد' کے جس اندیشہ کا اظہار مندرجہ بالا تقریر میں کیا گیا ہے۔ ایک پہلو اس اندیشہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر استادوں کے ایک حلقہ میں جن علوم و مسائل کی قدردانی قیمت طلبہ پر واضح کی جاتی ہو، اور معادوسرے حلقے میں پہنچنے کے ساتھ ان ہی کے وزن و وقار سے طلبہ کو خالی الذہن کر دیا جائے، اثبات دہنی کے اس قصد میں اگر ہر دو کی نفی ہوتی ہے، تو ان دو متضاد طریقہ تعلیم کا خود ہی سوچنے دوسرا انجام ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اور یہ وجہ تو اس بات کی تھی کہ قدیم و جدید علوم کا مشترکہ نصاب دارالعلوم دیوبند میں کیوں نافذ نہیں کیا گیا۔ بلکہ بجائے اس کے سیدنا الامام البکیر نے اپنے اس تعلیمی نظریہ کو پیش کیا ہے کہ پہلے دینی و اسلامی علوم کا نصاب دانش مندی کے فنون کے ساتھ ختم کرایا جائے، جن کے بغیر حقائق اسلامی علوم، تفسیر، شروح احادیث و فقہ وغیرہ کی کتابوں کے نہ مطالعہ ہی کی صحیح قدرت پیدا ہو سکتی ہے، اور جیسا کہ چاہئے، ان کتابوں سے استفادہ بھی بآسانی ممکن نہیں، اس کے بعد جیسا کہ آپ

ملہ بد کو ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے خاکسار بھی اسی نتیجہ تک پہنچا، بلکہ اسی کے ساتھ جدید علوم و فنون والسنہ کو چونکہ حکومت کی سرپرستی و پشت پناہی حاصل تھی، اس کی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا کہ اسلامی دینی علوم کے جن آثار کی توقع پڑھنے والوں میں کی جاتی ہے، بجائے ان کے اکثریت میں وہی رنگ غالب ہو جاتا ہے، جو رنگ خاص مغربی علوم و فنون کی تعلیم پانے والوں کی خصوصیت ہے، رنگ و رنگ، وضع قطع، طریقہ فکر و بیان سب ہی میں پایا گیا کہ وہ مغربی علوم کے طلبہ کے طفیل بنے ہوئے ہیں۔ انھیں علی دین ملو کھد بات تو برائی ہے، لیکن ہر سنے زمانہ میں اسی پرانی بات کا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، مولانا حبیب الرحمن سابق، مہتمم دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم کے نصاب کے متعلق اسی سلسلہ میں ایک دن گفتگو ہوئی، تو پہلی دفعہ اسی "پیرودانا" نے نوجوانی کے زمانہ میں فقیر کو سمجھایا تھا کہ توازن کا باقی رہنا دشوار ہو جائے گا۔ طلبہ پر عموماً انگریزیت غالب آجائے گی، دین کی ٹوٹی بھوٹی خدمت دارالعلوم کے طلبہ سے اس وقت جو بن آتی ہے، اتم دیکھو گے کہ اس سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا چلا گیا، مشاہدہ سے ان تجسہ بہ کاروں کے خیال کی تائید ہوتی چلی جا رہی

دیکھ چکے صاف اور واضح لفظوں میں اپنی یہ تجویز پیش کی ہے، کہ علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے۔ اپنی اس تقریر میں یہ دعوے بھی کیا ہے، کہ اس ترتیب سے تعلیم دلانے کا تجربہ کیا جائے، عوام ہی کو نہیں، خود حکومت کو جو شش میں اگر براہ راست مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ

”سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد اے کہا کرتے ہیں“

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دانش سدی کے قدیم علوم جن کو معقولات بھی کہتے ہیں، ان میں بال کی کھال نکالنے کی مشق کی وجہ سے قدر تا فکر و نظریں گہرائی کی کیفیت جو پیدا ہو جاتی ہے، نازک سے نازک بات تک پہنچنے اور پہنچانے کی اس عادت کے ساتھ جدید علوم و فنون میں حقیقت یعنی واقعات ظہری پر جو زور دیا جاتا ہے۔ قدیم و جدید تعلیم کی ان دونوں طبعی خاصیتوں کی باہمی ترکیب سے علمی استعداد کے جس رنگ کو پیدا کیا جاسکتا ہے، اس رنگ کو صرف قدیم، یا صرف جدید تعلیم کی سادہ سے شاید حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والائے اپنے ہی زمانہ میں تعلیم کے تمام پہلوؤں، اہل ان کے مختلف نسلیں کا صحیح اندازہ کر لیا تھا، تعجب تو اس پر ہوتا ہے، کہ حکومت مسلطہ جس کی امداد کی طرف غلطی ہو بھی آپ دیکھنا شاید پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن قدیم و جدید علوم کے بیوند کی مجوزہ ترتیب کی افادیت کے خیال نے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس التزام کے حدود کے توڑنے پر بھی آپ کو شاید مضطر و مجبور کر دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑی رکاوٹ آپ کی تجویز کے ”عملی نفاذ“ میں حکومت کا وہ عجیب و غریب رویہ تھا، کہ ”حصول علم“ کو بھی طلبہ کی عمر کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، فلاں عمر تک فلاں امتحان میں طلبہ شریک نہیں ہو سکتے، یا فلاں امتحان میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ امیدوار اپنی عمر سے ہو چکا ہو۔ امتحان میں شرکت کے حق سے وہ محروم ہو جائیں گے، جو حکومت کی مقرر کردہ عمر سے ایک دن بھی آگے بڑھ گئے ہوں، علم کے طلبہ کی غلامی کے ساتھ خود علم کی اس غلامی کو دیکھتے ہوئے سیدنا امام الکبیر نے محسوس فرمایا کہ میری مجوزہ ترتیب پر تعلیم پانے والوں کے لئے سرکاری مدارس میں

داخل ہو کر جدید علوم و فنون سے استفادہ میں رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلاف دستور دستگیری کے لئے اس موقع پر آپ نے حکومت کو بکھارا ہے ارشاد ہوا تھا کہ

”کاش! گورنمنٹ ہر بھی قید عر طلبہ نو داخل کو اڑا دے“ ص ۱۱

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات و اسلامیات کی تعلیم کے بعد یورپ کے نئے علوم اور اس ملک کی نئی علمی زبانوں کے سیکھنے سکھانے کے متعلق حضرت دلا کے خیالات و جذبات کی صحیح نوعیت کیا تھی؟

بہر حال سلسلہ کے جن جن ذویوں کو جس جس طریقہ سے اپنی تقریر میں حضرت دلا نے پیش کیا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ صرف جواب دینے کے لئے سرسری طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا تھا، گویا ذکر کرنے والے کے سامنے حقیقی معنوں میں کوئی شخص تھوڑا سا باب میں نہ تھی۔

میں کیا عرض کر دوں، دارالعلوم دیوبند کی رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ مشروع میں مدت کی تعلیمی مدت معلوم ہوتا ہے کہ دس سال مقرر کی گئی تھی، لیکن دو سال گزرنے کے بعد ۱۲۸۵ھ میں ہم دیکھتے ہیں، نصاب اور تعلیمی مدت وغیرہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک مجلس مقرر کی گئی، جس نے بوجہ دوسری تجویزوں کے ایک تجویز بھی پیش کیا کہ

”کل میعاد مدت تمام کتب اسباق ثلاثہ کے چھ سال مہین ہر سے ۱۲۸۵ھ و ۱۲۸۶ھ

”اسباق ثلاثہ“ مراد یہ ہے کہ وقت واحد میں تین کتابوں سے زیادہ پڑھنے کی اجازت کسی طالب علم کو نہیں دی گئی تھی، چھ سال کی محدود مدت میں اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ خالص دینیات یعنی حدیث و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و فرائض کی وہ ساری کتابیں ختم ہو جائیں، جن کے پڑھنے پڑھانے کا عام رواج اس زمانہ میں تھا، اور جن کو پڑھ لینے کے بعد دینی علوم کے متعلق مزید کتابی تعلیم کی کھجا جاتا تھا کہ ضرورت باقی نہیں رہتی، اس میں مشکوٰۃ کے ساتھ حدیث میں ہم صحاح ستہ کو بھی پڑھتے ہیں، فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں توضیح تلویح تفسیر میں بیضاوی، کاسمیک، ادب عربی کے لئے شرح ملائک صرف ادب کی کتابوں کے ساتھ تشریف نوحۃ العین، تحریری، کلیلہ و منہ، تاریخ عینی، اور نظم میں تنبی، حاشہ شریک، ہیں عربی سے اردو،

اردو سے عربی ترجمہ کے لئے بھی وقت نکالا گیا ہے اور معقولات، باعلوم دانش مندی میں فلسفہ کی حسد تک اگرچہ صرف میبذی ہے، لیکن دماغی تربیت اور ذہنی ورزش کے لئے منطق کی چھوٹی بڑی کتابوں کی کافی تعداد باقی رکھی گئی تھی، مختصر رسالوں، ایساغوجی، کمال اتول، مرقات، تہذیب اور مبسوط کتابوں میں شرح تہذیب قطبی، میر تقی سب کو باقی رکھا گیا ہے۔

چھ سال کی اس محدود مدت میں اس نصاب کو ختم کرانے کے لئے نقشہ میں سال بھر کے تعلیمی دنوں کی میزان کو پیش کر کے ہر دن اور ہر دن میں ہر سبق کے لئے کتنا وقت دینا چاہئے، تفصیل وار نقشہ میں ان ساری امور کا ذکر کے مدین کو ذرا دھیرا لایا گیا ہے کہ فلاں کتاب کو اتنی مدت میں ختم کرادیں۔

الغرض کوئی سوال اور کوئی پہلا ایسا نہیں ہے، جسے تشذجھڑ دیا گیا ہو، نقشہ کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہو کہ دس سال کی عمر میں بھی، دارالعلوم کے اس شش سالہ نصاب کو شروع کر کے سولہویں سال میں پڑھنے والے اس کو ختم کر سکتے تھے، اہل صرف خالص اسلامی علوم ہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کے موروثی مروجہ فنون سے بھی کافی مناسبت پیدا کر لینے کے بعد سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم اور علمی باتوں کو سیکھ کر یائیس تیس کی عمر میں گریجویٹ بن جائے گا کافی اور مختتم موقع پیدا کر دیا گیا تھا، یعنی آج بھی گریجویٹ بننے کی جو عام عمر ہے، کم و بیش اسی عمر میں سیدنا امام الکبیر کی مجوزہ تربیت کے مطابق باضابطہ مولوی اور مستند گریجویٹ بن جائے گا، قومی امکان، مسلمانوں کے سامنے آگیا تھا، دین اور اپنے آبائی سرمایہ کی ضمانت کے ساتھ باہر کی چیزوں سے استفادہ کی صلاحیت کے لئے مزید وقت دینے کی ضرورت قطعی طور پر باقی نہیں رہی تھی،

صحیح طور پر یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ اس تعلیمی نصب العین کے مطابق آئندہ عمل درآمد کی راہوں میں کیا رکاوٹیں پیش آئیں، کہ اس مختتم اوقتی امکان سے مستفید ہوئے کا موقعہ نہ مل سکا۔

دیوبند کے مقامی مدرسہ کو ہندوگیر خامہ کے طالب ہیں، ڈھالے لٹکی کو شمشوں میں بدترین ناسازگار ماحول میں جس کے عزم کی بے پناہ قوت سرگرم عمل تھی، چند ہی سال گزرے تھے، کہ اچانک ہندی مسلمانوں کو اس کی ناسوقی خدمات سے قدرت کی نامعلوم مصلحتوں نے محروم کر دیا، یعنی پچاس سال بھی

پورے نہیں ہوئے تھے کہ سیدنا امام الکبیرؑ کی اصل کئی پوری ہو گئی۔ یہ حادثہ واقعہ تو یہ ہے 'دارالعلوم کی تاریخ کا ایسا حوالہ گسل 'پوشش بر باحادثہ تھا کہ دیوبند کی یہ تعلیم گاہ باقی ہی کیسے رہ گئی 'اور گو جو کچھ ہونا چاہئے تھا 'مان لیا جائے کہ وہ نہ ہوا 'لیکن جو کچھ بھی ہوا 'حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ یہی کیسے ہو گیا۔ پہلے سال میں جس ادارہ کا میگزائیز (بحث) (۳۹۳) رد یہ تھا۔ آج قریب تریب پانچ لاکھ روپے کا بجٹ اسی ادارے کی مجلس شورے نے مجدادثہ منظور کر رہی ہے 'انڈس مدرسہ کی بنیاد قائم کرتے ہوئے قائم کرنے والوں کو یہ ایشیہ ستارہ تھا کہ

”پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آئیں گے یہ اصل پہلی روداد متعلقہ ۱۲۸۲ھ

آج اسی میں طلبہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزاروں بھی آگئے بڑھی ہوئی ہے 'اور جن کی اکثریت کی ہر جہتی ضرورتوں کا حائل خود مدرسہ ہے۔

بہر حال بظاہر یہ خیال تو یہی ہے کہ سیدنا امام الکبیرؑ کے تعلیمی نصب العین کے عثمانی نفاذ میں غالباً آپ کی وفات کا واقعہ زیادہ اثر انداز ہوا 'ہر شخص کے بس کی بات یہ نہ تھی کہ جس زمانہ میں مدرسہ قائم ہوا تھا 'اور جو ماحول اس عہد کا تھا 'اس میں اس "تعلیمی نصب العین" اور اس کے ثمرات و فوائد کا صحیح اندازہ لگا سکتا 'روداد میں مدح ہونے کے باوجود آپ کے اس "تعلیمی نصب العین" کا چرچا لوگوں میں بیدار نہیں کیا گیا 'حتیٰ کہ اس کا خیال بھی لوگوں میں باقی نہ رہا 'خود یہی واقعہ بتا رہا ہے کہ سوچنے والے کی بات شاید سوچنے والے کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

باقی اس زمانہ کا ماحول "جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں 'آج تو اس کا کھٹنا بھی دشوار ہے لیکن اس "ماحول" میں جو جی رہے تھے 'میں تو سمجھتا ہوں کہ بے چارے معذرت تھے تفصیل کا تو موقع نہیں ہے 'لیکن اجمالاً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند خصوصی موثرات کا ذکر کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کا مدرسہ سرزمین ہند میں جس وقت قائم ہوا تھا۔ اس وقت ایک طرف تو انگلشیہ کے نصاب کے پڑھنے پڑھانے والے حضرات تھے 'ان ہی کو علماء کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا 'دوسری طرف عام مسلمان تھے 'جن کے آباد اجداد مغل حکومت کی کشمیری و فوجی خدمات انجام دیتے تھے '

مولوی صاحب کا دستور تھا کہ ان سے پڑھنے والے طلبہ میں کوئی طالب علم کسی مسئلہ پر الجھنے لگتا اور ناہمی سے کام لیتا، تو مولوی صاحب کہتے ”دیکھو! اس کا چہرہ دریدہ بند کی طرف تو نہیں ہے، ظاہر ہے کہ یہ حال زیادہ دن تک قابل برداشت نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب میں دس نظامیہ کی ایک، عقول کی کتاب اپنے تمام منہیات و عاشی کے ساتھ اسی طرح بہ تدریج شریک ہوتی چلی گئی، جن کو خارج کر کے نصاب کو چھوڑنے کی حدود مدت میں ختم کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

اسی طرح دارالعلوم کی وردادوں میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے، شاید میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے، کہ فارسی ادب کی کتابوں کے دس کے اضافہ کو قرین مصلحت قرار دیا گیا، اور اسی سلسلہ میں گلستان بوستان کے ساتھ ابوالفضل، سکندرنامہ، انوار سہیلی، یوسف زلیخا، عبدالواسع، انشاء خلیفہ وغیرہ کتابوں کو بھی دارالعلوم کے درسی نصاب میں ہم شریک پاتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس سے ملک کے قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین کا کام لیا گیا۔

اسی کے ساتھ میرا ذاتی تاثر یہ بھی ہے، کہ اس شش سالہ نصاب میں بھی ادب عربی کی نظم و نثر اور ترجمہ کو داخل کر کے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سرکاری مدد اس کے جدید تعلیم یافتوں کے اس مطالبہ کی تکمیل کی گئی تھی، کہ انگریزی زبان پڑھنے والے انگریزی میں بولنے اور لکھنے کی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن مولویوں پر حیرت ہے کہ سالہا سال تک کہتے ہیں کہ انہیں عربی زبان ہی میں سب کچھ پڑھایا جاتا ہے، لیکن نہ ایک جلد وہ بول ہی سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ ہندوستان کے مولویوں کے لئے عربی بولنے یا لکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن چونکہ انگریزی پڑھنے والے انگریزی بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اس لئے ضرورت یہ ہے کہ عربی پڑھنے والے مولوی بھی عربی میں بول کر اور لکھ کر ہم کو دکھائیں۔ گو یا اس کاف کے بغیر جدید تعلیم یافتہ طبقہ مولویوں کو مولوی ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان ہی کے مطالبہ کی تکمیل عربی ادب کی کتابوں کو نصاب میں داخل کر کے کی گئی تھی۔ بہر حال اسی سہ عملی میں علم کا جو آشیانہ بن رہا تھا، قدرتا ہر ایک کا دباؤ اس پر پڑنا ہی چاہئے تھا،

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا تعلیمی نصاب کافی پختل اور عریض و طویل ہوتا چلا گیا، اسی نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صرف ہونے لگا، اور دینی تعلیم پانے کی وجہ سے عمر نائی کے آلات (ریش دروت) سے بھی کش کش کا سوتہ ان کے لئے باقی نہ تھا، حقیقت کے چہرے پر مجاز کی نقاب چڑھانے سے مذہباً وہ معذور تھے، ظاہر ہے کہ ایسی ہی دلاڑھیوں کے ساتھ سرکاری مدارس میں داخل ہو کر پڑھنے کی صورت ہی کیا تھی؟ اور یوں سیدنا الامام الکبیر کا تعلیمی نصب العین صرف ایک تاریخی نصب العین بن کر رہ گیا، عوام کے مطالبہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے، جس سے قطع نظر کر کے کام کرنا آسان نہیں ہے، اور نوادہ اسی شش سالہ نصاب میں، عربی ادب کی شرو و نظم اور ترجمہ کا کافی زور و نظر آتا ہے، میں تو نہیں سمجھتا کہ خالص اسلامی علوم (قرآن و حدیث فقہ و کلام وغیرہ) کی عربی عبارتوں کے سمجھنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر جیسے دیدہ و درحضرات نصاب میں اس غیر ضروری اضافہ کو اسی طرح ناگزیر قرار دیتے تھے، جیسے خفائی و واقعات سے جو نواقف ہیں، کچھ بھی بادل کئے ہوئے ہیں۔

ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو، لیکن اپنا ذاتی احساس یہی ہے کہ ادب عربی میں ناقص رہ جائے گا جو اعتراض جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے مولویوں پر کیا جاتا تھا، اس اعتراض کا ازالہ کر کے چاہا گیا تھا کہ مولویوں سے انگریزی خوان مسلمانوں کو مانوس بنایا جائے، یہی دیکھا بھی گیا کہ شروع شروع میں ان ہی مولویوں کو حسن قبول جدید تعلیم یافتوں میں حاصل ہوا، جنہوں نے کسی نہ کسی طرح عربی ادب کی ہمارت کا ثبوت اس زمانہ میں پیش کیا تھا۔ اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی درس نظامیہ کے معقولاتی مولویوں کے مقابلہ میں زیادہ رعایت نصاب مرتب کرنے والوں کے مد نظر تھی۔

آخر اگر یہ نہ مانا جائے تو پھر اس واقعہ کی کیا توجیہ کی جائے، کہ نظامیہ درس کی اکثر و بیش تر معقولاتی کتابیں خاموش کر دی گئیں۔ وہی کتابیں جن کے پڑھے بغیر نظامی درس کے مولویوں کا عام خیال تھا کہ طالب علم سطلی بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن عربی ادب کی ایسی کتابیں جن کے نام سے بھی شاید اس زمانہ کے نظامی مولوی عموماً واقف نہ تھے۔ مثلاً کلیدِ دمنہ، تاریخِ یمنی وغیرہ کا اضافہ شش سالہ نصاب میں کیا گیا،

اور کسی طرف سے کوئی مخالفانہ آواز مجلس شوریٰ میں نہیں اٹھائی گئی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ درس نظامی کی خارج خردہ عقولاتی کتابیں سیدنا الامام الکبیر کی زندگی ہی میں جیسا کہ رودادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، تدریجاً دارالعلوم کے نصاب میں مشرک ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ سطحیت کا الزام دامالعلوم کے فیض یافتوں پر نظامی درس کے عقولاتی مولویوں کی طرف سے جو مسلسل لگایا جا رہا تھا، اور طعن و تشنیع تو فیض و تضحیک کا جو طوفان اٹھایا گیا تھا، اس کا مقابلہ آخر تک کیا جاتا، لیکن بالآخر ہم اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ حلقہ دیوبند کے بعض ذمہ دار اکابر آخر وقت تک اسی پر اصرار فرماتے رہے، کہ قدیم فلسفہ کی کتابوں سے دامالعلوم کے نصاب کو پاک رکھا جائے۔ ان اکابر میں سب سے زیادہ نمایاں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات تھی۔ حضرت والا کی وفات کے بعد دارالعلوم کے مستقل سرپرست اپنی زندگی کے آخری دنوں تک آپ ہی رہے، مسلمانوں کے شاندار ماضی میں مولانا عہدیاں صاحب نے بھی آپ کی مخالفت کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ مکتب رشیدی میں حضرت گنگوہی کا خط مولانا صدیق احمد مرحوم کے نام جو پایا جاتا ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے متعلق مولانا صدیق احمد صاحب کے ایک خواب کی تعمیر درج کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا تھا کہ

”مگر دیوبند کے مدرسہ کے خواب کی البتہ ضرورت تعبیر ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس حقیر کا خیال ہر روز یہ ہے، کہ فلسفہ محض بے کار امر ہے، اس سے کوئی نفع مستد بہ حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ دو چار سال ضائع ہوں، اور آدمی خردماغ، غبی دینیات سے ہو جائے، فہم گج، و کوہ فہم شرعیات سے ہو جائے، اور کلمات کفریہ زبان سے نکال کر ظلمات فلسفہ میں قلب کو کدورت ہو جائے، اندر کوئی فائدہ نہیں“

اسی کے بعد یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”لہذا اس غی خبیث کا مدرسہ سے اخراج کر دیا تھا، چنانچہ ایک سال سے اس کی پڑھائی مدرسہ دیوبند سے موقوف کر دی گئی ہے“

آگے لکھا ہے کہ

”مگر بعض بعض مدرسین اور طلبہ کو خیال اس کا (یعنی فلسفہ کا) چلا جاتا ہے اور شاید خفیہ خفیہ درس

بھی اس کا ہوتا ہو گا مثلاً مکاتیب رشیدی

مکتوب گرامی کے آخر میں تاریخ رمضان ۱۳۱۲ھ کی درج ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جیسے شمس سالہ نصاب سے میبذی کے سوا فلسفہ کی ساری کتابیں اور مقالات کا سارا احوال دہرے کے تعلیمی نصاب سے سیدنا امام الکبیر کی زندگی میں خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد داخل ہونے کے بعد کچھ دنوں کے لئے پھر فلسفہ کی کتابیں مدرسہ بدر ہوئیں۔ لیکن مولویت کا اس زمانہ میں جو ماحول تھا اس نے پھر مجبور کیا اور کچھ ہی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں لوگ پھر وقت ضائع کرتے رہے اور آج تک ”امناعیت اذقات“ کا وہی سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ دارالعلوم کی تاریخ میں ”حقولانی کتبوں کی بے قدری“ اندے ثمری کا خیال ابتداء ہی سے شریک ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے کی حد تک ان کتابوں کو لوگ پڑھتے بھی رہے اور پڑھائے دے پڑھاتے بھی رہے، کافی وقت طلبہ کا اس میں صرف ہوتا ہے، لیکن حوصلہ شکن موردنی رہزایات بے اس توجہ و محنت سے اس فن کو محروم رکھا جس کی کوہ کندن، کاہ برآمدن کے اس شغل میں ضرورت ہے، ادیبوں ذہنی ورزش، فکری ریاضت کا فائدہ جیسا کہ سمجھا جاتا ہے عموماً طلبہ کو میسر نہ آ سکا۔ ضرورت سے زیادہ اور بہت زیادہ طول کلامی سے اس موقع پر مجھے کام لینا پڑا، لیکن کرتا کیا؟ سیدنا امام الکبیر کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں پر ادھل ہو چکا ہے۔ اس کو سمجھانا، دشنائی و خواہد سے دعویٰ کو مدلل کرنا اور سب سے زیادہ اہم بات یہ بھی کہ جب یہی چاہا گیا تھا کہ اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کر لینے کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا موقع مسلمان بچوں کے لئے فراہم کیا جائے۔ تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک نمونہ ”بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دارالعلوم پیش نہ کر سکا۔ یقیناً یہ کافی اہم اور دشوار سوال تھا۔ واقعات کی روشنی میں اس کا صحیح جواب اگر نہ دیا جاتا تو اس تعلیمی نصب العین کا سیدنا امام الکبیر کی طرف انتساب کا دعویٰ شاید

سیر اذاتی رجحان، یا صرف خوش اعتقادی بن کر رہ جاتا۔

بہت سے غنئی پہلو اور دقیق اسباب پھر بھی باقی رہ گئے، لیکن واضح اسباب جن کی وجہ سے آپ کا تعلیمی نصب العین بر روئے کار نہ آسکا۔ اور قدیم و جدید علوم واسنہ کے پیوند، و گراہ اندازی کی جو ہم آپ سر کرنا چاہتے تھے۔ افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم مان لینا چاہئے کہ اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ یہ تدریج جو حالات پیش آئے اور سلسلہ پیش آتے چلے جا رہے ہیں۔ جن کی ان پر نظر ہے، وہ یہ امید قائم کر سکتے ہیں کہ جو ہم اب تک سر نہ ہو سکی، اس کے سر کرنے کے لئے جس زمین کی ضرورت تھی، وہ بحمد اللہ چند در چند وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ تیار ہو چکی ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک اموا۔

یہ عجیب بات ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین یعنی خالص اسلامی، اور دانش مندی کے قدیم علوم سے فاسخ ہونے کے بعد، سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم و فنون کو حاصل کیا جائے اس نصب العین کے مطابق جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اپنی پوری تاریخ میں دارالعلوم دیوبند کسی صحیح نمونہ کی پیش کرنے سے اگرچہ اس وقت تک قاصر رہا ہے۔ لیکن ششہ میں عام دستار بندی کے لئے مشہور تاریخی اجتماع دارالعلوم دیوبند میں جو ہوا تھا، جس میں پہلی دفعہ دیوبندی علماء کے جلسے میں جدید تعلیم یافتہ کی

لئے میرا مطلب یہ ہے کہ نظامی درس کے مقررات کی ہوا بھی اکثر چکی ہے اور داخلہ و بار کے دفتر میں کی اولاد فارسی و عرب کی اس اہمیت کو بھلا چکی ہے جو صرف حدودی روایات کی پیداوار تھی، اہل بصیرت پر عربی زبان کی دونوں قسموں کی نوعیت واضح ہو چکی ہے، یعنی خالص اسلامی علوم (تقریباً حدیث و فقہ و فروع) کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کچھ جاننے کے لئے عربی زبان کے جس حصہ سے واقفیت کی ضرورت ہے، اسی حصہ سے بالکل مختلف ہے، جس کی ضرورت صرف ان ہی نوروں کو ہے جو عربی زبان کی جاہلی و اسلامی ادبی ذہنوں پر محدود حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسے قدرتی تغیرات ہیں، جن کی وجہ سے خالص اسلامی علوم کے نصاب میں کافی گنجائش اس بات کی پیدا ہو چکی ہے کہ جدید علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری مدارس میں داخل ہونے کیلئے بطور مقدمہ کے جن چیزوں کے کھانسنے کی ضرورت ہے، ان کو نصاب میں شریک کر کے قدیم و جدید علوم میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق رشتہ قائم کر کے نیکلے راہ درست کی جائے۔ خاکسار نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں مجائے اہمیت کے نظام تعلیم کی وحدت کا نظریہ جو پیش کیا ہے، اس میں بھی اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بعض ممتاز اور سربرآوردہ ہستیاں شریک ہوئی تھیں، علیگڑھ کالج، اب مسلم یونیورسٹی بن چکا ہے اس کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم گویا نمائندہ ہیں کہ اس جلسہ میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس وقت پھر وہی "قدیم و جدید علوم کے بیوند" کا سلسلہ چھڑا، اور چاہا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے بالکل برعکس ترتیب ہی کا اس سلسلہ میں تجربہ کیا جائے۔ یعنی جدید علوم و فنون کے گریجویٹوں کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کر کے اسلامی علوم و فنون کی تعلیم سے استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔ تجویز پاس بھی ہوئی، اور اس کے مطابق علیگڑھ کالج کے گریجویٹ درجہ بند کے مدرسین، ڈی شریک بھی ہوئے۔ لیکن نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ ناظم جمعیت العلماء مولانا سید محمد مہاں صاحب اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں یہ لکھتے ہوئے کہ:

"اس کا (یعنی اس تعلیمی ترتیب کا) ثمرہ نہایت تلخ تھا"

آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ:

پہلی مرتبہ جو علیگڑھ سے عربی حاصل کرنے کے لئے آئے وہ انگریز کے سی۔ آئی۔ ڈی تھے

جنہوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرانے میں دہلی دہشتی اور قوم پرستی کا حق ادا کر کے انگریز

بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا عہدہ حاصل کیا۔ ۱۱ حصہ پنجم

اب جب کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی زندان خاکی سے آزاد ہو کر اپنے سلف صاحبین تک

عزیز و مقتدر کے متعدد صدق میں پہنچ چکے، اور ان کا دشمن انگریز بھی ملک کو خالی کر کے جا چکا۔ اس "ثمرہ تلخ"

کی اجمالی خبر کی تفصیل ضرور ہے۔ جو ہر نا تھا، وہ ہو چکا، اور میں نہیں سمجھتا کہ جس تلخی کا تجربہ ہوا، سیدنا

الامام الکبیر کے نصب العین کے سکھوں کی ترتیب کا تجربہ آخر اس کے سوا کس ثمرہ کو پیدا کرتا، انسانی جبلت

کا یہ فطری قانون ہے، کہ نام عمری میں جس رنگ کو بھی پختہ کر دیا جائے، وہی پختہ ہو جاتا ہے۔ پختہ رنگ کا

ازالہ کر کے نئے رنگ کا چڑھانا آسان نہیں ہے۔ سیدنا الامام الکبیر کی حکیمانہ بصیرت نفسیات انسانی کو

اس مادہ کو تجربہ سے پہلے اگر نہ پالیتی تو اور کون پالتا۔

باقی میں نے افواہا ہی سنا ہے، اور مولانا سید محمد مہاں نے بھی لکھا ہے کہ سکھوں کی ترتیب کے

کے تجربہ کے ساتھ ساتھ تجربہ کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ دارالعلوم سے فارغ ہونے والوں میں سے بھی انتخاب کر کے جدید علوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگوں کو علیگڑھ بھیجا جائے۔ گویا دوسرے لفظوں میں سیدنا امام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے تجربہ کا بھی کہا جاتا ہے کہ ارادہ کیا گیا تھا۔ مولانا سید محمد میاں صاحب نے جو ارتقا فرمایا ہے کہ

”صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے تجربہ پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علیگڑھ کالج انگریزی پڑھنے جایا کریں“ ۱۱

اس کا مطلب یہ ہے، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، ترتیب معکوس کا عملی تجربہ تو یقیناً کیا گیا، شاید دارالعلوم میں ایک سے زیادہ گریجویٹ، یا انڈرگریجویٹ حضرات شریک کر لئے گئے، اور اپنی بے سرو سامانی کے باوجود میرا علم یہی ہے کہ ان میں بعضوں کو دروس سے اعداد (تعلیمی وظیفہ یا خوراک وغیرہ) کی مشکل میں دی گئی۔ لیکن علیگڑھ بھی دیوبند سے اپنے خرچ یا کالج کے خرچ پر کوئی بلا یا گیا، شاید ایسی کوئی صورت عملاً پیش نہ آئی، کاش! ایک دو نمونے بھی سیدنا امام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق تیار ہو جاتے، تو شاید معکوس ترتیب کے تجربہ کی تلخیوں کی تلافی کی کوئی صورت نکل سکتی تھی، لیکن یہ مسئلہ

خداوندان نعمت ما کریم نیست

گرمیاں را بدست اند درم نیست

کے جموں ہی میں جموں رہا، اور آج تک جموں رہا ہے۔

بہر حال دارالعلوم کے تعلیمی نصاب پر سیدنا امام الکبیر کے تعلق سے جو کچھ کہنے کی ضرورت تھی، آپ اسے پڑھ چکے، البتہ اسی سلسلہ میں حضرت جلالا کے رفیق الدین والد آخرہ مولانا گنگوہی کے گرامی نامہ سے فلسفہ کے متعلق جو الفاظ فعل کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو کچھ زیادہ درشتی اور سختی ان الفاظ میں محسوس ہوئی ہو۔ لیکن جب یہ سوچا جاتا ہے، کہ خواہ کتابوں میں ”فلسفہ“ کی فنی تعریف کچھ بھی کی جاتی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ کائنات کے متعلق انسانی فطرت میں

بنیادی سوالات جو پینا ہوتے ہیں، ان سوالوں کے حل کی قدرتی راہ، یعنی وحی و نبوت سے بے نیازی اختیار کر کے جانے بغیر اپنے اپنے زمانہ کے چرب زبانوں نے خود تراشیدہ دوسو سوں کے جس مجموعہ کو فرض کر کے مشہور کر دیا کہ یہی ان بنیادی سوالوں کا صحیح جواب ہے، اسی کا نام ”فلسفہ“ رکھ دیا گیا، چونکہ ان جوابوں کا تعلق حقائق و واقعات سے نہیں ہوتا، بلکہ مفرد تضاد ہام سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں ہوتے، اسی لئے مقبول ہونے کے بعد تھوڑے تھوڑے دنوں پر ہر زمانہ کا فلسفہ مسترد ہوتا رہا ہے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے، اور اب بھی ہو رہا ہے، آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے دس نظامیہ کے تدریسی حلقوں میں فلسفہ کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ اس زمانہ میں جس میں حضرت تگلو ہی نے یہ خط لکھا ہے، قطعی طور پر مردود ہو چکا تھا۔ لیکن ہمارے علماء محض سرورشی روایات کے زیر اثر اسی مرحوم مدفن فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے چلے جا رہے تھے، آپ ہی بتائیے کہ طلبہ کا قسمی وقت اور عمر کا گرانایہ حصہ ایک ایسے مہل مشغلہ میں جو برباد ہو رہا تھا، اس پر بشیدہ دماغوں کو جتنا بھی غصہ آئے، کم تھا۔ دین کے لئے فلسفہ کے مطالعہ کی ضرورت صرف اس لئے ہوتی ہے کہ فلسفہ کی راہ سے خام عقول کو جن منالطوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، ان کا ازالہ کیا جائے۔ اس لحاظ سے بجائے اس مسترد اور مردہ فلسفہ کے کچھ ضرورت تھی تو اس بات کی کہ اس زمانہ میں ”فلسفہ“ کے نام سے جن خیالات کو حسن قبول حاصل ہو رہا تھا، جو ظاہر ہے کہ مغرب کا جدید فلسفہ ہی ہو سکتا تھا، لیکن اس کی طرف نظامی دس کے معقولی علماء نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت والا کے منشاء کے مطابق یہ رشتہ اگر قائم ہو جاتا، تو بجائے اس مردہ فلسفہ کے یورپ کے ”جدید فلسفہ“ کے مطالعہ کا موقع ہمارے علماء کے لئے آسانی

لے یعنی یہ کائنات جن میں انسان بھی شریک ہے کیلئے، اس کی ابتدا کیلئے انتہا کیا ہے۔ اس کا مدعا کیلئے یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جن کے صحیح جوابوں کا علم حاصل کئے بغیر عالم کا یہ سامان نظام صرف گونجے کا ایک خواب بن کر رہ جاتا ہے۔ مذہب یا دین درحقیقت ان ہی سوالوں کے ان جوابوں کا نام ہے، جو وحی و نبوت کی راہ سے بنی آدم میں پیچھے ہوئے ہیں۔ وحی و نبوت کے سوا ان سوالوں کے حل کا کوئی علمی ذریعہ آدمی کے

میسٹر آسکتا تھا، اور اس وقت قبل سیدنا الامام الکبیر دنیا دیکھ سکتی تھی کہ علماء کی علمی استعداد کسی ہوتی ہو کچھ بھی ہو، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ مکتوب الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ علماء دیوبند کی ”عقلی علوم“ کے درس و تدریس، مطالبہ و مذاکرہ کے مخالف تھے۔ صحیح نہ ہوگا۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ مطلقاً عقلیات کے اگر وہ مخالف ہوتے تو شش سالہ انصاب میں بھی نصف درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں منطق کی کیوں باقی رکھی جاتیں۔ اور مفتی مبارک علی صاحب حال نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند براہ راست مولانا سید برکات احمد بہاری ثم ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر جس قصہ کے راوی ہیں۔ یعنی مولانا برکات احمد مرحوم مفتی صاحب سے فرماتے تھے، کہ آج فلسفہ اور منطق کے درس و تدریس میں غیر معمولی شہرت مجھے جو حاصل ہوئی ہے، اس کو میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت سمجھتا ہوں، کہتے تھے کہ بچپن میں ایک دفعہ اپنے والد مرحوم حکیم مولانا دایم علی خاں صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، میرے والد نے حضرت والا سے استدعا کی کہ اس بچے کے لئے دعا فرمائی جائے، مولانا برکات احمد صاحب کا بیان ہے کہ

”حضرت مولانا نانوتویؒ کی زبان سے بے ساختہ نکلا، کہ اللہ تعالیٰ اس کو علم مقبول میں کمال عطا فرمائے“

سننے کے ساتھ کہتے تھے کہ میرے والد حکیم دایم علی صاحب نے عرض کیا کہ

”حضرت نے یہ کیا دعا فرمائی، میری تمنا تو یہ ہے کہ اس کو فقہ اور دین کا علم حاصل ہو“

مفتی صاحب کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے جو کچھ فرمایا تھا، الفاظ تو یہ یاد نہیں رہے، لیکن مولانا برکات احمد صاحب کی روایت کے مطابق خلاصہ اس کا یہی تھا کہ فقہ کے اس زمانہ میں

”دین پر قائم رہتے علم مقبول حاصل کئے بغیر دشوار ہے“

لے مفتی مبارک علی صاحب دام مجدد نے اپنے ایک نفاذ نامہ میں جو فقہ کے نام انہوں نے لکھا تھا باقی لکھی

گو یا خود "دین" پر استقامت کے لئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ "عقلیات" کے مطالعہ کی ضرورت محسوس فرماتے تھے اور کسی ضرورت کہ علم دین کے طالب کو عقلیات کے مطالعہ کا صرف مشورہ ہی نہیں دیا جانا تھا بلکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دعا تک اسی کیلئے کی گئی۔

ادارہ رویت توفیق مہارک علی صاحب کی ہے، خود "صاحب البیت" حضرت نانوتوی کے تحت جگر فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سے براہ راست خاکسار نے جو قصہ "انگریزی زبان کے سیکھنے کے متعلق سنا ہے۔ اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں تفصیلاً اس قصہ کو درج کر چکا ہوں، حاصل جس کا یہی ہے کہ حج کے سفر میں سیدنا الامام الگسیر جہاز کے کسی یورپین کپتان نے مذہبی سوالات کئے جن کا جواب "ترجمان" کے ذریعہ دیا گیا، کپتان آپ کے جوابوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ ہندوستان آئے گا موقع ملا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوگی، حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مولانا نانوتوی نے اس کے بعد عزم کر لیا تھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد

اگلے صفحہ سے، اس روایت کا تذکرہ فرمایا ہے یہ بھی اسی خیال سے کہ حکیم صاحب قبلہ نے نظام سروج اس قصہ کو جس مجلس میں بیان کیا تھا، اس میں مفتی صاحب کے ساتھ حکیم فضل الرحمن ٹوکی بھی تھے جو مولانا برکات احمد کے خاص تلمذ ہیں سے ہیں، تو کہا جاسکتا ہے کہ خبر آبادی خاندان کی عقلیت کا چراغ آخر دنوں میں مولانا برکات احمد صاحب ٹوکی رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں جو روشن رہا، پس پردہ بانی دارالعلوم دیوبند کی دعا ہی سے اسے اسادہ ملی تھی، اس سلسلہ میں قدرتنا حضرت مرشد تھانوی کا وہ قول یاد آتا ہے خود بھی فرماتے تھے کہ ہم تو جیسا بخدا کی مطالعہ میں (جو بگھتے ہیں) میرزا ہاد احمد عام کے مطالعہ میں بھی دیکھا ہی (جو بگھتے ہیں) (دارالعلوم ماہیج الاول ۱۳۳۵ھ) وہ اپنے استاد دارالعلوم دیوبند کے صدر مولانا محمد یعقوب صاحب علماء دیوبند کے استاذ اساتذہ کا یہ قول بھی دہریہ نقل فرماتے تھے کہ "ہم کو تو امید ہے کہ جیسے بخدا کی مدد کے پڑھائے ہیں ہم کو قرآن ملتا ہے، ایسے ہی فلسفہ کے پڑھائے ہیں بھی ملے گا" آخر میں فرماتے کہ "ہم اعانت فی الدین کی وجہ سے فلسفہ کو پڑھنے پڑھانے میں (قصص الکاکابر)، اور صرف فلسفہ ہی نہیں، بلکہ حضرت مولانا یعقوب کا مذاق مطالعہ کے باب میں کتنا وسیع تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، فرمایا کرتے تھے، کہ "میاں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو، تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہئے، اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی" (قصص)، سچ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الگسیر کی کتابوں کا مطالعہ صحیح معنوں میں ہی کر سکتے ہیں اور دہریہ ان کی تصنیفات سے مستفید نہ ہو سکتے ہیں، جنہوں نے کسی نہ کسی حد تک عقلی علوم کا مطالعہ کیا ہو۔

ہندوستان پہنچکر میں خود انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کروں گا۔ حضرت نانوتویؒ کا احساس تھا کہ ترجمان کے بغیر راہ راست تقریر سے پاکستان زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔

مطلب جس کا یہی ہو سکتا ہے کہ دوسروں تک دین کی دعوت کو پہنچانے کیلئے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی حضرت والا نے اپنے ”دینی مجاہدات“ کی فہرست میں شامل کر لیا تھا اور حج سے واپسی کے بعد ہی آپ کا وقت پورا نہ ہو جاتا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کا یہ عزم پورا ہونے سے رہ جاتا۔

آپ ہی بتائیے کہ ”مذکورہ بالا مسلمات“ جن کا ذکر متن اور حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ ان سے وقف ہونے کے بعد کیا علماء دیوبند کی طرف ”تنگ نظری“ کے الزام کے عائد کرنے کی اب بھی کوئی جرات کر سکتا ہے۔ مولانا سید محمد میاں نے اپنی کتاب ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

”جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں حضرت کو بھی کمال حاصل تھا، کسی فن کی کوئی کتاب علیٰ ہر کوئی شروع سے آخر تک ایک بار ضرور مطالعہ فرمایا“

یہ اطلاع بھی دی ہے

”آپ نے بعض مخصوص غلامہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی“

غالباً جدید سائنس یہ وہی ابتدائی کتاب ہے جسے بیروت کی یونیورسٹی نے عربی زبان میں تالیف کر کے شائع کیا تھا، یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

”اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہئے“

۲۲۲ حصہ پنجم

جتنی مدت دارالعلوم دیوبند کے قیام پر اب تک گزر چکی ہے۔ اس کے اول وسط آخر ہر دور میں اس تعلیمی ادارہ سے تعلق رکھنے والی ذمہ دار ہستیاں اپنے جن احساسات و تاثرات کو ظاہر کرتی رہی ہیں چاہئے تو یہی تھا کہ ان کے مطابق کچھ عملی نوئے بھی پیش ہوتے۔ لیکن ایسا کیوں نہ ہوا۔ اس کا کیا جواب دیا جائے؟ مسلمانان ہند کے تقدیری کرشموں میں اس کو بھی شامل کر لیجئے۔

ایک یہی کیا، دارالعلوم دیوبند کو ہندو گیر جامعہ بنانے کے لئے، یہی نہیں کہ ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے طلبہ کو مدرسہ میں داخل کر کے ملک کے ہر حصہ میں بھیلانے کا کام چوکایا گیا، اور مجدد اللہ اس کا سلسلہ اس تک جاری ہے، اس کے سوا بھی جہاں تک میرا خیال ہے، سیدنا امام الکبیر کے زمانہ میں جس کوشش کا آغاز ہو چکا تھا، کہ کچھ بھی اس کو آگے بڑھانے کا ارادہ کیا جاتا، تو غالباً ہندوستان کی عام یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں دیوبند ہی کا جامعہ ایسا جامعہ بن جاتا، جس کی براہ راست نگرانی میں بے شمار مدارس ہر صوبہ اور صوبہ کے ہر ضلع، ضلع کے ہر تعلقہ میں چاہئے تو یہی تھا کہ قائم اور جاری نظر آتے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند میں مدرسہ کے قیام کے کل دو سال بعد اس قصبہ کے ضلع کا جو صدر مقام تھا، یعنی سہانپور، وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی، ۱۲۹۲ھ کی روداد میں سیدنا امام الکبیر کی جو تقریر حلیہ تقسیم اسناد و انعام میں ہوئی تھی، اسی تقریر میں سہانپور کے اسی عربی و درنی مدرسہ کا ذکر فرماتے ہوئے، ارشاد ہوا تھا،

”مخدوم العلماء و مطاع الفضلاء مولانا سادات علی سہانپوری مرحوم کو خیال مدرسہ میں کے باحث اہل سہانپور سے مکرمات باندھ کر دوسرا چشمہ فیضی ظلم برپا کیا۔“
اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا تھا،

”آج وہ مدرسہ اس مدرسہ کی ہم جہت ہے۔“

ہم جہت کی تشریح اسی کے بعد ان الفاظ میں کی گئی تھی،

”غرض اصلی اس مدرسہ سے بھی یہی تعلیم علوم دین ہے۔ گویا یہ دونوں ایک دریا کے دو گھاٹ ہیں، جن پر ہزاروں تشنہ لب آتے جاتے ہیں، اور اپنی لیاقت کے موافق اپنا حصہ لے جاتے ہیں، اس نعمت غیر مترقبہ کا شکر کس زبان سے کیجئے۔“ روداد ص ۱۱ بابت ۱۲۹۶ھ

اور ایک سہانپور ہی کی خصوصیت نہیں ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ دیوبند میں قیام مدرسہ کے بعد روہیل کھنڈ کی متعدد چھوٹی بڑی آبادیوں میں تدریجاً عربی مدارس کے گویا حال ہی ایسا معلوم ہوتا ہے،

بچے چلے جاتے ہیں۔ منظر نگر، مراد آباد، رڈ کی، خود، منگلور، نگینہ وغیرہ میں آگے پیچھے مدرسے جو قائم ہوئے، اور مجدد افسر اس وقت تک ان میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی شکل میں اب تک باقی ہیں، ان کی تاسیس زیادہ تر سید نالامام البکیر رحمۃ اللہ علیہ کے چشم دایرہ کے اشاروں ہی کی رہیں منت ہی سے قائم ہونے والے ان مدرسوں کے ساتھ حضرت والا کے غیر معیاری تعلق و توجہ کی نوعیت کیا تھی، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ نگینہ میں عربی کا مدرسہ جو قائم ہوا تھا، اور صدارت کیلئے حضرت والا ہی نے اپنے تلمیذ شدید مولانا فخر الحسن گنگوہی کا انتخاب فرمایا تھا، کچھ دن بعد اپنے ایک خط میں مولانا فخر الحسن مرحوم نے حضرت نافو قویؒ کو خبر دی کہ مدرسہ باشندگان نگینہ کی پڑاویوں کا شمار بڑھتا چلا جا رہا ہے، شاید یہ بھی لکھا کہ ان حالات میں اب میرا قیام نگینہ میں مشکل ہے، اسی کے جواب میں حضرت والا کے قلم سے جو الفاظ نکلے ہیں، انہیں پڑھئے، جو اب کی زبان جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا، غلطی تھی، ارقام فرمایا گیا تھا کہ

”باقی باطلاع تزلزل بنا مدرسہ نگینہ بدو وجہ رنج دادم، کیے از طرف آن عزیز، دوم از طرف اہل نگینہ، کہ چہ کم حوصلگی کردند“

لہجہ اس کے بعد کافی تند و تیز ہو جاتا ہے، بے ساختہ نوک قلم سے یہ فقرہ نکل پڑا ہے۔

”آئیے ہر قسم کے بے سابقہ جدوجہد و جدی رسد ناقہ درشتناں، بہین سان ضائع ہی کنند“

بے عین ہو کر اپنی تکلیف کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا

”یارب! ایں چہ زمانہ است کہ از شرفاء فہم برگرفتند“

آخر میں نگینہ کے ان ہی شرفاء کے مرض کی تشخیص ان الفاظ میں فرماتے ہوئے کہ

”چوں بنظر غمہ بنگرم، این ہمہ نیرنگیہا رہے نیازی ست، صدق مولد الکرم“ یرفع

العلم“

مطلب یہی ہے کہ مجدد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے علم کا جو نیا اہمیتی سرمایہ مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا، اس کی ضرورت کا احساس لوگوں میں باقی نہیں رہا ہے، اس لئے باوجود کیا گیا ہے کہ مسلمان علم کو

اس نبوی سراپہ سے بے نیاز اور مستغنی ہونے کے ہیں۔ مشہور حدیث جس میں بیشکونی کی گئی ہے کہ وقت ایسا آئے گا کہ نبوی سراپہ کے گائے نبوت کی مادے سے علم کی جو دولت ان کو ملی تھی دینے والا اس کو واپس لے لے گا، وہی بیشکونی پوری ہو رہی ہے، گو یا علم ہی مسلمانوں کو چھوڑ رہا ہے، لیکن وہ سمجھ رہے ہیں، کہ ہم اس کو چھوڑ رہے ہیں۔ آخر میں نگینہ دلوں کو اسی خط میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ

”بظاہر چنان ہی فائدہ کہ اگر اس خوانِ نعمت را از نگینہ خواہند برداشت باز نخواہند گسترانید
انائندہ وانا الیہ راجعون“ ۱؎ مکتوب یا زوہم (مجموعہ قاسم العلوم)

شاید یہی دھمکی کارگر ثابت ہوئی، اسی کا نتیجہ ہے کہ مدت دراز تک نگینہ کا یہ مدرسہ قائم رہا، ان نگینہ دلوں کسی نہ کسی طرح اس کو چلا تے ہی رہے۔

بہر حال قصبہ دیوبند کے سوا قرب و جوار کی چھوٹی بڑی آبادیوں میں مدرسے جو قائم ہو رہے تھے، آج تو عمر نیا یہ مدرسے جدا گانہ ہستی، اور مستقل وحدت کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن قدیم رودادوں کے جائزے سے اس کا انکشاف ہوتا ہے، کہ کافی مدرسے ان میں ایسے بھی تھے، جو یا ضابطہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ اسی طرح ملحق تھے، جیسے جدید عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کے ساتھ مختلف شہروں میں قائم ہونے والے کلیات اور کالج ملحق ہو کر رہتے ہیں۔ ان الحاقی تعلیم گاہوں کی تعلیم و نصاب مدرسین کا تقرو، ان کے امتحانات، ان کی آمد و خرچ کا حساب و کتاب، یہ اور اس قسم کے سارے متعلقہ امور پر براہ راست دارالعلوم کی نگرانی قائم تھی، دستور یہ بھی تھا کہ دارالعلوم کی سالانہ روداد کے ساتھ ان الحاقی مدارس کے نتائج امتحانات، آمد آمد و خرچ کے حسابات بھی بطور ضمیمہ الترتیباً شریک ہو کر شائع کئے جاتے تھے، ۱۲۹۳ھ یعنی قیام دارالعلوم کے گیارہ سال بعد پرانی رودادوں میں ایک جدید عنوان یہ ملتا ہے، یعنی

”ذکر مدارس شاخہائے مدرسہ اسلامی دیوبند“

پہلی دفعہ ۱۲۹۳ھ کی روداد میں اس عنوان کے نیچے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

اس مدرسہ کی چند شاخیں بھی بعض اہل اسلام کی ہمت سے جاری ہیں ۲؎

اس اجمال کی تفصیل یہ کی گئی ہے کہ

”مبجلہ ایک انیسٹھ پیرزادگان، ضلع بہار، بیرون اور دو تھانہ بھون ضلع مظفرنگر، ایشیہ مظفرنگر میں اور ایک گلو دھمی، ضلع بلند شہر میں ہے۔“

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نئے قائم ہونے والے عام مدارس میں سے دس گیارہ سال کی مدت میں پانچ مدرسے تو ایسے تھے جن کا باضابطہ قانونی شکل میں الحاقی مرکز یعنی دارالعلوم سے ہو چکا تھا، آگے ہر مدرسہ کے متعلق تفصیلی طور پر بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کس مدرسہ میں امتحان لینے کے لئے مرکز نے اپنے یہاں کے کن کن مدرسین کو بھیجا۔ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی، اس کا پتہ اسی سے چلتا ہے، کہ بجائے عام مدرسین کے عموماً امتحان لینے کے لئے دارالعلوم کے صدر اول مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس تشریف لے جاتے تھے، ۱۲۹۳ھ کی روداد میں گلو دھمی کے مدرسہ کے متعلق لکھا ہے کہ

”مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول نے بھراہی، مہتمم مدرسہ دیوبند اس مدرسہ کا امتحان لیا،
اسی طرح انیسٹھ کے مدرسہ کے امتحان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”اس مدرسہ کا امتحان سالانہ بھی جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول مدرسہ دیوبند
نے لیا۔“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی، بلکہ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اطلاع کے عنوان سے الحاقی مدارس کے تذکرے کے بعد ایک اعلان بھی شائع کیا گیا تھا، جس میں درج تھا کہ ”ادب و مشارکت مدرسہ دیوبند کے نزدیک جن کے سپرد ادب ان مدارس (یعنی الحاقی مدارس) کا امتحان وغیرہ رکھا گیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اگر ہمتان شاخہ لئے مذکور اپنے اپنے مدارس کے چند سے تھوڑی تھوڑی امداد فرمائیں، تو ان مدارس کے امتحان اور نگرانی تعلیم کے لئے ایک گروہ اہم مقرر کیا جائے، جو ماہوار یا دوسرے مہینے جیسا کہ اتفاق پڑے، ان مدارس کا امتحان لیا کرے، اور جو کسی قسم کی ابتری یا خرابی دیکھا کرے، تو اس کے دہ کر نیکی

حسب رلئے مہتمان اس کی تدابیر کیا کرے ؟ ص ۱۴۱

اس کا پتہ تو نہ چلا کہ الحاقی مدارس کے مہتمموں پر اس اعلان اور مشورہ کا رد عمل کیا ہوا، لیکن بہر حال اس سے سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کا ایک ایسا پہلو تو سامنے آتا ہے، جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سرکاری مدارس کی نگرانی کے لئے جیسے انسپکٹروں کا تقرر علیہ مرت کرتی تھی، چاہا جاتا تھا کہ اس کے مقابلہ میں آزاد تعلیم کا مرکزی نظام قائم کر کے اس آزاد نظام تعلیم کے تحت چلنے والے مدارس کی نگرانی کیلئے بھی مرکزی دارالعلوم کی طرف سے بھی انسپکٹروں کا تقرر کیا جائے، اسی لئے خواہش کی گئی تھی، کہ ہر الحاقی مدرسہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ مرکزی خزانہ میں داخل کرے۔

اس سلسلہ کی ایک دل چسپ خبر ان ہی رودادوں میں یہ بھی درج کی گئی ہے، کہ مشہور قصبہ کیرانہ میں بھی مدرسہ قائم کر کے مرکز سے اس کا الحاق کیا گیا تھا۔ عام چندے کے علاوہ وہاں کے باشندوں سے آمدنی حاصل کرنے کی یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی، جو روداد میں یوں لفظ درج ہے، کہ

”یہاں کے وقف میں چاہ بکثرت ہیں، اگر سرچاہ ایک من غلہ مقرر کیا جائے تو بہتر ہے چنانچہ اس پر اکثر اصحاب راضی ہو گئے ہیں“ ص ۱۴۲ روداد

اس تجویز کا ذکر کر کے دارالعلوم کی روداد میں باشندگان کیرانہ کو توجہ دلاتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ ”اگر یہ بات چل نکلی، تو پھر دیکھو کہ اس مدرسہ کا کام کس خوبی سے چلتا ہے اور کیسے کیسے پھل پھول گئے ہیں“

آخر میں یہ لکھتے ہوئے کہ ”اب خدمت میں جملہ رؤساء قصبہ کیرانہ، ذرا ح کیرانہ عرض ہے“ یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ

”علم سکھو سکھاؤ، کہ علم ہی دونوں جہان کی کنجی ہے“ ص ۱۴۳

الغرض الحاقی مدارس کی آمدنی سے جہاں چاہا گیا تھا، کہ مرکزی دارالعلوم کے خزانہ میں حصہ بہت بڑا تھا، اس سلسلہ کی کچھ داخل کریں، وہیں ان الحاقی مدارس کی امداد پر بھی لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ سرکاری مدارس کو حکومت اور حکومت کے خزانہ کی پشت پناہی حاصل تھی، اور

میاں جو کچھ بھی تھا، سب کا دار و مدار رضا کارانہ خدمات پر تھا، سیدنا امام الکبیر کے بعد مرکز ثقل پر جمع کرنے والی قوت باقی نہ رہی، نئے مدارس کا الحاق تو آپ کے بعد کیا عمل میں آتا۔ اپنے الحاق کو تو تعلیم کا ہیں منظور کر چکی تھیں، بہترین معیار پر چلے جاتے ہوئے دارالعلوم سے ان کا رشتہ بھی اتنا کمزور ہو گیا، کہ اب رسمی تعلق سے زیادہ شاید ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔

بہر حال تاسیس دارالعلوم کے ابتدائی سالوں ہی میں انصیب العین سامنے تھا کہ سامنے ہندوستان کے مناسب مقامات پر قومی خزانہ سے درجی تعلیم گاہوں کا جال اسی طرح بچھا دیا جائے، جیسے حکومت کے خزانے سے دنیاوی مدارس ہر جگہ کھولے جا رہے تھے۔ آپ کو مدرسہ کے تیسرے سال یعنی ۱۳۲۷ء ہی کی روداد میں یہ عبارت مل جائے گی، ”روداد کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے دعاؤں و مشکریہ کی سرخی قائم کر کے منجملہ دوسری باتوں کے یہ اطلاع درج کرتے ہوئے کہ

”نہایت خوشی اپنی ظاہر کرتے ہیں۔ اس امر پر کہ اکثر حضرات باہمت نے اجراء مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقامات مختلفہ دہلی و میرٹھ و خوجہ و بلند شہر و سہارنپور دکن وغیرہ جاری فرمائے، اور دوسری جگہ مثل علیگڑھ وغیرہ اس کا خرچہ کی تجویز ہی ہو رہی ہیں“

آخر میں جاسمائی نصب العین کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ

”امید کرتے ہیں، کہ ہم کو بھی وہاں کے حالات و حساب و کتاب سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں کے ہمت کرتے ہیں، مطلع فرماتے رہیں، تاکہ جو عمدہ انتظام ان کے مدارس میں تبصر ہو، وہ یہاں بھی جاری کئے جاسکیں، اور یہاں سے وہاں، اور نتیجہ اس نیک تدبیر کا یہ ہوگا، کہ انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جائے گا۔“

دارالعلوم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے خاکسار جب وہاں تعین تھا، آج سے تیس چالیس برس پہلے کی بات ہے اس وقت تک اتنا اثر باقی تھا کہ چند خاص مقامات کے مدرس خصوصاً بڈی، بانس برلی، گنبد و غیرہ کے مدرسوں سے ہر سال چند ممتحن کو طلب کیا جاتا تھا، کبھی کبھی خاکسار بھی جاتا تھا۔ دانش و علم بالصور اب یہ رسم قدیم باقی ہے، یا یہ بھی ختم ہو گئی، اس کا تشابہ بھی باقی ہے، اہ اس میں وسعت بھی ہو گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہ،

آخری الفاظ یہی "انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جاویں گے" اسی کو میں جاسماتی نصب العین کہتا ہوں۔

قومی سرمائے سے چلنے والے مدارس کو نظم و ضبط کے وعداتی قالب میں ڈھال دیا جائے، اس دعوے کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ واضح شہادت اور کیا مہیا ہو سکتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتداری قوت کی پشت پناہی سے محرومی کا احساس کیے اسی پر لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا کہ بجائے لاگ ڈانٹ اور قیبانہ تعلقات کے قومی مدارس میں ربط و ضبط کے مراسم ہی کو باقی رکھا جائے، اور تعلیم کا کویشن کرے کہ جس مدرسہ میں مفید طریقہ کار اختیار کیا جائے، بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری کے دوسرے مدارس بھی اسی کو اختیار کریں۔

اب یہ واقعات ہی بتا سکتے ہیں کہ کرنے والوں نے کس حد تک ان قیمتی مشوروں اور تجویزوں پر عمل کیا۔ پیش کرنے والا وہ سب کچھ پیش کر کے جاچکا تھا۔ سوچو والوں کو وہ سوچھایا نہ سوچھا، ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری ان ہی لوگوں پر عائد ہو سکتی ہے، جن کے ہاتھوں میں ذہنی قیام کی باگ آئندہ سرزمین ہند کے ان مدارس کی آئی۔

تعلیم ہی کے سلسلہ میں ایک نئے اقدام کا پتہ ان ہی پرانی رودادوں سے چلتا ہے، مشکل کے حل ہو جانے کے بعد تو اب اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہیں ہو سکتا، لیکن جس زمانہ میں یہ اقدام کیا گیا تھا، تعلیمی و تدریسی نقطہ نظر سے شاید وقت کا وہ نازک ترین مسئلہ تھا۔

مطلب یہ ہے کہ مطابح اور پریس سے پہلے مسلمانوں میں ایک مستقل نظام "نقل کتب" کا قائم تھا، میں نے اپنی کتاب "مسلمانوں کے نظام تعلیم: تربیت" میں اس مسئلہ کے متعلق کافی معلومات جمع کر دی ہیں۔ حاصل یہی ہے کہ شہروں اور قصبوں تک میں "ذرائعیت" اور "نفاذیت" یعنی کتابوں کو نقل کر کر کے بیچنے والوں کا ایک گروہ پایا جاتا تھا۔ جو نادری نادر کتابوں کے متعلق اپنے پاس معلومات رکھتا تھا، کہاں آتی ہیں۔ ان کی نقل کس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے، ان امور کی واقفیت کے ساتھ اس کا سامان کئے رہتا تھا کہ فرمائش کے ساتھ ہی ضرورت مندوں تک وہ کتاب نقل کیے پہنچا دی جائے، معتدل قیمتوں پر

بڑی سے بڑی کتابیں بآسانی ان دفتروں اور نشاؤں کے ذریعہ سے مہیا ہو جاتی تھیں، اندازہ کے لئے یہی کافی ہو سکتا ہے، کہ جہاں قرآن مجید کا ہر پانچ پانچ سو تک بھی تھا، وہیں صحیح ناریخی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہے، کہ عام معمولی نسخہ ایک ایک ٹنگہ (دوبیر) میں بھی مل جاتا تھا، جو شاید آج بھی قابل تصور مشکل ہی سے ہو سکتا ہے، اسی کتاب میں مدد اس کے شہور انگریزی روزنامہ "ہندو" کے حوالہ سے آپ کو یہ نوٹ بھی ملے گا، یعنی ہندوستان میں پریس کا رواج کب سے ہوا، اس کا یہ جواب دیتے ہوئے کہ "ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۷۵۷ء میں چھپ چکی تھی۔"

گویا آج سے تقریباً چار سو سال پہلے ہی طباعت کا رواج حالانکہ اس ملک میں ہو چکا تھا، مگر باریک بینی سے لکھا ہے کہ

"ملک کے مختلف حصوں میں چھاپے خانے بہت کم کھل سکے۔"

جس کی وجہ دی یہ بیان کرتا ہے کہ

"ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ترقی میں سست رفتاری کی ایک وجہ تھی کہ شہر کتابوں کی نقل کیلئے خطاطوں کا انتظام مغلوں نے کر رکھا تھا۔" (اخبار ہندو مدد اس ۱۷۴۳ء ۶۱)

مغلیہ عہد کا یہی انتظام مغلوں کی حکومت کے ختم ہونے کے ساتھ درہم و برہم ہو گیا۔ لیکن اس کی جگہ نئی حکومت کی سرپرستی میں یوں قائم ہونے کو تو اس ملک میں مطابع قائم ہونے لگے تھے۔ لیکن عام خرقی زبانوں کی طباعت و اشاعت کی طرف جیسا کہ چاہئے تھا، حکومت نے کافی توجہ نہ دی، انگریزوں کو ابتدائی عہد حکومت میں دفتر چونکہ فارسی زبان ہی میں تھا، اس لئے فارسی زبان کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی زیادہ متاثر نہ ہو سکا، اور اس زبان کی خصوصاً وہی کتابیں ہی زیادہ ان طلبوں میں چھپی رہیں۔

فارسی کی جگہ انگریزی کے ساتھ حکومت نے اردو کی طرف اپنی توجہ جب مبذول کی، تو اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا رواج بھی تھوڑا بہت ہوا، لیکن عربی زبان اور اس زبان میں مسلمانوں کی جو دینی و علمی کتابیں تھیں، ان کے چھاپنے چھپوانے کا محرک اگر کچھ ہو سکتا تھا، تو مسلمانوں کا مذہبی جذبہ، لیکن مسلمانوں کی عمومیت مغرب عربی سے ناواقف تھی، لاکھوں لاکھ میں ایک دو ٹوٹے پھوٹے مولوی

غریبوں کی طلب کی تکمیل کے لئے کسی کو کیا ضرورت تھی، کہ عربی زبان کی ان کتابوں کے چھاپنے میں اپنا سرمایہ لگائے۔

الغرض ”ذرا قیت“ یعنی نقل نویسی کے ذریعہ کتابوں کی فراہمی کا قصہ ایک طرف ختم ہوا اور طباعت کے لئے پہلی شرط یہ تھی کہ جو کتاب چھاپی جائے، اس کے طلب کرنے والوں کی تعداد کافی ہو، لیکن ناکافی تعداد بھی جس چیز کے خواہش مندوں کی بازماندگی فراہم نہیں ہو سکتی تھی، خود سوچنے اسی کے چھاپنے پر مدد پے صرف کرنے، محنت برداشت کرنے کے لئے کون آمادہ ہوتا، مگر دینی تعلیم کی عام اشاعت میں عربی زبان کی کتابوں کا مسئلہ کافی اہم تھا، اسی سے اندازہ کیجئے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد دوسری رداد ۱۲۸۴ھ کی جو شائع ہوئی تھی، اس میں اس کی شکارت کرتے ہوئے کہ

”ترقی خواندگی میں بالخصوص یہ امر بھی خارج رہا کہ کتب درسیہ خاصہ کتب ادب و اشعار عرب جس کی تعلیم بیش تر مد نظر ہے، بقدر کفایت بہم نہ پہنچ سکیں“ ص ۷۱

اس سے جہاں ضمناً اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ادب عربی و اشعار کی طرف دارالعلوم کی تاسیس کے ابتدائی زمانے میں خاص توجہ کی جاتی تھی، آگے جن کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی اطلاع دی گئی ہے ان میں متنی و نغزائین جیسی عام کتابیں بھی ہیں۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نہ دستیاب ہونے والی کتابوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

”بالکل بہم نہ ہو سکیں“

ادیدہ کی ایسی دشواری ہے کہ

”رفح کرنا اس حرج کا اختیار ہر مہتمم مدرسہ و طلبہ سے باہر ہے“ ص ۷۲ رداد ۱۲۸۴ھ

مطلب جس کا یہی ہوا کہ ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے جب ”نغزائین“ اور ”متنی“ وغیرہ جیسی عام متداول کتابوں کا بندوبست کرنا طلبہ ہی کے لئے نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام و انتظام کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ انشاء اللہ وقت کی نزاکتوں کا کچھ ٹھکانہ تھا۔

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ حالات کی ان غیر معمولی نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے یہ تجویز کس نے پیش کی

لیکن اسی سال کی روداد میں ہمیں ایک تجویز ملتی ہے 'درسی کتابوں کی نایابی و کمیابی کی دشواریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ لکھ کر کہ

"یہ مشکل بہ توجہ تاجران کتب، دایم مطالع حل ہو سکتی ہے"

گویا ملک کے اسی خاص طبقہ کو متوجہ کر کے تجویز بایں الفاظ پیش کی گئی ہے۔

"یعنی ان کتب کو بکثرت چھاپیں، اور فروخت کریں، اور کسی قید و تعف خرچ مدرسہ بھی فرما کر مثال

نفع دین و دنیا ہوں"

جبکہ اس میں نے عرض کیا، یہ تجویز کس کی پیش کی ہوئی ہے، روداد میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن دارالعلوم کا سارا کاروبار جس کی نگرانی اور مشورے کی روشنی میں انجام پاتا تھا۔ بظاہر خیال یہی گذرتا ہے کہ ان ہی کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہوگی، اور ان ہی کے اشارے سے مہتمم صاحب مدرسہ نے روداد میں اس کو غالباً درج کیا ہے۔ یوں بھی سیدنا امام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا مطالع سے خاص تعلق تھا، آپ کی عمر کا اکثر و بیشتر تر زمانہ گزشتہ چھ کھمچوں میں تصحیح کتب کی خدمت میں گذرتا تھا، بلا اسی فقرے کو بڑھ کر میرزا بن خداوند نے کن کن سائل کی طرف منتقل ہونے لگا۔ علمی خدمات کے سلسلے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا عربی کتابوں کے چھاپہ خانوں کی خدمت کو قبول کرنا، غدر سے پہلے زیادہ تر آپ کا اسی مشغلہ میں مصروف رہنا، فتنہ کے فرو ہونے کے بعد عربی خط نسخ کے سب سے بڑے مرکزی جگت استاد زہدیت قم یعنی انشی متاز علی صاحب مرحوم کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلقات جن کا ذکر کر چکا ہوں، ان ہی انشی متاز علی مرحوم کا

جلد چھ سو و اوسط سولہ نظام الدین مغربی حیدر آبادی مرید خاص حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ جب میں حیدر آباد میں مقیم تھا، کہ ان سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم نے فرمایا، 'دینیز میرے والد صاحب نے بھی مجھ سے ہی واقعہ دوسرے عنوان سے بیان فرمایا، کہ حضرت نانوتویؒ کی حیات میں دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا تھا، بلکہ حقیقت حضرت نانوتویؒ فرماتے تھے، کہ اگر اختلاف کی وجہ سے حضرت نانوتویؒ کے قلم پر وارد ہوتی تھی، اس کا ہیبت انکا میں میرے قلم پر ہو جاتا تھا، اور میں اس کام کو کر گذرتا تھا۔ میرے کام کر لینے پر حضرت نانوتویؒ فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزا خیر عطا فرمائے، میرا دل یہی چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ پھر یہی واقعہ میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے بھی سنا، آگے سن میں بھی اس روایت کا حوالہ آ رہا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

قائم کردہ وہ مطبع تھا جو بہار کو مطبع مجتبیٰ دہلی کے نام سے مشہور ہوا اور مولوی عبدالاحد مرحوم بیروآدی نے یہ مطبع خریدا جس سے بالآخر وہ دہلی کے رئیسوں میں شمار کئے گئے نصف صدی تک عربی مدرس کی دہلی کتابوں کے مطبع و اشاعت کا کام منشی ممتاز علی مرحوم کا قائم کردہ یہی مطبع مجتبیٰ انجام دیتا رہا منشی صاحب کے دو صاحبزادے منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی اپنے والد کے بعد خط نسخ عربی کے سامنے ہندوستان میں استاذانِ کلمہ بن گئے۔ یاد ہو گا کہ آبی کار وہاں سے براہِ راست تعلق رکھنے والے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کے نور چشم مولانا حفیظ الرحمن کے مکتوبِ گرامی سے خط نسخ کے ان ہی دونوں کتابوں (منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی) کے متعلق یہ شہادت نقل کی گئی تھی کہ ان کے

”سینکڑوں تلامذہ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں“

ہندوستان میں عربی خط نسخ کی طباعتی سرگزشت کی ان محفلِ معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ خود سوچئے مسندِ جبر و دودا کی تجویز کے ان الفاظ کو جس کے مخاطب اربابِ مطالع تھے یعنی

”ان کتب (عربی کی دہلی کتب) کو بکثرت چھاپیں“

اگر تجویز کے اس جز کو سیدنا الامام الکبیر کی طرف میرا ذہن منسوب کرتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ میرے دل میں اس قسم کے خیالات جو آ رہے ہیں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جیسے دینی علوم کی درس دہلی و تبلیغ اشاعت کا ذریعہ سیدنا الامام الکبیر کی ذاتِ مبارک کو دلائلِ علوم دیوبند قائم کر کے حق سبحانہ تعالیٰ نے بنایا کیا عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں بھی کام لینے والے نے آپ ہی سے کام لیا وہی ہندوستان جہاں نغمہء ایں ’ادبِ منہی جیسی عام کتابیں بھی ڈھونڈتے نہیں ملتی تھیں وہیں پھر عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام طول و عرضِ ادب میں جتنا بڑھا پھیلا پھیلا اور جو کچھ تماشا بھی دیکھا گیا اور ۱۹۴۲ء تک جب تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا عروج و ارتقاء کے ان تماشوں سے شمالِ جنوب کے علاقے پٹے ہوئے تھے عربی کی ضخیم ضخیم کتابیں جو کسی خالص اسلامی ملک میں بھی نہ چھپ سکیں ہندوستان میں وہ چھاپی جا رہی تھیں کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی تہ میں اردو کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی

توجہ دہمت کی قوت پوشیدہ نہ تھی ؟ واقعات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑ کر دیکھئے شاید واقعہ آپ کے سامنے بھی اسی شکل میں آجائے، جیسے میرے سامنے آ رہا ہے۔

بہر حال یہ تو تجربہ بزرگ کا پہلا حصہ تھا، یعنی اربابِ مطالع کو کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ دوسرا جز، اس کا جوہ تھا کہ اپنی چھاپنی ہوئی کتابوں کے کچھ نسخے بطور وقف مدرسہ میں بھی داخل کر دیے۔ بظاہر اس وقت یہ ایک معمولی تجویز تھی، لیکن جس کا جی چاہے آج دارالعلوم دیوبند میں اگر معائنہ کر سکتا ہے کہ تجربہ بزرگ کے اسی ابتدائی تخم نے کتنے بڑے تناور درخت کا قالمسب اختیار کر لیا۔ آج اسی کی چھاؤں میں علم کے غریب مسافروں کی کتنی بڑی تعداد آرام کی زندگی گزار رہی ہے۔ نیچے سے اوپر تک بیسیوں جماعتوں، اندان جماعتوں میں ستر ستر اور اس کی بھی کہیں زیادہ بہت زیادہ تعداد شریک ہوتی ہے۔ نہ جانے دالوں کو سن کر تعجب ہو گا، کہ اول سے آخر تک مدرسہ میں تعلیم پانے والے طلبہ میں مشکل ہی سے اعلیٰوں پر گئے جانے والے ایسے افراد ہونگے جو اپنی خریدی ہوئی کتابیں پڑھتے ہوں، بلکہ پڑھنے کے لئے ہر جماعت کے طالب علموں کو مدرسہ ہی کی طرف سے عاریۃ کتابیں دی جاتی ہیں، پڑھنے کے بعد طلبہ ان کو پھر مدرسہ میں واپس کر دیتے ہیں۔ ان کتابوں میں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ جہاں بعض کتابیں روپے دو روپے کی ہوتی ہیں۔ وہیں ان میں بڑی کتابیں بھی ہیں، جن کی قیمت اس وقت بازار میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپے سے کم نہیں ہے۔ یقیناً ماننے کہ مدرسہ کی طرف سے مفت کتابوں کی فراہمی کا نظم اگر نہ قائم کیا جاتا، تو سب کچھ ہوتے ہوتے بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے، کہ تعلیم و تدریس کے سلسلے کو جاری رکھنے کی شکل ہی کیا ہوتی۔ عربی مدارس میں پڑھنے والے طالب علموں کی مالی حالت یقیناً ان کتابوں کی خریداری کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا مسئلہ تھا جس کے حل کی صورت شروع ہی میں سوچ لی گئی تھی، بحمد اللہ اس میں کامیابی ہوئی۔ اور بہت غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ دارالعلوم کا کتب خانہ اسی لئے دو مستقل شعبوں پر منقسم ہے۔ ایک شعبہ صرف ان ہی کتابوں کا ہے جس سے ہر سال طالب علموں کو عاریۃ پڑھنے کے لئے کتابیں دی جاتی ہیں۔ اسی لئے عموماً اس شعبہ میں صرف وہی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ایک ایک مدرسہ کی کتاب کے

نسخے ستر ستر اور تلو ستر سے بھی زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں، اور یہی شعبہ دارالعلوم کے کتب خانہ کا خصوصی شعبہ ہے۔ باقی دو ستر شعبہ عام کتابوں کا ہے۔ الحمد للہ کہ اس وقت تک اس شعبہ میں بھی بچاس ساٹھ ہزار کے لگ بھگ کتابیں جمع ہو چکی ہوں گی۔ اس شعبہ کی بنیاد بھی ابتدائی میں ڈال دی گئی تھی، مذکورہ بالا تجویز کے آخر میں جو یہ فقرہ ہے کہ

نامہ کا کتب خانہ کی توجہ سے جن کی کتابیں صندوق دار الماریوں میں رکھی ہوئی وقف خورش کرم دیکھیں، یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

الحمد للہ کہ یہ تحریک بھی کامیاب ہوئی، اور وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف حصوں سے دارالعلوم میں چھوٹے بڑے کتب خانے ان علمی خاندانوں سے منتقل ہو رہے ہیں، جن میں اسلامی علوم کا شوق باقی نہیں رہا ہے۔ امید ہے کہ وقف خورش کرم دیکھ کی جگہ دارالعلوم کے کتب خانے میں وقف کر کے اپنے بزرگوں کی علمی یادگاروں کی حفاظت کی اس تدبیر سے آئندہ بھی لوگ غفلت نہ برہیں گے۔

اسی تجویز کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے وقف اور ہبہ کرنے ہی کا مشورہ نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ بجائے وقف کے توجہ دلائی گئی تھی کہ مدرسہ کی علمی خدمت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مکرّم دو ایک دینی الماریوں اور صندوقوں سے بحال بحال کردار العلوم کے کتب خانے میں المانہ و معاریہ اپنی کتابوں کو لوگ محفوظ کرادیں۔ یہاں ان کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی، اندر اساتذہ و طلبہ کو ان کتابوں سے استفادہ کا موقع بھی ملتا رہے گا، اہم صاحب نے تجویز کے بعد اسی ردہ ادب میں یہ اقدام فرماتے ہوئے کہ

”جن حضرات نے اس شیوہ پسندیدہ کو اختیار کر کے کتب عربی و فارسی وقف مدرسہ فرمائیں، یا معاریہ واسطے استعمال مدرسہ کے سپرد، منتہم کیں، فہرست ان کی آخر ردہ ادب مندرج ہے۔“

جو فہرست عاریۃ و امانۃ مدرسین کتابوں کے رکھوانے والوں کی درج کی ہے اس میں سب سے پہلا اہم گرامی خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور کافی قیمتی کتابوں کا نام لیا گیا ہے، گویا عملاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنت حضرت والا ہی کی جاری کی ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ قیام دارالعلوم کے ابتدائی دنوں سے کتب خانہ کے دونوں ہی شعبوں (تدریسی و غیر تدریسی) کی طرف پوری توجہ کی گئی، ہر سال کی روداد میں اس اہم علمی ضرورت کی طرف مختلف الفاظ میں مسلسل اور مؤثر پبلیش شائع ہوتی رہیں۔ جن کا بجز اللہ اچھا خاصہ اثر ہوا، گویا اپنے اپنے مطبع اور تجارتی کتب خانوں کی کتابوں کے چند نسخوں کا دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں داخل کرنا رفتہ رفتہ ایک رسم اور دستور کی صورت بن گیا، انتہا یہ ہے کہ علاوہ مسلمانوں کے اس سلسلہ میں غیر معمولی فراخ دلی کا ثبوت منشی نول کشور نے پیش کیا، ۱۲۸۷ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ ”امداد کتب کی نسبت جو سال گذشتہ لکھا گیا تھا، بہت سے اہل ہمت نے اس طرف توجہ فرمائی، اور بار سال کتب قیمتی و کارآمد مدرسہ کی امداد فرمائی“

آگے اسی کے بعد ہے کہ

”بالخصوص منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ تر قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بعد مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی“

صرف اسی روداد میں نہیں بلکہ آگے کی رودادوں میں بھی، منشی نول کشور کی توجہ خاص کا اس سلسلہ میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۲۸۹ھ کی روداد میں ان کا اور ان کے علیہ کا ذکر کے لکھا ہے کہ ”ارباب مشورہ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریا دلی کو کام فرمایا، اور چند کتب مفید سے امداد مدرسہ میں بہت فرمائی، فہرست ان کی ضخیمہ نمبر ۴ میں مندرج ہے، انہی کو خاص کر نسخہ قاموس کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے، اور منشی صاحب نے خاص اپنے مطبع میں اس کتب کو نہایت خوبی اور صحت سے اس سال میں طبع فرمایا ہے، لائق بیان ہے“

آخر میں یہ الفاظ بھی درج کئے گئے ہیں کہ

”مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا۔ یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر

مدرسہ اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے۔“ ۵۰ رواد سال ۱۲۸۹ھ

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ مدت تک دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و طلبہ اپنی دینی و علمی ضروریوں کو کسی ایک غیر مسلم کے کتابی عطیہ کی مدد سے پوری کرتے رہے، قرآن سمجھتے رہے، حدیثوں کے لغوی مشکلاّت کو حل کرتے رہے اور یہ تھا دور قاضی کا وہ دارالعلوم جو سرزمین ہند میں ہندوستان کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔

اور معاملہ کتابوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا، ہندوستان کا یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو زبان کے سوادے چند اخبار بعض مقامات سے نکلنے لگے تھے۔ سب کو تو نہیں، لیکن ایسے چند اخبار جن کے مالک مسلمان تھے۔ ان میں بعضوں کو توفیق ہوئی اور مدرسہ میں بھی ایک ایک کاپی اپنے اپنے اخباروں کی ہدیہ ارسال کرنے لگے، خصوصیت کے ساتھ اس سلسلہ میں کانپور کے اخبار نورالانوار کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مالک منشی عبدالرحمن مالک مطبع نظامی تھے۔ نیز ”نجم الاخبار“ نامی میرٹھ سے جو نکلتا تھا، اس میں مدرسہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ تائیدی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ لیکن ایک تو ان اخباروں کے مالک مسلمان تھے اس لئے ان کی طرف سے ایک ایک کاپی مدرسہ میں اگر پیش ہوتی ہو تو اس پر تعجب نہیں ہوتا۔ ماسواں کے ہفتہ میں ایک بار نکلنے والے اخبارات تھے۔ بلکہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ منشی نول کشور جاپنے یاں کی مطبوعہ کتابوں سے دارالعلوم کی ہر سال امداد کرتے تھے، اور ان ہی کے مطبع سے ایک روزنامہ ”ادوہ اخبار“ نامی نکلتا تھا۔ جو غالباً ہندوستان کا پہلا روزنامہ تھا۔ منشی نول کشور کی طرف سے یہ اخبار بھی ہدیہ دارالعلوم میں آتا رہا۔ اسی طرح دیوبند کے نواح میں ایک قصبہ بوڑھانہ پر لے ایک خبرست بھی اسی زمانہ میں آئے۔ اسے اخباروں کی دی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ادوہ اخبار کے سامنے یہ اضافہ بھی درج ہے کہ

”ان کا (یعنی منشی نول کشور کا) اخبار یاد جو کہ روزانہ جاری ہوتا ہے اور پیش یہاں ہے، غایت فراتے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں“

دباں کے ایک بچے ٹھا کر جن کا نام راؤ امر سنگھ تھا۔ "سفیر بوڈھانہ" کے نام سے ایک اخبار اپنی اسی قصبہ سے نکالا کرتے تھے۔ اور اس کی ایک کاپی مدرسہ کے تدریجی التزائم کی کرتے۔ ۱۹۲۹ء کی روداد میں ان دونوں (اودھ اخبار اور سفیر بوڈھانہ) کا ذکر کرتے ہوئے جن الفاظ میں شکر یہ ادا کیا گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ ان کو نقل کر دیا جائے۔

"شکر یہ جہان اخبار و مطابع" کا عنوان قائم کر کے عمومی شکر یہ کے بعد اسی روداد میں ہے کہ "جناب منشی نول کشو صاحب مالک اودھ اخبار لکھنؤ" اور جناب راؤ امر سنگھ مالک اخبار "سفیر بوڈھانہ" کا بالخصوص کہ باوجود دونوں صاحب اہل ہندو سے ہیں۔ مگر آخر میں، صد ہزار آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر، کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں، جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا تزل سے شکر یہ ادا کرتے ہیں۔"

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی، آگے کے الفاظ پڑھئے،

"اور سب صاحبوں کے حق میں اور ان کے اخبارات کے حق میں دعا خیر کرتے ہیں، کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانجات کو دم دم ترقی عطا فرمائے۔"

اور آخر میں یہ کہ

"ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے۔" ۱۹۳۰ء روداد ۱۹۲۹ء

مدرسہ دیوبند کی پہلی مجلس شوریٰ جس کے جزو و کل وہ حقیقت سیدہ ثلاثہ امام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے، اسی مجلس شوریٰ کے "جملہ ارباب شوریٰ" کی طرف سے شکر یہ اور دعا خیر کے ان الفاظ میں غور کیجئے، اور سوچئے، کہ حکومت متغلبہ و تسلط کی بڑی سی بڑی اداوی پیشکشوں کو اپنی پوری تادم میں جس مدرسے کو بھی آنکھ نہیں لگائی، اسی کا طرز عمل اسی ملک کے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ کیا تھا، اور کس قسم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بیش بہائی کے سلسلے میں یاد آگیا، اسی اودھ اخبار کا ذکر غالب نے بھی اپنے خط (مذہب اور دینے والی) میں کیا ہے، کہ اس کو بھی منشی جی دیتے یہ اخبار دیتے ہیں، لیکن حصول ڈاک لکٹوں کی شکل میں بھاری غالب کو خود بھیجے پڑتے تھے۔

تعلق کو وہ ان کے ساتھ قائم رکھنا چاہتا تھا۔

عہد قاسمی کی ان ہی قدیم رودادوں میں ”دستور المل چنڈہ“ و ”ذکر آئین چنڈہ“ کا عنوان قائم کئے پہلی دفعہ اسی دستور اور آئین کی باریں الفاظ اس زمانہ کی ہر روداد میں جو ملتی ہے یعنی

”چنڈہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں اور نہ خصوصیت مذہب و ملت“

اسی کے ساتھ ان ہی رودادوں میں چنڈہ دینے والوں کی فہرست میں دیکھ لیجئے اسلامی ناموں کے پہلو پہلو، منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہروداری لال، لالہ بیچنا تھ، پنڈت سری رام، منشی موٹی لال، رام لال، سیوارام سوار وغیرہ اسار بھی سلسلے ملتے چلے جاتے ہیں، سرسری نظر ڈال کر شاید چنڈہ نام جو سامنے آگئے، وہ چن لگے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دیوبند مسلمانوں کا خالص دینی مدرسہ تھا، اس مدرسہ کی امداد میں کسی ملت و مذہب کی خصوصیت کو قطعی طور پر ختم کر کے مسلمانوں کے سوا ملک کے دوسرے مذہبی اقوام و طبقات کے لئے دروازہ کو کھلے رکھنے کی پہلے ہمت ہی کیسے کی گئی اور کسی مصلحت سے لکھنے کو اگر یہ لکھ بھی دیا جاتا تھا، تو عملاً غیر مسلم اقوام کی امداد اس دینی کام میں قبول ہی کیسے کی گئی، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہوتا ہے، کہ لینے والے لینے پر کسی وجہ سے آمادہ بھی ہو گئے تھے، تو یہ جانتے ہوئے کہ دیوبند کے مدرسہ میں مسلمانوں کے خالص دینی علوم پڑھ پڑھائے جاتے ہیں، غیر اسلامی دائرے کے افراد کی طرف سے امدادی رقوم کیسے پیش ہو رہی تھیں۔ میں یہ ماننا ہوں کہ چنڈہ دینے والوں میں جیسا کہ چاہئے تھا، زیادہ اور بہت زیادہ تعداد مسلمانوں ہی کی تھی، مسلمانوں ہی کا یہ مدرسہ تھا، وہ اس کی امداد نہ کرتے، تو اللہ کون کرتا، لیکن یا اس ہمبر جو مسلمان نہ تھے، وہ اس مدرسہ کی مدد کیوں کرتے تھے۔ مزید حیرت اس پر ہوتی ہے، کہ عموماً غیر مسلم افراد کے ان چندوں کی نوعیت وقتی چندے کی نظر نہیں آتی، بلکہ دائمی چنڈہ دینے والوں کی فہرست میں ان میں اکثر ناموں کو ہم پاتے ہیں۔ میرے لئے یہ سارے سوالات آج سمجھنے بچنے ہیں۔ آج کیا ہے۔ کل کیا تھا؟ آج کی تاریخ کل کی تاریخ سے کیوں بدل گئی، کیسے بدل گئی اور کس حد تک بدل گئی؟ اللہ اللہ دل ان باتوں کو سوچتا ہے، اور سوچ کر دم بخود ہو جاتا ہے۔ اف!

اس گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے

شاید یہ صورت جتنی خوفناک مشکلوں میں آج سرزمین ہند میں پیش آئی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی مثالیں مشکل ہی سے مل سکتی ہیں، معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا۔ **فَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاعْبُدُونِ**۔ سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری زمانہ تقریری و تحریری مناظروں اور مباحثوں میں جو گذرا، جس کی بحث آگے آئے گی، شاید اس عجیب و غریب انقلاب کے بعض پوشیدہ اسباب سے اس بحث میں پردہ اٹھایا جائے۔ اس وقت تو ”دارالعلوم دیوبند“ کے ساتھ آپ کے تعلقات اور آپ کی خدمات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے نزدیک جو پہلو ستی تھا کہ اسے اجاگر کیا جائے۔ اپنی معلومات کی حد تک اس کام کو گویا پورا کر چکا ہوں۔

یاد ہو گا کہ چندھواں سال بھی ابھی مدرسہ کا پورا نہیں ہوا تھا، کہ سیدنا الامام الکبیر کی سرپرستی کی برکات سے وہ محروم ہو گیا، ان چندھو سالوں میں بھی ابتداء کے چند سال عرض کر چکا ہوں، ”ایسے ہی گزرے ہیں“ جن کے متعلق یہ تسلیم کرنا چاہئے، کہ قصبہ دیوبند کا یہ مقامی مدرسہ صحیح معنوں میں براہ راست سیدنا الامام الکبیر کے فیوض و برکات سے مستفید نہ ہو سکا، نام تو حضرت والا کا شروع ہی سے خصوصی ارکان کی غہرست میں شریک تھا۔ لیکن ہند گیر جامعہ بننے کے لئے آپ کی آغوش شفقت میں بعد کو آیا، پھر حج کا سفر بھی جس کا ذکر آگے آیا ہے، اسی زمانہ میں ہوا، جسمانی امراض و آلام کے هجوم اور حملہ کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ان ہی وجوہ سے چندھو سال کی اس مدت کو چندھو سال سے بھی کم ہی سمجھنا چاہئے، گویا دہائی سے بارہ سال تک کی مدت سے زیادہ اس کا تخمینہ مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ اسی محدود مدت میں خلیع مہادینور کے ایک غیر معروف قصبہ کا مقامی مدرسہ جس کے پہلے سال کی آمدنی ہر مذکی کل چھ سو انتچاس (۶۴۹) روپے چار آٹے (۴) تھی، امداد طلبہ کی مدد کو نکال دینے کے بعد اصل مدرسہ کی آمدنی درحقیقت کل چار سو ایک روپیہ ہوتی تھی، کل دو مدرس یعنی ایک عربی، ایک فلسفی و ریاضی وغیرہ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ کل بیس طالب علم شروع میں شریک ہوئے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے سارے مصارف کے بعد بھی (۲۵۵) دو سو پچھپن

خراج ہونے سے باقی رہ گئے (دیکھو رد واد ۱۲۵ ص ۱۸) سیدنا الامام الکبیر کے ظل عاطفت میں آ جاتے
کے بعد چند سال بھی اس مدرسہ پر نہیں گذرے تھے۔ یعنی تاسیس مدرسہ کا بار ہواں سال تھا اور العلوم
کے ادل صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ
ارشاد فرماتے ہوئے طلبہ کی تعداد جو دوسو کے قریب پہنچ چکی تھی، اسی کی طرف اشارہ کر کے آخر میں یہ
اطلاع بھی حاضرین جلسہ کو دی کہ ان میں ہندوستان کے سوا

”مختلجہ بر دیسیوں کے ایک ملک برہما کے رہنے والے ہیں، اندھین جزائر حبشان کے یعنی
سمند زنا پور کے اور ایک ملک تبت کے مثلاً رد واد ۱۲۵ ص ۱۸

حیرت ہوتی ہے، کہ اتنی مختصر مدت میں فراخاٹے ہند کے طویل و عریض رقبوں کو پھلانگ کر ایک قصبائی
مدرسہ کی شہرت سر بہا، تبت اور جزائر ہند کے پامشندوں تک کیسے پہنچ گئی تھی، خصوصاً اس زمانہ میں
جب مذاہبادوں اور برقی پیناموں کے پھیلنے پھیلانے کا عام رواج اس ملک میں عموماً اور طبقہ علماء
میں خصوصاً گویا نہیں ہوا تھا۔ اسی رد واد میں ایک خبر یہ بھی دی گئی ہے، کہ ہندوستان کے اسی گنام
قصبہ دیوبند اس کے مدرسہ کی شہرت اس عہد کے اسلامی دارالخلافہ استنبول (قسطنطنیہ) تک
پہنچ چکی تھی، اور اس امتیاز کے ساتھ پہنچ چکی تھی کہ دارالخلافہ کے ایک بڑے سربراہ عدہ عالم علامہ
احمد حمدی آفندی نے ایک کتاب

”النجوم الدارای فی ارشاد الساری“

نامی تصنیف فرمائی تھی، کتاب طبع نہیں ہوئی تھی، مصنف نے صرف چار قلمی نسخے اپنی اس کتاب کے
تیار کر لئے تھے، جن میں دو نسخے تو خود دارالخلافہ (قسطنطنیہ) کے کتب خانے میں داخل کئے
گئے تھے، اور ایک نسخہ اس کا مصر بھی گیا تھا، چوتھا نسخہ اس کتاب کا قسطنطنیہ میں بیٹھ کر اسی مصنف
نے خاص دیوبند کے اسی مدرسہ کے لئے لکھوایا تھا اس زمانہ میں ترکی حکومت کا جو نمائندہ بمبئی میں
رہتا تھا، یہ نسخہ اسی نمائندہ کے توسط سے دارالعلوم تک پہنچایا گیا۔ قلمی کتاب کے ساتھ خود علامہ
احمد حمدی آفندی کا ایک مکتوب بھی فارسی زبان میں اس علمی ہدیہ کے ساتھ شریک تھا، جو اسی سال کی

ردداد میں چھاپ کر شائع کر دی گئی تھا۔ خط میں ان ہی باتوں کا تذکرہ کر کے کہ کل چار قلمی نسخے اس کتاب کے تیار کئے گئے تھے جن میں ایک نسخہ آپ کے مدرسہ کے لئے اس لئے بھیجا جا رہا ہے کہ ”مدرسہ آنحضرت کے منیع فیض عموم ست، فرستادہ آئندہ تا یادگار آں بزرگوار بر محل خود باشد“ اگرچہ دہلی طود پر خط میں مدرسہ کے ستم مولوی رفیع الدین اور صدر حضرت مولانا محمد یعقوب، ائمہ مجلس شوریٰ کے ایک رکن حاجی محمد عابد کے نام بھی مکتوب کے عنوان میں درج ہیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے جسے علامہ احمد حمدی آفندی نے اپنا مخاطب اہل بیتانا چاہا ہے، وہ حضرت سیدنا الامام اَلکبیرؑ ہی کی ذاتِ مبارک تھی، مکتوب کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔

”جناب فضائل مآب، مولوی محمد قاسم صاحب“

یہ ”جناب فضائل مآب“ کے الفاظ صرف حضرت والا کے نام گرامی سے پہلے استعمال کئے گئے ہیں۔ باقی دوسرے بزرگوں کے نام کے ساتھ صرف ”مولوی“ کا لفظ ہے۔

کچھ بھی ہو، قاف تا قاف کی پرانی ضربِ اشل کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن عصری تقریروں میں ساحل باسفورس تا دیوار چین کا جو محاورہ مستعمل ہے، یہ واقعہ ہے کہ قریب قریب دس لاکھوں پر گئے جانے والے سالوں کے اند اندہ دیوبند کے قصبہ کا یہی مدرسہ، شاعرانہ رنگ میں نہیں، بلکہ فی الحقیقت اپنی شہرت و عظمت میں حیرت ہوتی ہے، کہ واقعی ان ہی حدود تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان کے لحاظ سے چین کی دیوار بہا از نہت ہی کے علاقے تو ہیں، اور باسفورس کے ساحل کے خوبصورت شہر استنبول (قسطنطنیہ) سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ علمی تحائف وہاں سے چلو آ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں تو اس کی توجیہ سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں، کہ مصر کے سوا زمین کے اس کوسے پر حالانکہ عیسویں اسلامی سالک چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے، لیکن قسطنطنیہ کے اس عالم کی اپنی کتاب کے لئے مصر کے بعد نظر انتخاب ہندوستان جیسے ”درد از ملک اور اس ملک میں بھی ضلع سہارنپور کی ایک قصبائی آبادی کے مدرسہ پر کیوں پڑتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا، اور سلم وغیر سلم باشندوں کا ایک ایسا ملک وہ بن چکا تھا، جس پر شہری طاقت

حکمران تھی اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ جو اللہ کے لئے شے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا، اٹھا تو اللہ ہی کو مگر اٹھا رہا تھا اور بچا کر رہا تھا اور یہ سب جو کچھ تھا اسی کی رفعت و بلندی کے مختلف مشاہداتی مظاہر تھے، من تو اضع للہ رقعۃ اللہ کی گویا یہ بھی ایک عملی تفسیر تھی اس کے سوا بتایا جائے کہ آخر کیا سمجھا جائے؟ تاویل و توجیہ میں اور کیا کہا جائے؟

بہر حال گئے چنے، ان ہی چند سالوں میں کراہ کے خام مکانوں سے مکمل کراہی موجودہ تدبیری و اقامتی عمارت میں بھی منتقل ہوا، جس کی تفصیل دارالعلوم دیوبند کی تاریخ لکھنے والے کے فرائض میں داخل ہے، یعنی یہ سوالات کہ شروع میں دیوبند کا یہ مدرسہ کہاں قائم ہوا؟ جن مکانوں میں مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا، ان کی تعمیر و نوعیت کیا تھی، کن کن لوگوں کے مکانات کراہ پر لئے گئے، کراہی کی مجموعی رقم کیا تھی، پھر کن دشواریوں کا احساس ارباب اہتمام و انتظام کو ہوا اور طے پایا کہ مدرسہ کی مستقل عمارت بنانی چاہئے، اس سلسلہ میں پہلے دیوبند کی جدید جامع مسجد جو اسی زمانہ میں بعض ارباب ہم کی جدوجہد کی بدولت بن کر تیار ہوئی تھی، فیصلہ کیا گیا کہ اسی جامع مسجد کے آس پاس چند حجرے اگر بنائے جائیں گے وہی کافی ہوں گے، حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کے متمم اول نے اسی تجویز کے مطابق مسجد کو اگر دو کچھ حجرے تیار بھی کر دیئے تھے، لیکن حال سے زیادہ جس کے سامنے مدرسہ کا مستقبل تھا، ہم آج جو کچھ دیکھ رہے ہیں، سب کچھ شاید اس کو پہلے ہی دکھایا جا چکا تھا، اپنی اسی لاہوتی بصیرت کی روشنی میں مدرسہ کے لئے پہلے زمین کا انتخاب کیا، زمین کیسے حاصل کی گئی، اور تقدیر کا وعدہ تدریس کا قالب اختیار کر کے سلسلہ کیسے سامنے آتا چلا گیا، ظاہر ہے یہ دارالعلوم کی تاریخ کے اہم اجزاء ہیں، جب کبھی لکھنے والوں کو اس کی طرف توجہ ہوگی، وہ یہ تحقیق کر کے ہر منزل کی روداد کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی حد تک زیادہ سے زیادہ گنجائش اسی کی ہے، کہ ان چند سالوں یعنی ۱۲۸۳ھ آغاز تاسیس سے ۱۲۹۶ھ تک جس سال سیدنا امام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی، اس درمیانی وقفہ میں جو کچھ ہوا، اس کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

عرض کر چکا ہوں کہ تاسیس مدرسہ کے دوسرے سال ۱۲۸۴ھ میں حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کی

مہتممی سے شکش ہو کر سفر حج پر روانہ ہو گئے، ان کی جگہ مولانا رفیع الدین صاحب کو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے مجبور کیا کہ وہ اہتمام کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ حاجی عابد حسین صاحب کی دیہی حجاز سے ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ اہتمام کی خدمت پھر ان ہی کے سپرد ہو گئی، ۱۲۸۷ھ تک وہی ہتم رہے، پھر ۱۲۸۸ھ میں مجلس شوریٰ نے حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کو اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ فساد خارج مسجد کی تعمیر ان کے سپرد رہی، اور مدرسہ کے اہتمام و انتظام کا کام پھر مولانا رفیع الدین صاحب کے سر ڈالا گیا۔ اور اسی سال جو قیام مدرسہ کا چھٹا سال تھا، ایک طویل الذیل ایبل روداد میں شائع کی گئی، جس میں مدرسہ کے لئے مستقل عمارت کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا یہ ایک خاص درق، اور اہم تاریخی وثیقہ ہے، اس میں پہلے تو مدرسہ کی مکانی دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے، کرایہ کے جن مکانوں میں اس وقت تک مدرسہ تھا، کچھ ان کی حالت، 'درگاہ'، 'طلبہ کی قیام گاہ'، کتب خانہ کا مکان، ان سب میں کافی فاصلہ، نیز درگاہ کے تنگ غیر سدریسی مکان میں پڑھنے والے اور پڑھنے والوں کو جو وقتیں پیش آرہی تھیں، مثلاً اجتماعات ندریس کی وجہ سے شور کا بلند ہونا، اور شور کو محسوس کر کے

”ہر شخص کو اس ضرورت سے کچھ آواز بلند کرنی ہوتی ہے، اور جتنی جتنی آواز بلند ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی شور بڑھتا ہے۔“

پھر قصبہ ہونے کی وجہ سے وسیع مکانوں کی دستیابی میں ناکامی، سب سے دل چسپ اطلاع یہ ہے، کہ قصبہ والوں کے خام کچے، ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو کرایہ پر مدرسہ نے جو لے لیا تھا، تو جہاں ہی دیوبند میں ایک طبقہ ان مسلمانوں کا تھا، جو سب کچھ مدرسہ پر بھیجا اور کر رہا تھا، وہیں روداد کے اس فقرے کو پڑھ کر کہ

”مکان مدرسہ کا اول تو کرایہ کا ہے، اور ہر سال نیا معاملہ کرنا ہوتا ہے، اور مالک مکان کے بسبب اس کے کہ حاجت مند جانتے ہیں، ہر سال کچھ نہ کچھ کرایہ زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔“

ان الفاظ کی پڑھ کر کم از کم سیری گردن تو جھک گئی، مسلمانوں پر جو افتاد پڑی تھی، اور پڑتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی تہ میں ٹوٹنے سے کچھ اسی قسم کے اسباب کا نشان ملتا ہے، 'ما ظلمنا احدہم' لیکن کا نوا انفسہم یظلمون کے قرآنی قانون کی ہی زندہ شہادتیں ہیں۔

بہر حال یہ اور اسی قسم کے متعدد اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں مجلس شہیدانی کی اس تجویز سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ

”ایک مکان وسیع، با فراغت، جس میں قریب ایک سو طلبہ بآرام تمام رہ سکیں، چار پانچ درگاہ بھی ہوں اور رفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اس میں ہو، تیار ہو یا نہ ہو۔“

آج دارالعلوم دیوبند کی فلک بیا، کوہ سیکل، عمارتوں کا سلسلہ طویل و مغزض رقبہ میں پھیلا ہوا ہے یہی پہلی تجویز اس تنازعہ و سخت کا تخم اول تھی، تجویز شائع کر دی گئی، تعمیر کی مد میں رقوم آسنے لگیں۔ ۱۳۸۹ھ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی غلام حسین صاحب حالانکہ مدرسہ کی مہتممی سے سبکدوش ہو چکے تھے، اور جامع مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے، انہوں نے اپنی اسی جامع مسجد کے ارد گرد چند چھوٹے بڑے حجرے بنوائے شروع کر دیئے۔ حاجی صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ یہی حجرے دیوبند کے مدرسہ کے لئے کافی دانی ہوں گے۔ اگرچہ اب شوروی نے حاجی صاحب کی اس رائے کی بظاہر مخالفت نہیں کی، بلکہ اسی ۱۳۸۹ھ کی روداد میں تعمیری مد کے ذیاعانت کے متعلق یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ تعمیر کا کام ان ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے چلے گئے، مگر اس مد کی رقوم

”بخدمت حاجی صاحب مدرسہ الصدوقیہ جامع مسجد ہی کے ارسال فرمائیں“

لیکن سچ پوچھئے، نو مدرسہ کا مستقبل جس کے سامنے تھا، وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، نہ دیکھنے والوں کے لئے اس کا دکھانا بھی دشوار تھا، اور جب تک وہی سب کچھ دوسروں کو بھی نہ سمجھتا، جو وہ دیکھ رہا تھا، لوگ یہ کیسے باور کر سکتے تھے، کہ ضلع سہانچود کی ایک تھپاتی آبادی کا نام تعلیم و تعلم، درس و تدریس کی تاریخ میں ایک ایسی ٹھوس حقیقت کا قالب اختیار کرنے والا ہے، کہ عام تعلیمی تاریخ نہ ہی، لیکن اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کی ہندوستان ہی کی حد تک نہیں، بلکہ بلا خوف تردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ سارے

عالم اسلام کی تعلیمی تاریخ کا یہ شعبہ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ حال مستقبل کے متعلق نقطہ نظر کے اسی اختلاف کا اثر دلوں میں کشش کی ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کو پیدا کئے ہوئے تھا، جس پر زیادہ دن تک صبر شاید برداشت سے باہر ہو چکا تھا، حاجی صاحب مرحوم جامع مسجد کے ارد گرد جو حجرے بنوا چکے تھے، دوسری مسجدوں کے حجروں کی طرح طلبہ کی اقامت گاہوں کا کام ان سے لیا جاسکتا تھا، اور یہی کام ان سے بعد کو لیا بھی گیا، آج تک لیا جا رہا ہے۔ اس لئے ان کی تعمیر میں مزاحمت تو مناسب نہ خیال کی گئی، جو کچھ وہ کر رہے تھے، چھوڑ دیا گیا کہ کرتے رہیں۔ اور خود مجلس شوریٰ نے جیسا کہ ۱۲۹۱ھ کی روداد میں مدرسہ کے مستقل اور وسیع مکان کی تعمیر والی تجویز کا ذکر کر کے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

”۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ ہجری معلوم بروز جمعہ عین جلسہ انعام طلبہ میں اس کے لئے گزارش کیسا“ ۱۱۵

کاغذی ایبل کے بعد باضابطہ ”جلسہ تقسیم انعام“ میں تعمیر والی یہ تجویز عام مسلمانوں کے مجمع میں پہلی دفعہ پیش کی گئی، لکھا ہے کہ

”برابر فرد چند پر دستخط ہوتے چلے جاتے ہیں، جس میں بہت سارے یہ وصول ہوتا تھا کہ“

چند ہی دنوں میں اتنی رقم فراہم ہو گئی کہ اسی سال

”ایک قطعہ نہایت وسیع واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا“ ۱۱۵ روداد ۱۲۹۱ھ

لکن واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے، تمہید میں جو یہ الفاظ درج کئے گئے ہیں، کہ یہ

”آئندہ دیر میں جس کی سالہا سال سے امید تھی“

اصلاً اسی سے سمجھ میں آتا ہے، کہ جامع مسجد کے ارد گرد جو حجرے تعمیر ہو رہے تھے ۱۲۸۹ھ کی روداد میں ہیں

کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ اس کی طرف

”جناب عمدہ اہل صفا، خیر خواہ خلائی جناب حاجی محمد عابد صاحب، متمم سابق مدرسہ ہذا“

حال متمم تعمیر جامع مسجد نے توجہ تام فرمائی، اور احاطہ مسجد ہی میں جملہ خارج ضروریہ درگاہ

قیام گاہ طلبہ و دیگر ضروریات کے لئے موقع مناسب کے مکان تجویز فرمائے۔^{۱۱۷}
 یہ شاید حاجی صاحب مرحوم کی ذاتی تجویز تھی، جس کی مزاحمت نہیں کی گئی تھی، لیکن تعمیر کی دیرمیں آرزو،
 جس کی سالہا سال سے امید تھی، اس کے مقابلہ میں گویا اس کی حیثیت گونہ اصرار بے جا ہی کی سی تھی، شاید
 اسی لئے جامع مسجد کے حجرہ وانی تجویز بجائے ارباب ثورہ کے براہ راست حاجی صاحب مرحوم
 کی طرف ردداد میں منسوب کی گئی ہے، مدرسہ کی تاریخ میں آئندہ بعض ناگفتہ بہ ہنگامی اختلافات جو
 پیش آئے، بظاہر ان کی ابتداء شاید اسی واقعہ سے ہوئی، کچھ نہ کچھ جس کی کسک آج تک طلبہ میں باقی ہے، مگر
 میری بحث کے موضوع سے یہ مسئلہ ہی خارج ہے، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دودھ کا مٹی میں ملنے
 کن منزلوں کو طے کر چکا تھا۔ مدرسہ کی مستقل تعمیر کے لئے ۱۲۹۱ھ میں زمین خرید لی گئی، اور ۲۲ ذی الحجہ
 ۱۲۹۲ھ میں جیسا کہ ۱۲۹۲ھ کی ردداد میں اطلاع دی گئی ہے، تقسیم اسناد و اخراجات کا کاروبار جلیلہ منعقد ہوا، جس
 میں غیر معمولی طور پر علاوہ دیوبند کے کافی تعداد باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کی بھی تھی، ان میں وقت
 کے بعض سربراہ و درہ علماء، اور امراء بھی تھے، آخر میں لکھا ہے کہ

”کل ایالیان جلسہ اس موقع پر شریف اللہ نے جہاں تعمیر مکان مدرسہ کی بنیاد کھدی ہوئی
 تھی، اول تھیں بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب بہار نیوری نے اپنے دست مبارک
 سے رکھا، اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب
 و مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔“ ح ۱ ردداد ۱۲۹۲ھ

اس تعمیر مدرسہ کی تاریخ کی یہ معلومات تردید ہیں جو براہ راست مدرسہ کی قدیم رددادوں سے فراہم کی گئی ہیں، علماء علوم کی تاریخ
 کے لکھنے والے مزید معلومات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔ غیر سبقت ضرورت چیزوں کا انتخاب کر لیا ہے، اس موقع پر
 ادراج تلاش کی اس رعایت کا قہر تاخیر آتا ہے جس کے بعض اجزاء کا کسی کتاب میں مختلف موقعوں پر ذکر گذر چکا ہے، ادراج
 تلاش کی اس رعایت میں سنگ بنیاد کے متعلق یہ اضافہ پایا جاتا ہے کہ سید ملا محمد باکیر کے اشارہ سے حضرت مولانا
 اصغر حسین صاحب کے نانا جو میاں جی نے شاہ صاحب کے نام سے شہود تھے، وہی طلبہ کئے گئے اور پہلی اینٹ
 انہی کے دست مبارک سے رکھی گئی۔ لکھا ہے کہ میاں جی نے شاہ صاحب علاوہ سید ہونے کے خود بڑے بزرگ
 تھے۔ بلکہ میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے، قرباناً تا ہے کہ میر شاہ خان مرحوم حضرت نانوتویؒ کے حوالے سے یہ بیان کرتے تھے
 کہ میاں جی نے شاہ ایسے آدمی میں جن کے دل پر گناہ کا شاید خطرہ بھی نہیں گذرا۔ (انشاء ظلم دوسری بات (باقی اگلے صفحہ پر)

مجلس قائم کر دی گئی ہے، چاہئے کہ دوسرے شہروں میں بھی اس کی پیروی کی جائے۔

مدرسہ کی تعمیر کا کام بھی جاری رہا، اور اسی کے ساتھ ان ہی دنوں میں وقتاً فوقتاً بعض اصلاحی اقدامات کی طرف بھی توجہ کی گئی، خصوصاً عربی اور دینی تعلیم کے ساتھ ”معاشی ذرائع“ کے سکھانے کا انتظام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے اس کا خیال بھی سامنے تھا، اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں، کہ خالص دینی و عربی تعلیم کی حد تک اس کا تجربہ ہوئے لگاتار دنیا میں ان علوم کے جاننے والوں کی مانگ ہے۔ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ مدرسہ کی تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ سکے ہو کر بیٹھ جائیں، حکومت قائمہ کے دناتر کی نوکری معاش کے بے شمار ذرائع میں ایک مختصر ترین معدودہ ہے، لیکن اس کے سوا

”ادب بھی اعلیٰ و افضل طریقے ہیں، مثلاً تجارت، زراعت، حرفت“ ۱۱

آگے یہ اطلاع بھی دی گئی ہے۔

”اس بات کے سننے سے ادب بھی تعجب ہوگا، کہ خدا کے فضل و عنایت سے اکثر علاقہ

(علاقہ ملازمت) واسطے فارغ التحصیل طلبہ کے اطراف ہندوستان سے بڑا ہرہہ متقل

مدرسہ ہذا میں آتے رہتے ہیں، اور نوکری ان لوگوں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے“

پھر اس زمانہ میں ریاست بھاول پور، اور گجرات کے کسی مقام لاچھو سے جو مطالبے آئے ہوئے

تھے، ان کا تذکرہ کر کے اطلاع دی گئی ہے، کہ باوجود اس نوکری کے، ملنے کے دارالعلوم کے فارغ التحصیل

طلبہ میں کوئی ان نوکریوں کے قبول کرنے پر تیار نہ تھا، آمادہ نہیں ہوا ہے۔

بہر حال بات یہی ہے، جس کا ذکر شاید پہلے بھی کر چکا ہوں، اور اپنے متعدد مقالات و مضامین

میں اس خیال کو فقیر نے ظاہر کیا ہے، کہ تقریباً اپنی صد سالہ زندگی میں دارالعلوم یوبند سے دینی و

دعویٰ منافع جو حاصل ہوئے، وہ تو خیر بجائے خود ہیں، واقعہ یہ ہے، کہ معاشرتی حیثیت سے بھی مسلمانوں

میں پست ماندہ طبقات کے خدا جانے کتنے گھرانوں کو اس کا موقع مل گیا کہ اگر دارالعلوم کے تعلیمی

نظام سے استفادہ کا موقع ان کو نہ ملتا تو خوش حالی و فارغ البالی کی جو زندگی آج گزار رہے ہیں۔ ظاہر

اسباب کی رو سے شاید اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ معاشی منافع دارالعلوم کی بدولت جن لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدا تا سب سے اس وقت تک ان افراد کی تعداد شاید لاکھوں سے متجاوز ہو چکی ہوگی۔ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سلسلہ میں مستفید ہوئے ہیں۔ ان میں بعضوں کو تو کافی بلند ہونیکے مواقع مل گئے، جن کی داستان طویل ہے۔

قطع نظر اس عام معاشی منافع کے عہد فاقہی ہی میں بعض ایسے امداد کی طرف جیسا کہ رودادوں سے معلوم ہوتا ہے، توجہ مبذول ہو چکی تھی، جن کو سیکہ کر خدا ہی جانتا ہے، کتنوں کو روزی کمانے میں ہولتیں میسر آئیں۔ مثلاً ۱۲۹۵ء یعنی قیام دارالعلوم کے چھٹے سال ہی میں لکھا ہے کہ:

”حافظ محمد کوثر علی صاحب خوشنویس ساکن نگینہ نے..... تعلیم خوش خطنی طلبہ اپنے ذمہ کر لی“ ص ۱

ظاہر ہے کہ مطالعہ اور پڑیس، خصوصاً ہندوستان جہاں بجائے ٹائپ کے اس وقت تک لیتھو پریس ہی کے مطبوعات کو عوام بھی پسند کرتے ہیں، اور کتابوں کے نشر و اشاعت کے کام کرنے والوں کا بیان ہے کہ ٹائپ کے حساب سے لیتھو کی طباعت پر نسبتاً کم مصارف عائد ہوتے ہیں۔ اسی لہٰذا خوشنویس کا سہرا اس زمانہ میں روداد کا ایک مستقل ذریعہ ہے، خصوصاً پڑھے لکھے عربی و فارسی کے جانتے والے خوشنویس چاہئے تو یہی کہ عام اردو خوان کتابوں کے مقابلہ میں کتابت کے فرائض کو زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دیں۔ یہ ایک ایسا معاشی پیشہ ہے، جو علم کے ساتھ کافی مناسبت رکھتا ہے، اور علم سے اس پیشہ کے فروغ میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

اسی طرح ۱۲۹۵ء کی روداد کے آخر میں ایک اعلان میں اس کی خبر بھی دی گئی ہے، کہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں ”طب پرانی“ کے پڑھانے کا نظم کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ:

”مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول اس علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں“ ص ۱۰

اور گو اس خیال کی تکمیل کی طرف بعد کو توجہ نہیں کی گئی، لیکن اس راہ میں جن بلند حوصلوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا اندازہ اسی اعلان کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اسی طبی تعلیم کے شعبہ کی طرف ابواب خیر کو متوجہ

کرتے ہوئے ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ

”اس فن لطیف کے لئے ایک بڑا کتب خانہ کتب و بیاض ہائے مستشرق حکماء حاذق
 و اطباء کامل“

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ

”دآلات عمدہ جراحی وغیرہ طبیب و جراح تجربہ کار کا واسطے سکھانے ظرفیہ مطبوعہ فن پرچی
 وغیرہ کے نہایت ضرور ہے“ منہ روداد ۱۲۹۵ھ

دیکھ رہے ہیں، عہد قاسمی کے دارالعلوم کی انگلوں اور اولوالعزمیوں کا حال، وقت سے مساعدت نہ
 کی، باغ کے لگانے والے کے سامنے جو ارادے تھے، اولاً سب ظاہر نہ ہو سکے، اور اورادھر اور
 جن کا کچھ پتہ چل جاتا ہے، تو ان پر عمل کی توفیق میسر نہ آئی، ۱۲۹۱ھ کی روداد کے اس جز کو طحطہ
 فرمائیے۔ اخبار و مطالع کے ان کادر پردازوں کا فکر یہ افا کرتے ہوئے جو مدرسہ کی اسناد پر اخبار اور
 کتابوں سے کرتے تھے۔ قسطنطنیہ کے ایک عربی اخبار ”النجاریت“ نامی کے متعلق یہ اطلاع
 دیتے ہوئے کہ

”بلا اذنیتم بعض‘ بنظر خیر خواہی اس مدرسہ اسلامی دفاۓہ طلیہ اہل اسلام کے غایت
 کرتے ہیں“ ۱۲۵۵ھ

سب سے بڑا فائدہ عربی زبان کے اس اخبار کا یہ بیان کیا گیا ہے، کہ

”طلیہ عربی خواں کو زبان دانی کا فائدہ علاوہ فائدہ اخبار کے کمال درجہ حاصل ہوتا ہے“

۵۳ روداد ۱۲۹۱ھ ہجری

عربی زبان دانی اور اخبار بینی کے ان منافع کی طرف عہد قاسمی کے بعد کتنی توجہ کی گئی، اس کا جائزہ
 ”صورت میں حالت پیرس“ ”بانچیاں راجہ پیاں“ کے سوا اور کیا دیا جاسکتا ہے؟

بہر حال دارالعلوم کی عمر کی یہ مدت جو عہد قاسمی میں گزری، خواہ جتنی بھی مختصر ہو، لیکن جوشہادتیں
 آپ کے سامنے گذر چکیں، ان کی بدشہنی میں دیکھئے بعد کو دارالعلوم نے تاریخ کے جس طویل دور کو

بہا کیا، قریب قریب ایک صدی گویا ختم ہو رہی ہے، اس عرصہ میں مولانا عرضاً اس کے مختلف شعبوں میں جو ہر جہتی ترقیاں ہوئی ہیں۔ ان کا بھلا کون اسکا ذکر کرتا ہے، لیکن بنیادی سالوں میں جن جن تخفوں کو پورے والے بوکر چلے گئے، سچ تو یہ ہے کہ ابھی صبیح معنوں میں ان ہی کی نشوونما میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، اسی لئے دارالعلوم کی حد تک اپنا خیال تو یہی ہے کہ نئی تجویزوں سے زیادہ ضرورت اس کی ہے، کہ عہد قاضی کے کلیات کی روشنی میں عملی اقدامات کی طرف توجہ کی جائے، جو کچھ اس وقت تک سوچا جا چکا تھا، اسی کو عمل کا قالب عطا کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی کی تاریخ کا صحیح اور مفید مطالعہ ہی ہو سکتا ہے جس سے مستقبل کے سلجھانے میں مدد ملی جائے، ورنہ گزرے ہوئے واقعات کا اعادہ، واقعات ہی کا اعادہ کیوں نہ ہو، نتیجتاً ایک افسانہ سے زیادہ انصاف کی بات یہی ہے کہ وہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد قاضی کی جن رد وادوں سے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کو مرتب کر کے شائع کرنے والے یعنی حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دارالعلوم کے ہستم مقرر ہوئے تھے ان ہی کے بعض ذاتی اعترافات یہاں نقل کر دیے جائیں۔ زبانی روایت تو اس باب میں ان ہی کو حوالہ سے اردو حلقہ میں یہ پائی جاتی ہے، فرماتے تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ دیوبند کا اہتمام کبھی خود نہیں فرمایا بلکہ اہتمام کیلئے مجھے طلب فرمایا، اور میں وہی کرتا ہوں، جو انہیں مشکوف ہوتا ہے۔“

مصاف اور واضح غلطوں میں اپنے مافی الضمیر کی شرح خود مولانا رفیع الدین صاحب یہ کرتے تھے کہ ”علم ان کار مولانا نانوتوی رح کا محل میرا ہے“ ۱۳۵۷ھ

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے جسے موصوف نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج کیا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ واضح دواخ، خود مولانا رفیع الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خود نوشتہ تحریر، شہادت ہے، جو ۱۲۹۶ھ کی رد واد میں بیٹا مولانا اکبر

کی روایات کے تذکرہ کے بعد ظلم ہند کی گئی ہے،

حضرت مرحوم کے دینی جذبات عالیہ، اور عام اسلامی جذبات جلیلہ کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد مولانا رفیع الدین مرحوم نے لکھا تھا۔

”خصوصاً اس مدرسہ (دیوبند) کو، کیونکہ اس چشمہ فیض کے منبع، اور اس آب حیات کے

مصدر، اور اس آفتاب عالمیاب کے منظرِ آب (یعنی سیدنا الامام الکبیرؑ) ہی تھے۔“

آگے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”انشاء اللہ اس کارخانہ خیر و برکت یعنی مدرسہ کی ترقی میں کسی کیسی ہمتیں لگائیں۔“

اپنی اعتراضی شہادت وہی یہ درج کرتے ہیں

”حق تو یہ ہے کہ اس شمس الاسلام ہی کے حسن بھی کا یہ نتیجہ ہے، کہ ملک ہند میں بائیس

ضعف اسلام، و اسلامیان، علم دین کو کس زور و شور سے پھیلا کر باید و مشاید، عدل

رد و اد ۱۲۹۶ھ

اس کے بعد، عہد قاسمی کی رودادوں کی تجویزوں کا حقیقی سرچشمہ حضرت والا کی فکر حکیمانہ کے سوا، خود ہی

بتائے، کہ اور کس چیز کو قرار دیا جائے۔ صراحتاً جو باتیں آپ کی طرف نہ بھی منسوب کی گئی ہوں، ماننا۔ ہی

چاہئے، کہ ان کی تہ میں بھی حضرت والا کے چشم و ابصار کے اشارے کام کر رہے تھے،

انچھ استاد ازل گفت ہماں می گویم

خود پس آئینہ واسلے طوطی ہی کا جب یہ اقرار ہو، تو سمجھنے والے آپ ہی بتائے کہ آخر کیا سمجھیں۔

خلاصہ یہ ہے، کہ دین و دنیا قدیم و جدید علوم کی پیوستگی و وابستگی یعنی باہم ایک کو دوسرے کے ساتھ

بہم رشتہ کرنے کے لئے نصاب کی ترکیب و اصلاح کا مسئلہ، انتشار و پرانگیذگی کی جگہ سرزمین ہند کی اسلامی

تعلیم کا ہوں کو جامعاتی قالب میں لانے کے لئے کسی ایک مرکز یران کو مجتمع کرنا، دینی مدارس کے طلبہ اور

نارغین کے معاشی سوال کا حل، ان کی مسائل کے ساتھ ساتھ دوسرے تعلیمی جزئیات و شکلا کیوں کی حفاظت

و طباعت و اشاعت کے متعلق کافی راہ نمائیاں ان معلومات سے حاصل ہو سکتی ہیں جو عہد قاسمی کی

رودادوں سے فراہم کر کے پیش کی گئی ہیں۔ بلکہ آج مسلمانان ہند کے سامنے سب سے بڑا سوال اس ملک کے دوسرے آبادکاروں کے تعلقات کی بنیاد پر جو پیدا ہو گیا ہے، چاہا جائے، تو اس سوال کے حل کی راہیں بھی ان ہی معلومات کی روشنی میں ڈھونڈ ہی جاسکتی ہیں۔ لیکن کان لہ قلب اوالقی السمعم وھوشہیل۔ واقعہ تو یہ ہے، سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے جس پہلو کو اب پیش کرنا چاہتا ہوں، ایک حیثیت سے یہ سمجھنا چاہئے، کہ جہنم بن کر جو چنگاری آج ملک میں بھڑک اٹھی ہے، یہ چنگاری کیسے پیدا ہوئی، شاید آئندہ جو کچھ عرض کیا جائے گا، اسی میں اس سوال کا جواب بھی آپ کو مل جائے۔

آپ دیکھ چکے، سنے سناے افواہی قصوں اور زبانوں ہی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے مقدس دینی ادارہ کے متعلق یہ تحریری وثیقہ آپ کی نظر سے گزر چکا کہ وقت اسی ملک پر وہ بھی گزر چکا ہے، کہ ہندوؤں کے اخباروں (ادوہ اخبار اور سفیر بوڈھاش) کے لئے یہ دعا کی جاتی تھی کہ

حشا

”ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے“

گذر چکا کہ زمامت یا چندہ کے متعلق بلا التزام سہ سال کی رودادیں ہی اعلان مسلسل کیا جاتا تھا

”چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اور نہ خصوصیت مذہب و ملت“

اعلان بھی یہی کیا جاتا تھا، اور عمل بھی اسی پر ہوتا رہا، اسی بنیاد پر بخشی ان ہندوؤں کی مالی امداد بھی قبول ہوتی رہی، جو ان کی طرف سے پیش ہوتی تھی، خصوصاً کتابوں کی شکل میں بار بار ان رودادوں میں اس کا اعتراف کیا جاتا رہا، کہ اس باب میں غیر معمولی فیاضیوں کا تجربہ ایک ہندو مالک ملے ہی کے متعلق مدد دالوں کو ہوتا رہا۔ کتابوں کے سوا قیمتی اور دروز نامہ جو شاید ہندوستان میں وہی پہلا روزنامہ تھا، اسی سیر چشم، فراخ دل ہندو کی طرف سے ہدیہ پیش ہوتا رہا، جیسا کہ چاہئے تھا۔ مدرسہ کی طرف سے بھی بار بار اس بڈل و فزائل کا شکریہ ادا کیا جاتا تھا۔ الفرض دنیاوی علوم و فنون کی تعلیم کے مدارس کا بلکہ حکومت کے خزانے پر ڈال کر دینی و ملی تعلیم کے لئے ہندوستان کے قومی خزانہ سے استفادہ کا ارادہ جو کیا گیا تھا، اس میں ہاشم سنگان ملک کے دینی نظریات اور مذہبی احساسات کی قید گویا اٹھا دی گئی تھی، اسی لئے

ہر طرح کے لوگ دے بھی رہے تھے اور مدرسے بھی رہا تھا، بلکہ اس کا اظہار کرتے ہوئے کہ مقصود اصلی اس مدرسہ کے بانی کا دینی علوم ہی کی اشاعت ہے۔ لیکن بقدر ضرورت فارسی اور کچھ حساب و کتاب یعنی ریاضی کی تعلیم کا بھی مدرسہ کے ابتدائی کلاسوں میں انتظام کیا گیا ہے۔ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

”یہاں تک کہ بعض بعض ہندو لڑکے بھی پڑھتے ہیں“۔ حصہ ۱ روداد ۱۲۹۲ھ

”ہندو لڑکے پڑھتے تھے“ ظاہر ہے کہ مطلب اس کا یہی ہو سکتا ہے، اور یہی ہے بھی کہ خاص ہندوؤں کی وجہ سے دیوبند کے مقامی ہندو باشندے بھی کبھی کبھی فارسی اور حساب وغیرہ کے پڑھنے اور سیکھنے کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کو مدرسہ کی ان ابتدائی کلاسوں میں شریک کر دیتے تھے جن میں ان مضامین کی تعلیم ہوتی تھی، اس سے کچھ اور ثابت ہوتا ہو، یا نہ ثابت ہوتا ہو، لیکن قطعاً کی شگفتگی کا اس سے زیادہ واضح ثبوت کیا ہو سکتا ہے، کہ دارالعلوم دیوبند جیسی خالص دینی و اسلامی درسگاہ میں ان بچوں کو یکساں پیشانی شریک کر لیا جاتا تھا، اور کتنے کھلے دل کے ساتھ شریک کر لیا جاتا تھا، کہ روداد تک میں تذکرہ کر کے سارے مسلمانان ہند کو اس سے مطلع کیا جاتا تھا، اس سے بھی زیادہ عبرت آموز سبق اسی اطلاع سے یہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں جو مسلمانوں کے دین اور صرف دین کا خالص تعلیمی مرکز ہے، اس میں بغیر کسی دغدغہ کے اپنے بچوں کو ہندو شریک کرتے تھے اور شریک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے تھے۔ دلوں اور دماغوں پر آج جو تلے چڑھا دیے گئے ہیں، ان کو دیکھئے، اور اندازہ کیجئے کہ اسی ہندوستان میں اسی آسمان کے نیچے اسی سرزمین پر اس تماشا نے کو بھی دیکھا جاتا تھا اور بخوشی دیکھا جاتا تھا جس کا تصور کرنا بھی آج شاید دشوار ہے، ایسا کیوں؟ وہی ملک جس میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہی کرڈٹیں بدلتے ہوئے موجودہ حالات تک کیسے پہنچا، ان سوالوں کی صحیح جواب تازہ کے جن اوراق میں لکھے ہوئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ پھاڑیے گئے، ان ہی لوگوں نے ان کو پھٹا دیا جو دوسروں پر قوی تاریخ کے اوراق کے پھاڑنے کا جبرانہ الزام لگاتے ہیں۔

۱۲ شاید اب تو ندامت کے ساتھ کچھ سر جھک بھی رہے ہیں، اور ان فیضیہ وغیرہ نے ہندوستان کی باقی اچھے حضرات

تمام ان ہی پاک شدہ اوراق کے کچھ ٹکڑے کسی کسی اور اُدر اُدر مل جاتے ہیں سب کے سب جمع کرنے کی اور ان سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان تفصیلی بحث کی تو اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے لیکن ان میں بعض ٹکڑوں کو خاص ترتیب سے درج کر دیتا ہوں پڑھنے اور جتنیے ان سے پیدا ہوتے ہیں ان کو خود ملاحظہ فرمائیے۔

کتاب کے مقدمہ میں بھی 'اور اصل کتاب میں بھی اس کا تذکرہ مختلف مقامات میں گزر چکا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ختم کر کے اس ملک کی سیاسی باگ ڈور جس قوم کے ہاتھ میں آگئی تھی اس قوم کے ان حکمرانوں کی طرف سے پہلی کوشش تو اسی کی گئی تھی کہ

"جس طرح سے ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے" (تاریخ التعلیم ڈاکٹر سید محمد منقول از مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۳۱)

اور اسی نصب العین کے پیش نظر منجملہ اودھ بیروں کے جوہری تدبیر انگریزی تعلیم تھی۔ لارڈ میکالے جنہوں نے اپنے ایک دورث سے ہندوستان کے مشرقی نظام تعلیم کو مغربی نظام کے قالب میں

(گزشتہ صفحہ سے) تاریخ جس زمانہ میں لکھی ہے عموماً اس زمانہ میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ سرزمین ہند کی "مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں ملتی" ایلفسٹن صاحب کا جو یہ تھا "مشہور جرمنی فلسفی شاعر کا قول نقل کیا جاتا تھا کہ تاریخ تو صرف روم اور یونان ہی کی تاریخ ہے" باقی قدیم قوموں میں مصر، یونان، چین، یا ہندوستان کسی حالت میں ان کے حالات عجائبات سے زیادہ نہیں (سمتہ کی تاریخ قدیم ہند ص ۱۳۱)

سمتہ ہی نے اپنی اسی کتاب میں یہ عجیب و غریب دعوے کئے ہیں کہ سکندراعظم کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اسی کا نہیں بلکہ سومات پرمو وغرنوی کی چڑھائی تک کے ذکر سے ہندوستان حتیٰ کہ گجرات تک کی تاریخیں خالی ہیں اسکا بیان ہے کہ ہندوستان پر باہر سے جو حملہ ہوئے ان کے متعلق خاموشی کی ایک سازش پائی جاتی ہے (دیکھو تاریخ قدیم ہند ص ۱۳۱ ترجمہ اردو) ان باتوں پر مجھے خیال آیا کہ آج کل یورپ والوں نے جو یہ پھیلا رکھا ہے کہ مصر کی قدیم تاریخ کے جو دشمنی مختلف شکلوں میں ملتے ہیں ان میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان خطرات کا ذکر نہیں ملتا جن کے قصہ تورات اور قرآن میں پائے جاتے ہیں خیال بھی گذرا کہ قدیم قوموں کی سازش ہی جب تھی جس کا اکتھ صاحب نے دعویٰ کیا ہے تو مصری تاریخوں کا بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے خالی ہونا محض تعجب کیوں ہو۔ اگرچہ پچھلے دنوں بعض لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ مصر کی تاریخ میں بنی اسرائیل کے آثار کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن نہیں بھی ملتا تو خاموشی کی مذکورہ بالا سازش کے بعد ملنے کی توقع ہی کیا ہو سکتی تھی؟

ٹھہرا دیا۔ انہوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد اپنے والد کے نام جو خط لکھا تھا۔ شاید پہلے بھی نقل کر چکا ہوں جس میں پیشگوئی کی گئی تھی کہ

”تیس سال بعد ایک بت پرست یعنی ہندو بنگال میں باقی رہے گا“ (روشن مستقبل ص ۳۳)

اسی کا اندازہ کرنے کے لئے کہ انگریزی تعلیم کس حد تک اس نصب العین کے لحاظ سے بار آور ہو رہی ہے۔ عموماً کام اور نتیجہ کا جائزہ بھی وقتاً فوقتاً لیا جاتا تھا۔ سرچارلس تریویر لین جو اس مسئلہ سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے اور ترقی کر کے گورنری کی عہدہ تک پہنچے تھے، انہوں نے لکھا تھا کہ

”کلکتہ چھوڑنے سے قبل میں نے تمام ان تعلیم یافتہ لوگوں کی فہرست بنوائی جو عیسائی ہوئے“ (ص ۱۴۱ روشن مستقبل)

اور گو عیسائیت کے قبول کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ لیکن سبھی نتیجہ بہت زیادہ کامیاب تھا، لارڈ میکالے کے الفاظ میں جس کی تعبیر یہ تھی کہ

”کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا“

الغرض انگریزی تعلیم کا یہ ”سلبی اثر“ کہ اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ جہاں اس کا پتہ چلتا تھا، اسی کے ساتھ ایجابی نتائج کے متعلق لارڈ صاحب ہی نے یہ بھی لکھا تھا کہ پھر

”ان میں بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں، یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں“

”موحد ہو جاتے ہیں“ بظاہر ان الفاظ سے اشارہ شاید ان ہندوؤں کی طرف کیا گیا ہے جو انگریزی تعلیم پانے کے بعد بنگال میں راجہ رام موہن رائے کے قائم کئے ہوئے ”برہو سماج“ یا علامہ بمبئی کے ”پرلر تھن سماج“ والی سوسائٹیوں میں شریک ہو کر موحد بن جاتے تھے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے جاتے دالے ان سے کم و بیش واقف بھی ہیں، لیکن اسی سلسلہ میں اندونی طوط پر بے پاؤں ایک اور سیلاب بھی اس زمانہ میں جوڑ چمکیاں دے رہا تھا۔ تاریخ کے اسی حصہ کے متعلق ”خاموشی والی سازش“ شاید اختیار کی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے عام مشترک نام کا ازالہ کر کے یہ جو کچھ لیا گیا تھا کہ قدرتاؤگ عیسائی

مذہب کو قبول کر لیں گے، ایک تو یوں بھی صحیح نہیں تھا کہ عیسائیت کی توحید خود تخلیث کے معنی میں اچھ کر
 جیتنا بنی ہوئی تھی، اور گو اس ملک میں اسلام کے نمائندے اسلام سے زیادہ خود اس ملک کی مشرکانہ
 ادبام ہی میں لفظوں کے پیر پیر سے غوطے کھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان نہ ہی، مسلمانوں کی آسمانی کتاب
 اور اس آسمانی کتاب کے لانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی کتابوں میں موجود تھی، اسی
 کے ساتھ ایک غیبی لطیفہ اس ملک میں خلیک اسی زمانہ میں حضرت مولانا سید شہید بریلوی اور ان کے
 رفقاء صدیقین و شہداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شکل میں اچانک ظاہر ہوا تھا۔ یہ حضرات خالص اسلامی
 توحید کے مجسم نمونہ بھی تھے، اور اسی کی سادگی بھی ملک کے طول و عرض میں کمال جوش و خروش
 کے ساتھ کر رہے تھے۔

پس ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اپنے آبائی مشرکانہ دین کی صداقت سے جیسا کہ میکالے نے لکھا
 ہے، ہٹ رہا تھا۔ ان میں عیسائیت، یا عیسائیت کے بغیر توحید کے قبول کرنے والوں کے ساتھ ساتھ
 واقعہ یہ پیش آیا تھا۔ ایک بڑا طبقہ تھا جو اپنے ملک کے خالص توحیدی دین اسلام کو قبول کر رہا تھا،
 کس پیمانے پر قبول کر رہا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہر سکتا ہے، کہ ۱۸۵۷ء میں تحفۃ الہند نامی مشہور کتاب
 ایک تو مسلم مولوی محمد عبید اللہ صاحب کی جو ضائع ہوئی تھی، اس میں مولوی صاحب نے اپنے قصبہ
 پاشل (متصل لودھیانہ پنجاب) اور اسی کے گرد و نواح میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد جو بتائی ہے
 قریب قریب ستر تو وہی پہنچ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بڑی حکومت کی بدولت ملک ایک نئے ماحول سے آشنا ہوا تھا، اس ماحول کو
 دوسرے نتائج جو قصداً پیدا کئے جا رہے تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ قصداً اور نامادہ کے بغیر اندہی
 اندہا اسلام اور اسلامی توحید کی طرف بھی لوگ گھنچنے لگے۔ اسی کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی
 مصنف کتاب نے نقل کئے ہیں، کہ اعلان اسلام سے پہلے اپنے خاندانی پردہت برہمن سے منافقا
 لکھا ہے کہ میں نے کہا کہ پردہت جی میں تو مسلمان ہو گیا۔ اس فقرے کو سن کر بجائے بگڑنے کے
 لکھا ہے کہ پردہت صاحب نے کہا کہ

”مہاراج جہاں جہاں وہیں پر وہت“

یعنی جو مرید کا دین وہی پیر کا دین بھی ہے۔ پہلے تو سمجھا گیا کہ یہ گفتگو دل لگی کے طور پر ہوئی لیکن بعد کو عیاں کہ مولوی عبید اللہ نے لکھا ہے کہ پر وہت جی

”گھر بار چھوڑ کر مسلمان ہوئے“ ملا:

مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں مختلف طریقہ سے اپنے بعض ذاتی مشاہدات و تجربات کا بھی تذکرہ کیا ہے جن سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ علانیہ دین اسلام قبول کرنے والوں کے سوا کافی تعداد اس زمانہ میں اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، جو بظاہر اپنی شکل و صورت سے مسلمان نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن واقعہ میں اسلام کو اپنا دین بنا چکے تھے، ایک دل چسپ قصہ اسی سلسلہ میں انہوں نے لاہور کا درج کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لکھا ہے کہ

”ایک مسافر ذی عزت، صاحب کمند ساکن شاہ جہاں آباد (دہلی) سے ملاقات

ہوئی، اسے ظاہر میں سراوگی تھے اور میں ان دنوں میں اپنا اسلام مخفی رکھتا تھا“

خلاصہ یہ ہے کہ اسی دہلی مسافر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ درمیان میں کچھ مذہبی گفتگو چھڑی، تاہم ایک آخر میں اس سراوگی نے اقرار کیا کہ

”میں مدت سے پردہ میں مشرف باسلام ہوں اور نماز پیچھے نہ ادا کرتا ہوں“ ۵۵

لیکن مصلحتاً دوسروں پر اس کو ظاہر نہیں کیا ہے اس قسم کے متعدد واقعات کا تذکرہ مختلف مقامات پر اس کتاب میں کیا گیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ منہل حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی حکومت اس ملک میں جیب قائم ہوئی، تو اس سلام کی طرف غیر معمولی رجحان یا شندوں کے قلوب میں پیدا ہو گیا تھا۔ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں ایک موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ

”پر وہت کا مطلب مولوی صاحب نے خود ہی لکھا ہے کہ غافلانہ سیروں کی یہ ہندو تفسیر ہے، شاہی راہ اور مومنان وغیرہ

میں ان سے کام چلتا ہے۔ بھجان یعنی مرید لوگ اپنے اپنے پرہیزگوں کو ہی تقریروں میں مذہب نیاز دیتے ہیں ۱۲

”یاد جو دیکھ فرنگی لوگ لکھا روپیہ خرچ کرتے ہیں، اس بات پر کہ لوگ ان کا دین (عیسائی) اختیار کریں، چنانچہ پادریوں کو نوکر رکھنا، اور مدرسوں کا تعمیر کرنا، اور کتب خانوں کا تقسیم کرنا، اسی واسطے ہے۔“

پھر یہی نہیں وہی آگے لکھتے ہیں

”اور جو کوئی ان کا (فرنگیوں کا) دین اختیار کرتا ہے، اس سے نان و نفقہ کی بھی مرمت کرتے ہیں۔“

مگر ان ہی کا بیان ہے کہ بجز ”بے عقل حوادث زدہ“ لوگوں کے عیسائی دین قبول کرنے والوں میں ”کوئی ہزار میں ایک آدمہ ہوتا ہے۔“

برخلاف اس کے اسلام کے متعلق وہی لکھتے ہیں کہ

”اسلام یاد جو دیکھ یہ سبب نہ ہونے سلطنت اہل اسلام کے اس ملک میں ضعیف ہو گیا ہے اور اکثر اہل اسلام کہ مستحق، و اہل مرمت میں چنداں اسباب دنیاوی موجود نہیں رکھتے کہ کسی شخص مشرف باسلام کا روٹی اور کپڑا اپنے اوپر کر لیں۔“

مگر بایں ہمہ اپنے زمانہ کا یہ حال انہوں نے درج کیا ہے کہ اس ضعف اور بے توانی ’و بے کسی کے باوجود بہت سے آدمی اپنی حشمت دنیاوی چھوڑ کر دین اسلام کو اختیار کرتا اور درویشی و غلی میں آنا غنیمت جانتے ہیں۔“

واقعات جو سننے میں آتے ہیں، واقعی ان کو سن کر حیرت ہوتی ہے، ایک طرف بہار میں ایک راجپوت ریاست کھیرانا می کے راجہ کے بھائی جو بعد کو راجہ عبدالرحمن آف مرچا کے نام سے مشہور ہوئے، اور اس وقت ان کے خاندان کے لوگ مرچا میں موجود ہیں۔ تو دوسری طرف مولوی عہد اللہ صاحب نے ایک پیراڑی سردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے ان کا نام

”کنور جوالا سنگھ تھا۔“

اپنی متعدد بیویوں اور ملازم کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ شیخ غلام محمد اب ان کا نام ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جس قسم کی نئی ذہنی بلچل انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اس ملک میں پیدا ہوئی، علاوہ ان یونیورسٹیوں کے، جن کے ذریعہ جدید مغربی علوم سے ملک کو آشنایا جا رہا تھا، بقول سرچارلس ٹریلین

”بالواسطہ کتابوں، اخباروں، یورپیوں سے بات چیت وغیرہ“

سے دلوں اور دماغوں پر جو رنگ قدرتی طور پر چڑھ رہا تھا، یا قصہ آ حکومت اپنے خاص باطنی اغراض سے چڑھا رہی تھی۔ اب اس کو کیا کہئے، کہ خالی تو کئے جا رہے تھے لوگوں کے دل اور دماغ بپتسمہ کے پانی سے بھرنے کے لئے، لیکن عین اسی زمانہ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اُس مقدس پانی سے دیکھا جا رہا تھا وہ بھرتے چلے جا رہے ہیں جو اسلامی دین کے سرچشمے سے ایل ہوا تھا، افسوس ہے کہ باوجود تلاش و جستجو کے حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی متعلقہ کتابوں میں اس قسم کی اجمالی اطلاعات جو دی گئی ہیں، کہ جو دریائی سفر آپ کا دلی سے گلگت تک ہوا تھا۔ اس سفر میں مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کے قبول کرنے والوں کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاہد تھی۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل کیا تھی، بجز مولوی عبید اللہ صاحب حرم کی اسی کتاب ”تختہ البند“ کے جس میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اندر آپ کے رفقاء کا ذکر غیر معمولی احترام سے کیا گیا ہے، اور اسی سے کچھ میں آتا ہے، کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ سید شہید کی تحریک کے اثر پذیروں میں تھے۔ بس اس کے سوا اس زمانہ کی کسی تصنیف میں اب تک تفصیلات کا پتہ نہیں مل سکا ہے۔

سوال یہی ہے کہ گورنری تک پہنچنے والے حکام جس حکومت کے فہرست ان لوگوں کی جب تیار کر رہے تھے، جو حکومت کی منت خانی تدبیروں کے زیر اثر اپنے آبائی دین سے منگڑواں ہو کر عیسائی دین قبول کر رہے تھے۔ کیا اسی حکومت کی نظر اس پر نہیں پڑ رہی تھی کہ زمین تو حکومت اپنی بالواسطہ یا بلاواسطہ مصارف سے تیار کر رہی ہے، لیکن اسی کی تیار کی ہوئی زمین سے فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں، گو یا پھل توڑنے کا موقع ان کو مل گیا ہے، جنہوں نے نہ درخت ہی لگائے، نہ ان درختوں کی

آبیاری و نشوونما میں کوشش کی تھی، مطلب یہی ہے کہ اپنے موردی دین سے بدگمان اور بدظن کرنے کا کام تو حکومت انجام دے رہی تھی، اور اسی لئے دے رہی تھی تاکہ اس ملک کے باشندوں کا مذہب بھی دبی ہو جائے جو اس کے حکمرانوں کا ہے، یعنی لوگ عیسائی ہو جائیں۔ لیکن بیچ میں بیکار اس صورت حال سے اسلامی دین کے دائرہ کی وسعت میں جو مدخل رہی تھی، اور جو حق درجوں لوگ اس زمانہ میں دقت گیر کش اسلام جو ہو رہے تھے، کیا یہ سمجھ میں آئے کی بات ہے کہ دن کی روشنی میں اپنی کتہ و کاوش کے اس عجیب و غریب نتیجے سے حکومت اندھی بنی بیٹھی رہ سکتی تھی۔

میں نے جو عرض کیا تھا کہ تاریخ کے اوراق پھاڑ دیئے گئے ہیں۔ ان پچھلے ہوئے اوراق میں ایک درق یہ بھی ہے۔ اس زمانہ کی معمولی معمولی جزئیات سے بھی نتائج اس دقت جو پیدا ہو سکتے تھے، یا آئندہ جن کے پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ کتابیں اٹھا کر دیکھئے، سب ہی پر بحث کی گئی ہے اور حکمت و دانش کے دریا بہا دیئے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ فقیر نے کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خطرہ بھی حکومت اور حکومت کے کارندوں کے دنوں پر کبھی نہیں گذرا، سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن حکومت کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ طریقہ عمل سے خواہ کچھ بھی باور کرایا جا رہا ہو لیکن یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا حکومت اس کے سلسلہ کیوں ہی آگے بڑھنے کے لئے چھوڑ دی۔ عقل کا افتخار تو یہی ہے لیکن اس عقلی نتیجے کے لئے جن تاریخی شہادتوں کی ضرورت ہے، مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ تفصیلاً ان کے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ صرف چند گروے بڑے مگر طے مل گئے ہیں، انہیں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں، ان ہی کو جو ذکر کچھ پڑھ سکتے ہوں پڑھ

(۱)

پہلی بات تو اس سلسلہ کی یہ ہے کہ وہی کلکتہ جو اس زمانہ میں اس قسم کی کارروائیوں کا مرکز تھا، اسی شہر میں کچھ دن بعد یعنی ان ہی دنوں کے بعد جن میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اور شادیوں کے چکائے جا رہے تھے کہ

”تیس سال بعد بنگال میں ایک ہندو باقی نہ رہے گا“

بنگال ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر ہند کے متعلق توقعات قائم کی جا رہی تھیں، کہ
”جیسے ہمارے آباء و اجداد ایک دفعہ عیسائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی
سب کے سب ایک دفعہ عیسائی ہو جائیں گے“

انگریزی نظام تعلیم کے نفاذ میں کامیاب ہونے والے صاحبزادے لالٹ صاحب اپنے بڑے مسمی
باب کو خردہ سنا رہے تھے کہ

”کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔
جس کلمتہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے، کہ اسی کلمتہ میں دیکھا جاتا ہے، کہ گوری
کھال، گورے رنگ کا آدمی یہ کہتے ہوئے، کہ

”میری رگیں میں ایک ہندو بھی غلامی کے خون کا نہیں ہے“

انگریزی زبان میں ہندوؤں کے ایک مجمع کو خطاب کر کے احسان جتلا رہا ہے، کہ انگریزی حکومت نے
انگریزی نظام تعلیم کو جاری کر کے ہندوؤں کی عام ذہنیت میں جو انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی، ان الفاظ میں
باد دلاتے ہوئے کہ

مذہب کی تعلیم دنوں سے قریب قریب دور ہو چکی تھی، مغربی تعلیم، اور مغربی تعلیم یافتہ
ستادوں کا اثر اس قدر عادی ہو گیا تھا، کہ ہندو تعلیم یافتوں کا پچاس فی صدی ۱۹۰۰
مادہ پرست، اور روحانیت کا منکر، ۲۵ فی صدی سنشی مان (بتلائے شک)، اور باقی ۲۵
فی صدی کٹر ہندو رہ گئے تھے“

صرف بنگال ہی نہیں، اس نے کہا

”کل ہندوستان میں تعلیم یافتہ جماعت کی یہی کیفیت ہو گئی تھی“

اسی نے کہا کہ اس زمانہ میں

”تعلیم یافتہ ہندوؤں کی چٹکی لی جاتی تھی، اور جب کبھی اہل مغرب کے سامنے اپنے

مذہبی عقائد اور قومی دھرم کا اظہار کرتے تھے، طعن و تشنیع کی صدا گوش زد ہوتی تھی ۛ

اس کے بعد یہی مقررہ اطلاع دیتے ہوئے، کہ

”مگر اب زمانہ بدل گیا ۛ

بدلے ہوئے زمانہ میں جو کچھ ہوتا تھا، اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے، کہ اب

”زیادہ تر تعلیم یافتہ ہندو اپنے مذہب پر خوشواش کرتے ہیں، اور لائق سے لائق جماعتوں

میں اپنے عقیدوں کے ثابت کرنے میں مطلق شرم نہیں کرتے ۛ

پھر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ ہندو مذہب کے شائستروں اور کتابوں کی کس پرسی کا ناز گذر گیا۔

اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ

”قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا جا رہا ہے، غیر سے وہ بڑھی جا رہی ہیں۔ بہت اعلیٰ درجہ کی

کتابیں چھپ گئیں، اور چھپتی چلی جا رہی ہیں۔ بہتوں کا انگریزی اور روسی بھاشاؤں میں ترجمہ

بھی ہو گیا ہے، اور زمانہ حال کی تحقیقاتی معلومات کے زیر اثر ان کی تشریح کی جاتی ہے ۛ

یہ ہے تاریخ کے دریدہ اوراق کا ایک ٹکڑا۔ یہ اقتباسات جن صاحب کی تقریر کے ہیں، ان کا بڑا

تھا، کرنل اسکاٹ صاحب، یہ کون تھے، کہاں کے تھے۔ ان تفصیلات کو تو چھوڑیے۔ لیکن کر،

کے نام کا جو جزو ہے، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ کسی زمانہ میں شاید فرجی خدمت سے تعلق رکھتا

یہی صاحب ہیں، جو دنیا کی مشہور نام نہاد مذہبی سوسائٹی تھیاسوفیکل کے بانی تھے۔ میڈم ملیو

کی مددگار اور معاون تھیں۔ ہندوستان میں تو خود ان کی تشریف فرمائی مشاعرے میں ہوئی، لیکن اور

سوسائٹی اور اس کی شاخیں مشاعرے سے بہت پہلے امریکہ اور یورپ میں قائم ہو چکی تھیں۔ ۛ

یہی میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ میں ہندوستان کے ”بودھ مذہب“ کا بیرو ہوں۔ مسز انی بیسنٹ

ان ہی کرنل اسکاٹ کی ہندوستان میں جانشین بن کر نمایاں ہوئی تھیں۔ ہندو کالج بنارس جو اب ہندو

یونیورسٹی ہے، اس کے سوا مسز انی بیسنٹ ہی نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں نئے نئے ناموں

سے مختلف تعلیمی اور دینی ادارے جاری کئے۔ عداس میں بمقام ادیار میلوں میل کے رقبہ میں ہندو کے

کے کنارے ایک آشرم یا خانقاہ بھی ان کی قائم کی ہوئی، اس وقت تک موجود ہے، جس میں گو دنیا کے اکثر مذاہب کی نمائندگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن دراصل چھاپ اس پر ہندو دھرم ہی کی ہے۔

بہر حال یہی کرنل اسکاٹ صاحب ہیں، جنہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے، ہندوؤں کی نئی انقلابی ذہنیت کا اعلان مذکورہ بالا الفاظ میں کیا۔ اور یہ سب کچھ فرمائے کے بعد آخر میں عیسوعی کے واقف کار شریف ہندو صاحبوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ یہ ذہنی انقلاب جو ہندوؤں میں پیدا ہوا، اور بیداری کی نئی لہر اپنے آبائی اور موروثی دین کے متعلق ان میں جو اٹھی، اور جو نتیجے اس سے پیدا ہوئے۔

”ان تسکین بخش نتیجوں کی تکمیل کہاں تک تھیاسوفیل سوسائٹی کے ذریعہ ہوئی ہے، آپ خود کہہ سکتے ہیں، میرے کہنے کی ضرورت نہیں ہے“۔
تاریخ کے پٹے ہوئے دقیق کا تو یہ ایک ٹکڑا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۲)

تھیاسوفیل سوسائٹی اور اس کی شاخیں امریکہ اور یورپ میں قائم ہو رہی تھیں، لیکن اس سوسائٹی اور اس کی مختلف شاخیں جن کا جال یورپ و امریکہ کے شہروں میں پھیلا ہوا تھا، اس کے لئے سردار اور امام، حاکم، گرو اور استاد کی جگہ خالی تھی، کہ اچانک امریکہ و یورپ کے اخباروں میں ایک اعلان شائع ہوتا ہے، یہی کرنل اسکاٹ صاحب جو سوسائٹی کے بانی مہاتمی اور روح رواں تھے، ان ہی کا اعلان شائع ہوتا ہے، کہ ایک شخص، جو قطعی طور پر انگریزی زبان کے ایک حرف سے بھی آشنا نہ تھا۔ نہ یورپ کی دوسری زبانوں میں سے کسی زبان سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتا تھا جس نے یورپ ہی کو دیکھا تھا، اور نہ امریکہ کو اور شاید امریکہ و یورپ کے باشندوں سے اس کے تعلقات بھی نہ تھے، وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی عام بولی جانی دالی زبانوں میں بجز گجراتی زبان کے اور کسی زبان کو نہیں جانتا تھا۔ خانگی طور پر تھرا کے بعض پنڈتوں سے البتہ منسکرت زبان کی ادبی تعلیم اس نے کچھ

حاصل کی تھی۔ خود اس کی زندگی میں ایسی عام باتیں یعنی کہاں کا رہنے والا ہے، کس خاندان کا تعلق ہے، ان باتوں کا صحیح علم لوگوں کو نہ تھا، البتہ وجودِ طبع کو مشنوں کے آج تک، اس کی زندگی کے یہ ابتدائی سوالات تقریباً کچھ نا فیصل شدہ شکل ہی میں ہیں۔ سناٹا چھا گیا، دنیا میں سناٹا چھا گیا، جب تھیا سونیئل سوسائٹی اور یورپ و امریکہ میں اس کی پھیلی ہوئی ساری شاخوں کی طرف سے یہ اعلان پڑھا گیا، کہ ہندوستان کے اسی شخص کو

”ہم اس سوسائٹی کا سرور ادا پنا پڑا اگر وہ رہنا اور حاکم قبول کرتے ہیں“

(کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم ص ۲۵۴)

یہ پراسرار شخصیت پنڈت دیانند سرسوتی بہاراج کی تھی، جو آریہ سماج کے مشہور بانی (اور بزرگ) سمجھے جاتے ہیں، وہی مغرب مشرقی اور مشرقیوں میں بھی سکین ہندوستانی جس کے سینے تقریباً ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ سے چھیدے جا رہے تھے۔ بے دردی کے ساتھ برسانید لے اس قسم کے تحقیری تیروں کے برسانیکے عادی تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ

”یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں ہندوستان و عرب کے سائے

علم و ادب کے برابر ہیں“

دلوں میں تجلی نیز دلوں کی ایسی انیاں بھی ہوئی تھیں۔ کہنے والے کہتے پھرتے تھے کہ

”ایک انگریز نیم حکیم عطائی کے لئے (ہندوستانی طب) موجب ننگ و عار ہے“

صبح و شام قبہ قبہوں کے ساتھ اس قسم کے فقرے دہرانے والے دہراتے رہتے تھے، کہ

”ان کو دہندی معلومات نجوم و افلاک کی پڑھ کر انگلستان کے زمانہ عہدہ کی لڑکیوں کی

ہنسی رک نہیں سکتی“

یہ فقرے لارڈ میکالے کی اس مشہور تعلیمی رپورٹ میں استعمال کئے گئے ہیں، جو ہندوستان کے مستقبل

لاٹ صاحب مردوخ نے تیار کر کے حکومت میں پیش کی تھی۔

اور یہ تو ادنیٰ نمونہ ہے، ان نکو ہیدہ کو مشنریں کا جن کے ذریعہ ہندوستان کے باشندوں کے

قلب میں اپنی اور اپنے اسلاف کی بیچ میٹری، کم مانگی کی تخم پاشی میں اڑی سے چوٹی تک کا زور
نئی قائم ہونے والی حکومت لگا رہی تھی۔ درد کی یہ داستان کافی طویل ہے۔

یہاں مجھے کہنا یہ ہے، کہ جس یورپ فامریک کے متعلق یہ یاد رکھایا جا رہا تھا۔ کہ وہاں کے زنانہ
مدروں کی لڑکیاں بھی اپنی ہنسی کو ہندوستانی دل و دماغ کے علمی اور فکری نتائج کو سن کر روک نہیں سکتیں
تاریخ کے ہزارہا ہزار سال کی سرسریوں اور دماغ کا دیروں کے بعد بھی علم کی جن شاخوں کے متعلق
اس ملک کے باشندوں نے جو کچھ بھی سوچا سمجھا، لکھا پڑھا تھا، اعلان کر دیا گیا تھا، کہ یورپ و امریکہ
کی موجودہ تحقیقاتی تالیفات و تصنیفات کے مقابل میں ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے، جہل و
حماقت کے سوا وہ اور کچھ نہ تھے، سوچنے کی بات ہے کہ اچانک اسی جہل کدہ اندر حق ناز ہند کی ایک
انفرادی شخصیت کے علم و فضل کا صرف اعتراف ہی نہیں کیا گیا، بلکہ تھیا سونیکل سوسائٹی جس زمانہ
میں قدیم و جدید علوم و معارف کے بڑے بڑے مستند ماہرین اور علم الثبوت فضلا کی یورپ و
امریکہ میں کافی با عظمت سوسائٹی بھی جاتی تھی، اسی سوسائٹی کا "بڑا گرد" وہ نام، حاکم "تسلیم کر لیا گیا،
ہندوستان کے اخباروں میں یورپ کے اخباروں سے منقول ہو کر جب یہ خبر شائع ہوئی ہوگی، ہند
قوم کے دل شکستہ، پست حوصلہ، تعلیم یافتہ طبقات کے نفیات پر اس خبر کا جو اثر مرتب ہو سکتا
تھا، شاید موجودہ حالات میں ہم اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ملک کے اس بہت بڑے فرد کی علمی
عظمتوں سے قلب اگر لب ریز ہو گئے، تو جس طریقہ سے خبر کی اشاعت کی گئی تھی، اس کا یہ لازمی
منطقی نتیجہ تھا، خصیہ صاحب یہ سوچا جاتا تھا کہ دوسروں سے کچھ لئے بغیر صرف اپنے خانہ ساز گھر کو
علوم سے اس غیر معمولی وقار و عزت کے حاصل کرنے میں وہ ان مالک میں کامیاب ہو رہے ہیں، جہاں
بکھا جاتا تھا کہ جہل و حماقت، اٹھیں اور نادانی کے سوا ہندوستان میں نہ پہلے کچھ تھا، اور نہ اب کچھ ہے۔
بہر حال دیکھا گیا کہ تنہا کے ایک نابینا پنڈت، درجہ مند جیہیں ہندہ روپے کی انداد کسی راجہ سے ملتی تھی،
ان ہی کے خانگی پاٹھشالہ کا ایک طالب علم یا برہمنچریہ جس نے مسکرت کے سا کسی سے کچھ نہ پڑھا تھا،
نہ سیکھا تھا۔ اچانک وہی، بمبئی کے حبش راناٹے کے کبھی یہاں میں، اور کبھی احمد آباد میں ایک دوسرے مرہٹہ

نچ مارے بساہ پنڈت گوپال راؤ ہری دیش مکھ کی دعوت پر ایک مہینہ ان کے ساتھ رازدنیاز میں بسر کرتے ہیں۔ نکلنے کے مشہور ممتاز تعلیم یافتہ افراد کیشپ چندر سین مہرشی، دیندو ناتھ ٹیگور، بابو راج نارائن بوس وغیرہ سب ان کے دست بنے ہوئے ہیں۔ الغرض جس بڑے شہر میں جاتے ہیں، وہاں کے تعلیم یافتہ ہندو جن میں کچھ ترقی صدی افراد کا بقول اسکاٹ صاحب اپنے موندنی دھرم پر اعتماد باقی نہ رہا تھا، وہ اپنے غریب ذات کی تسکین کے لئے اطمینان کے کسی نئے سرمایہ کی تلاش میں تھے، ان کو دیکھا جا رہا تھا کہ وہ پنڈت جی کو شمع محفل بنا کر خود پر دانے بن کر ان پر اس لئے ٹوٹ رہے ہیں، کہ ان کو اپنے گھری میں ایک ایسی شخصیت مل گئی۔ جسے یورپ و امریکہ کے اہل علم و فضل اپنا گرد اپنا رہ نما، اپنا حاکم تسلیم کر چکے ہیں، ان ہندو تعلیم یافتوں میں اس وقت تک زیادہ سے زیادہ ایسا شخص تو پیدا ہو چکے تھے۔ جنہیں نے شاگرد بن کر یورپ و امریکہ کی جدید یونیورسٹیوں سے سند حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، لیکن مغربی ممالک کی ان جدید یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں نے بھی جسے اپنا گرد و راستا دمان لیا ہو۔ ان ہی میں کیا شاید پورے مشرق میں پنڈت دیانند سروتی جی اس کی اپنی آپ مثال تھے۔

پنڈت جی کو یورپ کے ان نئے تعلیم یافتہ ہندو مفکرین، جن میں مذہبی اور سیاسی مختلف فرقے رکھنے والی ہستیاں تھیں، ان سے کیا کیا مشورے ملے، یا ان کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر خود پنڈت جی کے دماغ میں کس کس قسم کے نئے خیالات پیدا ہوئے۔ میرے لئے اپنی اس کتاب میں سب کی نہ تفصیل کا موقع ہی ہے، اور سچی بات یہ ہے، کہ مدون پندہ کی ان سرگوشیوں تک ہر کردار کی رسائی آسان بھی نہ تھی، لکھنے والوں نے پنڈت جی کی سوانح عمریوں میں کچھ کھا بھی ہے، تو مشتے از خروارے کو زیادہ نہ وہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

پنڈت جی کو یورپ و امریکہ کی تھیا سوفیکل سوسائٹیوں کے صدرا الصدور یا رئیس اکبر بنانے کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کرنل اسکاٹ زمانہ تک ہندوستان سے باہر ہی رہ کر کام کرتے رہے۔ اس عرصہ میں دیکھا گیا، کہ پنڈت جی جو پہلے منسکرت زبان میں تقریر کیا کرتے تھے، نکلنے کے

بابو کیش چند سین کے مشورے کے مطابق ایسی عام فہم زبان میں تقریر کی مشق ہم پہنچائی، جسے تعلیم یافتہ طبقہ ہندوؤں کا کچھ سکتا تھا، ان تقریروں میں کیا ہوتا تھا۔ ان کا اندازہ رنگ دید اور بکروید کی ان تفسیروں (بھاشیہ) سے ہوتا ہے، جسے لکھ کر اس زمانہ میں پنڈت جی شائع کرتے رہتے تھے، اور پروفیسر سیکس مولے جن کو ”عجائبات کا ذخیرہ“ قرار دیا تھا۔ اور سنسکرت زبان و علوم کے مستند استاد پروفیسر ڈاکٹر اچ۔ ڈی گروسلو ایم۔ اے نے اپنی رائے یہ دی تھی کہ

”سوامی جی ویدکے وہی معنی لگا لیتے ہیں، جن سے ان کا مطلب نکلا ہے، لگو یا ان کو ویدک

الفاظ پر جا کا نہ تصرف کے اختیارات حاصل ہیں۔“ ۱۹۹

گر ورسولہ صاحب ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ

”تفسیر کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ اپنے خیالات ان کتابوں میں داخل کر دیے جائیں بلکہ

مطلب یہ ہے کہ مصنف کے خیالات کو کتاب کی عبارت سے اخذ کیا جائے۔“

پنڈت جی کی تفسیری خصوصیت کی تعبیر یہ تھی کہ وہ یعنی پنڈت جی

”جس عبارت سے جو مطلب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔“

جیسا کہ پنڈت پانڈونگ صاحب ایم۔ اے نے جو سنسکرت کے متقدم فاضل تھے، اپنی رائے پنڈت

جی کی تفسیروں کے متعلق یہ ظاہر کی تھی۔

”ان کی تفسیروں ویدکا اصل مطلب تو نہیں ہے، بلکہ وہی مطلب ہے جس کو وہ چاہتے تھے،

کہ وید میں ہونا چاہئے۔“ ۲۰۰

واقعہ یہ ہے، کہ تمدن و تہذیب، سیاست و تدبیر تحقیق و تلاش کے جن نتائج تک یورپ پنڈت جی

کے زمانہ میں پہنچ چکا تھا، صرف ان ہی کے متعلق نہیں بلکہ قیامت تک ان راہوں میں جن نتائج تک

پہنچنے کا عقلی امکان ہے، یا آدی جن کو فرض کر سکتا ہے۔ کھلے کھلے صاف صاف لفظوں میں پنڈت

جی نے اصرار کے ساتھ اس دعوے کا اعلان کیا کہ ہمارے ویدوں میں سب کا ذکر موجود ہے اور گزشتہ

زمانہ میں وید کی ماننے والی قوم یہ سب کچھ کر کے ختم کر چکی ہے۔

دید کی عبادتوں سے مطلب برآری کے حاکم: اقتدار کے بعد ظاہر ہے کہ پنڈت جی نے بڑے کچے کیا اس کی بھی زیادہ کیا جاسکتا ہے، اور خواہ دید کی عبادتوں سے واقعی وہی مطالب نکلتے ہوں جنہیں پنڈت جی نکالتے تھے، یا نہ نکلتے ہوں، لیکن اپنے آبائی دھرم کے دائرے سے ہندوؤں کا جو تعلیم یافتہ طبقہ یا ہر کل چکا تھا، اور نکلنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی، جیسا کہ کرنل اسکاٹ صاحب کی شہادت گزر چکی، نکلنے کے بعد نکلے ہوئے بھی واپس ہونے لگے، اور آئندہ نکل جانے کا خطرہ بہت حد تک کم ہو گیا۔

بعد کو کرنل اسکاٹ صاحب اپنے مائے گرو، حاکم ورہتا سے ملنے کے لئے ہندوستان بھی پہنچے۔ سہارنپور اور میرٹھ جو زیادہ تر پنڈت جی کی علمی جدوجہد کی آماجگاہ تھے، کرنل صاحب کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان ہی دونوں مقامات میں باہم دونوں کی ملاقات ہوئی، یہ لکھتے ہوئے کہ ”سہارا پریل کو بہ مقام سہارنپور واقع مالک مغربی و شمالی سوامی (پنڈت دیانند) کی پہلے پہل ہماری ملاقات ہوئی“۔

آگے کرنل صاحب کی ڈائری کے الفاظ ہیں

”ہمارے اور سوامی جی کے درمیان لمبی اور پرجوش بحثیں ہوئیں“

سہارنپور کے بعد لکھا ہے کہ

”۳۴ مارچ، ۱۸۵۷ء، رشی کو میسر ٹھوس ہوئی رہیں“ ۲۵۷

یہ قصہ کہ براہ راست ملاقات کے بعد اسکاٹ صاحب اور پنڈت جی کے تعلقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کا کیا مطلب تھا، یہ ارادی تبدیلیاں تھیں، یا بخت و اتفاق کی پیداوار تھیں یہ سارے مسائل میرے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ اس موقع پر ذکر کرنے کی بات یہ ہے کہ کرنل اسکاٹ اور سوامی جی کی ملاقات سے چار پانچ سال پہلے، جب سارا ہندوستان پنڈت جی کے ان عجیب و غریب لکچروں، تقریروں و کتابوں کے ذکر سے گونج رہا تھا۔ جن میں ثابت کیا جاتا تھا کہ آج یورپ، ان کے پاس توپ، بندوق، دھانی گاڑی، دھانی چھانسی، دھانی جہاز، تار برقی جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، یا آئندہ جن اکتشافات

کی توقع کی جاتی ہے، یہ سب کچھ ہندوستان میں موجود تھا، ساری دنیا کا پائے تخت ہندوستان ہی تھا، یورپ و امریکہ افریقہ اور ایشیا کے سارے ممالک ہندوستان کے باجگزار مقبوضات تھے، لہٰذا ایک کمر سنسکرت کے مجہول فقروں سے اسی قسم کے معلومہ سناٹے پنڈت جی پیدا کرتے تھے، گو اس زمانہ میں اردو ادب ہندی اخباروں کا چرچا زیادہ تو ملک میں نہ تھا۔ لیکن ہفتہ وار اخبار مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے تھے، جن میں پنڈت جی کی ان عجیب و غریب تقریروں کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔

ان تقریروں کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً پنڈت جی کی تصنیف کردہ کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں، ٹھیک ۱۹۵۵ء جو بھجری کے حساب سے ۱۹۹۷ء کا سال تھا۔ بنارس سے زبان ہندی ایک کتاب شائع ہوئی، اسی کا نام ”ستیا رتھ پرکاش“ تھا۔ اور لکھا ہوا تھا ”شری سوامی دیانند جیت“ یعنی سوامی دیانند جی کی لکھی ہوئی ہے۔ نویدین یا بشارت کے عنوان کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔

”یہ پستک شری سوامی دیانند مسرتی نے میرے ربہ (خرچ) سے برچی ہے۔ میرے ہی ربہ (خرچ) سے یہ ملات ہوئی (یعنی شائع ہوئی)۔“

نویدین کے عنوان سے یہ اعلان نئی قائم ہونے والی حکومت کی ایک بڑی خطاب یافتہ ہستی ”شری راج کرشن داس بہادری“ ایس۔ آئی۔“

کی طرف سے کیا گیا تھا جن کی مہر بھی کتاب پر ثبت ہے،

جس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے یہی سی۔ ایس۔ آئی۔ راجہ صاحب بہادری نے باضابطہ اجرت دے کر یہ کتاب پنڈت جی سے لکھوائی اور اپنے ذاتی مصارف سے ان ہی راجہ صاحب نے اس کو طبع کرا کر شائع بھی کیا تھا۔

یوں تو اردو ادب ہندی اخباروں کے ذریعہ پنڈت جی امدان کے خیالات کی عام اشاعت سے لوگوں کی عام توجہ ان کی طرف منقطع ہو ہی چکی تھی۔ آج پنڈت جی نے سہارنپور میں یہ کہہ کر میرٹھ میں یہ بولے، کانپور میں یہ اشتہار شائع کیا کہ دانا پور (بہار) میں ان کی تقریر اس موضوع پر ہوئی، ان عام

خبروں کے ساتھ ساتھ جوں ہی کہ یہ کتاب مطبع سوشلٹ ہو کر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچی، تو ایک طرف خود ہندوؤں اور ان کے مختلف فرقوں میں تہلکہ مچا ہوا تھا، ان کے دینی پیشواؤں، ان کی کتابوں، ان کے عقائد پر تنقید ہی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ شرفاء کے کان جن الفاظ کے سننے کے عادی تھے، اور جن فخر و کوشاید بے غیرت سے بے غیرت آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا، نہ معلوم پنڈت جی نے اپنی کئی صفحات پر ان کے استہزاء پر غیر معمولی غیاسی و کام لیا تھا، 'خیر یہ توجہ کچھ تھا، گویا پنڈت جی کا خانگی جھگڑا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ اپنی اسی کتاب میں پنڈت جی نے علاوہ ہندوؤں کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے دین، ان کی آسانی کتابوں، اور ان کے پیغمبروں کی بھی خبر لی ہے۔ ستیا رتھ پرکاش کا پبلائیڈیشن ہندی زبان میں شائع ہوا تھا۔ اسی لئے براہ راست عام مسلمانوں کے مطالعہ میں وہ کتاب تو نہ آ سکی، لیکن بعد کو اسی کتاب کے اردو ایڈیشن میں بڑے حصے والوں نے وہ سب کچھ پڑھا جس کا وہ شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔

کچھ بھی ہو، سوشلٹ کے ہنگامہ کے بعد چند ہی سال کے اندر تھوڑے بہت سکون کی کیفیت ملک میں جو پیدا ہو گئی تھی۔ پنڈت دیانند جی کی تقریروں اور تحریروں کی بدولت پھر ملک میں نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جو باتیں پنڈت جی کی طرف منسوب ہو ہو کر مسلمانوں میں پھیل رہی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اُن کو کھا اور نہ لالہ بکھج مسخوں میں حد سے زیادہ طیش آفرین ہو کھلا۔ یہ نہ لالہ غیظ انگیز الزام یہ تھا جو ستیا رتھ پرکاش میں آج بھی بایں الفاظ پایا جاتا ہے۔

”خدا اور مسلمان بڑے بت پرست اور پورانی (یعنی سابق دھرمی ہندو) اور جینی یعنی جین بت

کے پیرو چھوٹے بت پرست ہیں“ (مکولاس مگلہ - ۷۱۲ - ۱۱۲)

اسلام اور مسلمانوں کے دین پر تنقیدیں یا اعتراضات کے قصوں میں کہنے والے بہت کچھ کہتے چلے آ رہے تھے، لیکن اس کی طرف تو شاید اسلام کے بڑے بڑے ائمہ انجمن کادریان کبھی نہیں گیا ہو گا کہ اسلام جیسے خالص توحیدی دین پر مشرک کی بدترین شکل بت پرستی کا بہتان کبھی باندھا جاسکتا ہے۔ اپنی ساری ذہنی بلند پروازیوں، اور افتراء و بہتان کی انتہائی چابکدستیوں کے باوجود یورپ فالتوں کے

ماشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔

لیکن پنڈت جی کی ذہانت واقعی قابلِ داد ہے کہ دن کی روشنی کیلئے جو سب کے سامنے بھیلی ہوئی تھی، دھوئی لے کر ٹھکے کہ نہی صرف رات ہے، انجی سازی کہئے یا سندھ زوری کی یہ اپنی آپ مثال تھی ہندوستان کی اسلامی آبادی پنڈت جی کے اس اعتراض سے تھلا اٹھی۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ سوانح مخلوط کو مصنف نے پنڈت جی اور ان کی ”آریہ سماجی“ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے، جو کچھ لکھا ہے صرف یہی لکھا ہے کہ

”ہندوؤں میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جو مسلمان جیسے سوجدوں کو مشرک بتلانے لگا۔“

پنڈت جی کی اس تم نظریہ کے نتائج و آثار کا تخمینہ آج مشکل ہے۔ لیکن اپنی سیزہ صد سالہ تاریخ میں اس اچھوتے الزام کی پہلی آواز تھی۔ جو مسلمانوں کے کانوں کو ٹکرائی تھی۔ اس زمانہ کے اخباروں کے پرانے قائل کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ شمال سے جنوب تک اور شرق و مغرب تک ہندوستان کے طول و عرض میں بچل مچل ہوئی تھی، مسلمانوں کے ہر گھر میں اسی کا چرچا تھا۔

ادھر مدت کے بعد ہندوستان میں پادریوں کے بازاری و اعظوں کے ساتھ ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ کے سلسلہ میں اس ملک کی ایک دم کہیں نے تازہ جنم لیا تھا، قصہ تراں کا طویل ہے مختصر لفظوں میں یہ سمجھئے، کہ مناظرہ یعنی مختلف عقائد و اعمال رکھنے والے مذہبی فرقوں کا تحریک یا تقریر و ادائیگی اس لئے سمجھت و مباحثہ کہ حتی الوسع حتی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔

تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے اس کا سلسلہ جاری ہے، اور جاری رہے گا۔ لیکن مناظرے کے مقابل میں دوسرا اصطلاحی لفظ ”مکابره“ کا جو پایا جاتا ہے جس میں بحث کرنے والوں کے سامنے صرف ”ہم بڑے کہ تم بڑے“ کے سوا اور کوئی بلند نقطہ نظر نہیں ہوتا۔ ہر فریق پہلے ہی سے طے کئے ہوتا ہے، کہ کچھ بھی ہو، بہر حال فلاں مذہب کو غالب کر کے دکھانا ہے، اسی پر کوشش مرکوز ہے، اگر یا مذہب کی طرف سے وہی فرض انجام دیا جاتا ہے، جو کام آج کل کی عصری حد اتوں میں دکلاہ اور بیرونیوں کا طبقہ انجام دیتا ہے جس کی خیس لے لی جاتی ہے۔ اسی کی حمایت سمجھا جاتا ہے، کہ دیکھو

اور ہر سرور کا شخصی فریضہ ہے۔

دوسرے عالم سے اس وقت بحث نہیں، لیکن ہندوستان کی دینی تاریخ کی ممتاز ہستی شکر اچاریہ کی مذہبی معرکہ آرائیوں کی داستانیں جن کتابوں میں ملتی ہیں ان کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے سارا ملک مذہبی اور دینی کشتی گیروں کا گویا ڈنگل بنا ہوا تھا^۱ اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں تو مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے درمیان اس قسم کی مکارانہ یا دکیلانہ کش مکشوں کا پتہ نہیں چلتا، لیکن پنڈت دیانند سرسوتی جی کے گرد مسموم افواہی پنڈت درجاند کے جو حالات سوامی دیانند کی سوانح عمریوں میں ملتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے پنڈتوں میں شاید محدودی طور پر مذہبی مباحثوں کا ذوق منتقل ہوتا چلا آتا تھا، پنڈت دیانند سرسوتی نے

^۱ کہتے ہیں کہ بدھ مذہب اور جین متی کے ماننے والے اہل علم و فضل سے سارے ہندوستان میں گھوم گھوم کر شکر اچاریہ نے مقابلہ کیا تھا بڑی بڑی راجے، مہاراجے اپنی سرپرستی میں گھٹکراتے تھے اور شکست خوردہ ہوجی اور جینی دونوں کے متعلق دانشور اہل علم بالخصوص یہ قصبے کہاں تک صحیح ہیں، کہ کھیتے ہوئے گرم تیل کے کرٹا ہوں، ان کو تلوایا جاتا تھا، سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی ہے کہ سنگدلی اور تساوت قلبی میں انسانیت گرتے ہوئے اس حد تک بھی پہنچ سکتی ہے شکر اچاریہ کے ان مباحثوں کا تذکرہ ”دک و بے“ یا ”مشکو بے“ منسکرت زبان کی جن کتابوں میں کیا گیا ہے۔ براہ راست ان کتابوں تک تو میری رسائی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان ہی کتابوں کے حوالے سے بیان کرنے والوں نے کچھ باتیں بیان کی ہیں۔ پچھلے مودعین کا ایک طبقہ ان دونوں کتابوں کے تاریخی استناد کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس موقع پر ضمناً ایک بات کا خیال آگیا، ویسا ہی وحدت الوجود جسے ہندوستان کے مذہبی حلقوں میں کافی حسن قبول حاصل ہوا۔ کہتے ہیں کہ شکر اچاریہ ہی نے ویسا گیا کے بعض اشارات کو بنیاد بنا کر ایک مستقل نظریہ کا قالب عطا کیا۔ سنی ہوئی افواہی روایات سے متاثر ہونے والے بعض مسلمانوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے صوفیوں میں وحدت الوجود کا خیال ہندوستان کے اسی دیوانخی نظریہ کا عکس ہے، مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ خود شکر اچاریہ لیبار میں اس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جب اسی طیارہ میں تقریباً دو سو سال پہلے اسلام پھیل چکا تھا، اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی کافی اشاعت ہو چکی تھی۔ ۱۲

^۲ انگریزی زبان میں پنڈت دیانند سرسوتی جی کی ایک ضخیم سوانح عمری باوا جھونگہ کی لکھی ہوئی پائی جاتی ہے، اسی کتاب کے حوالے سے کتاب ”سوامی دیانندی امدان کی تعلیم“ میں پنڈت درجاند سرسوتی جی کے گرد کے متعلق اس قسم کے قصبے نقل کئے گئے ہیں کہ مشرقی بڑ بڑ کلکٹر سے پنڈت درجاند نے مل کر یہ درخواست کی کہ کرشن شاستری جواں کا مقابلہ تھا، اس سے میرا مباحثہ کر لیا جائے، دھند سیٹھ جو شاید کرشن شاستری کا طرفدار تھا اس سے (باقی اگلے صفحہ پر)

جو کچھ بھی پڑھا تھا، پنڈت درجاندھی سے پڑھا تھا۔

پنڈت درجاندھی کی سیرت و کردار سے ان کا متاثر ہونا عمل تعجب نہیں ہو سکتا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ جب شروع شروع میں بڑھ کر وہ باہر نکلے، پتہ چلتا ہے کہ پنڈتوں سے مناظرہ اور مباحثہ ہی میں گذرتا تھا، خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں پنڈت درجاندھی نے ریاست بجن پور میں اپنے کارنامہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

”وہاں (یعنی بجن پور میں) میں نے پرچم دیشنومت کا کھنڈن کر کے (یعنی اس کو خفا ثابت کر کے)

شیو مت کی استھاپنا کی (یعنی اس کو مقبول انداز میں بنادیا)۔“

بجن پور میں دیشنومت کے ایک پنڈت رنگا چاریہ نامی کے ”شاستر ارتھ“ یعنی مباحثہ یا مونچھوں کی لڑائی کا پنڈت بھی نے جیلنج دے رکھا تھا، اور بے چارے رنگا چاریہ کو پنڈت بھی اس زمانہ میں لکھا ہے کہ رندا چاریہ کے نام سے موزوم کرتے تھے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ پنڈتوں کے خاص دائرے کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن مسلمانوں کی حکومت کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں میں منکابہ اور مجادلہ کا بازار کبھی گرم ہوا ہو۔ نہ عوام ہی میں اس نوعیت کے عام مذاق کا پتہ چلتا ہے، اور نہ ہلالین و امرا کی دوسری بازوؤں کے ساتھ مذہبی نمائندوں کی گتھ گتھا کی اس بازی کا کسی نے ذکر لیا ہے، سچی کہ اکبر تک کے زمانہ میں بھی حالات سب ہی کچھ ہوا۔ غائب عالم کے نمائندے اکٹھے کٹھ گئے، لیکن بادشاہ کی سرپرستی میں مناظرہ کا کوئی دخل قائم ہوا تھا، کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔

گذشتہ صفحہ سے پانچ سو روپے کی پوری رقم مجھے ملائی جائے۔ یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ درجاندھی ہندو مذہب کے مشہور فرقہ کے پنڈت تھے، ان کا مقابلہ دوسرے فرقہ و شنومت کے پنڈت سے ہوا اور جاندھی شکست ہوئی۔ شکست کے بعد نفرت اور خصم کی حالت چلی کہ دیشنومت کی کتابوں کو درجاندھی چارپائی کے نیچے ڈال دیا کرتے تھے، اور دیشنومت کی ایک کتب سہ حانت کو مدی کے مصنف کے متعلق درجاندھی نے جیلوں کو حکم دیتے تھے کہ اس مصنف کے نام پر بھی اس کی تصویر پر بھی جوتیاں لگائیں، دیکھو مایہ داند ادا ان کی تعلیم ملا مصنفہ خواجہ غلام الحسین بانی جی ۱۲

۱۳۔ یہ ساری باتیں آپ کو اسی کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم میں کتابوں کے حوالہ سے مل جائیں گی۔ ۱۲

مسلمانوں کے ہر واقعہ، اہل کفر کے ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے پادریوں کو دکھایا جاتا ہے کہ بائبل میں
 اور میلوں ٹھیلوں میں پہنچ کر دوسروں کے عقائد و اعمال پر کتنے جیسی کر رہے ہیں۔ جس کے بعد ہندوستان کے
 مقابلہ کے لئے بھی لوگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن غلامیاد پادری جن میں زیادہ تر دیسی کالے رنگ
 والے پادری ہوتے تھے، جن کا علمی مواد بھی معمولی ہوتا تھا، اور کیا کہا جائے۔ لیکن جو واقعہ تھا، اس
 کا کیسے انکار کیا جائے کہ ان خاندانوں سے ان دیسی پادریوں کے راجہ مل کر رہے ہیں۔ عیسائی مشنری
 کے لوگ کامیاب ہو کر رہے تھے، ایک تو مرزئی مذاہبات ہی ان کی حدود پرست ہو تی تھیں، تنہا
 محض دفع حاجت کے لئے دین قبول کرنے والوں سے کردار کی بلندی کی توقع عام طرز پر کرنی بھی نہ
 چاہئے۔

ہندوستان کے مزاج و مذاہب و مذاہبات پر اعتراضات کی ایک فہرست تیار کر لی گئی تھی، یہی فہرست
 ان کو رٹادی جاتی تھی جس کا ادا کو چھوڑا باز آئیں وہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کو دکھائی دیا
 اعتراضوں کے ان گراموں کی طرف اسلام کے سنجیدہ علماء، قوجہ بڑیا کرتے، اسی بات یہ ہے کہ
 ان سے گفتگو یا بحث و مباحثہ کو علمی وقار کے مناسب بھی محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔

صرف غدر سے پہلے فنڈر نامی ایک مغربی خزا پادری جو عربی و فارسی میں مسلمانوں کی زبانوں
 کا ماہر تھا، جب وہ دندھچا نے لگا، اور شوش زیادہ بڑھی، تو پس پردہ گو ایک اہل صاحب تھے لیکن
 گفتگو کرنے کے لئے درمیان میں مکرمہ کے شہور بانی حضرت مولنا رحمت اللہ کیرانوی میدان
 میں اتر آئے تھے۔ بعد میں ایک تاریخی مناظرہ بمقام اگرہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا جو ہوا تھا اس
 میں ایک طرف ہی فنڈر، اور دوسری طرف مولنا رحمت اللہ صاحب مرحوم تھے، اس منہجی مناظرے
 میں جیسا کہ مشہور ہے، فنڈر کو شکست فاش ہوئی تھی۔ مولنا رحمت اللہ نے عربی و فارسی دونوں زبانوں
 میں کافی کتابیں عیسائیوں کے موجودہ تبلیغی دین کی تنقید و تردید میں لکھیں، جن میں مصر میں بھی
 شائع ہوئیں، بلکہ مناسب ہے کہ ان کی کتاب دعوت الحق کسی زمانہ میں مصر کے دینی مدارس کے نصاب میں
 بھی مشتمل ہوگی۔

برگزیدہ متاثر علماء میں مرثیہ رحمت اور شہرہ انور کے صوفیوں نے بڑی ذرا دلچسپی سے سنا۔ یہ سنی مسلمانوں کے لیے ایک نیا موضوع تھا۔

اہل بیت مسلمانوں میں بعض غیر متاثرہ افراد جو ہندوستان کے باغی بلکہ ممتاز علماء میں خوشامد نامہ ہوتے تھے، لیکن انہوں نے اسلامیات کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے رتبہ کے سوا کچھ کافی معلومات فراہم کر رکھی تھیں۔ انہوں نے گویا اس زمانہ میں پادریوں سے بڑھ کر مسلمانوں کو اپنا پیشہ بنالیا تھا، جن میں دلی کے مولوی، مسعود علی صاحب نے خاص شہرت حاصل کی تھی، اسی کی مدد سے ان کے خطبے مسلمانوں میں مشہور ہوئے، اس زمانہ میں بعض دلچسپ افراد بھی مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے جن میں ایک صاحب نعمان بن لقمان نامی بھی تھے، جو اپنے آپ کو

”مکیل مسر کا بابر قرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“

زبان سے بھی کہا کرتے تھے، اور ان کی مہر پر بھی یہی الفاظ لکے گئے تھے۔

”جنگ رہی جاتا ہے بلکہ جوڑیں ہوتا ہے۔“

کا فیصلہ کچھ بڑے اپنے ترازو کو دکھا کر کرتی تھیں، اور اسی پر فتح کی تالی پٹ جاتی تھیں، اس قسم کی مجلسوں میں

اہل میلہ خدا شناسی کی ورداد میں بھی لگاتار کھڑے ہو کر کلامِ اقدس کے ساتھ شاد جہاں پور کے منظرہ میں آواز اٹھاتے تھے، لکھا۔ یہ کہ تحصیل علم کی ہی گھنٹہاں سے زیادہ دلچسپی لیکن پادریوں کے پیچھے بڑھ گئے تھے۔ ان ہی عنوان پر ان صاحب کی وہ مشہور نظم ہے جس کے بعض اشعار اب بھی پڑھنے والے لوگوں کی زبانوں پر آتے ہیں، یعنی

دہن میں جھلا ہے آئے جس کا جی چتا ہے نہ آئے، تیشِ دوزخ میں جلتے جس کا جی چلا ہے
معاذ اللہ فرزندِ خدا بہت ہیں نیسے نام کو تو ردا کوں ہے، ہاں تائے جس کا جی چلا ہے

یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر اٹھائے گئے، اور تمہارے پیغمبر تو نہ آیا ہی، جن سے، اسی کا جواب کچھ عیسائیوں کی طرف سے دیا گیا تھا۔ پادریوں کے مذاق کی پستی کا اندازہ اس تحریر کی خدمت کو بھی ہوتا ہے، جس کا ذکر اسی میلہ خدا شناسی کی ورداد میں کیا گیا ہے کہ جب مسلمانوں کے وکیل نے کہا کہ مسیح تو بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے تو انجیل کو ساری دنیا میں کیوں بھیلائے پھرتے ہو، تو کسی دینی نہیں بلکہ ایک پادریوں کا جی چلا ہے، کہ انگریز مسلمانوں کے پس منظر میں بنی اسرائیل کی طرف جو دعوت دے گا، مسلمانوں کی طرف ترید دعوتی دعوت ہو، پادری صاحب نے اپنی چھری کو دکھا کر کہا کہ چھری وہاں ہے مگر ٹی بھیڑی۔ حدیثی مردہ جنوری کی ۱۱

سجیدگی اور متانت و وقار کی گنجائش ہی کیا تھی، گو یا جیسی روح تھی، ویسے ہی فرشتے۔ ہمارے مصنف امام نے بازاری پادریوں کا ذکر کر کے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

”اسی زمانہ کے درمیان میں دہلی میں پادریوں کے وعظ کا چرچا تھا، اور مسلمانوں میں سے بعض بے چارے اپنی ہمت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ نہ کرنا تھا۔“ ص ۲۲

اس عدم توجہ کا راز زیادہ تر یہی تھا کہ صحیح علمی طریقہ سے بحث و مباحثہ پادری کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، مخالفہ بازیوں، ہتھکڑا انگیرہوں پر ان کی ساری کارروائیوں کا دار و مدار تھا۔ لیکن بایں ہمہ اسلام، اہل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدودہ صفات کی تحقیر و توہین میں بھی بازاری پادری اپنی ہرزہ درائیوں، تراش خائوں کو آخری حد تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

سیدنا امام الکبیر کے سینے میں جو دل تھا جب تک وہی دل اور دل کا وہی درد کسی میں نہ ہو، اندازہ ہی نہیں کر سکتا، کہ حضرت دالا پران یا وہ گوئیوں کی ان خبروں کو سن کر کیا گذر رہی تھی، کیا کیا جائے، ان دیدہ دہنوں کے منہ کس طرح بند کئے جائیں، منہ لگانے کے لائق ہوتے، تو خود ہی میدان میں اتر آتے۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ شروع میں جب ضبط کا یا ر نہ رہا، تو جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔

”مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیر) نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی کھڑی ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو۔“

اندر یہ کہ

”جہاں وہ لوگ، (یعنی مسلمانوں کے وکلاء) بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو۔“ ص ۲۲

یہ قصہ کس زمانہ کا ہے مصنف امام نے اس کی تصریح تو نہیں کی ہے، لیکن بظاہر یہ اسی زمانہ کی بات ہے، جب غشی ممتاز علی مرحوم کے مبلغ مجتہائی میں، شہداء کے بعد ان ہی کے اصرار سے حضرت مولانا

تصحیح کا کام اپنے ذمہ لیا تھا، اور دلی میں دوبارہ قیام آپ کا اسی تعلق سے کچھ دنوں تک رہا تھا۔ کیونکہ
عموماً اسی زمانہ میں شاگردوں کا ایک گروہ آپ کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ حسب ارشاد گرامی آپ کے شاگردوں نے
بھی پادریوں کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کیا، بات نے غالباً طول کھینچا، اور باضابطہ مناظرہ
یعنی دہی نکابروہ کا چیلنج پادریوں کی طرف سے دیا گیا، اس زمانہ میں ایک کالے پادری ماسٹر تارا چند
نامی کی دلی میں خاصی شہرت تھی۔ مشہور ہوا کہ عیسائیوں کی بحالت ماسٹر تارا چند صاحب ہی کریں گے۔
اس خبر سے لوگوں میں گونہ تشویش پیدا ہوئی۔ خبر حضرت والا تک بھی پہنچی، حالانکہ ساری زندگی میں اس
قسم کے بازاری غل غپاڑے بچانے والوں سے آدرش کا موقعہ بھی آپ کو کبھی نہیں ملا تھا، اور آپ
کی بلند علمی شان کے مناسب بھی نہ تھا، کہ اس قسم کے بازاری لوگوں کو اپنا مخاطب بنائیں۔ لیکن کچھ
ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دلی میں کسی وجہ سے اس مباحثہ کو حشاش اہمیت حاصل ہو گئی تھی،
حالانکہ خود اسی دلی میں عیسائیوں کے مناظرے کی امام مولوی منصور علی صاحب موجود تھے۔ موجود ہی نہ تھے
بلکہ مصنف امام نے خبر دی ہے کہ مناظرہ جب ہوا، تو دھجلی میں دوسروں کے ساتھ یہ امام فن مناظرہ
بھی مسلمانوں کی طرف سے وہاں حاضر تھے، مولوی منصور علی صاحب کا ان الفاظ میں تعارف کراتے
ہوئے کہ وہ

”فن مناظرہ بھل کتاب میں لکھا ہیں“

اور یہ کہ

”بائبل (توریت و انجیل وغیرہ) کے گویا حانظ ہیں، اور ان کا طرز مناظرہ بھی جدا گانہ ہے،
آپ ان ہی کے (یعنی مولوی منصور علی صاحب کے) ساتھ گرد ہفتا بل پادریوں کے دہلی
میں دعویٰ کرتے ہیں۔“

مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ سیدنا الامام اکبر کی مولوی منصور علی صاحب سے

”اسی زمانہ سے (یعنی جس زمانہ میں یہ مناظرہ ہوا) ملاقات ہوئی“ ص ۲۷

بہر حال باوجود ان تمام باتوں کے صورت حال کچھ ایسی تھی کہ خود سیدنا الامام الکبیر کا فیصلہ ہوا،
 یا دوسروں نے آپ کو آمادہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو پادریوں کے اسی مناظرہ میں حضرت ذالاک کی
 شرکت ضروری ہے۔

اللہ بڑے کئے ہوئے تھا کہ اپنے آپ کو خاک میں ملا کر رہیں گا، تاکہ مجھے کوئی نہ ملے اور
 جو کہتا ہو کہ جانوروں کے بھی گھونسلے ہوتے ہیں، لیکن میرے لئے یہی نہ ہوتا، اساری زندگی جس کی
 اسی آرزو میں تھی کہ کاشش اکوئی میری ہوا تک نہ پاتا، عرض کر چکا ہوں، بار بار اسی کہہ رہا تھا ہوں،
 وہ جتنا ٹھنڈا چاہتا تھا، بڑھانے والا اسی نسبت سے اس کو بڑھا رہا تھا، اس نے امانت سے انکار
 کیا، امام بنایا گیا۔ اس نے وہ غصہ کوئی سے بچنا چاہا، ہندوستان کے سحرالعیان خلیفوں میں وہی شمار
 کیا گیا، وہ بڑھاتا نہیں چاہتا تھا، لیکن سارے ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی دینی علوم
 کے پڑھنے پڑھانے کی سنت اسی سے زندہ ہوئی، جو کسی کے سامنے آتا نہیں چاہتا تھا، اسی لئے
 غیر تو غیر خود مولویوں کے دائرے کے اختلافی، باحث و مسائل سے بھی اس نے بہت کم دلچسپی
 لی، لیکن آج ایک غیر مذہب کے مجادل و منکابز کا مقابلہ بن کر وقت کا تقاضا ہو رہا ہے کہ وہی میدان
 میں اترے۔ بقول شیخنے سن

کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے۔

افسوس ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں پہلی دفعہ یہ صورت دلی میں جو پیش آئی تھی، جیسا کہ
 چاہئے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ مصنف امام کے بیان سے بس اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ بہر حال
 آپ پادری تارا چند سے گفتگو کرنے پر آمادہ ہو گئے، شرط صرف یہ رکھی گئی، کہ نہ تارا چند ہی کو میرے
 نام اور میری شخصیت کا علم ہو، اور نہ عام پبلک کو۔ ایک حامی مسلمان کی حیثیت سے میں حاضر ہو جاؤنگا
 اور جو کچھ سمجھیں آئے گا، عرض کروں گا۔ مصنف امام کی سوانح عمری میں اسی مناظرے کے متعلق یہ الفاظ
 جو پائے جاتے ہیں یہی

آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی صاحب، (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کے کسی صورت نہ مشکل بنائے

ادرا پنا نام چھپا چا موجود ہوئے۔

ان الفاظ سے بھی سمجھ میں آتا ہے، آگے دہی اتی پادری تارا چند کا ذکر ان الفاظ میں کر کے کہ

”ایک پادری تارا چند نام تھا۔“

دہی سامنے آیا، زہر رٹے دھانے اختر، دونوں کا فرست جیسا کہ دستہ تھا، اسی کا آموختہ سنا نے لگا،

جواب دینے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے ایک ایسا آدمی نکلتا ہوا، جو اپنی شکل و صورت سے مولوی

بھی معلوم نہ ہوتا تھا، اوروں سے بحث و مباحثہ کرتے ہوئے دلی دالوں نے کبھی اس کو دیکھا تھا۔

خود تارا چند پادری کے لئے بھی اس کی شخصیت اجنبی تھی، جو ابلی تقریریں وقت ختم ہوئی، جیسا کہ چاہی

تھا، مجلس پر شاہجہا یا ہوا تھا، مصنف امام کی خبر کے الفاظ میں کہ

”اس سے دہی تارا چند پادری سے گھٹک ہوئی، آخروہ بند ہوا، اور گھٹک سے بھاگا۔“

امام فن منظرہ مولوی منصور علی صاحب کا سیدنا امام البکر سے تعارف نہ تھا۔ قدر تا تقریر اور جواب

کے سننے رنگ نئے ڈھنگ کو دیکھ کر حضرت سے آکر ملے، ظاہر ہے کہ ان سے اپنے آپ کو

چھپانے کی دھڑکیا ہو سکتی تھی حضرت دالا اور مولوی صاحب سے پھر دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے،

ان کو بڑی خوشی ہوئی، کہ ان کی پشت پناہی کے لئے ایک خیر سمونی علی قوت میسر آگئی۔ آخروہ بھی

ان کا ذکر آئے گا۔

دوسری خداداد ودینوں کے ساتھ سیدنا امام البکر کی ”فطرت قائمہ“ اور ”جیٹہ بدیعہ“ کا ایک

نیا پہلو تھا، جو پہلی دھڑکا تارا چند پادری سے گھٹک کرنے کے بعد دلی کے مسلمانوں کے سامنے آیا،

صحیح طور پر دلی کے اس پہلے مباحثہ کی تاریخ تو معلوم نہ ہو سکی، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ قرآن کا اقتضار

یہی ہے، کہ مشیخہ کے خلفشار کے فروز ہونے کے بعد جب گو نہ امن ادرا طینان کا ماحول ملک میں پیدا

ہوا، اسی زمانہ کی یہ بات ہے،

ادھر پادریوں کے رد و قدح، بلکہ اسلام کی تحقیر و تمذیب، اور مسلمانوں کی دل آزاری، اذیت سانی

کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ان ہی کی دیکھا دیکھی، جہاں تک میں جانتا ہوں، مراد آباد کے ایک گنام آدمی

پہلے انھیں جو تھوڑی بہت اردو فارسی زبانوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات اور روایات کا مطالعہ کر سکتے تھے ان کے دل میں بھی ہوک اٹھی اور مسلمان جنہوں نے اپنے ایم حکومت میں آج تک ہندوؤں کے دین کو دھرم کی تنقید یا تردید، جرح و اعتراض کو موضوع بنا کر نہ کوئی مستقل کتاب ہی لکھی تھی اور اپنی محدود معلومات کی بنا پر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ضمناً بھی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ان کی کتابوں میں شکل ہی سے کیا گیا تھا۔ بلکہ برعکس اس کے کافی ذخیرہ ایسا موجود ہے جس میں ہندوؤں کے دین و آئین کے متعلق ہندو ہی اور حسن ظن ہی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ابو الفضل کی آئین اکبری ہی میں نہیں، بلکہ نقشبندی طریقہ جو اتباع سنت اور دینی صلابت میں تمام دوسرے صوفیانہ طریقوں میں متنازع تھا جاتا ہے، جس رنگ کہ حضرت مجدد الف ثانی کی محددیت نے بہت زیادہ نکھار کر چکا دیا ہے، اسی نقشبندی مجددی طریقہ کے سرخیل حضرت مرزا جان جانان ادران کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں کے کلام میں ڈھونڈھنے والوں کو آج بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ مل سکتا ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

کچھ بھی ہو، دوسرے اریان و مذاہب کے ماننے والوں کی دل آزاری اور اسلامی دین کی روح کے بھی خلاف ہے اور مسلمان مصنفوں نے اس روح کی رعایت کسی اور مذاہب و دین کے ساتھ کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن ہندو دھرم کے ماننے والوں کو انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس باب میں مسلمانوں کے تمسکات کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اس قوم سے مسلمانوں کا تعلق تقریباً ہزار سال سے قائم ہے اور تعلق بھی حاکمیت و محکومیت کا، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، عام طور سے پاسے مصنفین اس سلسلہ میں احتیاط ہی سے کام لیتے رہے اور مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے، کہ جب تک مسلمانوں کا دور حکومت ہندوستان میں رہا، شاید ہندو مصنفین نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ناشارفہ کلمات کے استعمال سے پرہیزی کی تا کہ اہم از کم میری واقعیت یہی ہے، جن زبانوں سے میں واقف نہیں ہوں، ان میں کچھ کہا گیا ہو۔ تو یہ الگ بات ہے۔

پہلی دفعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں غزبری چھڑ چھاڑ، ٹوک جھٹک کا مسئلہ بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے۔

کئی قائم رہی اور حکومت ہی کے عہد میں شروع ہوا۔ پینڈت اندرسن مراد آباد میں بیٹھے، مگر کچھ لکھا کرتے تھے اور مراد آباد ضلع ہی کے مشہور قصبہ بچھراویوں کے ایک عالم مولانا محمد علی صاحب ان کے مقابلے میں ہندو مذہب کی تعلیمات و روایات پر تنقید کرتے تھے۔ مولانا بچھراویوں کی کتاب "سوطا شتہ الجبار" شاید کسی مسلمان مصنف کی پہلی کتاب ہے جس میں دل کھول کر پینڈت اندرسن کے غلوں کا جواب سنگ سے دیا گیا ہے۔ ان کے بعد غدر سے پہلے ایک نو مسلم بزرگ کی کتاب "تحفۃ الہند" شائع ہوئی۔

لیکن پینڈت اندرسن کی کچھ ترکم علمی اور اس سے بھی زیادہ بے چارے کی ناداری و غلطی ساتھ ہی قلم تو خیر کسی حد تک ان کا چلتا تھا، مگر یہ ایک جلسوں میں بولنے یا تقریر کرنے کی صلاحیت تھی نہیں رکھتے تھے۔ آئندہ خود ان ہی کا ذاتی اعتراف نقل بھی کیا جائے گا۔ ان کے افلاس اور بے کسی ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے نہیں، بلکہ مراد آباد ہی کے چند مقامی مسلمانوں کی درخواست پر مراد آباد کے مجسٹریٹ نے ان کی کتابوں کے منافع کرنے کا حکم دے دیا۔ اور پانچ سو روپے جرمانہ

لے۔ خود اس کتاب میں مصنف نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اپنے موروثی دھرم کو چھوڑ کر دین اسلام انہوں نے کیوں قبول کیا۔ ہندو مذہب کی روایات پر بھی تنقید کی ہے اور اسی کے ساتھ اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں مشرک و بدعات کے جراثیم بری طرح جو پیرست ہو گئے تھے، ان پر بھی کافی حملے کئے گئے ہیں لکھا بھی ہے کہ مخاطب اس کتاب کے صرف ہندو نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمان بھی چونکہ میں اسی لئے بجائے تحفۃ الہند کے کتاب کا نام میں نے تحفۃ الہند رکھا ہے۔ البتہ اس کتاب کے آخر میں کوئی شیخ سلیم نامی صاحب کی ایک نظم بھی مشرب کی کر دی گئی ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ یہ شیخ سلیم کون تھے کہاں کے تھے۔ نظم کب لکھی گئی کس نے لکھوائی، لکھوائے کی ضرورت کیا تھی ہاں سارے سوالوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ زبان بھی اس میں جو استعمال کی گئی ہے۔ شمالی ہند کے مسلمان عموماً اس زبان ہی کو استعمال کرتے ہیں اور پروے طہر اس کو کچھ سکتے ہیں، پان تلسی اس کی رائے کے سمجھنے والے ہندوؤں کو کچھ میں خوب اچھی طرح آ سکتی ہے یہی مشہور نظم ہے جسکی ٹیپ کا بند لکھوہ کوئی دھرم ہے جو عجیب بات کہ قریب قریب ان ہی لوگوں کے لگ بھگ جزیری ہند میں ایک نظم جزیری ہند کے مسلمانوں کی عام بولی میں بھی شائع ہو کر پھیلی جسکے ٹیپ کا شعر یہ ہے۔ یاد ہوئے مگر تمہیں ہم کو بتاؤ درہم کا کپہ کو پھر نے ہونا حق جو چوتھو ترن۔ دکنی بولی کی اس نظم کا رنگ بھی دیکھ شیخ سلیم دانی لکھتھا ملانی کا ہے۔ نقد تادو نوں ہی ہندوؤں کے قلوب میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے یا دیکھنا چاہئے کہ تحفۃ الہند میں نظم ۱۳۰ میں بھی "دکنی بولی دانی نظم" میں ۱۳۱ میں شائع ہوئی "ہندوؤں کے مسلمانوں کے تعلقات کی حالت" میں یہ دونوں نظمیں شمالی و جزیری ہند کی خاص طہر پر ہیست رکھتی ہیں ۱۲

ہندوستان سے طلب کیا گیا۔ لکھتے ہیں کہ مقدس کی پیل کی گئی اور جج نے برہانہ کے متعلق فیصلہ میں لکھا کہ چونکہ وہ (اندھرن) غریب ہے اس لئے چار سو روپے صاف کئے گئے "جرم اس پر ثابت ہے" اس لئے نو روپے بحال ہے۔

مگر یہ کہ اندھرن جیسے کچھ دوسرے ناپربان حال گناہم لوگوں کی طرف سے بھی اسلام کے خلاف تقریر یا تحریر کرنے یا لکھنے کا سلسلہ نئی حکومت اور نئے قانون کی وجہ سے ہلکا رہا ہے لیکن جہنم تک میں جانتا ہوں اس ملک کے عام آبادکاروں میں نہ کسی قسم کی ٹیبل ہی پیدا ہوئی، نہ نہ عوام کی توجہ ہی ان مذہبی جھگڑوں رگڑوں کی طرف جیسا کہ پاس ہے منعطف ہوئی۔

مگر وہی کہ پرانے ہندوؤں کے اس طبقے سے کل کر جس کا سب سے بڑا مشغلہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے عقائد اور عبادات کے منہن اور کشدن، تائید و تردید کے سوا اور کچھ نہ تھا، اچانک ہی حلقہ کے محدود دائرہ سے نکل کر یورپ، امریکہ کی تھیا سویل سوسائٹیوں کے گرد حاکم کی شہرت کے ساتھ سید ان میں ہندوت دیناں سرسوتی جی تشریف لائے۔ جن کو ہندوؤں کے بڑے بڑے سرکاری حکام اور لیڈروں کی سرپرستی بھی حاصل تھی، اور اچانک وہی جو ابھی چند دن پہلے وشنو مت کے مقابل میں ہندوؤں کے شیو مت والے فرقہ کی حمایت میں اپنے علم اور بیانی قوت کا نمونہ دکھا رہے تھے۔ ان کو دیکھا گیا کہ دنیا کے سارے مذاہب ادیان کے ماننے والوں پر برس رہے ہیں، ان کے مذاہب کو بھی اور ان کو پیشاؤں کی بھی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔

نہ گھروالوں کو چھوڑتے ہیں اور نہ باہروالوں کو، ایک طرف ہندوستان کے مقامی مذاہب سنان، دھرم، جن مت، بودھ مت، والوں کو جو جی میں آتا تھا کہتے چلے جاتے تھے اور دوسری طرف یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی کتاب قرآن اور ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں پختہ پختہ ایسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں جنہیں ان سے پہلے کلاں نے سنا تھا اور شاگھوں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا، دنیا دم بخود تھی، کچھ میں نہیں آ رہا تھا، کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور کیوں ہو رہا ہے، مسلمان اور ہندو

الحق منقول از بانی شاعر غازی محمود و مریدان ص ۱۳ انہوں نے یہ الفاظ یا تہجی کی مودعہ عمری سے نقل کئے ہیں ۱۲

تو غیر مجبور تھے 'معذور تھے' نہتے تھے 'لیکن جس قوم کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت کی باگ تھی، اسی حکومت کے اس شاہی فرمان کی سیاحتی بھی شاید ابھی خشک نہ ہوئی تھی، جس میں دقت کے حکمران نے اپنے آپ کو عیسائی مذہب کی پشت پناہ قرار دیتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ

'ہم کو مذہب عیسائی کے صدق کی نسبت یقین نکل جاتا ہے اور جو قسطنطنیہ کا خطرہ اس سے ہوتا ہے، اس کا کمال شکر گزاری و اعتراف ہے۔'

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ملک و کنٹریریہ کا جو عام فرمان باشندگان ہند کے نام شائع ہوا تھا۔ یہ فقرہ اسی میں موجود ہے، مگر بایں ہمہ فدا ہی جانتا ہے کہ پنڈت جی کو آزادی کا ایسا پردہ نہ کیسے اور کہاں مل گیا تھا کہ اسی عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کے متعلق وہ ایسی باتیں نہ صرف عام جموں میں کہنے پر جری تھے بلکہ لکھ کر چھاپتے تھے، جنہیں نقل کرتے ہوئے آدمی کی انگلیاں کاٹنی لگتی ہیں، آج بھی ستیاگرہ پر کاشش میں وہ موجود ہیں۔ لیکن وہی حکومت جو غریب انداز میں کی کتابوں کو معمولی ایک اخبار عام جمشید ناسی کے مطالبہ پر ضائع کر چکی تھی اسی کے کان پر جو بھی نہ رہی۔ حالانکہ یہ کتاب ہندی اردو گوہر گنجی 'اندانگریزی زبان میں سلسل شائع ہوتی رہی۔'

۱۷۰۰ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر لکھا گیا ہے کہ وہ غصہ نہ تھا..... اس کی جنگی آدمیوں کی ہی جھلک تھی یا یہ نام ممکن باتیں یسوع کی جہالت پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر اسے دینی یسوع، کچھ بھی تیز نہ تھی تو ایسی پھر وہ خیال نہ باتیں کیوں کہتا: 'یا کہ یوسف بنار بڑھتی تھا' اس نے عیسیٰ بھی بڑھتی تھا، کئی ایک برس تک بڑھتی کا کام کرتا رہا بعد ازاں پھر بناتا خدا کا بیٹا بھی بن بیٹھا۔ یہ اور اسی قسم کے الفاظ حضرت یسوع علیہ السلام کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں، اسی طرح یسوع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام لے کر لکھا ہے، اس کا چال چلن غصہ وغیرہ برصفا سے پر ہے، وہ انسان کی جان کٹی کر ڈالا، جو چور کے مانند بدکار سزا سے گہرے زکرنے والا تھا..... دردِ ملو بھی ضرور ہو گا، 'العیاذ باللہ' زنا کار، نیک کا لفظ ان کے متعلق استعمال کیا گیا ہے، عیسائی مذہب کو وہی مذہب لیے جوڑے گھوڑے پھر عیسائی مذہب، وحشیانہ مذہب، ایسب جابلوں کی باتیں ہیں، 'بجز خدا ایک کے تمام خرافات سے بھرا ہوا' حد یہ ہے کہ عیسائیوں کے خدا تک کو نہ چھوڑ گیا۔ 'وہ ایک گوشت خور شریر آدمی کے مانند ہے، ستیاگرہ پر کاشش کے بارگاہ میں یہ سارے الفاظ آپ کو مل جائیں گے۔ دل پر جبر کے خرد سے چنداں نہ پیش کیجئے سے چنے گئے۔'

۱۷۰۰ء تک بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیستالیس ہزار مختلف زبانوں میں اس کتاب کے شائع ہو چکے تھے، ہندی ادب میں گیارہ مرتبہ اردو ادب میں دس مرتبہ اگر بڑی چار مرتبہ گوہر گنجی چار مرتبہ اس دقت تک چھپ چکا تھا۔ ۱۲

یوں تو پنڈت جی کے لکچروں کا یہ سلسلہ کئی سال سے جاری تھا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں وغیرہ کے مظلوم ہوتا ہے کہ ان کے مناظرے اور مباحثے بھی ہوتے تھے۔ مناظرے اور مباحثے کے سلسلہ میں سداس کے رہنے والے ڈاکٹر مرڈک ایم، اے نے اپنی کتاب "دیک ہندوازم اینڈ آریہ سماج" میں پنڈت جی کے طریقہ کار کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ

"سباحہ میں ان کا (یعنی سوامی دیانند کا) طریقہ یہ تھا کہ تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی اپنے ساتھ رکھتے تھے، جب وہ باؤ از بلندا اپنے مخالفین کی ہنسی اڑاتے اور تہقہ لگاتے تھے، تو اس کام میں یہ لوگ (منڈلی والے) ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔"

(منقول از سوامی دیانند اہ ان کی تعلیم)

لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، پنڈت جی کی کتاب ستیا رتھ پرکاش ۱۸۷۵ء عیسوی مطابق ۱۲۹۲ء میں بنارس سے شائع ہوئی، اور جو کچھ پنڈت جی زبانی اپنی تقریروں میں اب تک کہتے پھرتے تھے، اسی نے مستقل تحریری لباس بھی پہن لیا، حکومت میں اس کی رجسٹری بھی کرائی گئی تھی، راہبہ جے کرشن داس سی، ایس، آئی کے دستخط سے اسی ایڈیشن میں یہ عبارت چھپی ہوئی ہے

"میری اور سے اس پستک کی رجسٹری قانون۔ ۱۸۷۳ء کے نوٹس ہوتی ہے، سوائے میرے دوسری آگیا کے اس پستک کے چھاپنے کا کسی کو ادھیکار نہیں ہے۔"

اسی سال ادھر یہ کتاب شائع ہوئی، اور ٹھیک اسی سال یعنی ۱۲۹۲ء مطابق ۱۸۷۵ء میں ایک عام اعلان اخباروں میں بھی کیا گیا، اور علیحدہ اشتہارات بھی مختلف زبانوں میں تقسیم کئے گئے، عثمان تو ان اعلانوں اور اشتہاروں کا تھا

"میلہ خدا شناسی"

اصل مضمون تو مجھے نہ مل سکا، خلاصہ اس کا جیسا کہ کتاب "گنگوئے مذہبی میں لکھا ہے، یہ تھا کہ "پادری نوٹس صاحب انگلستانی، پادری شاہ جہاں پور، اور منشی پیارے لال کبیر بٹھی ساکن موضع چاغاپور متعلقہ شہر شاہ جہاں پور نے مل کر ۱۸۷۵ء میں ایک میلہ بنام میلہ خدا شناسی

موضع چانداپور میں جو شہر شاہجہاں پور سے چھ کوس فاصلہ پر لب دریا واقع ہے، مقرر کیا اور تاریخ میلے رٹی ٹھیکرائی۔“ ص ۷

یہ پادری نولس صاحب انگلستانی اور منشی پیارے لال کبیر پنچھی کون تھے، دونوں کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، مختصر لفظوں میں اس کی کچھ تفصیل ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ نامی رسالے میں جو کچھ کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری نولس صاحب حقیقت شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، ہیڈ ماسٹری کے ساتھ ساتھ مشن کا کام بھی شاہ جہاں پور کے اطراف و نواح کی آبادیوں میں گھوم پھر کر کیا کرتے تھے، اسی سلسلے میں ”چانداپور“ جو شاہ جہاں پور کے متصل قصبہ باقی آبادی تھی، وہاں بھی پادری صاحب کا مدغظ ہوا کرتا تھا۔ چانداپور کے ایک خوش حال اور خوش باش باشندے منشی پیارے لال صاحب جو کبیر پنچھی تھے، ان کی تقریروں میں شریک ہوا کرتے تھے، پادری صاحب اور منشی جی میں تعارف پیدا ہوا۔ میل جول بڑھا، پادری صاحب کے توسط سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز حکام تک بھی منشی جی کی رہائی ہونے لگی۔ صاحب رسالہ نے لکھا ہے کہ

”پادری صاحب کی ملاقات سے ان کی عزت و توقیر بھی بڑھ گئی۔“ ص ۷

غالباً ان الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کچھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ منشی پیارے لال نے عیسائی دین تو قبول نہیں کیا، لیکن پادری اس حد تک ان کو متاثر کرنے میں غالباً کامیاب ہو چکے تھے کہ منشی پیارے لال کے

”خیر خواہوں نے دیکھا کہ منشی صاحب اپنی حالت دیرینہ کی طرح اپنے آبائی عقیدہ کو

بھی پارینہ سمجھنے لگے۔“ ص ۷

الغرض بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو پادری نولس صاحب کی تحریک اور کچھ منشی پیارے لال کے احباب اور دوستوں کے مشورہ سے لے پایا کہ چانداپور کے متصل منشی پیارے لال کی زمینداری میں ایک گاؤں سارنگ پور نامی میں جہاں بقول مصنف رسالہ ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ منشی جی کی

”ملوک زمین اور باغات“

تھے 'اور ان کی اپنی ملوکہ زمین و پادشاہت کے درمیان ایک بڑی ندی بہتی تھی جس کا نام اسی رسالہ میں
"دریا کے گرا"

بتایا گیا ہے 'اسی ندی کے کنارے

"میلہ خدا شناسی"

کے نام سے ایک میلہ کیا جائے اور یہ کہ عہدہ عام لوگوں کے خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے
"علماء مذہب مختلفہ کا مناظرہ ہو"

خدا شناسی کے اس میلہ جانے کا بظاہر مقصد تو یہ رکھا گیا کہ علماء مذہب مختلفہ کے یاہمی 'مناظرہ و
مباحثے

"تحقیق مذہب بھی ہو جائے گی"

یعنی دنیا کے مروجہ مذاہب میں 'سچا مذہب' جو منشی جی کے لئے قابل تسلیم ہو، اس کا پتہ لگو اہل جائے گا
مگر ظاہر ہے کہ زمیندار طبقہ کے ایک سربراہ دار آدمی کے لئے صرف یہی وجہ کافی نہیں ہو سکتی تھی 'اور اس لحاظ
ہوتا ہے کہ مستقبل میں میلہ کا سہرا بچ بھی ان کو دکھایا گیا، شاید باور کرایا گیا کہ بیسیوں سیٹے ہندوستانی ہیں
معمولی معمولی بیادوں یا جیلوں پر جتے ہوئے بالآخر عظیم الشان میلوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اپنی کٹنی
شور زمینوں کو ان ہی تدبیروں سے لوگ 'بہشتی فکرو' اسی زمانہ میں بنا رہے تھے۔

"اس میلہ سے کچھ اند فائدہ کی صورت ہو گی"

منشی جی کے خیر خواہوں کے مشورے کا یہ جزو جسے 'مباحثہ شاہجہاںپور' والے زمانہ کے مصنف نے نقل کیا
ہے۔ اس سے تو کچھ بھی سمجھ میں آتا ہے۔

کچھ بھی ہو 'میلہ کی پہلی روداد جو میرٹھ کے مطبع ضیائی کے کارپردازوں محمد ہاشم علی اور محمد حیات صاحب
کی مرتب کی ہوئی ہے 'اور لکھوئے مذہبی' یا 'فاقہ میلہ خدا شناسی' جس کا نام رکھا گیا تھا، اس میں اگرچہ منشی
بیانے لال کے متعلق لکھا ہے کہ

"دولت مناد وہاں کے (یعنی چاندپور کے) رئیس ہیں" مسک۔

تاہم ان کی طرف سے میلہ کے قیام کا انتظام ہی نہیں، بلکہ جیسا کہ اسی رسالہ میں خبر دی گئی ہے کہ ”سب کو کھانا اور خیمے وغیرہ انہیں (یعنی منشی پراسے لال) کی طرف سے ملے۔“

اس خبر میں ”سب“ کا لفظ اگرچہ حد سے زیادہ بھل ہے۔ ہر وہ شخص جو میلہ میں شریک ہوا تھا سب کو کھانا غشی جی کی طرف سے دیا جاتا تھا، اس کو واقعہ قرار دینا تو مشکوک ہے۔ لیکن ”سب“ کے لفظ کا مذاہب کے نمائندوں ہی کی حد تک محدود رکھا جائے، تو ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ مسلمانوں کے جن نمائندوں کے ذکر اس رسالہ میں ضرورت کیا گیا ہے، ”سیرے خیال میں میں تجھیں تک تو ان ہی کی تعداد پہنچ جاتی ہے“ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ پادریوں کا بھی کافی مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ منشی جی خود ہندو تھے۔ قدرتا ہندو مذاہب کے نمائندوں کی تعداد بھی چاہئے تو یہی کہ کم نہ ہو، ”میلہ دو دن تک رہا“ اسی صورت میں ناشتہ یہی کم از کم کھانا سب مہانوں کو چار وقت، تو ضرور کھلایا گیا ہو گا۔ مردادہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی نمائندوں کے سوا دوسرے ہندو مسلمان معزز مہان بھی میلہ میں موجود تھے، جن میں عدالت کے وکلاء اور حکومت کے حکماء مثلاً دہشی کلکٹر، پٹیل جی جانا پور کی بستی شاہ بہاں پور کے شہر سے لکھا ہے کہ ”پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر لب دریا واقع ہے۔“

موتہ وغیرہ سراج السیر سوار یوں کا زمانہ نہ تھا کہ میلہ میں شریک ہونے والوں کے متعلق یہ توقع کی جائے کہ کھانا کھانے کے لئے شہر چلے آتے تھے۔ اسی لئے کم دیش میرا تخمینہ یہی ہے کہ تین چار سو آدمیوں کو فی وقت منشی جی کو کھانا کھلانا پڑا ہو گا۔ مہان بھی معمولی لوگ نہ تھے۔ دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ مختلف ہی سے کام لیا ہو گا۔ پھر مزید برآں خیمہ و خرگاہ اور دوسری قسم کی آسائشوں کی فراہمی میں منشی جی پر چاہئے تو یہی کہ کم مالی بارعائد نہ ہو ہو گا، اسی سے کچھ میں یہ بات آتی ہے کہ میلہ کے پیچھے محرکات معمولی نہ تھے، اب یا یہ مان لیا جائے کہ ”تلاش جن کا کوئی غیر معمولی جذبہ منشی جی میں مشتعل پذیر ہوا تھا، جس سے اس درجہ خلوت ہو گئے تھے کہ خرچ کے متعلق کم و بیش کا سوال ہی ان کے سامنے باقی نہ رہا تھا، اگرچہ آئندہ ان کے جس طرح عمل کا ذکر آ رہا ہے اس سے اس خیال کی چنداں تائید نہیں ہوتی، یا پھر مادی منافع کا جو سبز باغ ان کو دکھایا گیا تھا، ان منافع کی امید پر بطور جو پار یا تجارتی کاروبار کے ان مصارف کا بار انہوں نے اٹھایا تھا۔“

بہر حال کتابی شہادتوں کی حد تک تو بس ان ہی دو باتوں کا پتہ چلتا ہے اور دوسری شہادت کے بغیر کسی تیسرے احتمال کے اظہار کی جرات کیسے کی جائے۔

دوسرے میلہ کی روداد سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ”میلہ“ حکومت کے امتزاج اور مضامین سے منعقد کیا گیا تھا، اسی روداد میں جس کا نام ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ ہے، سیدنا امام اکبر کے ایک تلمیذ سید مولانا فخر الحسن گنگوہی کے قلم کی مرتب کی ہوئی یہ روداد ہے، اسی میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال صاحب نے

”مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہاں پور سے اجازت حاصل کر کے پارسال (یعنی ۱۸۸۷ء) میں کو جس شباب کی گری میں یہ میلہ منعقد کیا گیا“ صرف اجازت ہی نہیں بلکہ نظم و ضبط کی تمام ضروریات کے لئے پولیس کے سوا اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کرسیوں، منڈیوں وغیرہ کا انتظام بھی غالباً حکومت ہی کی طرف سے کیا گیا تھا،

الغرض شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر شباب پادری نولس صاحب کی ابتداء اور مسٹر رابرٹ جارج گری کلکٹر شاہ جہاں پور کی اجازت و رضامندی اور ان کی اخلاقی دقتوں سے مالی امداد سے یہ میلہ دریا لے کر لگا کر اسے سارا گپو گاپوں میں منعقد ہوا، اب ہی تو ابتدائی اور انتہائی قوتوں کے درمیان چاند پور کے رئیس اور دلت منو منشی پیارے لال صاحب تھے، جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ پادری نولس کی دوستی کی بدولت حکومت میں عزت و توقیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

قابل توجہ اور مستحق فکر و نظر یہ مسئلہ بھی ہے، جیسا کہ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے کچھ اشارہ بھی کیا ہے کہ پہلی دفعہ میلہ کے انعقاد کی تاریخ ۱۸۸۷ء مقرر کی گئی، جب بقول ان ہی کے ہندوستان میں گری کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے، گری بھی صوبہ یو۔ پی کے بالائی اضلاع یعنی روہیل کھنڈ کی

۱۔ میلہ خدا شناسی نامی مالی روداد میں لکھا ہے کہ تقریباً دو اڑھائی سو کرسیاں وغیرہ اس غیمہ میں اجڑیں، مباحثہ ہوتا تھا، عام چھائی گیس۔ جس نام کی یہ بات ہر اہم عام تمدن اس ملک کے باشندوں کا ہوتا تھا اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ یاد کرنا مشکل ہے کہ شہر سے دو ایک محرومی مقام میں حکومت کی امداد کے بغیر دو اڑھائی سو کرسیاں کی اجلاس میں میاں پو سکتے تھیں ۱۲

موسم بھی گرم اور مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے نسبتاً خون کی گرمی اس گئے اندر سے زمین سے بھی ناقابلِ توجہ نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ امیر الامراء نجیب الدولہ اور حافظ الملک رحمت خاں اور محمد علی خاں وکیل کے سرحدی پٹھانوں کی نو آبادی جو ان ہی کے قومی نام کی طرف منسوب ہو کر دوسرے کھنڈ کھلانے لگی تھی، گزرے ہوئے دنوں کی گرمی کے سوا چند سال بھی تو نہیں گزرے تھے کہ شہر میں سب سے زیادہ اہلِ کاتھریہ اسی علاقہ کے مسلمانوں کے بچے ہوئے خون میں حکومت کو ہرچکا تھا۔

تدریجاً یہ والیوں میں اگر پیدا ہو، کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظرہ اور ہاشمہ تو خیر کوئی نئی بات نہ تھی، ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس میلہ سے پہلے ان دونوں نہ ہی جانوں میں کافی مقابلے ہو چکے تھے۔ شاید کوئی شہر بلکہ قصبہ اس زمانہ میں ایسا ہوگا، جس میں پادریوں کے پنچہ آزمائی کے لئے مسلمانوں میں بھی کچھ انداز نہ پائے جاتے ہوں، عرض ہی کر چکا ہوں کہ اپنی ترازو کے ذریعہ پلڑے کو دکھا کر گنجر نہیں تنک پادریوں کے اعتراض کے جواب پر اس زمانہ میں چربی بھجی تھیں، مولوی نعمان بن لقمان دہی جو اپنے آپ کو وکیل سرکار، ابراہیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے مشہور کئے ہوئے تھے ان کا شعر

معاذ اللہ فرزندِ خدا کہتے ہو عیسائی کو

تو دادا کون ہے ان کا بتائے جس کا جی چاہے

پادریوں کا مذاق اڑانے کے لئے زبانِ زہرا م ہو چکا تھا۔ اس نوعیت کے عیسویوں لطیفے نقل کئے

ملہ صوبہ میں نہیں بلکہ اسی رسالہ واقعہ میلہ خاصا ششای میں یہ لکھتے ہوئے گزری کا موسم تھا، گرمی ہی کا وقت تھا، یہ اطلاع دی ہے کہ ”مکان جلسہ ایک مسجد شہر سے دس سائے کے لئے خیمہ یا تخت آج میں کامایہ آدھا آدھی دھوپ، غرض نہ پیش سے بچے گا کوئی عمدہ سامان نہ لے سچے کے لئے کوئی مکان۔“

لے بانی ندۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی گوگیری قدس اللہ سرہ العزیز سے خاکسار نے سنا تھا کہ کلکتہ میں بھی ایک دفعہ پادریوں اور مسلمانوں کے مولویوں سے مقابلہ کی ٹھہری، طے ہوا کہ بند کرے یا ایسے مکان میں جلسہ ہو۔ جہاں عوام کی رسائی نہ ہو، طرفین کے لوگ جمع تھے، باہر ایک دربان مقرر کر دیا گیا تھا کہ آنے والوں سے نام پتہ پوچھ کر پہلے اندر کے لوگوں کو اطلاع دے، تب جلسہ میں شرکت کی اجازت دی جاتی تھی، بجز مشہور پادریوں اور مولویوں کے اس اجلاس میں دوسرے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں مولوی الفت کی مشہور کتاب غنئی الادب کے مصنف دیبائی اسکے صفحہ پر

جاتے ہیں۔ گو بالوگ مولویوں اور پادریوں کی چھیڑ چھاڑ کے عادی ہو چکے تھے۔ اب اس میں کوئی ندرت و جدت باقی نہ رہی تھی۔ برعکس اس کے فشی پیارے لال کا یہ میلہ جو اپنے موضوع بحث کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھا۔ ”مذاہبِ دادیان کی تحقیق“ کے لئے بھی یہ میلہ جایا جاسکتا تھا، بجا لئے خود یہ ایک اچھوتا خیال اور نیا اقدام تھا اور اس سے بھی زیادہ اہم خصوصیت اس میلہ کی یہ تھی کہ دو فریق، مسلمانوں کے مولوی اور عیسائیوں کے پادری میں ہب کی مقابلہ نہ تھا، بلکہ بقول مصنف رسالہ ”ذوقِ میلہ خدا شناسی“ کہ اس مذاہبی میلہ یا مناظرہ کی مجلس میں

”مناظرہ کرنے والے تین فریق قرار پائے تھے، مسلمان، عیسائی، ہندو“۔

جہاں تک میں جانتا ہوں، ہندوستان کو وطن بنانے کے بعد مسلمان اس ملک میں جس زمانہ میں آباد ہوئے تھے، صدیوں پر صدیاں گزر چکی تھیں، لیکن تاریخ کے اس طویل عہد میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب اور دین کے موضوع پر اس قسم کے مناظرے اور مباحثے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی زمانہ میں نہیں جب اس ملک کی حکمرانی کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، بلکہ محکوم بن جانے کے بعد اور جو صدیوں بھی ان کے ساتھ پیش آئی ہوں، لیکن فریق بن کر مسلمانوں کے دین پر اعتراض اور تنقید کرنے اور ان کے مولویوں سے مناظرہ و مباحثہ کرنے کے لئے ہندو کسی مجلس میں اب تک کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ مرانا آبادی پنڈت انند من کے قصبے میں، صرف رسالوں اور کتابوں کی حد تک محدود تھے، اور پچھلے دنوں سے پنڈت ناتندر سرسوتی جی نے اپنی تنقیدی یا تحقیری زور آزمائیوں کے سلسلہ میں مسلمانوں اور ان کے دین کو بھی جو گھسیٹ لیا تھا، تو تنہا پیش کاغذی رویہ اپنی ہی ”ہی کی حد تک“ کے تقریری و تحریری ہنگامے محدود تھے، باہر اہل مناظرہ کی کسی مجلس میں پنڈت جی کا مسلمانوں اور ان کے علماء سے مقابلہ کی نوبت میرا ظم بھی ہے کہ ابھی تک

لوگ ذرا منہ سے مولوی عبدالرحیم صفی پوری جی اپنی سخت بندی اور علی وحسن میں بدنام بھی تھے، یہ بھی پیچھے نہ جانے نام اور پتہ پوچھا کہ یا کر سچ کا کلام ”ہوں یہ بھی بجا کر اندروالوں سے کہہ نہ پاؤں تو آگے روانہ ہوا“ اور مولوی عبدالرحیم اس کے پیچھے نیز احازت دراتے چلے گئے، مذہبی نے جلسوں میں کہا کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو سچ کا دلائل کہتا ہے، آنے کی اجازت چاہتا ہے، پادریوں میں نکل چلا۔ مولوی عبدالرحیم ساتھ ہی گئے آپ سے تھے، نہایت اطمینان سے کہنے لگے، جب سچ کا باب ہر مسئلہ سے قوراد میں کیا خرابی ہے، زندہ کا قبہ لگا ۱۲

نہیں آئی تھی، اور تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ہندو کو بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں دریائے گنگا کے ساحل پر منعقد ہونے والے اس صحرائی میلہ میں کھڑا کیا گیا تھا۔

ایسی صورت میں یہ دوسرے دنوں میں اگر سید اسد علی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں اس میلہ کے لئے جس میں پہلی بار مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو ایک دینی فریق بن کر شریک ہوئے تھے وہ ہیکلکھنڈ ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا، اور فرض بھی کیا جائے کہ منشی پیارے لال جیسے فیاض، مہمان نواز، سیر چشم رئیس، بجز چاند پور کے اور دوسری جگہ نہیں مل سکتے تھے۔ لیکن مناظرے کے لئے چائے بھر لائی علاقہ کے منشی جی کے وطن چاند پور کا مستقر ضلع شاد جہاں پور میں کیا ایسا میدان، ایسی جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں اس میلہ کو منعقد کیا جائے۔ شہر ہونے کی وجہ سے جو آسانیاں شریک ہونے والوں کو میسر آ سکتی تھیں۔ یقیناً سارا نگپور جیسے کورہ نگاؤں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چاند پور سے شاہ جہاں پور کا فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ گویا شہر کی فوجی آبادی ہم اس کو کہہ سکتے ہیں۔ منشی جی اپنے قصبہ سے شہر میں ضرورت کی چیزیں آسانی مہیا کر سکتے تھے۔ جیسے سارا نگپور تک آ کر ان ہی کو چیزیں پہنچانی پڑیں۔ خصوصاً بے چارے مسلمان لڑنے مارنے کے مسئلہ میں دیوی بدنام ہیں، اور جیسا کہ اسی رسالہ واقعہ میلہ خدا شنائی کے مصنف نے ایک موقع پر لکھا بھی ہے کہ پادریوں میں شہر بھی تھا کہ

”مسلمانوں کو جواب نہیں آتا، لڑنے کو دوڑتے ہیں“ ۱۹

مسلمانوں پر اس الزام کی شہرت پادریوں ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھی، بلکہ خود پنڈت دیانند جی بھی مسلمانوں کی طرف اسی قسم کی زیادتیوں کو منسوب کیا کرتے تھے۔ رڑکی میں پنڈت جی اور سیدنا امام اکبر کے درمیان جو واقعات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل اپنے موقع پر آگے آ رہی ہے، اس موقع پر بھی پنڈت جی نے رڑکی چھاؤنی کے محشریٹ کے سامنے کہا تھا کہ مسلمانوں سے مجھے ”فساد کا خوف ہے“

۱۹ حضرت مولانا تھانویؒ کے حوالے سے مذکور شدہ قصص والا بریں درج کی گئی ہے۔ یہ فقرہ پنڈت جی کی طرف اسی میں منسوب کیا گیا ہے۔ ۲۰

رسالہ ترکی بہ ترکی میں بھی پنڈت جی کے متعلق لکھا ہے کہ

”فساد کا کھسکا زبان پر آتا تھا“ ۱۱

بہر حال لڑنے کو دودھنے، یا فساد برپا کرنے کے یہ الزامات جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے بجائے خود ان کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن پادریوں، اور پنڈتوں کے دلوں میں کچھ بھی خطرہ اگر اس کا تھا، تو حیرت ہوتی ہے، کہ اس خطرہ کے باوجود بقول اسی رسالہ ترکی بہ ترکی کو مصنف کے ”فساد ہوتا تو چاند پور میں ہوتا“ جہاں کی بات کی حکام کو خبر بھی ہوتی تو بدیر ہوتی۔ ۱۲

لیکن اب اسے کیا کہئے کہ وہی خطرات جنہیں پادری بھی اپنے دلوں میں پاتے تھے، اور پنڈتوں کے پنڈت سواری دیا نند جی مہاراج کا بھی وہی قلبی تاثر تھا۔ ان خطرات کے باوجود ”چاند پور“ جیسی جگہ کا انتخاب اس ”مذہبی مقابلہ“ کے لئے کیا گیا۔ اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ میلہ کے لئے خدا ہی جانتا ہے کس مصلحت یا مجبوری کے زیر اثر گرم ترین موسم سنی کے مہینے کو ترجیح دی گئی، اور تاریخ بھی عامی مقرر کی گئی، حساب سے معلوم ہوتا ہے، چاندنی راتیں گزر چکی تھیں۔ اسی لئے قدرت کائنات میں بھی جلسہ کی گنجائش نہ تھی۔ ”واقعہ میلہ خدا شناسی“ میں خاص طور پر اسی بے ضابطگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا بھی ہے

”گرمی کا موسم تھا، گرمی ہی کا وقت تھا، یعنی جلسہ کا وقت دن کے اس حصہ میں مقرر کیا گیا

تھا جس میں گرمی شدت پذیر ہو جاتی ہے۔“

آگے ہے کہ

”مکان جلسہ ایک صحرا شہر سے دور، سایہ کے لئے خیرہ یا درخت آم جس کا سایہ آدھا سایہ

آدھی دھوپ“

اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ ممکنہ حد تک گرمی کی تکلیفوں سے بچنے کی ممکنہ تدبیریں جو کی جاسکتی تھیں، ان کی

طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی، جیسا کہ اسی میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

”نہ ہمیش سے بچنے کا کوئی عمدہ سامان ان لوگوں سے بچنے کے لئے کوئی مکان“

لوگوں کی تکلیف جب حد سے گزر گئی تو فوری طور پر یہ کیا گیا تھا، جیسا کہ اسی سال میں ہے کہ
 ”قنات خیمہ کو جس کو ہنزلہ دیوار خیمہ کہئے“

ان ہی قناتوں کے پردوں کو

”اٹھا کر پتلی پتلی چوبیوں پر استادہ کیا“ جس سے سایہ میں وسعت ہو گئی اور بہت سے شائق
 اس میں اکٹھے ہوئے۔“

لیکن باوجود اس کے قنات کے پردوں کا یہ سایہ بھی کافی نہ ہوا، اسی سال میں ہے کہ
 ”بہت کثرت سے آدمی تھے شوق گفتگو میں نہ لو کا خیال تھا، اور نہ دھوپ کا۔ جہاں جہاں
 نمک آواز کے پہنچنے کا احتمال تھا آدمی ہی آدمی تھے۔“

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، سوچ کر یہ سب کچھ کیا گیا تھا، یا بے سوچے کچھ اس قسم کے
 اتفاقات پیش آ گئے، لیکن اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس هجوم کے جس کا ذکر صاحب رسالہ نے کیا ہے
 ان ہی کو یہ خبر بھی دینی پڑی کہ

”اگر یہ خرابیاں (زمانی و مکانی) نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا۔“ ص ۲۷

میرے پاس کوئی تحریری ذمہ تو نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے
 یہ خیالی گذرتا ہے، اور صاحب رسالہ کی اطلاع کا یہ حصہ معنی ”آدمی ہی آدمی تھے“ غالباً اس میں
 زیادہ اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوگی جو چاند اور قصہ اور اس کے ارد گرد کے گادوں اور کھیروں کے رہنے
 والے تھے، کیونکہ اس سخت موسم میں دور دور سے لوگوں کا پہنچنا آسان نہ تھا، خود شہر شاہ جہاں پور
 بھی جب پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھا تو سواری پر آنے والوں کے سوا تپیش اور لو کے موسم میں پیادہ
 پا آنے والوں کے پہنچنے کی مشکل ہی سے توقع کی جاسکتی ہے۔ صاحب رسالہ نے سچ لکھا ہے، کہ
 ”یہ خرابیاں نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا“ جلسہ تھا ہی اس رنگ کا کہ لوگ دور دور سے آتے
 خود ہی میلہ دوسری دفعہ اسی مقام پر صرف تاریخ کی تبدیلی سے جب منتقد ہوا، یعنی بجائے مئی کے
 مارچ کی ۱۹ اور ۲۰ تاریخ رکھی گئی تو اس دوسرے سال والے میلہ کی روداد میں اس کا تذکرہ بھی کیا

گیا ہے کہ

”علاءہ ساکنان شاہ جہاں پور، نواح شاہ جہاں پور، تلہر، سیرٹھ، دتی، خورجہ، سنجل،
مراد آباد، رامپور، بریلی، دیرینڈ، نک سے بعض بعض شائقین تشریف لائے تھے“ ۱۰۵
مباحثہ شاہ جہاں پور

اس کا بھی پتہ اسی ردود سے چلتا ہے، کہ سال گذشتہ کی طرح منشی پیارے لال صاحب ان کو آنہو کے
مہافوں کی مہمانی برداشت نہ کر سکے بلکہ لکھا ہے کہ

”موتی میاں نے مہمان نوازی کو کام فرمایا، خاطر تواضع سے سب کو مکلف کھانا کھلایا“ ۱۰۶
اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ روہیلی کھنڈ کے مختلف مرکزی مقامات سے دوسرے سال جو لوگ
آئے تھے، وہ عموماً مسلمان تھے، اسی لئے بے چارے موتی میاں کی موروثی سیرٹھی اور دریادلی
کام آئی۔

لے موتی میاں کا ذکر خدا شناسی کے ان دونوں میلوں کی روداد میں کیا گیا ہے۔ میلہ خدا شناسی والی روداد میں
لکھا ہے کہ ان کا اصلی نام محمد ظاہر تھا عرف میں موتی میاں کے نام سے مشہور تھے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ موتی میاں
رئیس شاہ جہاں پور جو مولوی مدن صاحب کی اولاد میں سے ہیں۔ اور کہ بالفعل عہدہ آزرری بمشربٹی پر مست از
ہیں، میلہ میں مذہبی مباحثہ جو ہونے والا تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے قریشی پیارے لال باقی میلہ ہی ذمہ داری تھے، اور
عیسائیوں کی نمائندگی پادری فوس صاحب منشی جی کے دوست سے ہوتی تھی۔ شاید حکومت نے اسی لئے ایک مسلمان
یعنی موتی میاں کو جلسہ کے نظم کا ذمہ دار بنایا تھا، لکھا ہے کہ ”تھرا کی طرف سے موتی میاں اہم قزاق تھے“ ۱۰۷
پہلے سال کے میلہ کے بھی ”دوسرے سال کے بھی۔ باقی میں نے موتی میاں کی روداد کی سیرٹھی کی طرف جو شاہ
کیا اس کا قطعی ان کے چھوٹی مولوی مدن صاحب سے ہے۔ غالباً ہی مولوی مدن صاحب ہیں، جن کا ذکر اوپر
دوسرے شعر یعنی ۱۰۵ بڑھائی شیخ نے داڑھی سے گرہ میں کی سی + مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی - کیا گیا ہے۔
مغل حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر لطائف اللہ کی کے دور سے ہندوستان جیب گذر رہا تھا۔ اس زمانہ کی چند اہم شخصیات
میں ایک یہ مولوی مدن صاحب بھی تھے عماد السعدت نامی کتاب میں ہے کہ مولوی مدن کا شاہ جہاں پور کے قریب
تھہر شاہ آباد میں تمام تھا۔ مشہور تھا کہ حضرت غوث پاک شیخ عہدہ گوریلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ ایک
زمانہ تک کھنڈ کے نواب وزیر مسعود جنگ کے مشیر اور عزم اسرا رہے۔ مسعود جنگ کے مرنے کے بعد ناظم جنگ رہا
جنگ کے پاس مرشد آباد چلے گئے۔ وہاں بھی بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ مانی دلیکی (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال دوسرے سال والے میلہ کے متعلق تو نہیں، لیکن شروع شروع میں ہفتہ میلہ جن خاص خصوصیتوں سے جاتا تھا قریبہ کا اقتصاد یہ ہے کہ چاند اور اور اس کے ارد گرد کے دیہاتیوں کے سوا باقی سے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، اور گو چاند اور اور اس کے اطراف و نواح کی آبادیوں کے متعلق کوئی صحیح ذاتی علم مجھے نہیں ہے۔ لیکن یہ پنی کے عام حالات کے لحاظ سے خیال ہی گذرتا ہے کہ پہلے سال کے میلے میں مسلمانوں سے زیادہ بہت زیادہ تعداد چاہئے تھی کہ دیہاتی ہندوؤں کی ہی ہو۔ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دریلے گزرا کے ساحل پر یہ صورت حال جو پیش آگئی تھی کسی سوچے ہوئے بانٹا بطور دیگر گرام کا نتیجہ تھی۔ لیکن اب اتفاق کہنے یا باہمی اتفاق سے جو تیسریں اختیار کی گئی تھیں، ان کا

گذشتہ صفحہ سے، معاملات میں مہابت جنگ ان ہی سے رہنے لیا کرتا تھا۔ مغل کی حکومت حیب ختم ہو گئی تو پھر لکھنؤ کے نوجوان مکمل شجاع الدولہ سے تعلق قائم ہوا۔ شاہ آباد مغل شاہ جہاں پور تک لکھنؤ سے کافی فاصلہ پر تھا۔ اسی لئے لکھنؤ کے پاس ایک آبادی خالص پور میں مولوی من سے نکال کر تعمیر کرایا۔ جہاں کہیں رسے چودہ کرم کی بادشہ برساتے رہے۔ خالص پور کے قیام کے نظریں صاحب عماد السعادت کا بیان ہے کہ ہر سال درانجا عرس حضرت غوث پٹنلیں ہی کر دے اس عرس میں کیا ہوتا تھا۔ اسی سرخ کے الفاظ میں اس کا جواب سنئے، لکھا ہے

”جو قہر قہر ظہر ظہر علم و فوج فرج مشارح وادارہ شیعہ از اطراف و اکناف..... دران عرس صح می شدند“

لیکن اطراف و اکناف کا مطلب آپ نے سمجھا، وہی اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

”مثل عظیم آباد، سہرام، جرنپور، والیا آباد، اور وود خاٹا، بادشاہ جہاں پور و کورہ جہاں آباد، کاپی و انار و خیر آباد و سندیلہ کا کوری و لکھنؤ و سلون و برنی و ڈکنو“

لطیفہ یہ تھا کہ لکھنؤ کے شمال و جنوب مشرق و مغرب سے یہ آئے، اسے جراتے تھے تو پہلی کا کوریہ آمد غوث دونوں کا شاہجہاں کی سرکار کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ آخر میں لکھا ہے کہ ”سلسلہ روضہ عجیب انوسے و طرفہ تراشدی بود کویہ داشت چند نفر قتال تراز و در دست گزشتہ ای شستہ از صبح تا شام جنس راضی کردہ مردم می دادند، یعنی روزی الطہان دو بار و بیسے سہ بار دیکر دہی گزشتہ بقالان دم نمی زند خیر کہ مرید اور سرکار شاہ صاحب می یافتند“

بہر حال لکھا ہے کہ تخمیناً ہی ہزار آدم فراہم می آئے۔ گویا تین دن تک۔ ۹ ہزار آدمیوں کو راضی شاہ صاحب کی سرکار سے تقسیم ہو جاتا تھا۔ کیا کیا چیزیں ملتی تھیں ان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے جو مصنف نے بیان کیا ہے کہ چوکیوں، سرکاریوں کو علاوہ جنس و خوراک کے نقد بھی گانجہ بھاگت چرس پیئے کے لئے دیا جاتا تھا۔ عماد السعادت

لے یہ لفظ میرا نہیں ہے، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں جن سے خاص حالات جب پیش آئے (باقی اس کے صفحہ پر)

یہ منطقی اور لازمی نتیجہ تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف اظہر وہ یا انجوبہ یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب میلہ جرات نام اور عنوان ہی کے لحاظ سے شہرت پذیری کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتا تھا۔ پھر یا ضابطہ اشتہاروں اور اخباروں سے عام اعلان اس میلہ کے انعقاد کا سارے ہندوستان میں نہ سہی، لیکن یورپی میں کیا جا چکا تھا۔ لیکن رسالہ ”واقعہ میلہ خدا شناسی“ میں یہ عجیب و غریب اطلاع درج کی گئی ہے کہ سیدنا امام الکبیر تک جب یہ خبر پہنچی کہ شاہ جہاں پید کے پاس ”مذہبی میلہ“ قائم ہونے والا ہے، جس میں مختلف ادیان کے نمائندوں میں بحث و مباحثہ بھی ہوگا تو آپ نے اپنے دوست اور عزیز مولوی محمد منیر صاحب کو جو اس زمانہ میں بڑی رہتے تھے۔ یہ ارقام فرمایا کہ

”کیفیت مناظرہ اور محل نزاع سے اطلاع دیجئے“

اور مولوی منیر صاحب نے غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے براہ راست شاہ جہاں پور کی پولیس کے انسپکٹر جن کا نام مولوی عبدالحی تھا، میں ہی سے واقعہ کی پوری تفصیل دریافت کی تو انسپکٹر صاحب جزئیات کی تفصیل تو کیا فرماتے بجائے اس کے جواب میں لکھا تو یہ لکھا کہ

”یہ قصہ بے اصل ہے، علماء کے آئے کی کچھ حاجت نہیں“۔

مولوی عبدالحی صاحب شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس کی شخصیت سے میں واقف نہیں ہوں۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ جواب ان کی طرف سے مولوی منیر صاحب کو جو دیا گیا۔ آخر اس کا منشا کیا تھا۔ بظاہر نام سے یہ مسلمان آدمی معلوم ہوتے ہیں، اور جب تک کسی شخص کا حال معلوم نہ ہو جس نے ہی سے کام لینا ایمان اور اسلام بلکہ شاید شرافت کا بھی اختیار ہے۔ مگر کیا کہئے، یاد ہو گا اس زمانہ کی

گذشتہ صفحہ سے، جن سے پتہ چلا کہ بظاہر گویا انہوں مسلمانوں، ہندوؤں میں نہ ہی فرقوں میں مقابلہ ہے، لیکن درحقیقت عیسائی اور ہندو اندرونی طور پر ملے ہوئے ہیں، آگے اس کی تفصیل بھی کی جا رہی۔ ”مباحثہ شاہ جہانپور“ میں لکھا ہے کہ مٹھی پیارے لال سے موتی میان نے ”ترش رو ہو کر فرمایا کہ میں آٹھ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا“۔ پھر سلسلہ کارروائیوں کے رنگ و رخ کو دیکھتے دیکھتے جس نتیجہ تک موتی میان پہنچے تھے خصوصاً اسے چھپانے کا اندیشہ یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔“

پولیس ہی کے ایک افسر تو وہ صاحب بھی تھے، جن کا نام بھی مسلمانوں ہی کے ناموں کی طرح "محمد بخش" تھا، اور قصبہ دیوبند میں حکومت کی طرف سے کو تو ال شہر تھے۔ پنجایت کے ذریعہ دیوبند والوں کو مقدمات کے باہمی تصفیہ پر سیدنا الامام الکلیر نے جس زمانہ میں آمادہ فرمایا تھا، تو باوجود محمد بخش ہونے کے حضرت دالاکو مخاطب کر کے ان ہی کو تو ال صاحب نے کہا تھا کہ

"میں ابھی سرکار میں رپورٹ کرتا ہوں، کہ مولویوں نے سرکار کے خلاف میں عہدی جھوٹا

کھڑا کیا ہے" (سوانح مختصر خطہ ۱۷۷)

کچھ بھی ہو، ایک ایسا معاملہ جس کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ شاہ جہاں پور کے انگریز کلکٹر مسٹر بارٹ جارج گری صاحب کی باضابطہ منظوری نہیں حاصل تھی، بلکہ قرائن کا اقتضاء ہے کہ اس مذہبی میلہ کو سرکار کے اشارہ یا سرپرستی کا شرف اگر حاصل نہ تھا تو حکومت کی عملی ہمدردیاں اس کے انعقاد میں سلوم ہوتا ہے کسی نہ کسی حد تک ضرور شریک تھیں۔ بلکہ "واقعہ میلہ خدا شناسی" والے رسالہ میں خلعت کے هجوم کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر جو یہ لکھا ہے کہ

"سپایان پولیس اگر نہ روکتے تو (عوام الناس) سب اندر (خیمہ مباحثہ ہی) میں پہنچتے" ۱۷۸

اس سے جیسا کہ ظاہر ہے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نظم و انتظام کے لئے جیسے شاہ جہاں پور کے مقامی رئیس اور آئری مجسٹریٹ موتی میاں کو حکومت نے ذمہ دار بنایا تھا، اسی طرح شاہ جہاں پور کی پولیس بھی ذمہ دار ٹھہرائی گئی تھی، کہ میلہ میں کسی قسم کی بے ترتیبی اور گڑبڑ نہ پیدا ہو، اب آپ ہی بتائیے کہ اسی پولیس کے ایک ممتاز افسر انسپکٹر صاحب کو بھی اس کی خبر نہ تھی کہ اس میلہ میں کیا ہونے والا ہے، اور کس مقصد سے یہ میلہ یہاں قائم کیا جا رہا ہے، کسی طرح یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔؟

بہر حال حقیقت تو یہ ہے، کہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب کی یہ اطلاع خدا نخواستہ اگر کارگر ہو جاتی، اور ہو جاتی کیا سنی، وہ تو کارگر گویا ایک حیثیت سے ہو ہی چکی تھی۔ اسی رسالہ کی تہدید میں ہے، کہ جب میلہ کے انعقاد کی خبر شہر ہوئی، تو شاہ جہاں پور کے مسلمانوں نے حالات کی نزاکت کا انداز کرتے ہوئے سیدنا الامام الکلیر کو واقعہ کی نوعیت سے مطلع کرتے ہوئے، قدم رنجہ فرمائے کی زحمت

دی تھی۔ دوسرے ذرائع سے بھی حضرت دلاک سلسلہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ جب شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ پہنچا، تو نانوتہ جہاں اس زمانہ میں مقیم تھے۔ پیادہ پا وہاں سے روانہ ہوئے، ایک شب کے لئے دیوبند میں قیام فرمایا۔ یوں ہی ایک ایک رات راستہ میں مظفرنگر، اندر میرٹھ میں گذرتے ہوئے دہلی پہنچے، دلی میں شاہ جہاں پور کے اسپیکٹر مولوی عبدالحی صاحب کا یہ پیام آپ تک پہنچا کہ

”علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں“

جیسا کہ چاہئے تھا، وہی اثر اس پیام کا آپ پر پڑا، ترتیب ہوا کہ شاہ جہاں پور جانے کا جیسا کہ لکھا ہے، ارادہ مست ہو گیا۔

مگر ایک طرف اسپیکٹر صاحب کا یہ پیام تھا، اور دوسری طرف عام پبلیسی ہوئی، میلہ کی مشہور خبر پھر شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ اسی دعوت نامہ کی بنیاد پر آپ کا جیل پڑنا کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھیک اسی سال یعنی ۱۳۹۲ء مطابق ۱۹۷۵ء میں بنارس سے سستیاتمہ پر کاش پنڈت دیانند کاشیادہ کار پریس سے باہر آیا تھا، جس میں دنیا کے سارے مذاہب و ادیان کو جیسا کہ آپ سن چکے وہ کچھ بتایا گیا تھا، جسے دنیا کے کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

ادھر یہ کتاب پریس سے باہر آئی ہے، اور اسی سال شاہ جہاں پور کے ایک ایسے میلہ کے افتتاح کی خبر پھیلتی ہے، جس میں مذاہب و ادیان کے نمائندوں کے درمیان اعلان کیا گیا تھا کہ مباحثہ اور مناظرہ ہوگا، اعلان ایک ہندوؤں کی طرف سے تھا، اور اطلاع دی گئی تھی کہ پہلے دفعہ ہندو مذہب کے نمائندے بھی اس اکھاڑے میں اتریں گے، یا آتا رہے جائیں گے۔

نانوتہ تو خیر ذرا ایک مفصلاتی آبادی تھی، لیکن میرٹھ مظفرنگر دہلی وغیرہ جیسے شہروں میں جو یہ میگوئیاں اس سلسلہ میں جو رہی ہوں گی، ہم ان کا شاید آج صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے، خصوصاً میرٹھ تو ایک حیثیت سے سوای دیانند کا گویا گڑھ ہی تھا۔ میرٹھ ہی سے پنڈت جی کے قائم کئے ہوئے نئے ”سماج“ یعنی آریہ سماج کا آرگن ”آریہ سماچار“ نامی اخبار نکلتا تھا، کچھ ان ہی باتوں کا اثر غالباً یہ ہوا کہ شاہ جہاں پور کے

سفر کا ارادہ مست پر چکا تھا، لیکن جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے دہلی سے
برنظر احتیاط ایک خط شاہ جہاں پر لکھا کہ آپ بلا تے ہیں، اور مولوی منیر صاحب (جن کے
ذریعہ انسپکٹر صاحب کا پیغام پہنچا تھا وہی) یوں کہتے ہیں (یعنی علماء کے آنے کی کچھ حاجت
نہیں) اس لئے تردد ہے۔“ ص ۳۱

جن صاحب کے نام حضرت والا کا گرامی نامہ تھا، ان کو خاص طور پر تاکید کی گئی تھی کہ اس مذہبی میلہ
کی واقعی نوعیت کیا ہے۔

”مفصل لکھئے“

میلہ، مہرئی کو منعقد ہونے والا تھا، اور یہ خط ولی سے شاہ جہاں پر آتے تنگ وقت میں پہنچا کہ انعقاد
میلہ کی تاریخ سے کل تین دن پہلے یعنی ۲۲ مہرئی کو اسی دن

”مہرئی کو (شاہ جہاں پرستے) اول تو ایک تہہ برقی آیا“

یہ زمانہ تھا کہ تار کے پڑھنے والے دتی جیسے شہر میں بھی آسانی ہر جگہ نہیں میسر آتے تھے، مہرئی کا دن
بھی گزر گیا، اور پتہ نہ چلا کہ تار کا مضمون کیا ہے، بہ شکل تلاش کرنے کے بعد انگریزی جاننے والے
کوئی صاحب ملے تب

”قریب شام، یہ معلوم ہوا کہ ”ضروری آؤ““

یہی اس تہہ برقی کا مضمون ہے۔ شام کو یہ خبر ملی، اور دوسرے دن یعنی ۵ مہرئی کو تار کے سوا ایک خط بھی
شاہ جہاں پر لکھا جس میں لکھا تھا کہ

مولوی عبدالحی (انسپکٹر پولیس شاہ جہاں پور) کو غلطی ہوئی، آپ آئیں، اور مولوی سید
ابو المنصور صاحب کو ساتھ لائیں۔“ ص ۳۲

یہ سید ابو المنصور صاحب وہی امام فن مناظرہ کے لقب والے صاحب ہیں۔ یادریوں سے متبادل اور مناظرہ
میں جنہوں نے اس زمانہ میں خاص شہرت حاصل کی تھی، ان کو خاص طور پر اپنی رفاقت میں لانے کی
وجہ شاہ جہاں پور کے اس خط میں یہ بتائی گئی تھی کہ

”پادری نول (نولس) صاحب کو جو بڑے ستان اور مقرر ہیں یہ دعوائے ہے کہ مقابلہ دیں جیسی
 دین محمدی کی کچھ حقیقت نہیں“ ص ۱۷

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا امام اکبر کی طلبی میں پادریوں کا مقابلہ شاید خود شاہ جہاں پر
 دلوں کے پیش نظر بھی نہ تھا، اور بظاہر اس لئے آپ کو بلانے کی چنداں کوئی خاص وجہ ہو بھی نہیں سکتی
 تھی، کیونکہ اولاً مناظرہ کہنے یا منکابہ کے جو اکھاڑے اس زمانہ میں پادریوں کی بدولت قائم ہو گئے تھے،
 بجز ایک دفعہ کے جس کا ذکر کر چکا ہوں، یعنی تاراجند نامی پادری سے دلی میں اور وہ بھی باخوار نام آپ کی
 گفتگو ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس قسم کی دوراز کار اور لاعا حاصل تھنوں میں کبھی دل جیسی ہی نہیں نی تھی اور دلی
 والا باخوار اولاً ایک مقامی معاملہ تھا، ثانیاً باخوار نام کی وجہ سے آپ کی طرف اس کے منسوب ہونے
 کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔

تاہم اسپیکر صاحب شاہ جہاں پور کی مخالفت کے باوجود خود شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا
 آپ کی تشریف آوری پر اصرار اور کیسا اصرار؟ کہ خط ہی نہیں، بلکہ جس زمانہ میں تار پڑھنے والے دلی
 جیسے شہر میں بھی آسانی نہیں مل سکتے تھے، اس زمانہ میں تار کے ذریعہ سے آپ کی طلبی جو اس زمانہ
 کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی بجائے خود خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

مگر کوئی تحریری دثیقہ، یا ایسا بیان اب تک مجھے نہیں مل سکا، جس کی روشنی میں اس
 سوال کا صحیح جواب دوں۔

یہ صحیح ہے کہ جن خصوصیتوں کے ساتھ یہ میلہ چاند پور میں منعقد ہو رہا تھا، وہ دینی اور مذہبی نقطہ
 نظر کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مذہب اور دھرم
 کا معاملہ اس ملک کے باشندوں کی سب سے زیادہ قیمتی رگ ہے، ابھی چند سال ہی تو گزرے تھے
 کہ مشہد میں حکومت کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ عمیق اسباب و محرکات کچھ ہی ہوں، لیکن پھٹا تھا تو زخم
 صرف ”چرونی لگے ہوئے کار توں ہی کے تھیسے سے“ مذہبی زخم ہی سے چوٹ لگانی گئی تھی، جس سے
 سامانک گونج اٹھا اور فتنہ و فساد کی آگ بالآخر اسی ”گونج“ نے اختیار کی۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ

چند سال پہلے جس ملک میں یہ تماشہ دیکھا جا چکا تھا، اسی ملک کے ایک ایسے علاقہ میں جیسا کہ روہیلکھنڈ ہے، اور اس کے بھی کسی شہر میں نہیں، بلکہ ایک صحرائی مقام میں جمع کیا جاتا ہے۔ باشندگان ملک کے مختلف مذاہب و ادیان کے نمائندوں کو، جن میں پادری عیسائیوں کے نمائندوں کے متعلق تو خیر کیا جاسکتا ہے کہ لوگ گوند عادی ہو چکے تھے، بقول سرسید مرحوم

”پادری صاحب و عظیم صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذاہب کے مقدس لوگوں کو، اور مقدس مقاموں کو بہت بُرائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے، جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور ذلتی تکلیف پہنچتی تھی۔ مثلاً اسباب لغات ہندو خیمہ حیات جاوید“

یہ تو خیر دوزمرہ کا مشغلہ ہی بن چکا تھا۔ بار بار ایک ہی چیز سے انسان کب تک بھرکتا رہے۔ لوگوں میں گویا پادریوں کے طرز عمل کی طرف سے گوند جمود کی ہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن سوال اس نئے فریق کا تھا، جو پہلی دفعہ اس دنگل میں اتر آیا، انا مارا گیا تھا۔ میری مراد ہندوؤں سے ہے۔

انصاف کی بات یہی ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں ہندوؤں کا اسلامی دین اور اس دین کے پیشواؤں کے ساتھ جو سلوک بھی ہو، اس عہد کے متعلق تو بہت کچھ کہنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے، لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی کم از کم ہندو مذہب کے فلسفہ اور مذہبی زندگی بسر کرنے والے اس باب میں عموماً احتیاط ہی سے کام لینے کے عادی تھے، ”تختہ الہند“ نامی کتاب جو ۱۸۵۷ء میں لکھی گئی ہے، یعنی ہنگامہ غدر سے چھ سال پہلے اس کتاب میں بھی ضمت کتاب کے نو مسلم مصنف مولوی عبید اللہ صاحب نے اس زمانہ کے بعض واقعات کا ذکر کیا ہے، جن کا تجربہ اظہار اسلام سے پہلے ان کو ہوا، جن سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، ”مغلہ دوسرے قصبوں کے ایک قصبہ جوانی کے ساتھ پیش آیا“ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ اظہار اسلام سے پہلے بھی مذہبی امور کو متعلق اپنے بھائی برادری کے لوگوں سے گفتگو کرنے کے مواقع پیش آتے رہتے تھے، ایک دفعہ ایک ایسے دو دو ان ہندو پنڈت سے جو ہندو مذہب کے چھ شاستروں کا عالم تھا، اس سے بھی ان کی گفتگو

ہوئی لکھا ہے کہ

”اس پنڈت کو میر (درپردہ) مسلمان ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ یہ جانتا تھا کہ یوں ہی مستظرف

کرتا ہے۔“ ص ۶۳

اسی لئے منہ دیکھی بات کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، سلسلہ گفتگو میں اسی پنڈت سے ایک دفعہ مولوی عبید اللہ نو مسلم کا یہ کالمہ ہوا۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - پنڈت جی آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان اپنے دین دھرم پر قائم رہیں، تو ان کی کس (نجات) ہوگی یا نہیں؟

شاستری پنڈت - ہاں کیوں نہیں ہوگی۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - مسلمانوں کا دین حق ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت - ہاں! ان کے لئے حق ہے۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - ان کے (یعنی مسلمانوں کے) دین کی اصل قرآن شریف ہے، سو قرآن شریف بھی کتاب ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت - کیوں نہیں بھی ہی کتاب ہے۔

مولوی عبید اللہ نے لکھا ہے کہ اس آخری سوال کو ذرا زیادہ زور دے کر میں نے پھر ان سے پوچھا کہ

واقعہ تم قرآن کو بھی کتاب مانتے ہو، ان کا بیان ہے کہ پنڈت جی نے جوہ میں دہرا کر پھر ہی کہا کہ

”ہاں قرآن سچا ہے۔“ ص ۶۴

یہ تو یہ ایک انفرادی بات، لیکن جس خاص طریقہ سے خاص موقع پر گفتگو ہوئی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ پنڈت جی جو کچھ اس وقت کہہ رہے تھے، یہی ان کا بھی مذہبی عقیدہ تھا، ان خواہ واقعہ کے لحاظ سے یہ خیال غلط ہو، یا صحیح، لیکن کہا جاسکتا ہے کہ

لہٰذا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو سچی کتاب مان لینے کے بعد پھر پنڈت جی کا پتہ چلے کہ اسلامی دین ان کے لئے (یعنی صرف مسلمانوں کے لئے) حق ہے، اسی لئے مسلمانوں کی نجات کے لئے تو یہ دین کافی ہے، لیکن (باقی اگلے صفحہ پر)

ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات برہمنوں اور چٹوڑیوں کا احساس اسلام کے متعلق کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

سب سے پہلے دیانند کے زمانہ میں ہندو قوم کی اس موردنی روایت کے برخلاف اسلام اور اسلام کی کتاب اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد میں نئی جرأت اور جسارت اس قوم میں پیدا کی گئی تھی۔ نئی بات تھی، نیا جوش تھا۔ یہ میل چاند پور میں ٹھیک اسی زمانہ میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اسی سال پنڈت جی کی کتاب متیار توبہ پر کاشش پریس سے باہر آئی تھی۔ مذہبی مباحثہ کے سلسلے میں ہندوؤں کے نئے عنصر کا جوا اضافہ اس میل میں ہوا تھا، اور جن حالات میں ہوا تھا، اور جن خطرات کا اندیشہ ایسی صورت میں کیا جاسکتا ہے، کیا حکومت جس کی طرف سے باضابطہ اس میل کے انعقاد کی اجازت دی گئی تھی، اس اندیشہ کی رعایت اس کے فرائض میں داخل نہ تھی۔

حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ یہی پادری دوسروں کو جو جی میں آتا تھا، جیسے سناتے تھے، اسی طرح دوسروں سے بھی سب کچھ سننے کے عادی ہو چکے تھے، آخر متیار توبہ پر کاشش میں عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کو جو کچھ کہا جا چکا تھا، جب حکومت کے ساتھ پادریوں کا طبقہ بھی اس کو سن کر خاموش تھا، متیار توبہ

(گزشتہ صفحہ سے) مسلمانوں کے مواد سرے اوایان مذہب کی طرف جو لوگ متوجہ ہیں، ان کی نجات کیلئے اسلامی دین کا قبول کرنا ضروری نہیں بلکہ اسلام قبول کئے بغیر بھی ان کی نجات ہو جائے گی، کچھ پوچھتے تو یہ پنڈت جی کے اس دھوے کی تردید ہے، یعنی قرآن بھی کتاب ہے۔ ان کا یہ دعویٰ غلط ہوتا ہے۔ مولوی عبید اللہ صاحب مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی کو میں نے مطلع کیا کہ جناب والا جس کتاب و قرآن کو آپ بھی کتاب مانتے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ اسلام کے سوا جس دین کی بھی کوئی پیروی کرے گا اس سے اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا، یعنی وہیں یہی عقیدہ ہے کہ دینا ظن بقبل منہ کا جو مطلب ہے۔ بہر حال اسلام کو دین العرب اور پیغمبر اسلام کو رسول العرب یا رسول اللہ عین قوم عربی کہلئے یہ حقیقت اسلام ہی کو کچھ مانتے ہیں، اللہ نہ اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں، ایک دلچسپ محشاف تحفہ ہندو کے مصنف کے بیان سے یہ ہوتا ہے کہ برہمنوں نے عام ہندوؤں کو یہ یاد کر دیا تھا کہ گیتا میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اپنا دین اگر چہ مائی کے سلطان اپنی خدشہ کے دانہ کے برابر ہو، اللہ سوا ان بہت سارے مینی پھاڑ کے برابر ہے۔ جب بھی اپنا دین نہ چھوڑنا چاہئے، اللہ عظم گیتا میں یہ بات بتائی جا چکی ہے یا نہیں۔ لیکن اس سے اس کا توبہ چلا کر مذہب کے متعلق کتنے غلط فہم نظریے پیدا ہوئے ہیں، اگلیا تھا تو اللہ یہ ہے کہ مذہب کسی خاص قوم کی وراثت ہے اور نہ کسی مخصوص امت کی ذاتی جائیداد، بلکہ پیدا کرنے والے خانی نے اپنے بعدوں کو ان کی زندگی کے جس قدر حق آئین اور دستور اصل سے آگاہ کیا ہے، انسانیت اپنے صحیح انجام تک جس کی پابندی کے بغیر نہیں پہنچ سکتی (باقی اگلے صفحہ پر)

پرمکاش شدہ ۱۹۷۱ء میں چھپ کر پبلک کے سامنے آئی تھی۔ مولوی ابوالوفائشا دانشدہنوں نے آریوں کے ساتھ مناظرانہ کش مکش میں کافی حصہ لیا تھا، وہی اپنی کتاب ”حق پرکاش“ میں جیسٹہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی، اسی میں یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”ہندوؤں نے اپنے مضمون کے متعلق یعنی ستیارتھ پرکاش کے جس حصہ میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں پر اعتراضات کئے گئے تھے، ان کی طرف سے، اس کتاب (ستیارتھ پرکاش) کے متعدد جوابات دیئے ہیں، چنانچہ بعض کے نام یہ ہیں۔ دیانند ترمکھا سکر، دیانند بھاکر، دیانند سمبھاؤ پرکاش“

آخر میں لکھتے ہیں کہ

”عیسائیوں کا جواب کوئی سننے میں نہیں آیا“

مولوی صاحب کو عیسائیوں کی اس عجیب و غریب خاموشی پر حیرت ہوئی ہے، اپنے اسی استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”مشنریو! کہاں ہو“ ”حق پرکاش“

کم از کم اس سے اس کا تو پتہ چلا کہ بتیس سال تک کوئی جواب عیسائیوں کی طرف سے دیا نہ دی کی کتاب کے اس حصہ کا نہیں دیا گیا تھا، جس میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ عیسائیوں، اور ان کے دین کی متعلق کیا کچھ نہیں کہا گیا تھا۔

مگر یہی بے حس پادری جن کے کان پر ستیارتھ پرکاش کے نفرون کو بھی جوں نہیں رہی، وہی نام نہاد خدا شناسی کے اس میل میں اتنے ذکی النحس بن کر شریک ہوئے تھے کہ ایک موقع پر بائبل کی تحریف کا قصہ چھڑا۔ خود پادری نوٹس نے یہ تسلیم کر لیا کہ ”انجیل میں یہ فقرہ باہر سے بڑھا دیا گیا ہے“ ان کے اس

دگر مشتبہ مصلحت سے، اسی کا نام مذہب اور دین ہے، اصولاً اول سے آخر تک ہر قسم اور ہر امت میں اسی دین کو خدا کے پیغمبروں، حضرات انبیاء و صل علیہم السلام پہنچاتے رہے ہیں، اسی کی آخری شکل ترین شکل کا نام اسلام ہے جو پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے تاریخ کے آخری دور میں دنیا کو دیا گیا ہے ۱۲

لے تفصیل کے لئے تو ”تباہ شاہ جہانور“ کی روداد ہی کو پڑھنا چاہئے، مفصل یہ ہے کہ انجیل کے اس (باقی اگلے صفحہ پر)

اعتراف پر سید الامام اچھرنے ان ہی سے صرف اتنی بات پوچھی کہ

”ایک پیالے پانی میں ایک قطرہ پیشاب کا گر جائے تو وہ قطرہ سارے پانی کو ناپاک بنا دیتا ہے“

بے ساختہ زبان مبارک سے تشبیہی فقرہ کیا نکلا کہ پادریوں کے حلقہ میں غل جگ گیا کہ ”انجیل خدا کا کلام ہے“ اس قابل نہیں کہ اس میں ناپاکی ملائی جائے“

حالانکہ سید الامام اکیس فرماتے رہے کہ باہر سے ملائے جانے والے جزو کو میں نے پیشاب و تشبیہ دی ہے۔ انجیل کو تو پاک پانی ہی ٹھہرایا ہوں، لیکن پادریوں نے شر اور ہنگامہ کر کے تشاد باؤ ڈالا تو اس تشبیہ کو ناپس پیتے ہوئے حضرت دالہ نے فرمایا کہ

”یہ مثال نہ سنئے، دوسری مثال سنئے“ مثلاً مباحثہ شاہجہاں پور

الغرض ہندو بھی اب وہ ہندو نہ تھے، جو سوامی دیا بند سے پہلے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص میلہ کی حد تک پادری بھی اپنی مصنوعی بردباری و علم کے جذبات کے برخلاف دوسرے ٹیگ میں آکر شریک ہوئے تھے۔

رہا تیسرا فرق مسلمانوں کا، سوان کی آتش مزاجیوں اور دینی معاملات میں ان کی اشتعال پذیریوں کے پھیلنے ہوئے عام چرچوں کے سوا، جب ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ اس مذہب کی گناہیں عموماً جس زبان میں ہیں یعنی سنسکرت زبان تک کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیاد رہا ہو کہ

”عام طور پر مسلمان اس کو (سنسکرت زبان کو) بت پرستوں کی زبان سمجھتے رہے، اسی لئے ان کے

نزدیک وہ (سنسکرت زبان) قابل نفرت ہی رہی“ (سنسکرت اسمتھ ص ۳۱ کی تادم قدیم سنسکرت در ترجمہ) مثلاً

(گندیشہ صفحہ ۷۷) اور ترجمہ کرچر سبلی و نور مزاد پوریشتری جالوں نے چھاپا تھا، اسی کو لیکر سید الامام اکیس کے اشارے سے امام فاضل خاں سوروی اور انصاری جیسے کھڑے ہوئے اور برحق انجیل بائبل دس میں جو فقرہ یا ایجا تا جو گنہیں ہیں جو ایمان پر گواہی دیتے ہیں آپ کا نام اور معنی اللہ اس آیت میں لکھیں ”اسی پر عاشرہ خرمز اپو کی مشنری انوں کی طرف کرکھا گیا تھا کہ یہ لفظ کسی قدیم مذہب میں نہیں پائے جاتے مگر ایمان کی اعتراف شہادت تھی، خود پوری نوس نے بھی تصدیق کی کہ واقعی یہ ایسا ہی فقرہ ہے۔ دیکھو مثلاً“

لہذا اس میں شک نہیں کہ یورپ کی جدید علمی نشانات میں مختلف قدیم زبانوں اور ان کے حروف کے باقی اگلے صفحہ پر

بجائے خود، یا اسی نوعیت کے پھیلائے ہوئے دوسرے الزامات یا اتہامات کی دائمی حقیقت جو کچھ بھی ہو، لیکن جس زمانہ میں یہ سمجھا بھی جاتا تھا، اور یہ سمجھا یا بھی جاتا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلہ میں دیانندی جبارتوں کی سبب افزائیوں کے بعد اگر گھبرا کر دیے کا منطقی انجام خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا ہو سکتا تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ گھڑے کرنے والوں نے چاندیہ کے اس میلہ میں جن مختلف ادیان مذاہب کے نمائندوں کو لا کر جمع کیا تھا، پہلے سے کچھ اسی قسم کے انجام کا تصور کر کے خدا شناسی کے نام نہاد نام سے اس میلہ کے جانے کا نظم چاندیہ میں کیا تھا۔ پہلے بھی شاید کہہ چکا ہوں کہ اس کی کوئی واضح شہادت ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ جیب اس میلہ کی ان دونوں رودادوں کو پڑھتا ہوں جن میں دو سالوں کی کارروائیوں کو مستند صاحبان ہوش و گوش نے مرتب کر کے شائع کر دیا تھا، اور جہاں تک میں جانتا ہوں، واقعات جن کا تذکرہ ان رودادوں میں کیا گیا ہے، ان پر نہ اسی زمانہ میں کسی نے کسی قسم کی تنقید کی تھی، اور نہ آج تک ان کے خلاف کوئی آواز کسی طرف سے بلند ہوئی ہے، ان واقعات کے جاننے کے بعد عیسویوں کے متعلق میرا خیال تو یہی ہے کہ اپنے حسن ظن کو شکل ہی جو محفوظ

(گزشتہ صفحہ سے) پڑھنے کا عام مذاق خصوصاً یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں جو پایا جاتا ہے مسلمانوں کے زمانہ میں اس مذاق کی عمومیت کا پتہ نہیں چلتا، مسکرت ہی کیا یونانی زبان اور اس زبان کے حروف کے جاننے والے اور پڑھنے والے مسلمانوں میں کم ہی پیدا ہوئے ہیں، لیکن باوجود اس کے جیسے یہ مسلم ہے کہ یونانیوں کا ساما علمی سرمایہ جو یورپ والوں تک پہنچا، اس سرمایہ کی منتقلی میں واسطہ کا کام زیادہ تر مسلمانوں ہی نے انجام دیا ہے۔ اسی طرح مسکرت زبان کے جاننے والے پر بھیج ہے کہ مسلمانوں میں محدود سے چند افراد مثلاً البیرونی وغیرہ ملتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے علوم و فنون طب و نجوم ہیئت فلسفہ اور اس ملک کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے کافی فائدہ اٹھایا ہے، تقریباً اسی قدر جتنا فنیونائیوں کے علوم و فنون سے ان کو پہنچا ہے، ایسی صورت میں مسکرت زبان کے جاننے والوں کی کمی کو نفرت کا نتیجہ قرار دینا بجز تعصب تماشی کے اور بھی کچھ ہے۔ نفرت ہوتی تو پھر ہندوستان کے علوم و فنون کو مسلمان ہاتھوں ہاتھ کیوں لیتے، ہندوؤں کا دار الحکومت ان کی کتابوں سے کیوں بھر جاتا؟

بت پرستی کا لطیفہ اچھا صاحب نے جو پیش کیا ہے، میں ان سے بچنا چاہتا ہوں کہ یونان کی بت پرستی کیا ہندوستان کی بت پرستی سے کچھ کم تھی ۱۱

رکھنے میں کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں رد و ادیں نام طور پر ملتی ہیں 'ان کو پڑھئے۔

اس میں شک نہیں کہ میلہ میں شرکت کی دعوت، "خدا شناسی" ہی کے نام پر دی گئی تھی، 'اشتہار جس میں میلہ کے قائم کرنے کی غرض و غایت بیان کی گئی تھی، 'پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، '۱۰' ہکا ہنسون یہ تھا، 'میلے کے نام سے آپ کو میلہ کی غرض و غایت معلوم ہو گئی ہوگی، مگر مزید وضاحت کے لئے غرض ہے، کہ اصلی غرض "تحقیق مذہبی" ہے، 'اور اشتہار کا منشاء یہ ہے، کہ میلہ میں ہر مذہب کے آدمی آئیں، 'اور اپنے دلائل سنائیں، 'تو اعدا کی تفصیل آئندہ ملے ہوگی، '!

لیکن ہوا کیا؟ پہلا سال جس میں باوجود توقع کے پنڈت دیانند سرسوتی جی شریک نہ ہو سکے، حالانکہ اسی سال ان کی کتاب مستیارتھ پر کاش شائع ہوئی تھی۔ جس میں ہندوستان کے سارے مذاہب پر اعتراض کیا گیا تھا، 'یوں بھی سارے ہندوستان میں ہلچل وہ اسی زمانہ میں مچا گئے ہوئے تھے، 'اور اپنے ساختہ پرواختہ مذاہب جس کا نام انہوں نے ویدک دھرم دیکھ دیا تھا، چیلنج کرتے پھرتے تھے، 'مگر سارے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں صرف یہی ایک بچا دھرم اور صادق دین ہے۔ لیکن اب اسے کیا کہئے، کہ نہ صرف پنڈت جی ہی اس میلہ میں غائب تھے بلکہ شاہ جہاں پور کے قریب ہی اسی دہلی گنڈ میں منشی اندون جرزبان سے تو نہیں، 'لیکن قلم سے ہتھامہ برپا کئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی میلے کے اس پہلے سال میں ہم نہیں پاتے بلکہ بجائے ان دونوں کے ہندو مذاہب کی نمائندگی یا دکالت کرنے کے لئے جو آئے تھے، 'وہ اسی قسم کے لوگ تھے، 'کہ نہ ان رد و ادوں ہی میں ان کے ناموں کا اس زمانہ میں تذکرہ کیا گیا ہے، 'اور نہ باوجود تلاش کے کسی دوسرے ذریعہ ہی سے اس وقت تک مجھے کچھ نشان پتہ ان بے چاروں کا چل سکا۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کون لوگ تھے، 'اور ان کی علمی حیثیت کیا تھی؟ ورنہ تک جلسہ ہوتا رہا، 'ان پورے دونوں میں ان کی طرف سے کوئی گویا اٹھا ہی نہیں، 'اسی سال کی رد و ادیں ہے کہ دوسرے دن آخری جلسہ میں پادری نولس صاحب نے کہا کہ "اب بھائی ہندو اپنا بیان کریں، 'یہ سن کر بے چارہ ایک پنڈت اٹھا ہی تھا کہ اچانک بقول صاحب رد و اد کے

"ایک دسی پادری جو بڑے پادری صاحب (نولس صاحب) کے قریب ہی بیٹھے تھے او

ان کے اٹھنے بیٹھنے سے یہ نمایاں تھا کہ بعد پادی نول صاحب کے انہیں کا رتبہ ہے ،
 وہی پادی صاحب (یعنی پادی نول صاحب) کی طرف جھک کر کان میں کچھ فریانی لگے " منہ
 کان میں کیا کہا گیا ، دوسروں کے لئے اس کے جاننے کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ البتہ یہ دیکھا گیا کہ بجائے
 پنڈت صاحب کو تقریر کے اس مقام سے جہاں وہ اگر کھڑے ہوئے تھے ہٹا دیا گیا ، اور کان
 میں جھک کر بولنے والے پادی کو نول صاحب نے پنڈت جی کی جگہ تقریر کرنے کا حکم دیا ، وہ تقریر
 بھی کیا تھی ، کچھ جذبہ کی سی بڑھتی تھی جس کا نہ سر تھا نہ پیر ۔ وقت ٹالنے کے سوا بظاہر پادی صاحب
 کی اس تقریر کا شاید کوئی دوسرا غشاء معلوم بھی نہیں ہوتا ۔ لکھا ہے کہ اسی کے بعد دونے گئے ، اور
 جب دوسرے دن کا آخری اجلاس ختم ہوا تھا جس کے بعد سیلہ ہی اس سال کا ختم ہو جاتا ۔ اسی تنگ
 وقت میں دیکھا گیا کہ وہی پنڈت جی جو بٹھادیے گئے تھے ، وہ آئے اور بجائے تقریر کے جس کے لئے
 وہ کھڑے ہوئے تھے دیکھا گیا کہ ایک تحریر پڑھ رہے ہیں

"وہ تحریر ناگری میں لکھی ہوئی تھی" منہ

ناگری تو حرف تھا ، باقی زبان سو لکھا ہے کہ

"اکثر الفاظ زبان سنسکرت کے تھے"

جسے مسلمان کیا جس علاقہ میں تحریر سنائی جا رہی تھی ، اس علاقہ کے ہندو بھی عموماً نہیں سمجھ سکتے تھے لکھا
 ہے کہ ان پنڈت جی کے بعد

"ایک فقیر سو تنگ آئے ، اند ایک تحریر طویل جو بظان ناگری لکھی ہوئی تھی ، ہٹے اور چینی

شروع کی ، اکثر الفاظ سنسکرت کے تھے ، اند اسی زبان کے " دہرے اس میں مرقوم

تھے " منہ

گویا یہ دونوں تحریریں پڑھنی تو ضرور گئیں ، لیکن جب کسی نے ان کا مطلب ہی نہ سمجھا تو بجز اس بات کے
 کہ ہندوؤں کے نمائندوں نے بھی مباحثہ میں حصہ لیا ، خانہ پری کی حد تک اتنی بات تو صادق آگئی اور
 کوئی مال یا مقصد ان تقریروں کا معلوم نہیں ہوتا ۔

ہاں! ایک سال بعد جب یہی میلہ اسی میدان میں جوا، تو بالکل گزشتہ سال کے برعکس اس سال پنڈت دیانند سرسوتی جی بھی تشریف لاتے ہیں، اور پنڈت اندرن کو بھی ہم مجلس میں جلوہ فرما دیکھتے ہیں۔ جبریت اس پر ہوتی ہے کہ گزشتہ سال ان دونوں صاحبوں میں سے ایک بھی نہ آیا۔ اور اس سال آئے تو دونوں ہی آئے اور کس شان کے ساتھ آئے؟

مباحثہ شاہجہانپور نامی دوسرے سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہفتہ پہلے سے پنڈت جی چانداپور پہنچے ہوئے تھے، مباحثہ کی مجلس میں منشی پیارے لال کی طرف سے بربان اردو پانچ سوالات اس مطالبہ کے ساتھ جو رکھے گئے کہ پہلے ان سوالوں کا جواب دیا جائے، لکھا ہے کہ ”نصیب بیان بعض معتبرین سوالات مذکورہ پنڈت دیانند کے تجویز کئے ہوئے تھے“ ۱۵

اسی کے بعد یہ بھی ہے کہ

”جو شخص خود سوالات کرے گا، اور وہ بھی اس طور پر کہ ایک ہفتہ پہلے اسی کام کے لئے آیا ہوا ہو“ ۱۶

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میلہ کے بانی منشی پیارے لال رئیس چانداپور کا تعلق جیسے شاہ جہانپور شہری اسکول کے ہیڈ ماسٹر یا دیونس صاحب سے تھا، اسی طرح پنڈت جی سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے، منشی جی بے تعلق نہ تھے۔ بلکہ اسی روداد سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرے سال کے اس میلے کے برخاست ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نمائندے علامہ وغیرہ تو شاء جہاں پور

”حسب خواہش مولوی محمد طاہر صاحب (یعنی مولوی مدن داسے موتی میاں کے) مکان پر

فرز کش ہوئے“ ۱۷

اور انہیں کے یہاں بھی رہے، اپنی موروثی رعایت کے مطابق موتی میاں نے ان کی خاطر مدارات میں خاندانی خصوصیات کا اظہار جس پر کیا تھا، اس کا اندازہ صاحب روداد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

”ان کی مہمان نوازی اور دل جوئی، اس وقت آنکھوں میں پھرتی ہے“ ۱۸

مگر اس کے برخلاف سارنگپور جہاں کے باغ میں سیلا جایا گیا تھا، بجائے شہر یعنی شاہ جہاں پور آنے کے لکھا ہے کہ

”پنڈت صاحب یعنی سوامی دیانند سرسوتی، اندیشی اندمن چاندا پور کو چلے گئے“۔

یہ بھی اسی میں ہے کہ موتی سیاں نے بعض لوگوں کی تحریک سے جن میں سیدنا الامام الکیس کا اشارہ بھی تحریر تھا۔ اندمن کے پاس شاہ جہاں پور سے اپنا خاص آدمی چاندا پور یہ دعوت نامہ دے کر روانہ کیا کہ ”آپ براہ کرم بھمراہی پنڈت دیانند صاحب شریف لا کر قبول دعوت سے مرہون منت فرمائیں“

عرض کرنے کی یہی تھی کہ بعض تشنہ مسائل پر پنڈت جی اندیشی اندمن سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ دعوت نامہ میں اس کی اطلاع بھی دے دی گئی تھی، مگر جواب میں اندمن نے بجائے شاہ جہاں پور کے لکھا کہ اپنے مولویوں کو لے کر آپ ہی چاندا پور آئیے، جہاں اندیشی پیارے لال کے مہمان بن کر اندیشی جی بھی اندیشی پنڈت جی بھی فرزند کش تھے۔

ان ساری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی اندیشی اندمن دونوں ایک طرح سے اندیشی پیارے لال کو اپنا سرپرست سمجھتے تھے۔ ایسی صورت میں طرفین کے متعلق بے گانگی کا خیال خود ہی سوچنا چاہئے کہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

مگر باوجود اس کے میلہ جو پہلی دفعہ دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا، اسی میں دونوں کا نہ آنا، اعلان کی جگہ گنہام پنڈتوں کا پہنچنا، آخر اس کی توجیہ کیا کی جائے۔ پنڈت جی کے ساتھ جب ہم جانتے ہیں کہ کام کرنے والوں کی کافی تعداد تھی۔ ڈاکٹر مرڈک صاحب ایم۔ اے کی شہادت بھی گڈر چکی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ”سوامی جی تعریف کرنے والوں کی ایک جماعت اپنے ساتھ رکھتے تھے“ بلکہ کتاب ”جواب ترکی برکی“

لے اندمن کے جوابی خط میں یہ بھی تھا کہ میں آپ کے ذہنی مووی طاہر عرف موتی سیاں کے مکان پر نہیں آتا، ہاں اندیشی لنگا پرشاد ہوتے جن کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر یہ مقام شاہ جہاں پور ہو گئی ہے، تو ان کے مکان پر آ سکتا تھا۔ ”میں مباحثہ شاہ جہاں پور شاید ان اندیشی لنگا پرشاد سے بھی اندیشی جی کا وہی سرپرستی کا تعلق تھا جو اندیشی پیارے لال تعلق دار چاندا پور کے ذریعہ یہاں کو حاصل تھے۔“

سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کو آگے بڑھا کر کام کھانا، یہ بھی سوامی جی کے مختلف طریقوں میں ایک خاص طریقہ تھا، میرٹھ کے ایک آریہ منشی اندلال تھے۔ اس کتاب میں ان ہی کے سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، مگر یہ کہتے ہوئے کہ

”کون نہیں جانتا کہ پنڈت جی (یعنی سوامی دیانند جی، منشی جی (اندلال)، کے سرور ہوں

ہیں“ ص ۷

اس موقع پر یہ مشہور شعر

جرخ کو گب پیلے ہے ستم گاری میں

کوئی مشرق ہے اس پر وہ نگاری میں

”جواب ترکی بترکی“ کے مصنف نے استعمال کیا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ پہلے پہلے میں پنڈت جی (منشی جی) کی عدم شرکت کی نہ میں کچھ قسم کی بات نہ ہی ہو واقعی مذہب کی تحقیق پہلے کی غرض تھی، تو ہندوؤں کی طرف سے جن سرماء آدمہ و فمدار لوگوں کی شرکت کی توقع کی جا سکتی تھی، وہ اس پہلے سے غیر حاضر کیوں ہوئے، اندان میں جو آئے بھی، تو گو ابتدا میں ہندوؤں کی طرف سے منشی پیارے لال صاحب نے پہلی جو تقریر کی، وہ عام فہم تھی، لیکن اٹھنے کے بعد جن پنڈت صاحب کو بٹھا دیا گیا، اوپادی نولس کی سرگوشی دوسرے پادری سے جو گویا ان کے نائب تھے جب ہوئی تو اس کے بعد ہندوؤں کے نمائندوں نے اولا تقریر ہی نہ کی، بلکہ ان کی طرف سے تحریر پڑھی گئی، اور تحریر بھی اسی زبان میں جسے جلسہ کے عام شرکا بھی نہ سمجھتے تھے، اور نہ دو بجے مذاہب کے نمائندے اس زبان سے واقف تھے۔ اسی طرح دوسرے سال پنڈت دیانند جی (منشی اندمن) حسب توقع تشریف تو ضرور لائے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سال کے پہلے میں جیساکہ ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ میں لکھا ہے

”ہندو میں سوائے پنڈت صاحب کے اور کوئی صاحب ادلی سے آخر تک کھڑے ہی

نہیں ہوئے“ ص ۷۷

انسان کی تقریر کا رنگ جبرہا اس کا اندازہ اسی رد واد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ
 "ان کی زبان میں الفاظ مسکرت بہت ملتے ہوئے تھے، بلکہ اکثر جملے جملے سوائے کے
 کا وغیرہ حروف ربط کے مسکرت میں ہوتے تھے" ص ۱۱
 جس کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، یہی ہوا کہ

"سوائے دو چار آدمیوں کے حاضران جلسہ میں سے ان کے مطلب کو کوئی نہ سمجھا ہوگا۔"

ان دو چار آدمیوں کا حال یہی تھا کہ سوطہ اللہ الجبار کے مصنف، پھر ایوں کے مولانا محمد علی صاحب
 جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ہندو ادبیات کا کافی مطالعہ کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے سیدنا الامام الکبیر
 نے ان سے کہا

"یہ نیاز مند تو پنڈت بنی کی تقریر سمجھا نہیں، اس لئے اب آپ ہی کو تکلیف کرنی پڑے گی۔"
 مگر مولانا محمد علی صاحب نے جواب میں کہا کہ

"میں بھی پورا پورا نہیں سمجھا"

دل چسپ لطیفہ اسی رد واد میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"مولوی محمد ناکم صاحب نے عین اس وقت جس وقت پنڈت صاحب تقریر کر رہے تھے اپنی
 کرسی سے اٹھ کر آہستہ سے غشی اندر من صاحب سے یہ کہا کہ آپ اگر خود کچھ نہیں بیان فرماتے
 تو یوں ہی کیجئے کہ آدھے وقت میں تو پنڈت صاحب جو کچھ ان کو بیان کرنا ہو، کر لیا کریں اور
 آدھے وقت میں آپ اس کا ترجمہ کر دیا کریں، جو ہم بھی کچھ سمجھیں۔"

اور وہ انداز اسی زبان کے مصنف غشی اندر من یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جلسہ کے حاضرین جس زبان کو
 سمجھتے ہیں، ہم اس سے ناواقف ہیں۔ اس لئے انہوں نے مولانا کی پیش کش کے جواب میں فرمایا کہ
 "سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کبھی کچھ دینے کا اتفاق نہیں ہوا، جو لوگ یہ کام کرتے رہتے ہیں انہیں
 سے ہو سکتا ہے، اس لئے میں معذور ہوں" ص ۱۱

یوں غشی جی بھی کترا گئے، حاصل یہی ہوا کہ شرمیک ہوئے اور نظا ہر کچھ گفتگو میں ہندوؤں نے حصہ

ضرر دیا، لیکن پہلے کے ان دونوں سالوں میں نتیجہ کے لحاظ سے ہندوؤں کی حیثیت گویا صیفِ نوبی بن کر رہ گئی تھی۔

اور یہ حال تو مباحثہ میں حصہ لینے والے فریقوں کا تھا کہ مسلم ایک فریق کیا دھرم و قریب کا عدم ہی کے رہا۔ اب سنئے اتفاقِ میلہ اور مباحثہ میں حصہ لینے والے حضرات جب "محاسنِ مباحثہ" میں جمع ہو گئے تو پادری نرلس صاحب کی طرف سے گفتگو کی شرطوں 'اور قیدوں' کا سببان اٹھایا گیا 'اور سنہ سے پہلے اس مسئلہ میں وقت کے مسئلہ کو اہمیت دی گئی، اصولاً خود سیدنا الامام الکبیر بھی تحدیدِ وقت کے قاعدے کے حامی تھے حضرت نے پادری نرلس سے کہا بھی تھا کہ تعینِ وقت کی وجہ یہ ہے کہ

"مبادا کوئی شخص مفت مغر زنی کرنے لگے، اگر وقت محدود نہ کیا جائے گا، تو ایسا شخص بے وجہ مغر کھائے گا، اور اس کے سوا (دوسروں کو) بولنے کی گنجائش نہ ملے گی۔ مندرجہ بالا آپ ہی کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی، کہ دائمی دین کی تحقیق مقصود ہے تو ایک صورت اوقات کی تعین و تقسیم کی یہ ہو سکتی ہے کہ

"مباحثہ تین دن تک اس طور پر ہے کہ ایک روز ایک مذہب والا اپنے دین کے فضائل گھنٹہ دو گھنٹہ بیان کرے، اور پھر اس پر دوسرے مذہب والے اعتراض کریں اور جواب سنیں۔"

ادھر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا، یعنی مباحثہ کے تینوں فریق (ہندو، مسلمان، عیسائی) کے لئے ایک ایک دن نہیں دیا جاسکتا، تو آپ ہی نے دوسری متبادل تجویز پادری صاحب کے سامنے یہ رکھی، کہ "درس (یعنی تقریر) کے لئے کم از کم ایک گھنٹہ، اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے دیئے جائیں، مقررہوں، اور سوال و جواب (تنقیدی اعتراضوں) کے لئے دس منٹ سے بیس منٹ تک۔"

لیکن ہوا یہی کہ پہلے سال کے پہلے میں تو خیر

”مدت و عطل (درس) پندرہ منٹ اور سوال و جواب کی مدت ۱۰ منٹ قرار پائی۔“

لکھا ہے کہ

”اگرچہ اس امر میں مولوی محمد قاسم صاحب نے چاہا کہ مدت و عطل اور بڑھادی جائے، اور یہ بھی فرمایا کہ اتنے عرصہ میں حقیقت مذہب کا حق ثابت نہ ہو سکے گی مگر عیسائیوں نے نہ مانا۔“

تاہم ۱۵ منٹ کی مدت بھی غنیمت تھی، دوسرے سال کے پہلے میں توحیدہ کر دی گئی، کہ ”پادری زولس صاحب نے کہا کہ ہر ایک شخص کے درس و سوال و جواب کے لئے ۵ منٹ کی مدت مقرر ہو۔“

گھنٹہ دو گھنٹے کی جگہ درس یعنی تقریر اور سوال و جواب (تفتیدی اعتراضوں) دونوں کے لئے پندرہ منٹ اور دس منٹ بھی، بلکہ یہ حکم کہ سب کچھ تقریر بھی اور سوال و جواب بھی ان سارے قصوں کو ۵ منٹ میں ختم کر دیا جائے، لکھا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے لاکھ کہا گیا کہ ”۵ منٹ میں تو کچھ بھی بیان نہیں ہو سکتا۔“

بجھایا جاتا تھا کہ

”ذہبی جھگڑے جو فروع سمجھے جاتے ہیں ان میں بہتوں بنیائیت و بحث ہوتی ہے، یہ تحقیق مذہب ۵ منٹ میں کیونکر ہو سکتی ہے۔“

مسلمانوں کے نمائندے یہ بھی کہتے رہے کہ

”ہم لوگ بھی تو اس جلسہ کے ایک رکن ہیں، ہماری داسے کی رعایت ضرور ہے۔“ ص ۱۵۱

شاہ جہاں پور

سیدنا اہلکام اکبر یار یار فرماتے کہ

”پہلے سے کون اپنے مطالب کو ناپ تول کر لاتا ہے، جو وقت قلیل محدود الطرفین میں بیان

کرے۔“ ص ۱۵۲

لکھا ہے کہ ایک دفعہ تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

”جس مذہب میں ایک دو فضیلت ہو، تو وہ دو چار منٹ میں بیان کر سکتا ہے، پر جس کے

مذہب میں ہزاروں فضائل ہوں، وہ اتنے تھوڑے عرصہ میں کس طرح بیان کر سکتا ہے؟“

طرفدارِ جزیہ ہے، کہ پہلے ہی میلہ میں خود پادری نوٹس صاحب جنہوں نے بعد پندرہ منٹ سے زیادہ

درس یا تقریر کے لئے دینے سے انکار کیا تھا، وہی خود جب درس دینے کیلئے کھڑے ہوئے اور ۱۵ منٹ

ختم ہو گئے، اپنے خیال میں پادری صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کی تقریر پوری نہ ہو سکی، تو لکھا ہے، کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب غیرہ کی طرف مخاطب ہو کر کیا کہتے ہیں؟“

سنئے کیا کہتے ہیں؟

”اگر آپ صاحب مہربانی فرما کر کچھ اور ہمت دیں، تو ہم کچھ اور بیان کر لیں“

مولویوں کے عام طبقہ کی طرف سے پادری صاحب کی اس درخواست کے جواب میں جو کچھ کہا گیا تھا،

اس کا ذکر تو میں کسی دوسرے موقعہ پر کر دینا گا، لیکن مسیدنا الامام البکیر نے آگے بڑھ کر اس دقت

فرمایا تھا کہ

”پادری صاحب ہم آپ کی طرح نہیں کہ اجازت ہی نہ درس، ہماری طرف سے اجازت ہے۔

آپ پندرہ منٹ کی جگہ بیس منٹ بیان کریں، پچیس منٹ بیان کریں، تیس منٹ بیان کریں،

آپ حسب دل خواہ بیان کر لیں“

مگر اس تجربہ کے بعد بھی دوسرے میلہ میں جب دقت کا مسئلہ چھڑا تو نہیں پادری نوٹس صاحب نے ۱۵

منٹ کو گھٹا کر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں پانچ منٹ کر دیا۔ اگرچہ اسی دوسرے میلے میں دوسرے دن ایک اور

پادری صاحب کو نوٹس صاحب نے اپنی اعاذ کے لئے طلب کیا تھا، جن کا نام پادری اسکاٹ تھا، اور

مشہور تھا کہ وہ منطق کی کسی کتاب کے مصنف ہیں، ایسی اچھی کتاب فنِ منطق میں لکھی ہے کہ حکومت کی طرف

سے مشہور تھا کہ پانسو روپے انعام کے طور پر ان کو دیئے گئے ہیں، بہر حال کہنا یہ ہے کہ جب ہی پادری

اسکاٹ آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ تقریر پوری کے لئے کل ۵ منٹ کا وقت دیا گیا ہے، تو انہوں نے

اس کی مخالفت کی اور کہا

”درس کے لئے ایک گھنٹہ سے کم نہ ہونا چاہئے“ اس باب میں مسلمانوں کی رائے ٹھیک ہے۔“

اسکاٹ صاحب بار بار کہتے تھے کہ

”ایک گھنٹہ سے کم میں کوئی کیا سیکھ کرے گا؟“

خیر یہ قصے تو وقت کی تحدید نہیں کے منطبق تھے، گو یا میلہ خدا شناسی کے اشتہار میں جن شرائط کی تفصیل کا وعدہ کیا گیا تھا، ان میں ایک شرط کا بخار تو یہ ہوا۔ دوسری شرط جس کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہلے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی، لیکن دوسرے پہلے میں دیکھا جاتا ہے کہ تمام شرطوں میں اسی کو اہم ترین شرط قرار دیا جا رہا ہے، یعنی یہ چاہا گیا کہ مباحثہ سے پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ کس ترتیب سے بحث ہوگی، مباحثہ شاہ جہاں پر سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے رہے کہ واقعی مقصد اس میلہ کا اگر اثبات تحقیق مذہب ہے، تو اس کی طبعی ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ

”اول ذات باری میں گفتگو ہو، کہ وہ ہے یا نہیں، اور ہے تو ایک ہے یا متعدد، پھر صفات

باری میں گفتگو ہو کہ صفات مخصوصہ ذات خالق کیا ہیں، اور کون کون سی صفات اس میں پائی

جباتی ہیں، کون سی نہیں پائی جباتی، پھر تجلیات باری میں گفتگو ہو۔“

تجلیات باری کا کیا مطلب ہے، اس کی طرف اجمالی اشارہ کے بعد فرمایا گیا کہ

”نبوت میں گفتگو ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہے کہ نہیں، اور کون ہے، کون نہیں،

اس کے بعد احکام میں مباحثہ ہو، کہ کون سا حکم اصول مذکورہ پر منطبق ہو سکتا ہے، اور کون سا حکم

منطبق نہیں ہو سکتا، اور کون سا قابل تسلیم ہے۔“ ص ۵۲

لے بحث کی مدد آپ نے آخر میں اس سوال کو بھی فہرست مباحثہ میں شریک کر دیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ جو اصل حقیقت اس باب میں ہے اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت دلا نے یہ بھی اسی کے ساتھ فرمایا تھا، کہ اگرچہ بروئے اضافہ ”بعد نبوت، نبوت شخص میں دھمت و دایت“، یعنی ثابت ہو جائے فلاں شخص نبوت کے دعوے میں ملوث ہے، اس کی طرف جو حکم اور جوبات بھی صحیح ذریعہ سے منسوب ہو، بہر حال فرمایا گیا تھا کہ ان دونوں باتوں سے مطمئن ہو جانے کے بعد عقل و ادراک سے احکام کی بھلائی اور برائی کی تفتیش امر لا ظالم بلکہ نازیبا ہے (باقی ص ۳۹۷ پر)

مگر بجائے اس ترتیب کے آغاز جلسہ ہی میں جیسا کہ لکھا ہے کہ منشی پیارے لال باقی جلسہ نے ایک کاغذ اردو لکھا ہوا پیش کیا کہ یہ پانچ سوال ہماری طرف سے پیش ہوتے ہیں۔ سیدنا الامام اہلبیت کے پیش کردہ سوالات کے درج کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے، ان سوالوں کو بھی ملاحظہ فرمایا جائے (۱) دنیا کو پریشور (خداوند تعالیٰ) نے کس چیز سے بنایا، اور کس وقت اور کس واسطے۔ (۲) پریشور کی ذات محیط کل ہے یا نہیں، (۳) پریشور عادل ہے، اور رحیم ہے، دونوں کس طرح۔ (۴) دیدہ بایں، اور قرآن کے کلام الہی ہونے کی کیا دلیل ہے۔ (۵) نجات کیا چیز ہے، اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

یہی وہ سوالات ہیں جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں، سمجھا جاتا تھا کہ پنڈت دیانند جی نے ایک ہفتہ پہلے منشی اندمن کے ساتھ چاند پور پہنچ کر کافی غور و خوض کے بعد مرتب کر کے منشی پیارے لال کے حوالہ کیا تھا۔

حیرت ہوتی ہے، کہ دوسرے میل میں بھی کل دودن ہی خدا شناسی پر بحث کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے، لیکن ان دودنوں میں بنی اب اسے کیا کہئے، کہ تحدید وقت، اور سوالات کی ترتیب ہی کے قصوں میں جیسا کہ مباحثہ شاہچانپور میں لکھا ہے کہ

”روز اول اصرار اور انکار ہی میں وقت جلسہ گذر گیا اور گفتگو نہ ہونے پائی“ ۵۵

خود سوچنا چاہئے کہ جہاں اتنی بے دردی کے ساتھ غیر ضروری، اور ذیلی رگڑوں جھگڑوں میں وقت کو

گذشتہ صفحے، چہ کی بات اسی کے بعد یہ فرمائی گئی کہ عقل سے یہ کام دینی احکام کی برائی بھلائی کا مسئلہ نہ بلانا، ممکن ہو سکتا تھا تو انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہی کیا تھی، اندنی کا کہنا جب واجب التحظیم ہو گا تو پھر جو کچھ وہ فرمائیں یہ سر و چشم۔ مباحثہ شاہچانپور

لے پنڈت جی کو شاید اپنے اسی سوال پر سب سے زیادہ ناز تھا۔ سیدنا الامام اہلبیت کی تجلیات باری پر بحث کرنے سے غرض ان کے اسی سرایہ ناز سوال کی سچ کئی تصویر تھی۔ کائنات حق تعالیٰ کی تجلی نگاہ ہے۔ اسی میں اسی سوال کا جواب پوشیدہ ہے کہ خدا نے عالم کو کس چیز سے بنایا۔ تفصیل کے لئے حضرت دالاکئی کتبوں کو پایہ نہ ہر کے توفیق کی بخشہ کتاب ”الدری النجم“ کو دیکھ لیا جائے ۱۲

ضائع کیا جائے، وہاں آدمی اپنے اس غلے کو کہاں تک قائم رکھ سکتا ہے، کہ خدا شناسی کے نام سے لوگوں کو جو جمع کیا گیا تھا۔ واقعی مقصد اس اجتماع کا خدا شناسی ہی کی صحیح راہ کا پتہ چلانا تھا، سیدنا الامام الکبیر تو کبھی کبھی ان ہی حالات کو دیکھ دیکھ کر فریاد کیا کرتے تھے، کہ واقعی خدا شناسی اگر مطلب ہے، تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہوتا، مباحثہ شاد و چہان پر میں حضرت والا کا یہ فقرہ نقل بھی کیا ہے، کہ ایک دفعہ منشی پیارے لال کو مخاطب کر کے آپ نے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، صرف جیلہ اور بہانہ ہے، حضرت والا کے بھنبہ الفاظ یہ تھے کہ

”منشی صاحب آپ نے دیکھا پادری صاحب نے کیسے کیسے جیلہ اور بہانے کئے۔“

سوالات کی ترتیب کے قصے میں بھی آپ نے اسی جیلہ اور بہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

”اگر اثبات و تحقیق مذہب پر نظر ہے تو ترتیب عقلی (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو ہم نے کل عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں تو منشی پیارے لال صاحب ہی کے فرمانے کا اتباع ٹھیک ہے۔“

کل دو دن ان میں بھی کامل ایک دن کو اس قسم کے لائینی مشاغل میں صرف ہوتے ہوئے دیکھ کر سیدنا الامام الکبیر نے جب یہ تجربہ پیش کی کہ ایک دن بڑھا کر تین دن کر دیجئے، اور اس پر جیسا کہ لکھا ہے،

”پادری نوٹس کا یہ کہنا کہ ہم کو زیادہ فرصت نہیں آج ادکل ہی ٹھہر سکتے ہیں۔“

سیدنا الامام الکبیر سے نہ رہا گیا، جھنجھلا کر آپ نے پادری نوٹس کو خطاب کر کے کہا تھا ”یہ بات (یعنی عدم الفرصتی کا عند) ہمارے کہنے کی تھی، باوجود افلاس و بے سرمہ سامانی قرض دام سے کہ اپنی ضرورتوں پر خاک ڈال کر ایک مسافت دور دراز قطع کر کے یہاں پہنچے ہیں، اور اس پر یہ قول ہے کہ جب تک حسب دل خواہ فیصلہ نہ ہو جائے گا، نہ جائیں گے۔“

اپنے اس حال کو بیان کرنے کے بعد جس میں جہاں تک میرا خیال ہے، واقعہ ہی کا اظہار کیا گیا تھا جس کی تائید کتاب ”جواب ترکی بہ ترکی“ کی اس اطلاع سے بھی ہوتی ہے کہ چاند اپوری نہیں، بلکہ اس کے بعد رڑکی میں پنڈت دیانند سرتی اور سید الامام الکیسر کے درمیان جو سرگرم پیش آیا دونوں کی مرتبہ روداد میں سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے چھپ کر شائع نہ ہو سکیں، لکھا ہے کہ

”جو جہتی دستی یہ امید ہی نہیں، کہ روداد مباحثہ کو چھاپیں، ورنہ چاند اپور اور رڑکی کا واقعہ ہی

کیوں آج تک یوں پڑا رہتا؟“

ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں چند ورقوں کے ان مختصر رسالوں کی چھپائی کا سرمایہ مہیا نہیں ہو سکتا تھا، اسی زمانہ میں کیوں تعجب کیجئے اگر نانوے سے چاند اپور تک پہنچنے کے لئے قرض دام سے کام لینا پڑا ہو۔

بہر حال اپنے اس حال کو پیش کر کے پادری صاحب سے فرمایا گیا تھا کہ اب آپ اپنے حال کو ملاحظہ فرمائیے، اگر

”آپ صاحب تو اسی کام کے نوکر“ آنے جانے میں کوئی دقت نہیں، مگر مباحثہ شاہچاند اپور

لیکن باریں ہم جیسا کہ آگے لکھا ہے

”پادری صاحبوں پر کچھ اثر نہ ہوا“

خیر اس حد تک تو جو کچھ کیا جا رہا تھا، اس سے صرف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ”تلاش حق“ اور

”تحقیق مذہب“ کے نصب انجمن کا اعلان کر کے لوگوں کو جو بلایا گیا تھا، اتنے نئے شاخسائے نکال کر

جیلوں اور جالوں سے اسی کو پس پشت ڈالنے کی کوشش ہو رہی تھی، لیکن قصہ اسی ختم نہیں ہو جاتا، عرض

کر چکا ہوں کہ مباحثہ کے فریق بظاہر خدا شاہی کے اس پہلے میں تین تھے ہندو مسلمان عیسائی لیکن

ان دونوں میں سے پہلے پہلے میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہندوؤں کی طرف سے ابتدا میں مٹی

پیارے لال صاحب بانی میل نے اردہی میں تقریر شروع کی، لیکن پادری نولس اور ایک دوسرے

پادری جن کا مرتبہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے بعد ہے، ان دونوں کی باہمی سرگوشی کے بعد بجائے تقریر کے

ہندوؤں کی طرف سے پڑھنے والوں نے اسی تحریک پر ڈھیس جن کی زبان کے سمجھنے والے پورے

میلے میں تین چار آدمی سے زیادہ نہ تھے، یہ تو خیر بجائے خود تھا، دل چسپ لطیفہ یہ پیش آیا، کہ پہلے میلے میں دوسرے دن یہ سوال اٹھایا گیا کہ مباحثہ کے ہر فرقہ کی طرف سے گفتگو میں حصہ لینے والوں کی تعداد میں کون کی کمی ہو گئی ہو گی؟ اس کا جواب دیا گیا کہ ہر فرقہ کی طرف سے پانچ پانچ آدمی اس کام کے لئے چن لئے جائیں، مسلمانوں نے تو پانچ آدمی اپنے چن لئے، مگر ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا۔

”ہمارا ہر فرقہ جدا ہے، ہر ایک فرقہ میں سے پانچ پانچ آدمی چاہئیں۔“
مطلب جس کا یہی ہوا کہ دو فرقے بھی اگر ہندوؤں کی طرف سے جلسہ میں شریک تھے، تو ان کی تعداد مجموعی طور پر اس طریقہ سے دس ہو گئی، لیکن اس کا نتیجہ نہ چلا کہ کتنے فرقے ہندوؤں کے قرار پائے، بہر حال مطالبہ پیش ہوا، لکھا ہے کہ

”چنانچہ اسی کے موافق قرار پایا۔“ مگلا میلہ خدا شناسی

اس میلے کی حد تک تو معاملہ اسی پر ختم ہو گیا۔ لیکن دوسرے میلے میں جو کچھ دیکھا گیا، اس کا سراغ ان اطلاعات سے ملتا ہے، جنہیں اس میلے کی روداد میں ہم پاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ شرعاً غلط و غیرہ کے طے و تصفیہ کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ایک سبکدوش کمیٹی بنادی جائے جس کے اراکین ہندوؤں کے چند اشخاص چن لئے جائیں۔ یہ بھی کیا گیا۔ ہندوؤں کی طرف سے سبکدوش کمیٹی میں بجائے منشی سیارے لال بانی جلسہ ابراہان کے ایک رفیق منشی مکتا پرشاد کے پنڈت دیا تدرس سوتی اور منشی اندرسن پہلے شریک کئے گئے تھے، لیکن جب تعین اوقات وغیرہ کے مسئلے پر گفتگو ہونے لگی، تو لکھا ہے کہ

”پادری صاحب یہ چال چلے کہ منشی سیارے لال اور مکتا پرشاد کو بھی رکن شیعہ قرار دیا جائے اور یہ کہا کہ وہ بانی بانی جلسہ ہیں، ان کی دوائے یعنی بھی ضروری ہے۔“

یہ بات بھی مان لی گئی، جب یہ سب کچھ ہوا، تب سنئے، بیان کیا ہے، کہ پادری نولس صاحب نے سب کو خیمہ میں بلالیا، اور وہی پرانا حربہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلہ میں اول سے آخر تک استعمال ہوتا رہا ہے وہی ہتھیار نکل آیا، یعنی پادری نولس نے کہا۔

”اعتبار کثرتِ ادا کا چاہئے“ ۷۱

ادھر پادری صاحب کی طرف سے یہ اعلان ہوا ”اداس کے بعد ادا سے آخر تک مسلمانوں کو سلسلہ میں چیز کا تجربہ ہوتا رہا۔ مباحثہ شاہجہاں پور میں بار بار مختلف پیرایوں میں اس کا اظہار کیا گیا ہے، مثلاً تجدیدِ وقت ہی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال

”بوجہ توافقی پنہانی اندیز سندت صاحب بھی اُن کی (پادری صاحب کی) ہاں میں ہاں ملاتے
لگے“ ۷۲

آگے اسی کے بعد تقریباً اسی واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

”غرض جس بات کو پادری نوس صاحب کہتے تھے، حضرات ہنود بھی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے
تسلیم کرتے تھے“ ۷۳

ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ منشی پیارے لال کو براہِ راست مخاطب کر کے سید ملا امام الکبیر کو یہ کہنا پڑا،
”منشی صاحب ہم کو آپ سے بڑی شکایت ہے کہ ہم اند پادری صاحب دونوں آپ کے
بلائے ہوئے، دونوں آپ کے مہمان ہیں، آپ کو لازم تھا کہ دونوں کو برابر سمجھتے، مگر جب
آپ ڈھلتے ہیں، انہیں کی طرف ڈھلتے ہیں، جب تائید کرتے ہیں، ان ہی کی کرتے ہیں، انہیں
کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں“ ۷۴

ادری مولوی محمد طاہر یعنی مولوی عن دا لے موتی میاں جو میلے کے ہتم تھے۔ انہوں نے تو کھوے کھوے صاف
و صریح الفاظ میں منشی پیارے لال سے لکھا ہے کہ ترش رو ہو کر کہا کہ

”میں آئندہ سال شریکِ جلسہ نہ ہوں گا“ اس کے کیا معنی کہ مسلمان جو کہتے ہیں، ان کے کہنے
پر تو اتفاقات بھی نہیں کرتے، اور پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر
تسلیم کر لیتے ہو“

اداسی موقع پر موتی میاں کی زبان سے بے ساختہ وہ فقرہ نکل گیا تھا جسے پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، یعنی
”یہ بات بالکل سازش اور اتفاقِ باہمی پر دلالت کرتی ہے“ ۷۵

منشی بیارے لال ان باتوں کو سنتے تھے اور غرور و معذرت کے بارد الفاظ میں مختلف قسم کی مجبور یوں کا ذکر دیتے بہر حال خفا شناسی کے میلے کے پہلے سال ہی میں جو دیکھا گیا تھا، جیسا کہ اس سال کی روداد کے مرتب کرنے والوں نے لکھا ہے کہ

”اگرچہ بظاہر مناظرہ کرنے والے عین فریق قرار پائے تھے، مسلمان، عیسائی، ہند، مگر درحقیقت اصل گفتگو مسلمان اور عیسائیوں میں تھی“ ۵

کھل کر اس کا جو مطلب تھا، وہ دوسرے سال کے میلے میں لوگوں کے سامنے اس شکل میں آ گیا کہ عیسائی اور ہندو دونوں کو ایک فریق بنا کر مسلمانوں کے مقابلہ میں گویا کھڑا کر دیا گیا ہے، اور وہی ہندوستان جہاں کچھ ہی دن پہلے عیسائی پادریوں کی تبلیغی جدوجہد کے مقابلہ میں یکجہا جا رہا تھا کہ ”ہر ہندوستانی (غیر مسلمان ہو یا ہندو) عیسائیت کے عز و ج اور ترقی کو اپنوناہب کی بربادی سمجھتا تھا“ اسی لئے رد نصاریٰ میں جو کتابیں چھپتی تھیں، ان کو ہندو مسلمان سب پڑھتے تھے“

اور صرف پڑھتے ہی نہ تھے، بلکہ رد نصاریٰ میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، عموماً جن کے لکھنے والے مسلمان ہی ہوتے تھے، لکھا ہے کہ ان ہی کتابوں کو ہندو اپنے پریسوں میں چھپوا کر اشاعت کرتے تھے اس سلسلہ کی ایک مشہور کتاب ”غایۃ الشعود کج الحج المبرور“ جسے لکھنؤ کے ایک عالم مولوی محمد شاہ لکھنوی نے لکھی تھی، یہ کتاب

”منشی نول کشور نے ۱۲۹۰ھ میں چھپوائی“ فرنگیوں کا جال ۳۰

چھپوائی کے لفظ کا بظاہر مطلب یہی ہے، کہ طباعت کے سامنے مصارف منشی نول کشور نے خود برداشت کئے تھے

اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مثال اسی سلسلہ کی اسی کتاب میں نقل کی گئی ہے کہ ٹانڈو پنجاہ ضلع ہوشیار پور کے ایک صاحب جن کا نام مولوی شیخ احمد تھا، اور پادریوں نے جو طوفان ملک میں برپا کر رکھا تھا، جانتے تھے کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ بھلہ دوسری سیاسی چالوں کے ایک

چال بھی ہے، اسی نے لکھا ہے کہ

”ان کا طریقہ تھا، جس جگہ شام کو پادری جاتا، اسی جگہ پر صبح کو جاتے، اور وہ (یعنی پادری) بچسنے کا جو چال بچھا کرتا اس کو پاش پاش کرتے“

سننے کی بات یہ ہے، کہ یہی شیخ احمد صرف مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ

”ہندو مسلمانوں دونوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی تلقین کرتے“ ۳۱ فرنگیوں کا چال

اٹلر اٹلر دی ہندوستان جہاں ۱۸۹۰ء میں دیکھا گیا تھا کہ روئساری میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو اپنے خرچ سے ہندو چھاپ رہے ہیں، وہ ہیں چند ہی سال کے پیر پھیر میں یہ کیسا دردناک انقلابی نظارہ تھا کہ عیسائی پادری اور ہندوؤں کے پنڈت ایک صف میں بیٹھے ہیں، اور مسلمان دوسری صف میں اپنی دیدہ و عبرت نگاہ سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو تجویز بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی ہے، اس کو مسترد کرنے میں عیسائیوں کے پادری اور ہندوؤں کے پنڈت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گویا کوئی انددنی سا ہتھیار کئے ہوئے ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں، میلہ کس نام سے جمع کیا گیا تھا، اور اس سے کام کیا لیا جا رہا تھا، اور یہ قصہ تو شرائط و قیود کے تحت، باقی میلے کا حقیقی موضوع یعنی خدا شناسی پر مباحثہ، سو جہاں تک واقعات کے سلوک ہوتا ہے، اور مباحثہ شاہ جہاں پور میں لکھا بھی ہے کہ

”قلت فرصت کا بہانہ کر کے مباحثہ کو مختصر کر دینا“ ۳۲

پادری زیادہ تر اسی کے درپے تھے، یہ شکل تھوڑا بہت وقت جو ملا بھی، اس میں سچ پوچھتے، تو سر جوڑ کر، کسی مسئلہ کی تحقیق و تلاش کا جو عام طریقہ ہے، اس سے گریز ہی کی کوشش کی گئی، ہمارے مصنف امام نے اس میلہ کا جہاں تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے، وہاں شرائط و قیود کے اجالی ذکر کے بعد جو یہ اور قیام فرمایا ہے، کہ

”آخر گفتگو ہوئی، طرز گفتگو کی نہ تھی، بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا“ ۳۳

سوانح قدیم

اس سے ان کی غرض یہی ہے کہ حق کی تلاش و جستجو کا اس قسم کی مجلسوں میں جو علمی یا طبعی طریقہ ہے، وہ اختیار نہ کیا گیا، بلکہ وہی بات کہ اپنی اپنی باری پر بولنے یا لکھی ہوئی تحریروں کے پڑھنے کا صرف موقعہ لوگوں کو دیا گیا، مگر یہ گفتگو جو بیطرز گھنگوڑہ ہوئی، ”آپ سن ہی چکے، اگر ایک مستقل فرائض یعنی ہندوؤں کی طرف سے اگرچہ ابتدائی تعہد رنشی پیارے لال کی اسی زبان میں شروع ہوئی جسے میلہ داسے سمجھ سکتے تھے، لیکن پادری نرلس امدان کے نائب دوسرے پادری کی سرگوشی کے بعد یہ قصہ بھی ختم ہو گیا، اندیشی پیارے لال والی تقریر جو کبھی گئی، اس کا رنگ بھی جو کچھ تھا، اس کا اندازہ اسی نمونہ سے ہو سکتا ہے، جو پہلے سال کے میلے کی روداد میں درج ہے، لکھا ہے، ”کہنشی جی نے کھڑے ہو کر ایک تحریر پڑھی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ

”میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا، امدان کے ہتھ میں جاگتے سوتے برابر اسانا چلا رہتا ہے۔“ مٹ

اسی سے سمجھا جا سکتا ہے، کہ میلہ کے انعقاد کا جو نصب العین بتایا گیا تھا، خود کشی جی کو اس سے کتنی دل چسپی تھی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا، کہ جس شخص کے دینی احساسات اتنے سطحی اندیشیت ہوں، اسی میں ایسے عظیم الشان مقصد کے لئے میلہ قائم کرنے کا تصور پیدا ہی کیسے ہو سکتا ہے، اسی روداد میں لکھا ہے، ”کہ جب جلسہ ختم ہو رہا تھا، تو کشی جی نے ایک دوسری تحریر بھی پڑھی جس میں

”گوشت کے حلال بننے پر اعتراض تھا۔“ صلا

جس کے سنے یہی ہوئے، کہ دین اور مذہب کی حقیقی روح امدانسانی فطرت کی گہرائیوں میں چھپ چھپا ہوئی ہے، سوالات کا حل مذہب ہے، کشی جی بے چارے کو ان باتوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، ”وہ باہر چلے گئے اور ان کو مذہب کو بند کر دینا“ اس مایانہ خیال سے آگے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

یہ حال یہ بھی غنیمت تھا کہ جو کچھ بھی انہوں نے پڑھا، ایسی زبان میں پڑھا جسے سننے والے سمجھ تو رہے تھے، لیکن ان کے سوا ہندوؤں کی طرف سے پہلے پہلے میں بھی ”امد دوسرے“ پہلے میں بھی ”زبان یار“ کی دین ترکی نہی دامن“ کے سہنی کی مشق کی گئی۔ پہلے پہلے میں ”فیر سرنگ“ کے

نام سے جس تحریری بیان کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے متعلق رد واد میں لکھا ہے کہ اس کے سوا اور کچھ
 سمجھ میں نہ آیا کہ

”ہندوؤں کی نسبت دربارہ اعمال و اقوال کچھ دور بک تھی“ ص ۱۱

انتہا تو یہ ہے کہ دوسرے سال کا میلہ جس میں خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ لکھا ہے اشتہاروں
 اور اخباروں کے ذریعہ سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اب کی پادریوں کے سلا بڑے بڑے نامی گرامی پنڈت
 بھی آئیں گے، مشہور تھا کہ

”مجمیع بڑے بڑے ویانیتوں اور مشاہیر کا ہوگا“ ص ۱۱
 اور اس میں شک نہیں کہ شہرت کے مطابق وقت کی سب سے بڑی مشہور ہستی خود پنڈت دیانند
 سرسوتی جی ہی میلہ میں جلیہ وافر درج ہوئے، اور ان کے ساتھ منشی اندرمن بھی موجود تھے۔ اپنی چند خاص
 کتابوں کی وجہ سے ان کا نام بھی کافی ادنیٰ ہو چکا تھا، مگر عرض ہی کر چکا ہوں کہ منشی اندرمن مجھوں میں
 تقریر سے سذوری کا تذکر کے جیسے آئے تھے، اسی طرح واپس ہو گئے، ’رہے پنڈت جی سوا آپ
 سن چکے کہ“ کے کا“ کے سوا سننے والے ان کی تقریر کا ایک لفظ نہ سمجھ سکے۔ عام طور پر چونکہ یہ مشہور
 تھا کہ پنڈت جی کا یہ عقیدہ ہے کہ مادہ اور روح یہ دونوں بھی خدا ہی کی طرح غیر مخلوق ہیں، اور کہار یا
 بڑھئی وغیرہ کاریگروں پر خدا کو قیاس کر کے کہتے ہیں کہ جیسے مٹی کے بنیہ کہار برتن، اور لکڑی کے بنیہ
 بڑھئی کرسی نہیں بنا سکتا، اسی طرح مادہ کے بنیہ خدا بھی عالم کی کار سازی پر قادر نہیں ہے، اسی وجہ سے
 لکھا ہے،

”ہاں ایک دو بات اس قسم کی سمجھ میں آئیں، کہ جیسے کہار گھڑا وغیرہ برتن بناتا ہے“

اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے

”مگر ان دو ایک بات کے سوا اور کچھ کسی کی سمجھ میں نہ آیا“ ص ۱۲

الغرض ایک مسلم قرنی کی نوعیت دونوں میلوں میں کچھ ایسی رہی، کہ اس کی طرف سے جو کچھ بیان کیا گیا
 مطلب اس کا یہی تھا کہ گویا کچھ بیان نہیں کیا گیا، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ پھر ان کو خدا شناہی کی تحقیق

کے اس میلے میں شریک ہی کیوں کیا گیا تھا، یا خود، کیوں اس میں شریک ہوئے، مگر یہی بات کہ خدا
شناختی کا یہ میلہ خدا شناسی کے لئے حایا بھی گیا ہو؟

کچھ بات تو یہ ہے، کہ ہندوؤں کی طرف سے تو خیر یہ طرز عمل جس وجہ سے بھی اختیار کیا گیا ہو، وہ دھرم
کے پڑھنے سے توجیرت ہوتی ہے کہ نسب سے زیادہ پیش پیش پادریوں کا فریاد اس میلے میں تھا، لیکن
ان کے نمائندوں میں بھی پادری نولس صاحب جن کے متعلق مشہور تھا کہ

”بڑے نشان‘ اہم مقرر ہیں‘ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مقابلہ دین عیسوی دین محمدی کی
کچھ حقیقت نہیں“۔

اور اگر پادریوں کے عام بیانات اور تقریروں کو سن کر جن میں خود پادری نولس صاحب بھی تھے، سیدنا
الامام الکبیر نے فرمادیا تھا کہ

”پادریوں میں کوئی اس قابل نہیں معلوم ہوتا جس سے بظاہر کچھ اندیشہ خاطر ہو، ہاں ان
کی بے انصافی سے دل افسردہ ہوتا ہے“۔

لیکن بائیں ہمہ دوسرے پادریوں کے مقابل میں پادری نولس صاحب کی تعریف بھی حضرت دالانے ان
الفاظ میں کی تھی

”پادری صاحبوں کی طرف سے وہ لوگ کھڑے ہوئے تھے جن کو گفتگو کا سلیقہ نہ تھا، ان کا
سے اوقات کی خانہ پری کر دیتے تھے۔ مگر ہاں آج ہماری طبیعت محفوظ ہوئی، پادری صاحب
(یعنی نولس صاحب) بہت خوش تقریر اہم صاحب سلیقہ ہیں“۔

مگر ان نشان مقرر جن کی خوش تقریری اور حسن سلیقہ کا سیدنا الامام الکبیر نے اعتراف بھی فرمایا تھا،
انہوں نے دونوں میلوں میں دقت تو کافی لیا۔ پندرہ منٹ کی مدت کی توسیع کی التجا بھی بے شری
کے ساتھ ان کی طرف سے جو پیش ہوئی تھی، اس کا ذکر تو کر ہی چکا ہوں۔ لیکن بائیں ہمہ دونوں میلوں میں
انہوں نے جو کچھ فرمایا، کیا عرض کیا جائے کہ کیا فرمایا

دین عیسوی کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ بیان کی کہ دین عیسوی کی کتاب انجیل،

”دو ڈھائی سو زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے“ ص ۷

جس پر مولوی ابوالمنصور نے چبھتا ہوا نعرہ کہا بھی کہ

”قریوں کہو کہ اٹھارہویں صدی سے پہلے پہلے انجیل آسمانی کتاب نہ تھی“ ص ۹

مولوی صاحب نے جب دعویٰ کیا کہ انجیل کے ترجموں کی کثرت اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد ہی ہوئی ہے، تو پادری صاحب نے مان بھی لیا کہ

”ہاں ترجموں کی کثرت تو اٹھارہویں صدی ہی میں ہوئی ہے“ ص ۹

اور اس سے بھی دل چسپ برہانی استدلال پادری نوٹس صاحب کا کرشمینی کے بنیادی عقیدہ تثلیث کے ثبوت میں یہ تھا کہ

”دیکھو درخت ایک ہے پر اس میں جڑ بھی ہے، شاخیں بھی ہیں، پتے بھی ہیں“ ص ۱۲

اور بھی کئی چیزوں میں تین پہلو نکال کر کہنے لگے کہ اس سے بڑھ کر تثلیث کے ثبوت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے، اسی پر سیدنا امام البکیر نے فرمایا تھا کہ تثلیث ہی کیا، مثالوں ہی پر بات ٹھہری تو درخت ہی میں

”ہزاروں شاخیں، ہزاروں پتے، ہزاروں پھول، اور پھر ہر شاخ، برگ اور پھول میں کس

قدر گوئیں اللہ نگہتیں ہیں“ ص ۱۲

فرمایا کہ

”خیر پادری صاحب نے تثلیث ہی پر کیوں قناعت فرمائی۔ ترجیح، تخیس، بلکہ تہ ہیں تسبیح، و

تثنی، بلکہ تالیف وغیرہ“

سب ہی کو عقیدہ بنا کر اسی قسم کی عیش پافادہ مثالوں سے باسانی ثابت کر دیا جاسکتا ہے۔

یہ حال تو پادری نوٹس کی استدلالی قوت کا تھا، امدان پر کسی نے جب اعتراض کیا کہ مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے میں آیا ہوں تو آپ بنی اسرائیل کے سوا دوسروں میں سمیحت کی تبلیغ کیوں کرتے پھرتے ہیں، شاید اس لطیفہ کی طرف کہیں پہلے بھی اشارہ گزرا ہے کہ اپنے ہاتھ

کی چٹری یا لٹھی کی طرف اشارہ کر کے پادری صاحب نے فرمایا
 ”دیکھو! یہ لٹھی بھی ہے اور لٹھی بھی ہے۔ لٹھی عام ہے اور لٹھی خاص“

پس نتیجہ یہ ہوا کہ

”عیسیٰ علیہ السلام خاص بنی اسرائیل ہی کے لئے آئے تھے، مگر جہاں خاص ہوتا ہے وہاں
 عام بھی ہوتا ہے“

کہنے والے نے سچ کہا تھا کہ جب پادری نولس عیسائی ہو چکے تو انسانی جوان سے عام ہے وہ بھی عیسائی
 ہو گیا، اب تبلیغ کی حاجت ہی کیا رہی۔ میں ان تفصیلات کو اس لئے نقل کر رہا ہوں، تاکہ اندازہ ہو کہ خدا
 شناسی کیا واقعی اس میلے کی غرض تھی، کیا ایسے عظیم اور اہم تر موضوع پر گفتگو کرنے کا یہی طریقہ
 ہو سکتا ہے۔

اور یہ مختصر داستان تو پادری نولس صاحب کی تھی، اب نئے اسکات صاحب جن کو دوسرے میلے
 میں خاص طور سے میلے میں آئے کے بعد دعوت دی گئی تھی، وہی صاحب جن کو حکومت کی طرف سے
 پانسو روپے کا انعام ملنے کی کسی کتاب کے ارتقا میں فرمانے پر اراذانی ہوا تھا۔ ان کی آمد کی خبر جب
 میلے میں گرم ہوئی، اور اسکات صاحب کی خواہش پر پادری نولس نے ہمنٹ کے طے شدہ
 وقت کی جگہ چاہا کہ ایک گھنٹہ تقریر کا وقت کر دیا جائے، اس وقت میدان الام الکبیر نے برہم ہو کر پادری
 نولس سے کہا تھا کہ

”کل ہم بہ ہزار منت آپ سے اس بات کے خواستگار رہے کہ کم سے کم دس کے ٹو
 ایک گھنٹہ عنایت کیجئے، ہمارے التماس اور عجز و نیاز پر تو آپ نے نظر نہ فرمائی، آج اگر
 کسی کے کہنے سے اپنا نفع نظر آیا تو آپ ہم سے ہی بات کے خواستگار ہوتے ہیں جس کا ہم
 سے انکار کر چکے ہیں“

اند ذرا تیز و تند لہجے میں فرمایا کہ

”جو ہر چکا سو ہو چکا، اب کیا ہوتا ہے نہ وقت مقررہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور نہ پادری

اسکاٹ صاحب کو اجازت ہو سکتی ہے، یہ بات وقت شرائط کی تجویز کے ساتھ گئی،
اب کچھ نہیں ہو سکتا، ورنہ اس کے معنی یہ ہوئے، کہ ہم باوجودیکہ رکن مباحثہ ہیں، مباحثہ کے
حساب سے کالعدم ہیں، جو کچھ ہوئے آپ ہی ہوئے۔“

خیر یہ تو ایک ذیلی بات تھی، سیدنا الامام الکبیر نے خلاف دستور یہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا، اسے تو
چھوڑیے، کہنا یہ ہے کہ اسکاٹ صاحب کے علم و فضل سے پادری نولس صاحب اس قدر متاثر تھے، کہ
سیدنا الامام الکبیر کے اصرار کو دیکھ کر بولے

”آپ پادری اسکاٹ صاحب کو ڈرتے ہیں۔“

گرچہ جواب بھی وقت پر خود سیدنا الامام الکبیر نے ان کو دے دیا تھا کہ
”خدا کی عنایت سے پادری اسکاٹ کے استاد ہوں، تو ان سے بھی ڈروں، بلکہ انشاء اللہ
تمام پادری بھی اکٹھے ہو جائیں تو نہیں ڈرتا۔“

پھر اصرار کی وجہ بھی آپ نے ظاہر کر دی

”مجھ کو فقط یہ جملانا تھا کہ بات مقرر کر کے کون قائم رہتا ہے اور کون پھر جاتا ہے۔“

پادری نولس صاحب کی بے انصافی اور استبداد کے پردے کو چاک کرنے کے بعد ان کی التجا کی
پذیرائی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

”گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ، دو گھنٹہ جس قدر چاہیں آپ درس مقرر کریں اور جسے چاہیں درس کے
لئے مقرر کریں۔“

یہ حال کہنا یہ ہے، کہ آئے تو اسکاٹ صاحب اس دھوم دھام سے، اور اپنے درس کی سچائی کے ثبوت
میں سب سے بڑی منطقی دلیل جو پیش کی تھی کہ

”جب تک عیسائیوں کی عملداری ہندوستان میں نہ تھی، ہندوستان میں کسی کسی غارتگری
اور فتنہ و فساد اور ہزنی ہوا کرتی تھی، جب سے عیسائیوں کی عملداری ہوئی، کس قدر امن
و امان ہو گیا، مسوئتا چھالتے چلے جاؤ، کوئی پوچھتا نہیں، دیکھو گناہوں میں کتنی کمی آگئی۔“

جواب میں تو اس کے جیسے کہ واقعہ تھا، سیدنا امام الکبیرؑ ہی نے فرمادیا تھا

”یہ امن و امانی عیسائی غلامداری کی برکت نہیں ہے، اس امن و امان کی غفلت بجز پاس ملک اور آرزوئے ترقی تجارت اور کچھ نہیں، مذہب سے (۳) بات کو کچھ علاقہ نہیں،“ منت مباحثہ شاہ جہاں پر

اور گناہوں کی کمی کا جو ذکر پادری اسکاتھ نے کیا تھا، اس نے طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت دالانے ام النجاشت (شراب) اور ام النجاشم (زنا) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ شراب خواری سے محالاً کہ مذہبیان کے یہاں بھی ممنوع ہے،

”نصرانیوں میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جو اس گناہ سے بچا ہوا ہو“

اور ام النجاشم زنا سو آپ نے دریافت کیا

”کیا پادری صاحبوں کو لندن کے اخباروں کی اب تک خبر نہیں، کہ وہ کیا لکھتے ہیں، اور ہر روز کئی سو بچے ولد الزنا پیدا ہوتے ہیں، اور صبح کو راستوں پر پڑے ہوئے ملتے ہیں“

خیر سوال و جواب کی تفصیلات تو اصل روداد میں پڑھئے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پادری نوس کی تقریر کے محوری عناصر اور اسکاتھ صاحب کے بیان کی روح جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے کیا ان سے واقف ہونے کے بعد دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ چاند اور کاہیلہ خدا شناسی کے لئے قائم کیا گیا تھا یا بقول سیدنا امام الکبیرؑ پاس ملک کے جذبات ہی کی یہ کار فرمایاں تھیں؟

اور بڑے پادری صاحبوں نے تو خیر جو کچھ کہا، کہا۔ میرے دوست نے تو اس وقت کھڑے ہو جاتے

ہیں، جب سوچتا ہوں کہ سرزمینِ ردہ میں کھنڈ کے صحرائی مقام کے اسی میل میں جس میں سو بھی حالات کی وجہ سے کم از کم پہلے سال شہر کے لوگوں کو شرکت کا موقعہ تھا، وہاں ہی ملا تھا، زیادہ تر قرب و جوار کے رہیاتوں کے لوگ میل میں بھرے ہوئے تھے، مگر مباحثہ کی اس مجلس میں دیکھا گیا کہ ایک کالا پادری مولاد ادنامی اپنی کمر بختی میں کور بختی کا اضافہ (العیاذ باللہ) ان گندے الفاظ سے کر رہا ہے، یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے نبوت کا ذکر کر کے اپنی زبان اور اپنے دہن کو ان نجس الفاظ سے

آلودہ کر رہا تھا کہ (استغفر اللہ)

”بھنگیوں کا لالہ گورد بھی ایسا ہی کہتا تھا۔“

اور اسی پر اس تیرہ نصیب نے اکتفا نہیں کیا، بلکہ خود اپنے آپ کو رسوا کرنے کے لئے انجیل کی ایک آیت کا غلط ترجمہ کر کے کہنے لگا کہ

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ میرے بعد جو آئیں گے چور اور بٹ مار

ہوں گے۔“ ۱۹

قطع نظر اس سے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر افتراء پرداز کر رہا تھا، اور اسی وقت امام فن مناظرہ مولانا ابوالنصور نے ٹوک بھی دیا تھا کہ انجیل کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، اس میں تو یہ نہیں ہے کہ جو میرے بعد آئیں گے چور اور بٹ مار ہوں گے۔“

بلکہ برعکس اس کے اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ

”جو مجھ سے پیش تر آئے، وہ چور اور بٹ مار تھے۔“

لیکن اس کو تو جانے دیجئے، سوچئے اس بات کو جس ماحول میں یہ جلسہ ہو رہا تھا، اچانک اسی جلسہ میں ایک درہندہ وہیں کالے پاؤں کی زبان سے نکلے ہوئے ان نفروں کا انجام کیا ہو سکتا تھا۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ ان کے مقرروں کو تقریر کے لئے وقت نہیں دیا جا رہا تھا، ان کی پیش کردہ ترمیم کے مطابق بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ہندوؤں کو نامناسبہ پنڈتوں کو بھی ملا کر پارٹیوں اور پنڈتوں کی ایک صف قائم کر لی گئی تھی۔ ان کے عہد حکومت پر لعنت طاعت کرتے ہوئے، برطانوی راج کی تصدیق خوانی ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، وہ برداشت کرتے چلے جاتے تھے، لیکن اس سیاہ سینہ، سیاہ دل کالے پاؤں کی نجس اور گندی زبان سے ان کو اب جو کچھ سنایا گیا تھا، کیا اس کو وہ برداشت کر سکتے تھے، ہمیشہ وہ اس ان کے اس کے بعد کیا بجا رہ سکتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے، کہ اسی قسم کا کوئی واقعہ چنگاری بن کر اڑا ہے، اور آبادیوں، ملکوں، قوموں کو اس نے

جلا کر خاک سیاہ کر دیا ہے۔ اب میں کیا عرض کروں، دوسروں کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن خدا شناسی کے ان دونوں میلوں کے مشتملات اور جو کچھ ان میں کہا گیا، اگر لگایا سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اشقی القوم مولاداد کی تقریر کے ان الفاظ کو جب سوچتا ہوں، تو کچھ ایسا خیال گزرنے لگتا ہے، اگر وہ بوندی حلقہ میں کہ منظر کے نیم مجذوب کی وہ پیش گوئی جس کا پہلے بھی کہیں شاید ذکر گذرا ہے، یعنی غدر کے بعد حکیم عبدالسلام بیچ آبادی کہ منظر گئے تھے، وہاں ان سے ایک صاحب جو نیم مجذوب سے آدمی تھے، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ

”بہت شدہ دم سے یہ فرما دیا کہ تم یہیں (کہ) میں رہو، ہندوستان مت جاؤ، اس واسطے کہ

وہاں انقلاب ہو رہا ہے، جو غدر سابق سے بڑھ کر ہوگا“ ۲۳ اوراق ثلثہ

مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام نے جیسا کہ اسی کتاب اوراق ثلثہ میں لکھا ہے، اس کو سن کر فرمایا تھا کہ

”یہاں کچھ نہیں ہوگا“

لیکن غدر کے اٹھارہ انیس سال بعد نام نہاد خدا شناسی کے نام سے قائم کئے جانے والے میلوں میں جو کار فرمائیاں ہوئیں، اور جن کا اب تک ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے، کیسے کہا جائے کہ کہ نیم مجذوب کی واقفیت جس کا ذریعہ خواہ کچھ ہی ہو، کشفی ہو، یا غیر کشفی، کلیۃً بے بنیاد تھی، آخر وہ بے چارے نیم مجذوب ہی تو تھے۔ بجائے ”کل“ کے واقعہ کا کچھ حصہ ”ہی ان کے سامنے آیا“ اور اسی کو دیکھ کر کوئی مانے قائم کر لی ہو، تو جو کچھ ہوتا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے کیا وہی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی تھی، جو اس نیم مجذوب آدمی نے کی۔

واقعہ اب گزر چکا ہے، اور اسی طرز سے گذرا، جیسا کہ ہمارے مصنف امام نے فرمایا۔ بارود کے میگزین میں چنگا دی ڈالی جا چکی تھی، لیکن دھماکہ کیوں نہیں ہوا، میں اسی کو اب کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اور اسی سے معلوم ہوگا کہ شاید یہ ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا، ارحم الراحمین نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا، خدا کی اسی رحمت کا پامشندگان ہند کے ساتھ کس شکل میں ظہور ہوا۔ آئیے اور

واقعات کی روشنی میں اسی کا تماشا کیجئے۔ ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب او السمع وهو شہید

بات ذرا طویل ہو گئی، لیکن جو کچھ کچھانا چاہتا تھا، شاید ان تفصیلات کے بغیر اسے ذہن نشین بھی نہیں کر سکتا، یاد ہوگا، گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ پہلی دفعہ چاندا پور کے اس مذہبی سیلے کی شہرت ہوئی، سیدنا الامام الکبیر اس زمانہ میں اپنے قدیم آبائی وطن نانوتہ میں تھے۔ یہیں آپ کے پاس خلوط پہنچے، آپ پیادہ پا چل پڑے، دیوبند مظفرنگر میرٹھ ہوتے ہوئے دلی پہنچے، یہاں آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس مولوی عبدالحی نے کہلا بھیجا ہے کہ قصہ بے اصل ہے، علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں۔ دلی میں جس وقت یہ خبر آپ کو ملی تو شاہ جہاں پور کے سفر کا ارادہ مضحل ہو گیا، لیکن شاہ جہاں پور والوں کے تار او خط کے بعد آپ کا ذہن ہی ارادہ جو سست پڑ چکا تھا، نئے سرے سے پھر تازہ ہوا، لکھا ہے کہ

”ہرمئی کو بعد عشاء، بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند (ضلع سہارنپور) و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور ریل پر پہنچے“ ص ۳۲

ریل سے مراد یہ ہے کہ اسٹیشن پر پہنچے، کیونکہ آگے ہے کہ ”ادھر سے حسب وعدہ مولوی سید ابوالمنصور صاحب دہلوی امام فن مناظرہ اہل کتاب بمعیت مولوی سید احمد علی صاحب دہلوی، و میر حیدر علی صاحب دہلوی تشریف لائے، اور سب ریل مل کر گیارہ بجے ریل میں سوار ہو کر روزِ شنبہ ۶ ہرمئی کو بعد عصر شاہ جہاں پور پہنچے“

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تشریف آندی کی تاریخ اور وقت سے شاہ جہاں پور والوں کو غالباً آپ نے قہراً اطلاع دی تھی، اسی لئے اسٹیشن پر استقبال کے لئے کوئی نہ آ سکا۔ شاہ جہاں پور والوں کو تو اس کی بھی خبر نہ ہوگی کہ آپ آئیں گے بھی یا نہیں آئیں گے، اس کو مغتنم موقع خیال کر کے

لکھا ہے کہ

”مولوی صاحب نے سیدنا امام الکبیرؒ نے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ راستہ کو سرائے میں گزر کر مولیٰ الصباح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے۔“

اور یہی طے کر کے سفر کے دوسرے رفیقین کی تو اجازت دے دی کہ بجائے سرائے کے شہر چلے جائیں، اور خود جیسا کہ ”میلہ خدا شناسی“ نام والی روداد میں لکھا ہے، سرائے جاتے ہوئے اسٹیشن سے اپنے ساتھ رفتار تلامذہ کی جماعت میں سے صرف اپنے عاشق زار، جاں نثار خادم شیخ الہند مولانا محمود حسن کا فدا انتخاب فرمایا تھا۔ یا ساتھ چلنے کی اجازت ان کو مل گئی، اس کے الفاظ میں کہ اسٹیشن شاہ جہاں پور پر

”مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیرؒ) سب ساتھیوں کو چھوڑ کر مولوی محمود حسن صاحب کو اپنے

ہمراہ لے کر چپکے سے شہر کو ہوئے تھے مختصر رات کو ایک سرائے میں آرام فرمایا۔“

الغرض اسٹیشن سے سرائے تشریف لے گئے، شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی ساتھ تھے۔

اس سلسلہ میں کچھ اور روایتیں بھی پائی جاتی ہیں مگر وہ ثبوت کے لحاظ سے اس درجہ کی نہیں ہیں اس

لئے انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے، یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پہلے میلے کے موقع پر شاہ جہاں پور

کے اسٹیشن پر یہ یاد کر شہر سے کوئی آدمی استقبال وغیرہ کے لئے نہیں پہنچ سکا، روداد میں لکھا ہے کہ

”مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیرؒ) نے اپنے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرائے

میں گزر کر مولیٰ الصباح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے۔“

”اپنے آپ کو چھپانے کی“ فطری آرزو آج بھی آپ پر اسی طرح مسلط ہے، جیسے ساری زندگی اسی تمنا اور

اسی کوشش میں بسر ہوئی، اسی آرزو کے زیر اثر سفر کے معزز رفیقوں، اور اپنے چہیتے شاگردوں سے جدا

ہونے پر بھی آمادہ ہو گئے، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی کش مکش کے بعد حضرت والا کو اپنے حال پر چھوڑ دینے

کا فیصلہ سفر کے ان رفیقوں مانند شاگردوں نے کیا ہوگا، اگر روداد والی ہی روایت صحیح ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ

پیشکل حضرت مولانا محمود حسن کو ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی، ذرا اس اختار کے بھڑکے کی شدت کو

ملاحظہ فرمائیے کہ سرائے میں بھی اپنے آپ کو بجائے مشہور نام کے ”خیر شید حسین“ غیر معروف تاریخی نام سے رشتہ ساس کرایا گیا۔ تاکہ دریافت کرنے والوں کو پوچھنے کے بعد بھی پتہ نہ چلے، مگر جیسا اختصار ذکر کی کوشش بندے کی طرف سے سلسل جاری تھی، اسی بندے کے رفع ذکر کا فیصلہ اس کا الگ کئے ہوئے تھا۔ بعد کو جو کچھ ہوا وہ تو خیر آپ نہیں ہی گئے، لیکن سرائے کی اس رات میں بھی کیا ہوا، روضہ میں لکھا ہے کہ

”مگر ایک دو شخص (باشندگان شاہ جہاں پور) کو خبر ہو ہی گئی، قریب دو بجے رات کے سرائے میں جا کر مولوی صاحب (سید نالامام الکبیر) کو جا گھیرا“

خدا ہی جانتا ہے کہ خیر شید حسین نام کے پرے کو چاک کر کے ”مولانا محمد قاسم“ تک پہنچنے میں یہ بے چارے کیسے کامیاب ہوئے، بہر حال کسی نہ کسی طرح پہنچے، لکھا ہے کہ

”پس ازاں سرار، ناچار مولوی صاحب (سید نالامام الکبیر) ان کے مکان پر تشریف لے گئے“ ۱۱ ص ۷۷

یوں سرائے سے اٹھ کر آپ شاہ جہاں پور والوں کے گھر تک تو کسی نہ کسی طرح آ گئے، ”رہائی کا دن گذر چکا تھا، کل، رہائی کو میلہ کے افتتاح کی تاریخ تھی، چاند پور کا فاصلہ عرض کر چکا ہوں، کہ کافی تھا، سرائے میں تو جو کچھ چاہتے کر سکتے تھے، لیکن شہر والوں میں پہنچ جانے کے بعد کون راضی ہو سکتا تھا کہ آپ گرمی کے اس موسم میں پانچ چھ کوس کا فاصلہ پیادہ پاٹے کریں۔ لیکن روداد کی روایت میں بھی ابھار داح ثلاثہ میں مولانا احمد حسن امر دہوی کی زبانی جو روایت درج کی گئی ہے، دونوں ہی میں یہ الفاظ روداد کے ہیں،

”مولوی صاحب (سید نالامام الکبیر) صبح کی نماز پڑھ کر پیادہ پا ہی، چاند پور میں جا چکے“ ۱۲ ص ۷۷

گویا میلے کی خبر پا کر جیسے پیادہ پا آپ نانوتہ سے دیوبند بارہ کوس کا فاصلہ طے کر کے پہنچے تھے، اسی طرح ریل سے اترنے کے بعد شاہ جہاں پور سے چاند پور تک جو پانچ چھ کوس کا فاصلہ تھا اسکو بھی پیادہ پا ہی

ٹے فرمایا اور اسی پیادہ پانی کی دیر سے شاید وہ لطیفہ پیش آیا۔ جس کا ذکر پہلے میں بھی اندر پہلے کے بعد بھی اب تک لوگ مڑے لے لے کر کرتے ہیں۔

عرض کر چکا ہوں کہ میلہ چاند پور میں بھی نہیں، بلکہ اسی کے قریب ایک کھیرے سارنگپور نامی سرزمین میں قائم کیا گیا تھا، جہاں سے ایک ندی جو ”دریائے گڑا“ کے نام سے مشہور ہے گذرتی ہے۔ حالانکہ مٹی کا مہینہ تھا، لیکن ندی پایاب نہیں ہوئی تھی، شاید اس کے ساحل کے انتخاب میں آب رسانی کی سہولت بھی میلہ قائم کرنے والوں کے پیش نظر ہو۔ شاید جہاں پور سے سارنگپور جاتے ہوئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں یہی ندی ملتی تھی۔ مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ جو اب رفیق سفر ہو چکے تھے اکی مدایت میں ہے کہ

”راستہ میں ایک دریا پڑتا تھا“

فالبابہ وہی دریا لے کر آتا تھا چونکہ بقول حضرت امروہوی

”مولانا پیدل تھے“

شاید سواری میں یہ صورت پیش نہ آتی، بہر حال پیادہ پا چلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دریا جس میں پانی تھا، اس کو عبور کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ

”مولانا پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے، جس سے پاجامہ بھیگ گیا“

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ میں شریک ہونے کے لئے تعداد کوئی خاص قسم کا بانا آپ نے ایسا اختیار نہیں کیا تھا، جس کی وجہ سے امتیازی فکر لوگوں کی آپ پر پڑے، بلکہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ضلع سہانپور کے شیخ زادوں اور شہ فادہ کا جو عام لباس تھا، اسی لباس میں مولانا رہتے بھی تھے، اور آج بھی وہی لباس میں جا رہے تھے۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ پیدل چلنے کی وجہ سے آپ کو دریا میں اترنا پڑا، پانی اتنا تھا کہ پاجامہ آپ کا بھیگ گیا۔ حضر ہی میں جس کے پاس بیان کر چکا ہوں، بقول حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

”ذکر کوئی صندوق تھا، نہ کپڑوں کی کوئی گٹھری“ اور احث ثلثہ ملا

تو سفر میں بھلا اس کے بعد نامہ کپڑوں کے ہونے کی کیا توقع کی جا سکتی تھی، حضرت شیخ الہندؒ فرمایا بھی کرتے تھے کہ

”عمرو! اسی ایک جوڑے میں سفر پر راجوتا، جو حضور میں پہننے ہوتے تھے“

مگر اسی کے ساتھ وہی کہا کرتے تھے کہ

”ابنہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہو گئے، تو لنگی باندھ کر کپڑے

اتار لئے، اور خود ہی دھو لئے“

دریائیں اترنے کے بعد پاجامہ مبارک جب بھیگ گیا تو آپ کی یہی دعا ی رقیق ”نیلی لنگی“ بے چاری کام آئی مولانا ہر وہی کی روایت میں ہے کہ

”مولانا نے پار اتر کر لنگی باندھی، اور پاجامہ اتار کر نچوڑ کر چھ لائٹھی پر جیسے گناؤں کے ہونٹ لے

ڈال لیا کرتے ہیں، ڈال لیا“

ایسا ہی شان کے ساتھ آپ میلے کے میدان میں پہنچ گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا پار کرنے کے بعد

میلہ کا میدان کچھ زیادہ دور نہ تھا، اتنا دفعہ نگہ گذر سکا کہ بھیگ پڑا پانچواں آپ کا خشک ہو جانا، مداح ہی

مجھوری تھی کہ بجائے پانچواں کے ”نیلی لنگی“ ہی کے ساتھ آپ میلہ میں شریک ہو گئے۔ مگر جیسے قصدِ اُلو

ادارۂ نمائش کے لئے نیسی لنگی نہیں باندھی گئی تھی، اسی طرح اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی خاص قسم

کے لباس کا پابند اپنے آپ کی بنا کر عموماً کسی مجمع یا محفل کی شرکت سے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ جب

ایک وہی زبردستی اپنے اوپر عائد کیا ہو لباس فراہم نہ ہو جائے، مجمع میں جانا ان کے لئے گویا ناممکن

ہوتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں، چاہا تو آپ نے بھی تھا کہ جس لباس کے پہننے کے عادی تھے وہی کے

ساتھ میلے میں شریک ہوں، لیکن بھیگ جانے کی وجہ سے بجائے پاجامہ کے لنگی باندھنی پڑی، تو

بھکچکچائے بغیر آپ لنگی ہی کے ساتھ مجمع میں علماء کے تشریف فرما ہوئے۔ بلکہ خدا شناسی کے اسی میلے

کے پہلے سال کی روداد کے آخر میں بریلی کے رہنے والے ایک ہندو کا یہ بیان جو نقل کیا گیا ہے کہ

”مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی میلے سے کپڑے نیلی لنگی بن میں دبی ہوئی بیان

کرنے کھڑا ہوا۔ ۵

ان الفاظ سے سیدنا امام الکبیر کی طرف یہ ہندو وزیر شاہد کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خشک ہو جانے کے بعد پانچا سر پہن لیا گیا تھا، اور حسب دستور لنگی بغل میں دہنی ہوئی تھی۔ یہی ”نیلی لنگی“ بعد کو ”سارنجی نیلی لنگی“ بن گئی۔ اسی کا تذکرہ فرماتے ہوئے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، بھی فرمایا کرتے تھے۔

”مباحثہ شاہ جہاں پور میں مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا، بڑے بڑے عباد قباداے موجود تھے، اور حضرت مولانا (نانوتوی) اسی مولیٰ کرتہ اند لنگی میں تھے۔“ (قصص الاکابر، الہادی ماہ جادی الثانی ۱۳۵۷ھ)

مطلب یہی ہے، کہ قیمت ”منز“ کی ہوتی ہے، پھلکے کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو ”بے منز“ پھلوں کو کون خریدتا ہے۔

کچھ بھی ہو، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مدد دینے کی جو کوشش شاہ جہاں پور کے پولیس اسپیکر مولوی عبدالحی صاحب کی طرف سے کی گئی تھی، دو کوشش کامیاب نہ ہوئی، شاہ جہاں پور والوں نے اس کو مولوی عبدالحی کی غلطی قرار دیا، اور ان کے علی الرغم سیدنا امام الکبیر قدا شتابی کے اس میلے تک، بہر حال پہنچ ہی گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحی صاحب کے طرز عمل کی تعمیر غلطی کے لفظ سے شاہ جہاں پور والوں نے جو کئی میری کچھ میں تو اس کا مطلب بھی نہیں آتا۔ گذر چکا کہ دلی اور شاہ جہاں پور کے درمیان تار اور خط کے ذریعہ اس مسئلہ میں سوال و جواب ہم رسی کو ہمیشہ آیا، اور میلہ کے افتتاح کی تاریخ ۷ مئی تھی۔ آخر قریب زمانہ میں شاہ جہاں پور کی پولیس کے ایک ذمہ دار افسر کا اس میلہ اور اس کی تفصیلات سے ناواقف نہ جانا جو اسی کے علاقہ میں منعقد ہو رہا تھا جس کی نگرانی بہر حال ان کے فرائض میں تھی، بلکہ نقل ہی کر چکا ہوں، کہ میلے میں پولیس موجود تھی۔ دوسرے سال کے میلے میں تو ان کے نام مولوی عبدالحی کی تصریح کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے کہ وہ بھی میلے میں موجود تھے (مباحثہ شاہ جہاں پور ۱۳۵۷ھ)، پھر ان کا سرے سے قصہ ہی کو بے اصل ٹھہرانا، اور اس کو بے اصل ٹھہراتے ہوئے، اپنی یہ رائے پیش کرنا کہ ”غلام کے آنے کی حاجت

نہیں بتایا جائے کہ آخر اس کا کیا مطلب سمجھا جائے۔ اور غلطی کے لفظ کے اطلاق کی گنجائش کس چیز میں اس طریقہ سے ممکن ہو جائے۔

کچھ بھی ہو، سیر ذاتی احساس تو یہی ہے کہ خدا نخواستہ مولوی عبدالحی کی غلطی "اگر صحیح ہو جاتی" اور اور ان کی اطلاع سے سفر کا جو ارادہ مست ہو گیا تھا، وہ ختم ہو جاتا۔ یعنی سیدنا الامام الکبیرؒ کی رائے کے مطابق دینی سے بجائے شاہ جہاں پوچھنے کے، گھر واپس ہو جاتے، تو ظاہر ہے کہ جس قصہ کو بے اصل ٹھہرایا گیا تھا، واقع میں بے اصل تو تھا نہیں۔ خدا شناسی کا یہ میلہ چاندپور میں منہ ہو کر رہتا اور پہلے سال کے میلے میں جیسے ہندوؤں کی طرف سے اسی قسم کے نمائندے اور دکنلا مشرک بوسے آتے تھے، جن کے نام کتاب تک پتہ نہ چلا۔ کچھ اسی قسم کے گنام، خام کار، نا تجربہ کار چند مولوی مسلمانوں کی طرف سے بھی اس میلے میں رادھ رادھ کر اٹھے ہو جاتے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس میلہ کا کیا انجام ہوتا۔ اسنادتہ کہ سخت مولانا دکانے پادری کی مشرقاتی جس رنگ میں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے جذبہ و صبر کی کتنی بڑی آزمائش تھی، شعلہ سامانیوں کی جواگ اس دریدہ دہن موزی کے الفاظ میں دینی ہوئی تھی، کیا ان غریب مولویوں کے بس کی بات تھی کہ بھڑکنے سے اس کو روک دیتے۔

یہاں تو حال یہ تھا، کہ جس وقت ۱۵ منٹ وقت درس و تقریر کے لئے مقرر کرنے کے بعد پادری نوٹس کو اپنی تقریر کی توسیع وقت کی ضرورت محسوس ہوئی، اور انتہائی وضاحت سے کام لیتے ہوئے وقت کے ہی مسئلے میں مسلمانوں کے جن نمائندوں کی مسلسل تجویزوں اور درخواستوں کو انتہائی لاپرواہی کے ساتھ برابر ٹھکراتا ہی چلا جاتا تھا۔ ان ہی سے التجا کرنے لگا کہ مزید پندرہ منٹ اور تقریر کرنے کا موقع اسے دیا جائے۔ تو علاوہ سیدنا الامام الکبیرؒ کے مسلمانوں کے نمائندوں کی اس جماعت میں حالانکہ بعض کافی سرد گرم چشیدہ، آرمودہ کارہستیاں موجود تھیں، تاہم نگہا ہے سیدنا الامام الکبیرؒ کے سوا جتنے بھی تھے ان کی

"رائے نہ تھی کہ ان کو (پادری نوٹس کو) جہالت دی جائے"

سب مولوی اور جوان کے ساتھ وہاں تھے یہی کہتے تھے کہ

”جب وہ ہم کو بہت نہیں دیتے، تو ہم کیوں دیں؟“

انتقام کا جذبہ پوری قوت سے ابھرا آیا تھا، دل کی بھڑاس نکالنے کا موقعہ سمجھا گیا تھا کہ یہی ہے، آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ

”اچھا ان کا زولس صاحب کا، مضمون بھی نامتام ہی رہے۔“

مگر آپ سن چکے، ذکر کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے عام سوریوں کے اس فیصلہ کے برعکس پادری زولس کو بخندہ جبینی مزید وقت صرف کرنے کی اجازت دی، جس کا نتیجہ بھی اسی وقت اس رنگ میں سامنے آیا کہ مقررہ وقت سے زیادہ وقت لے کر جو کچھ کہنا تھا پادری زولس صاحب کہہ چکے، تو دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کھڑے ہیں، اور سکراتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ

”بیٹھے پادری صاحب اب ہم کو بھی تیس منٹ کی اجازت دیجئے۔“

چارہ کار ہی اب پادری صاحب کے لئے کیا تھا، اپنے دام میں خود گرفتار ہو چکے تھے، منت و سہانت حق و انصاف جس مسئلہ کے حل میں بے کار ثابت ہو چکا تھا، ٹھیک وقت نی ایک کاماندہ سوجھ سے وہی مسئلہ کتنی ہولت کے ساتھ حل ہو گیا، لکھا ہے کہ

”لاچار ہو کر پادری صاحب کو بھی اجازت دینی پڑی۔“

میرے خیال میں اس حکم اور حکم کی یہ ایک مثال تھی جس کے متعلق قرآن میں ایک سوزناؤ مقامات پر یہ اطلاق دی گئی ہے، کہ دین میں مقام انسان تک پہنچنے میں جو کامیاب ہوتے ہیں، یعنی المحسنین ہی کو حکم و علم کی یہ نعمت ارزانی ہوتی ہے۔ اس لاہوتی دولت کی صرف معلومات والے علماء میں توقع نہ کرتی چاہئے۔

احسانی حکم و علم کے آثار کا تجربہ کچھ اسی ایک واقعہ کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسی سلسلے میں اسلے ایسے مواقع پیش آتے رہے جن میں دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے ضمیر کی یہ روشنی چمک اٹھی، اور تاریکیوں کا ازالہ ہو گیا۔ اسکاٹ صاحب منطق پادری کے قصے میں جب ان کی خواہش کے مطابق یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان کو تصدیق کا بھی موقع دیا جائے، اور وقت کم از کم ایک گھنٹہ ملنا چاہئے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس مسئلہ کے پیش ہونے پر غلاف دستور سیدنا الامام الکبیر کی مخالفت کرتے ہوئے

بڑے درد کے بعد راضی بھی ہوئے تو ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ غشی پیارے لانی وغیرہ کی سعی و
 سفارش سے آپ راضی ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی وقت کی ایک سوجھ بوجھ ہی کا تقاضا تھا، قعدہ تہ طویل
 ہے تفصیل کے لئے اصل روزادری کا مطالعہ کیجئے۔ خاص یہ ہے کہ پہلے سال کے مینے میں دوسرے
 دن جب مباحثہ کی مجلس میں لوگ جمع ہوئے اندر بچکا تھا کہ ہر فریق کی طرف سے صرف پانچ پانچ آدمیوں
 کو برائے کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن اتفاقاً ایک صاحب جن کا نام قاضی سرفراز علی تھا، لکھا ہے کہ
 شاہ جہاں پور کے بڑے رئیسوں میں تھے، غدر میں مالی حالت ان کی خراب ہو گئی تھی، پادریوں سے
 متاثرہ اور مناظرہ کا ذوق رکھتے تھے، وہی ایک لکھی ہوئی تحریر لائے اور خواہش ظاہر کی کہ اپنی تحریر
 کے مناسبت کا موقعہ ان کو بھی دیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر نے اپنی جگہ ان ہی کو کھڑا کر دیا، ان کو دیکھ کر
 پادری نوٹس نے کہا کہ کیا

”آپ بھی ان ہی پنجتن میں ہیں جو اس کام کے لئے مخصوص ہوئے ہیں؟“

جواب میں قاضی صاحب نے جب کہا کہ ان میں تو میں نہیں ہوں، لیکن فلاں صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیر
 کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ

”ان کو اجازت ہے اور یہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں،“

جس پر نوٹس نے نہایت سختی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ

”ان کو اجازت نہیں ہو سکتی؟“

بے چارے قاضی صاحب کو کھڑے ہونے کے بعد بیٹھ جانے پر مجبور کیا۔

اس سال تو خیر یہ بات گذر گئی، میلہ جب دوسرے سال منعقد ہوا، اور اب کے بھی پانچ پانچ

آدمی ہر فریق کی طرف سے مقرر ہو چکے تھے، لیکن بعد کہ یہی اسکاٹ منطقی پادری نوٹس صاحب کے
 بلائے پر جب پہنچے، اصرار کیا کہ گفتگو میں ان کو بھی حصہ لینے کے لئے موقعہ دیا جائے، ادیک گھنٹہ
 تقریر کے لئے اسکاٹ صاحب طالب ہوئے، یہی موقعہ تھا کہ قاضی سرفراز علی صاحب کے واقعہ
 کا بھی جواب دیا جائے۔ نیز پھر ایوں والے مولانا محمد علی بھی اسی عرصہ میں پہنچ چکے تھے، جن کا نام

مسلمانوں کی طرف سے تقرر کئے ہوئے پانچ آدمیوں کی فہرست میں نہ تھا، تاحضیٰ سر فرزند علی کے بیٹے میں تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے مزید کسی آدمی کو بولنے کی اجازت پادری نہیں دیں گے جلاوطن سید نالامام الکبیر ان کو بھی گفتگو میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ درحقیقت اسکاٹ صاحب کے قصہ میں رد و کد کار از یہی تھا، اسی لئے راضی ہو جانے کے بعد سید نالامام الکبیر نے فرمایا بھئی کہ ”پادری اسکاٹ صاحب جب داخل مناظرہ کئے جاتے ہیں تو ہم مختلف مولوی محمد علی صاحب کو شامل کریں گے۔“ دیکھ مباحثہ شاہ جہاں پور

توسیع وقت، اور پادری اسکاٹ صاحب کی شرکت کے سلسلہ میں جب حضرت داتا گنج بخش پادری نے صاحب کی طرف سے منشی پیارے مال ٹنگ و دود کو روکے تھے تو ایک دفعہ منشی جی ست سید نالامام الکبیر نے فرمایا ”وہ تھا“

”منشی صاحب مجھ کو کسی بات پر خواہ مخواہ آڑ نہیں، مگر ہانی پادری صاحب کو اس کج رائی پہ کہ ہم غشیں کریں اور وہ تسلیم نہ کریں، اسی لئے بالفعل ہندی طرف سے یہی جواب ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا آپ ان کو سنا دیں“

آخر میں یہ سمجھاتے ہوئے کہ اس قسم کی معمولی باتوں کی کوئی قدر و قیمت میری نظر میں نہیں ہے، منشی جی کے کان میں یہ بات بھی آپ نے ڈال دی تھی کہ

”باقی جو کچھ ہو گا وقت پر دیکھا جائے گا“ ۴۹

وقت جب آیا تو دیکھا بھی گیا کہ جو کچھ پادری نوٹس نے چاہا سب ہی کچھ منظور کر لیا۔

اور یہ تو اس احسانی حکم و علم کی اسی جزئی مثالیں ہیں، جن کا شاید ذکر بھی نہ کرتا۔ اگر اس راہ کے ان چند کلی نتائج کے ذہن نشین کرانے میں مدد ملتی، جن میں اب پیش کرنا چاہتا ہوں، اور یہ ایسے کلی نتائج ہیں، جن سے سید نالامام الکبیر کی سیرت ہی کا ایک خاص پہلو نمایاں نہیں ہوتا، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے، اسلامی ہند آج جن مشکلات سے دوچار ہے، چاہا جائے تو ان مشکلات کے حل میں بھی ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ مذہب کے نام سے شاہ جہاں پور کے علاوہ میں اس سلسلہ کے انقطاع کا جو اعلان کیا گیا تھا، اس میں شک نہیں، کہ اس کے متعلق کبھی کبھی سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے اس قسم کے الفاظ جنھیں نقل بھی کر چکا ہوں کل جلتے تھے، مثلاً وہی بات کہ

”اگر اثبات نہ سمجھتے تو ترتیب عقلی (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو کل میں ہے

عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں، تو غشی بیارے لال کے فرمائے کا

اتباع ہے“ ۱۵

کہنے والے چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ میلے کے متعدد کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے دل میں بھی شک پیدا ہو جاتا تھا، اسی بنا پر ان کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ

”بہتر ہے کہ ہر فریق میں سے چند آدمی منتخب کئے جائیں“

دوسرے فرقوں کے نمائندوں نے بھی مسلمانوں کی یہ تجویز مان لی، اور عرض کر چکا ہوں کہ پانچ پانچ آدمی ملے جو کہ ہر فریق سے تقرر کرنے کے لئے جائیں۔ اور اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے پانچ آدمی جو مقرر ہوئے، ان میں دوسروں کے ساتھ ایک نام سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تھا۔ لیکن بالآخر مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے، کہ اس میلے کی بنیاد میں آج جو چیزیں ہیں نظر آتی ہیں، جن کے مختلف پہلوؤں کی طرف اب تک اشارے کرتا چلا آیا ہوں، ایسی کوئی صاف اور صریح شہادت میرے پاس نہیں ہے، جس پر اعتماد کر کے یہ دعویٰ کر دوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے ان میلوں میں جو کچھ کہا یا جو کیا، اس میں ان امور کا خیال بھی آپ کے سامنے کسی نہ کسی حیثیت سے تھا، بلکہ میان کرنوالوں نے جو چیزیں مجھ تک پہنچائی ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا میلہ ہر دوسرا، ہر ایک میں آپ کی شرکت مذہب ہی کے نام پر ہوئی۔ اسی کے نام پر اس میلے میں لوگ بلائے گئے تھے۔ پس مذہب ہی کے نام پر آپ ان میلوں میں داخل بھی ہوئے، اور ان میلوں سے نکلے بھی تو اسی خیال کے ساتھ نکلے کہ ”مذہبی کا دربار“ کے مسلمان کے پیچھے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، پس باہر سے تو مذہب ہی کے نام نے آپ کو کھینچا تھا، باقی آپ کے اندر کیا تھا، جو بیٹھا جائیکے

بعد بھی آپ کو اٹھا اٹھا دیتا تھا، دوسرے سال کے میلے کی اطلاع کھا ہے کہ جب آپ تک پہنچی تو پہلے میلے میں پار یوں کی بے اندانیوں کا خیال کر کے لکھا ہے کہ

”تہی دستی میں صفت کی زیر بادی“، ”بے فائدہ بیچ اوقات“ ہے ”ارادہ جانے کا نہیں کیا“

منہ مباحثہ شاہ جہاں پور

مگر بیٹھ جانے کے بعد پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے، کیوں اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے ذاتی نام و فود کا تو خیر اس شخص کے متعلق سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ جس کی ساری زندگی اسی کے دبانے میں گزاری، عرض ہی کر چکا ہوں کہ پہلی دفعہ میلے میں شاہ جہاں پور تک تو رفقاء کے ساتھ پہنچے، لیکن ریل سے اترنے کو ساتھ ہی، ہم سفروں کو شہر روانہ کر دیا، اور خود تنہا حضرت شیخ الہندؒ کو ساتھ لے کر شب گزاری کے لٹی کسی سرائے میں تشریف لے گئے، اور سرائے میں بھی اسی لئے کہ مشہور نام سے پتہ چلانے والے پتہ چالیں گے۔ ”خیر شید حسین“ اپنے تاریخی نام کے ساتھ داخل ہوئے، میلے میں جب ہر فریق سے ملے ہوئے پانچ پانچ آدمیوں کا انتخاب تقریر وغیرہ کرنے کے لئے کیا جائے، اور مسلمانوں کی طرف سے پانچ ناموں میں سے ایک نام آپ کا بھی تھا تو اس وقت بھی فہرست جو بنی لکھا ہے کہ

”یہ (مولوی محمد قاسم) نام ان کا نہیں لکھا گیا، بجائے مولوی محمد قاسم کے حافظ خورشید حسین صاحب لکھا گیا،“ ۲ میلہ خدا شناسی

طلب دی تھا کہ تقریر کی وجہ سے شہرت میلے میں اگر ہوگی بھی تو خورشید حسین کی ہوگی، محمد قاسم کی نہ ہوگی، ”اف“ کسی کے ”نام“ پر جو اپنا سب کچھ لٹا کر مٹا چکا تھا۔ اپنا وہ اپنے نام کا سوال ہی اس کے لئے کیا باقی رہا تھا۔ حالانکہ یہ دل کی بات تھی، دوسروں کو کیا معلوم کہ نانوتہ سے اٹھارہ انیس کو سن پیدل چل کر دیوبند پہنچنے والا، اور وہاں سے سرگرداں مظفرنگر، میرٹھ دلی ہوتا ہوا، شاہ جہاں پور، شاہ جہاں پور سے پیادہ پاسارنگپور کے اس میدان تک دھاوا کرتا ہوا کیوں پہنچا تھا، پہلی دفعہ بھی پہنچا، اور ارادہ ملتوی کرنے کے بعد دوسرے میلے میں بھی آدھمکا، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق دل کی باطنی کیفیت سے تھا۔

تاہم جو کچھ اندر بھرا ہوا تھا، کبھی کبھی دہی چھٹک پڑتا تھا۔ کس کی آبرو اور عزت کا سوال اس کے بے چین اور بے قرار کئے ہوئے یہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں لئے پھرتا تھا۔

پہلے سال کی روداد میں تو نہیں، لیکن دوسرے سال والے میلے کی روداد مباحثہ شاہ جہاں پور نامی ذالے میں نقل کیا ہے کہ شاہ جہاں پور کے اسٹیشن سے قریب سیدنا الامام انگیر کو مولوی حفیظ اللہ خان وغیرہ شہر لے گئے، اور اس دفعہ شاہ جہاں پور کی یہ رات بجائے سر لے کے مولوی عبدالغفور رضا کے مکان پر گزری، لیکن کیا پوری رات گزری؟ لکھا ہے کہ

”مناظرین اسلام آخر رات ہی سے راہی سیدان مباحثہ ہوئے“

اللہ اللہ یہ کچھلی رات کا وقت، سننے کی بات ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ سیدان مباحثہ

”جو شاہ جہاں پور سے چھ سات کو س کے فاصلے پر تھا“

اس فاصلہ کو طے کرنے کے لئے

”سب صاحب سوار“

جا رہے تھے، لیکن

”مولوی محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ پیارہ پا“ مدظلہ

راستہ میں پھر وہی ندی غالباً گرائانی می آئی، اس کے بہتے ہوئے پانی میں طہارت و وضو سے فارغ

ہوئے، مارچ کا مہینہ تھا، ۱۹ مارچ تھی، وضو کر کے بیان کیا ہے کہ

”نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی“

گرا گرا کر کسی کے قدموں پر سر رکھ کر مانگنے والا کیا مانگ رہا تھا، جس سے مانگ رہا تھا، اور چونکہ

رہا تھا، ان دونوں کے درمیان کا یہ راز تھا۔ لیکن آگے چند اوراق کے بعد صاحب روڈا نے یہ خبر

دیتے ہوئے کہ

”مولوی صاحب (سیدنا الامام انگیر) نے جب سے شاہ جہاں پور کا ارادہ کیا تھا، جس سے

ملنے تھے، یا جس کو اہل دعا سمجھتے تھے، استدعا دعا کرتے تھے“

آگے اس کے بعد لکھا ہے کہ

”خود یہ کہتے تھے کہ ہر چند ہماری نسبت اللہ ہمارے اعمال اسی قابل اثر کہ ہم مع سام
میں ذلیل و خوار ہوں۔“

سیاسی حیثیت سے ذلت و خواری جو کچھ ہو چکی تھی وہ بجائے خود بھی۔ لے دے کہ مسلمانوں کی دینی
زندگی کا کچھ ذلت باقی تھا، اب اس مذہبی سیلے میں اس ذلت کے زوال کا خطرہ سامنے آگیا تھا، اللہ
اللہ جگر شکن ہو جاتا ہے، مجرم اور جرم کی سزا و عقوبت کے استحقاق کا اقرار کرتے ہوئے، عرض کرنے
والے کے اس معروضہ کو جب ہم پڑھتے ہیں۔

”مگر ہماری ذلت و خواری میں دین برحق کی ذلت“

اور آہ کہ اسی کے بعد یہ جگر تنگ کاف، روح گرداں الفاظ نقل کرنا چاہتا ہوں اطفال نہیں ہوتے۔
”اس رسول پاک کی ذلت متصور ہے، جو تمام عالم کا سردار اللہ تمام انبیاء کا قافلہ سالار
ہے۔“

۔۔۔ یہی باطنی احساس، اور آپ کا اندوہی جذبہ تھا، جو آپ کو تڑپائے ہوئے تھا، خود بھی تڑپتے
تھے، اور دوسروں کو بھی تڑپاتے تھے۔ اللہ یہ دعا دینی

”اے الہی! ہماری وجہ سے اپنے دین، اور اپنے حبیب پاک، مشہور لاک کو ذلیل و خوار
مست کر، اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اور طفیل میں ہم کی عزت، انتخا
سے مشرف فرما۔“

لکھا ہے کہ

”خود بھی یہی دعا کرتے تھے، اور اور دل سے بھی یہی دعا کرتے تھے۔“

ہنگ و دو دکشش و کوشش، اضطراب اللہ بے عینی کے ان سارے قصوں کی تہ میں دل کی جو لگی،
قلب کا جو سوز، روح کا جو قلق پوشیدہ تھا، اس کا کچھ اندازہ دعا کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، پس
ایک ہی نام تھا، جس کی عزت کے لئے جینے والا بھی رہا تھا، اللہ اسی کے نام کی حرمت پر وہ مر گیا،

رحمۃ اللہ علیہ زبور اللہ مرقدہ۔

کچھ بھی ہو۔ پہلے تک یہی آپ کا باطنی جذبہ کھینچ کر لاتا رہا، لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سطر میں پہنچنے کے بعد اس قسم کے تماشے جو آپ کے سامنے پیش ہوئے، کہ ہنڈت صاحبان تو اپنی ہنڈتانی کے کمالات کی نمائشوں میں مصروف ہیں۔ سنسکرت الفاظ کے استعمال کے شوق کو دور کر رہے ہیں، اور بیسیائیوں کی طرف سے کالے پادری جو شریک تھے، بقول صاحب رودلو "میلہ خدا شناسی" ان کی تقریر کا حال یہ تھا کہ

"کاتب میں الفاظ کے ایسی معانی ڈالنے کی نوبت نہ آئی تھی، اور الفاظ ہی سے خانہ پوری اوقات کرتے تھے۔" ص ۱۲

خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کا یہ پادریوں کی تقریروں پر تنقید یاد ہو گا کچھ اسی قسم کے الفاظ میں فرمائی تھی، باقی ان کے لسان اور طرز اور مقرر پادری نولس صاحب سوائے "شکوہ خیز مخالطوں" شغل لکڑی اور لائمی والے عام دھاس، یا چر شاخ پتہ والے تشلیشی مخالطہ وغیرہ کے سوازیلہ وقت توان و قوانین کی ترتیب، ہی میں خرچ کر رہے تھے، اسی طرح منطق کی کتاب پر پانسو روپے سرکاری انعام پانے والے پادری اسکات صاحب وہ حکومت برطانیہ کی بھاٹ خوانی کو عیسائی مذہب کی دکالت قرار دے رہے تھے، الغرض یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے حالات منجیدہ نفوس کو کبیدہ و انسردہ کرنے کے لئے کافی تھے، دوسرے سال پہلے کے منعقد ہونے کی خبر پانے کے بعد اپنی شرکت کو بے ہمدہ اور بغضب اوقات، سیدنا الامام الکبیر نے اہتمام میں جو قرار دیا تھا، تو اسباب آپ کے احساس کے اسی قسم کی باتیں تھیں۔

ہاں ہر ای عجیب و غریب پہلے کی بدولت جس کے انعقاد کے درپردہ محرکات خواہ کچھ ہی ہوں، ایک ختم مرقعہ بھی سامنے آگیا تھا، دنیا کے دو بڑے مذہب عیسائیت، اور ہندو دھرم کے ماننے والوں کو ایک ساتھ مخاطب بنانے، اور دین کے آخری پیغام اور اس پیغام کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روشناس کرائے کا اس سے زیادہ سوز و ترین وقت اور کیا ہو سکتا تھا، کہا تو یہی جاتا تھا کہ

”تحقیق حق“ کے لئے ایک ہی جگہ شانہ سے شانہ ٹاکر سب بیٹھے ہیں، میلے میں پہنچنے کے بعد اس اتفاق اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے خیال ہی کا اظہار ہر نتیجہ معلوم ہوتا ہے، کہ پنڈت اور پارسی توجہ خفاں میں بھی ہوں، لیکن سیدنا الامام الکبیرؑ کو ہم دیکھتے ہیں، کہ مشراط و تیرہ کے قصیدوں سے بالا ہو کر اپنی توجہ کو اتنی تبلیغی نصب العین پر مرکوز کر کے صرف اسی کو شمشیں میں مصروف ہیں، کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اپنے خیالات کے پیش کر کے کاموقعا کر دیا جائے۔ پہلے تو آپ نے اسی لئے پڑھا تھا کہ تقریر کے لئے کافی وقت حاصل کیا جائے، لیکن اس میں جب کامیابی نہ ہوئی، تو جلسہ کے اندر جلسہ کے باہر جس طرح بھی آپ سے بی پرہا، جو کچھ سنانا چاہتے تھے، اس کو سناتے ہی چلے گئے، اسی سے اندازہ کیجئے، کہ دوسرے سال کا میلہ، جس میں پنڈت دیانند سرسوتی جی اور منشی اندرمن بھی شریک تھے اور جلسہ سے پہلے سبکدوش کیٹی میں یہ طے ہو چکا تھا کہ پہلے تقریر درس کرنا، سہارا ج پنڈت جی کی ہوگی اور عام مجمع میں تقریر کے لئے مقررین پہنچے، تو کھانا ہے کہ

”پنڈت صاحب (سوامی دیانند جی) سے کہا گیا کہ محفل شادی میں آپ کہہ چکے ہیں کہ آج ہم درس دیں گے سو آپ بیان کریں۔“

لیکن مجلس شادی کے اس طے شدہ فیصلے کے برخلاف بیان کیا ہے کہ

”انہوں نے (پنڈت جی نے) پہلو بھی کی نہ۔“

پارسی تونس بھی حیران ہو گیا، مگر کسی طرح پنڈت جی کو فیصلہ کے مطابق عمل پر آمادہ نہ کر سکا تو کھانا ہے کہ مجبور ہو کر اس نے سیدنا الامام الکبیرؑ سے کہا کہ جب پنڈت جی شروع نہیں کرتے، تو آپ ہی بیان کیجئے، یہاں کیا تھا، اول ہو یا آخر، آپ کے سامنے تو صرف حق کی تبلیغ تھی، صرف یہ فرماتے ہوئے کہ

”انصاف کا مقتضی اسی کا تھا کہ سب کے بعد ہم بیان کرتے، کیونکہ ہمارا دین سب سے

پچھلا ہے۔“

جو کچھ پارسی تونس نے کہا تھا، بلا چون و چرا آپ نے منظور فرمایا۔

اسی طرح تو سب وقت کی جو تجویز آپ کی طرف سے پیش ہوئی تھی۔ جب کثرت رائے ہو سترد ہو گئی تو اس وقت پادری نولس سے فرمایا کہ

”ہمارے بار بار کہنے سے انفرائش وقت کو تسلیم نہ کیا تو فیہ اس کو قبول کیجئے کہ بعد اوقت سام وقت جلسہ یعنی چار بجے کے بعد کل ہم ایک گھنٹہ وعظ کریں گے آپ بھی محض میں شریک ہوں اور بعد ختم وعظ کے اعتراض کرنے کا بھی اختیار ہے“

غرض آپ کی یہ تھی کہ پادری نولس صاحب ہی اس میلے کی سب سے زیادہ متاثر اور سرور آور رہے ہستی تھی۔ ان کی شرکت کی وجہ سے دوسرے بھی خارج از وقت والی میری تقریریں شریک ہو سکیں گے اسی لئے آخر میں یہ بھی آپ نے فرمادیا تھا کہ اعتراض کا حق صرف پادری نولس ہی کی حد تک ہوں محدود نہیں کرتا ہوں۔

”بلکہ جس صاحب کے دل میں آئے وہ اعتراض کرے، ہم جواب دیں گے۔“

آپ دیکھ رہے ہیں، جلسہ کے اندر حالانکہ تقریر کرنے والے پنڈت جی کی جگہ پہلے آپ کا کھڑا ہونا، طوطا شدہ فیصلے کے خلاف تھا۔ لیکن آپ نے اس کی پروا نہ کی، اور تقریر کرنے پر آمادہ ہو گئے، اسی طرح حیب آپ کو محسوس ہوا کہ دل کا حوصلہ وقت کی قید و بند کی پابندیوں میں نہ بسکے گا، تو خارج از جلسہ آپ نے نولس کو راضی کیا کہ بیان کرنے کا موقع آپ کو دیا جائے اور وہی سب کچھ جلسہ سے باہر کرنا چاہئے جسے جلسہ کے اندر کرنا چاہئے تھا۔

دوسرے میلے میں تو اس حد تک تبلیغ اور حق رسانی کا یہ دلولہ آپ میں اشتعال پذیر ہو گیا تھا کہ دوسرے دن جلسہ کے اندر تقریریں اور سال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر میں پنڈت دیانند سروتی جی نے مشہور خیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، جلسہ صبح سے چورہا تھا، پنڈت جی نے بالکل آخر میں جب گیارہ بج رہے تھے اس مسئلہ کو چھیڑا تھا، لکھا ہے کہ ان کے بعد سیدنا امام الکبیر اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے تقریر کے مقام پر حجب پہنچے، قریادریوں نے اعلان کیا کہ گیارہ بج چکے۔

”بس جلسہ کا وقت ہو چکا۔“

حضرت والا کی بے گلی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی، صاحبِ ورداؤ نے نقل کیا ہے، کہ جلسہ والوں کو خطاب کر کے

مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے فرمایا کہ دو چار منٹ ہمارا خاطر سے اور ٹھیرے بند درگاہِ جھٹ پٹ پنڈت جی کے اعتراض کا جواب عرض کئے دیتا ہے ۱۵۷
لیکن پادری کسی طرح دو چار منٹ کے لئے ٹھیرنے پر آمادہ نہ ہوئے، اس وقت آپ سے نہ رہا گیا، اور شاید یہ زندگی میں پہلا موقع تھا، کہ پنڈت دیانند سرسوتی جی کو شخصی مخاطب بنا کر حضرت والا کہتر گئے کہ

”پنڈت صاحب آپ ہی ٹھیر جائیں، وقت جلسہ ہو چکا ہے، تو کیا ہوا، دو چار منٹ خارج از جلسہ ہی ہوں؟“

مگر حیرت ہوتی ہے، اتنے غیر معمولی اصرار کے باوجود پنڈت جی بھی چند منٹ کی گنجائش نہ بحال سکے، لکھا ہے کہ

”پنڈت جی نے بھی نہ مانا اور یہ فرمایا کہ بھوجن کا وقت آگیا ہے، اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔“
۱۵۸ سباحہ شاہ جہاں پور

پنڈت جی تو یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گئے، سیدنا الامام الکبیر نے جب دیکھا کہ پنڈت جی تو خیر ہاتھ سے اٹھ گئے، تو نایتِ اضطراب میں بیان کیا ہے، کہ پنڈت جی کے ہمد و ہمراہ
”غشی اندزن صاحب کا ہاتھ پکڑ کر یہ فرمایا، کہ غشی صاحب، پنڈت صاحب تو نہیں سنتے، آپ ہی سنتے جائیں۔“

ہاتھ اگر پکڑ نہ لیتے تو شاید غشی جی بھی پنڈت جی کے پیچھے پیچھے چلے جاتے، لیکن دستِ گرفتہ ہو جانے کی وجہ سے شاید مجبور ہو گئے، اور سیدنا الامام الکبیر جو کچھ سنانا چاہتے تھے ان کو نہ کر رہے۔

اور یہ قصہ تو دوسرے میلے کا ہے، پہلے سال ہی کے میلے میں آپ کے جوشِ تبلیغ کی شدت بڑھتی ہوئے اس نقطہ تک پہنچ چکی تھی، جب میلے کے دوران ختم ہو چکے، اور اپنی فرودگاہوں میں لوگ

واپس ہوئے، طے یہ تھا کہ کل میلہ کے میدان سے لوگ روانہ ہو جائیں گے، اسی عرصہ میں جیسا کہ پہلے سال کی روداد میں لکھا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے موتی میاں صاحب سے کہا، یوں ہی چاہتا ہے کہ پانچ نوٹس صاحب سے تنہائی میں ملے، اور دعوت اسلام کیجئے“

آپ نے کچھ اس طرف سے اپنے دل کی آرزو بیان کی کہ موتی میاں حضرت والا کے منشاء کے مطابق پادری نوٹس کے خیچے میں اسی وقت چلے گئے، اور کہا کہ

”ہمارے مولوی صاحب آپ سے تنہا ملنا چاہتے ہیں“

نوٹس بخوشی ملنے پر آمادہ ہو گیا، اور یوں حضرت والا تنہا نوٹس صاحب کے پاس ان کے خیمہ میں پہنچے ان تہیدی فقرات کے بعد یعنی

”ہم آپ کے اخلاق سے بہت خوش ہوئے، اور چونکہ اخلاق باعث محبت ہو جاتے ہیں اور محبت باعث خیر خواہی ہو جاتی ہے، تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ دیکھیں آپ کی خیر خواہی کے آپ سے کہیں اور آپ نہیں“

نوٹس نے کہا کہ ”ضرور سنائیے“ تب جیسا کہ خود ہی بیان کیا کرتے تھے، پادری کے سامنے تبلیغ کا حق ان الفاظ میں ادا کیا گیا، یعنی فرمانے لگے کہ

”وین عیسوی سے تو بہ کیجئے، اور دین محمدی اختیار کیجئے، دنیا چند روزہ ہے۔ اور عذاب آخرت بہت سخت ہے“

”بیشک“ اس لفظ کے سوا، نوٹس کی زبان سے کچھ نہ نکلا، وہ خاموش بیٹھا رہا، تب آپ نے فرمایا کہ

”اگر مہذب آپ کو تامل ہے، تو اللہ سے دعا کیجئے کہ حق واضح کر دے“

یہ بھی تاکید کی گئی کہ

”اگر آپ اخلاص سے دعا کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ضرور حق کو روشن کرے گا“

تب ہم میں نوٹس صاحب نے کہا کہ

”میں روزِ دعا کرتا ہوں، کہ یا اللہ میرے دل کو روشن کر دے“

کہتے ہیں کہ اس پر آپؐ نے پادری صاحب کو ہدایت کی کہ

”یوں دعا کیجئے، کہ ان مذاہب مختلفہ میں جو ن ساندہیب حق ہو، وہ روشن ہو جائے اور حق
و باطل تمیز ہو جائے“

نولس نے یہ سن کر کہا کہ

”میں آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں، کہ آپؐ نے میرے حق میں اتنا فکر کیا، اور میں آپ کی اس
بات کو یاد رکھوں گا“۔

بہر حال اس میلے سے جس میں ہر طرح کے لوگ مذہبی احساسات کو بیدار کر کے شریک بن گئے ہیں،
اس سے تبلیغی نفع حاصل کیا جاسکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اجلاس ہی میں اس کی طرف
ذہن مبارک منتقل ہو گیا تھا، کیونکہ لکھا ہے کہ پہلے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد ہی

”مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیر) نے داعیوں دینی مسلمانوں کی طرف سے مولوی جو
شریک ہوئے تھے اور وعظ کہہ سکتے تھے ان ہی کو فرمایا کہ میلہ میں متفرق ہو کر وعظ بیان
کرنا چاہئے“

بیان کیا ہے کہ آپ کی اس تجویز کے مطابق

”داعیوں (اسلام) نے جاگیر پیر مولوی منصور علی صاحب کے علی الاطلاق منادی اسلام و ابلاغ
عیسائیت کو میان کرنا شروع کیا“

عصر کے بعد مغرب تک میلہ میں وعظ کہنے والے علماء پھیل گئے تھے، صاحبِ روزِ دعا نے لکھا ہے کہ
”قبل مغرب تک تمام میلے میں عجب کیفیت رہی اور عنایتِ ربّی سے کوئی پادری مقابل
نہ ہوا“

گویا جو پیشہ پادریوں کا تھا، حضرت دالا کے اشارہ سے مسلمان مولویوں نے وہی کام میلہ میں شروع کیا،
خیال یہ تھا کہ گورے نہ ہی ان کے سکھائے ہوئے کالے پادری ہی مقابلہ میں آئیں گے لیکن بقول

صاحبِ ردداد گورے پادری ہوں یا کالے

”خدا معلوم کہاں جان چائے پڑے رہے“ ملا واقعہ میلہ خدا شناسی

عصر سے مغرب تک سارے میلے میں یہ چرچا ہوتا رہا، مغرب کے بعد اندھیرا ہو چکا تھا، لوگ اپنی اپنی فرودگاہوں میں چلے گئے، علماء اسلام بھی یہاں لکھا ہے، اپنے خیموں میں

”صلاح و مشورہ کرتے رہے“ اسی حالت میں عشا کی نماز پڑھ کر اور کھانا کھا کر سر رہے۔

دوسرے دن بھی محفل مناظرہ منعقد ہونے والی تھی، صبح ہوئی، نماز صبح کے بعد دیکھا گیا کہ ابھی اجلاس میں دیر ہے، اس لئے پھر حضرت نے مولویوں سے کہ لکھل کی طرح آج بھی عام منادی اسلام کی میلہ میں کرنا چاہئے، یہی کیا گیا، صاحبِ ردداد نے لکھا ہے کہ

”چنانچہ ان حضرات نے میلہ میں جا کر کئی نفعی حق اسلام ادا کیا۔ جزاہم اللہ عن جمیع المؤمنین

خیر الجزاء“ ۲۲

بیان کیا ہے کہ دوسرے دن بھی

”۹“ ریجے تک برابر دھڑ دھڑ کا شور تمام میلہ میں رہا۔

بہر حال اعلانِ ادرہ اشتہار کے مطابق اس میلہ میں کارروائیاں ہو رہی ہوں، یا نہ ہو رہی ہوں، لیکن

ہمٹ جانے کے بعد سیدنا امام الکبیر نے ایک طرف تو اس کی کوشش کی کہ تبلیغِ حق کا فائدہ اس سے اٹھایا جائے۔ دوسروں کو بھی میلے کی افادیت کے اس پہلو کی طرف متوجہ فرمایا، اور خود ذاتی طور پر جو کچھ بھی کر سکتے تھے، آپ دیکھ چکے کہ کوئی دقیقہ آپ نے اس راہ میں اٹھانہ رکھا تھا، لیکن آپ کے احسانی حکم و علم کے اتنا ہی حد تک محدود نہ تھے، بلکہ آپ کی اس خداداد نعمت کا مظاہرہ سچ پوچھنے تو ان تقریروں میں ہوا، جن کا ذکر دونوں سیلوں کی رددادوں میں کیا گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ میلہ کے رددادوں پر وہ محرکات سے نادانف رہتے ہوئے آپ کی ہر تقریر بڑھیک مقتضی حال کے مطابق ہر اجلاس میں کیسے ہوتی رہی۔

میرا مطلب یہ ہے، کہ جن اشتباہی تاریکیوں کا تذکرہ اس میلے کے متعلق کر چکا ہوں، اگر یہ

مان لیا جائے کہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے یہ تارکیاں ائمہ تھیں، اور اس میلہ کو صرف ایک مذہبی میلہ ہی سمجھتے ہوئے، آپ تقریر فرماتے رہے، تو اب اس کی توجیہ کیا کی جائے؟ کہ ان تارکیوں سے کامل آگاہی کے بعد بھی جہاں تک میرا خیال ہے، ان سے زیادہ بر محل تقریروں اور بین موثقہ کے مناسبت بیانوں کا ہم شاید قصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر اجلاس میں آپ نے مذہبی کہنا جو کہنا چاہئے تھا، اور اس طریقہ سے کہا کہ نتیجہ ان میلوں کا جب سامنے آیا، تو دیکھا گیا کہ اس نتیجہ سے وہ قطعاً مختلف تھا، جس کی توقع اس قسم کے میلہ کے بعد کی جاسکتی تھی۔ میں ان تقریروں کی پڑھتا ہوں اور مہیوت ہو کر رہ جاتا ہوں، اس کے سوا اور کچھ کچھ میں نہیں آتا کہ دراد طور عقل قرار دے کر چپ ہو جائوں، عقل و قیاس کی اس کی توجیہ سے معذرتا ہوں۔ اس باب میں میرے جو احساسات ہیں، شاید صحیح طور پر ان کی تبصیر جیسی کہ چاہئے مجھ سے بن بھی نہ آئے، لیکن اپنی حد تک کوشش کرتا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی مرتبہ سوالات کی ایک فہرست مجلس مباحثہ میں اس تجویز کے ساتھ پیش ہوئی تھی، کہ علمی طور پر مذہبی موضوع پر بحث و تحقیق کا یہی طبعی طریقہ ہو سکتا ہے، لیکن آپ کی مجوزہ فہرست کی جگہ کثرت رائے سے اہل مجلس نے یہی طے کیا کہ سوالات کی جو فہرست منشی پیارے لال کی طرف سے پیش ہوئی ہے، سمجھا جاتا تھا کہ سوامی دیانند جی کے مرتب کئے ہوئے سوالات تھے، اسی کے مطابق بحث ہو۔ اس رنگ کو دیکھ کر چارہ کام ہی کیا تھا، کہ اکثریت کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا جائے، لیکن پھر بھی دونوں میلوں میں جلسوں کے اندر، یا باہر جہاں کہیں بھی جتنی دیر آپ کو بیان و تقریر کے مواقع ملتے رہے، عموماً ان میں وہی باتیں ہوتی تھیں جن کا ذکر آپ کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مباحثہ شاہ جہاں پور نامی دالی رد و اد میں بایں الفاظ کیا ہے، لکھا ہے، کہ

اس تقریر میں آٹھ باتیں تھیں۔ خدا تعالیٰ کا ثبوت، انس کی وحدانیت، انس کا واجبہ الاملاعت ہونا، نبوت کی ضرورت، نبوت کی علامات اور صفات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، ان کی خاتمیت، ان کی فلاح کے بعد انہیں کے اتباع میں نجات کا

اگرچہ ورداد میں ایک ہی تقریر کے شتلات کا تجزیہ کیا گیا ہے، لیکن جس حد تک آپ کی دوسری تقریروں اور بیانات کا جو حصہ ان وردادوں میں نقل کیا گیا ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان ہی ہشت گانہ عنوانوں کو محور بنا کر آپ تبلیغ کا حق ادا فرماتے رہے۔ دین کے ان اصولی عنوانوں میں سے ہر ایک کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے قصیدہ ہی انکار اور ان کی اچھوتی تصویروں کی تفصیل کا صحیح اور سزاوارتہ مقام تو کتاب کا دوسرا حصہ ہے جو حضرت والا کے

”نظریات فائقہ“

کی تشریح و توضیح ہی کے لئے انشاء اللہ مرتب کیا جائے گا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس جلیل علمی و دینی خدمت کی سادت کسے حاصل ہوتی ہے، اور توفیق ربانی کس کا انتخاب اس ہم کے لئے کرتی ہے، بجائے خود یہ ایک مستقل کام ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ٹھیک عصری تقاضوں کے مطابق دین کی تفہیم کا اس سے بہتر طریقہ شاید اس زمانہ میں سوچا جی نہیں جاسکتا، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان اچھوتے اور نئے خیالات کا لاش بھی نیا کر دیا جائے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کام کس کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

بہر حال ”سیرت طیبہ“ کے اس حصہ میں ان تقریروں اور بیانات کے سرف اس پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے شاہ جہاں پور کا وہی میلہ جسے آپ دیکھ چکے کہ اپنے دامن میں ہندو مت فتنہ نگ کی جنگاروں کو چھپائے ہوئے تھا، سوچا گیا ہو، یا نہ سوچا گیا ہو، لیکن میلہ کے جلسوں کی کاروائیوں کی رفتار ہی ایسی تھی، کہ غدر کے بعد غدر سے بھی زیادہ ہمیشہ فتنے کا ہندوستان خدا نخواستہ اگر شکار ہو جاتا، تو جو کچھ کہا جا رہا تھا، اذکر کیا جا رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے شاید وہ کوئی اچھے کی بات نہ ہوتی۔ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، تفصیل کے ساتھ اسے پیش کر چکا ہوں۔ آپ دیکھ چکے کہ پہلی دفعہ اسی سلسلے میں ہندوستان کے باشندوں کے ایک طبقہ یعنی ہندوؤں کے نمائندوں کو اسی ملک کے دوسرے دینی فرقہ مسلمانوں سے جدا کر کے عیسائی مذہب کے کلام یعنی پادریوں کی صف میں لاکر کھڑا کیا گیا تھا، آج اس ملک میں اکثریت و اقلیت کا جو عفریت گرج رہا ہے، اس کی پرچھائیاں غالباً پہلی دفعہ اسی سلسلے میں

احساسات کے سامنے نمایاں ہوئی تھیں، اور کون کہہ سکتا ہے، کہ اٹھارہ انیس سال پہلے جس ملک میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر عیسائیوں پر حملہ کیا تھا، اسی ملک میں انتقام کے اس تماشے کو کیا روکا جاسکتا تھا، کہ خود ہندو مسلمان باہم دست و گریبان ہیں۔ مگر اب اسے کیا کہنے، کہ وہ تماشہ تو کیا ہوتا، نتیجہ کی شکل میں جو نظارہ سامنے آیا، وہ اس سے مختلف اور قطعاً مختلف تھا، جس کی توقع میلہ کے بعد کی جاسکتی تھی، کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ دارمہی نہیں کر خالی گیا، بلکہ جو کچھ آپ پڑھیں گے، اس کو پڑھ کر شاید ہر پڑھنے والا یہی کہہ سکتا ہے، کہ دارکراٹھ دیا گیا، اگر یا کہا جاسکتا ہے کہ لڑائی کے قانونوں و لایحیق العکوالسواء الا بآہلہ کی عملی تفسیر ایک دفعہ شاہ جہاں پور کے اس میلے میں بھی قدرت کی طرف سے کی گئی، ادب اسی دلچسپ سرگزشت کی میں تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

زمانے والوں تک حتیٰ کے پہنچانے کا جو میدان اس میلے میں سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا تھا، یہ واقعہ ہے مگر کسی کی دروغ عایت کئے بغیر اگرچہ آپ سب کچھ اپنی ان تقریروں میں فرماتے رہے، عبادت کاستی صرف کائنات کا خالق ہے، اس مسئلہ کی تشریح و تبلیغ کرتے ہوئے صاف صاف نظروں میں آپ اعلان کرتے رہے کہ خالق کے سوا مخلوقات خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی ہو، جب مخلوق ہیں تو ان کی عبادت نہ تھا جائز ہو سکتی ہے، اور نہ عقلاً، آپ عیسائیوں اور ہندوؤں دونوں طبقوں کو خطاب کر کے کہا تھا۔

”ایسی صورت میں سوا خلاق کائنات کے، آدموں کی عبادت جیسے ہندو نصاریٰ کرتے ہیں، بالکل خلاف عقل و نقل ہوگی۔“

پھر اس اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے بھری مجلس میں آپ بار بار اس کا اعادہ فرماتے رہے، کہ ”خاص کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سری مام چندر اور سری کرشن کو معبود کہتا ہوں بھی عقل میں نہیں آسکتا کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے۔ پانچاٹھ، پیشاب، مرض اور موت سے

لے ہی غلط تھا، جس پر پادی نوٹس صاحب نے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ پانچاٹھ پیشاب کا غلط فرمایاں مرتی مایاں جو جلسہ کے ہتم تھے انہوں نے یہ سن کر کہا کہ پانچاٹھ پیشاب نہ کہنے بول دہرا ز کہئے۔ مثلاً باتی اگھو صفر،

مجبور تھے۔ ” مثلاً میلہ خدا شناسی

اور جیسے جیسے کھرے کھرے الفاظ میں ”اسلامی توحید“ کی منادی آپ کرتے تھے اسی طرح پرستار
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں (یعنی سارے انبیاء و رسل میں)، افضل سمجھتے ہیں“ اور بعد
 خداوند عالم انہیں کو جانتے ہیں۔ ” مثلاً میلہ خدا شناسی
 اور یہ کہ

”حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں افضل و اعلیٰ پایا۔“ ۲۱
 پہلے سال کے پہلے میں آپ نے ان ہی الفاظ میں اپنے دعوؤں کو پیش کیا، اور دوسرے سال کے پہلے
 میں بھی یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ

”یہ بات ناچاق تسلیم ہے کہ آپ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)، تمام انبیاء کے
 قائلہ سالار اور سب رسولوں کے سردار اور سب سے افضل اور سب کے خاتم ہیں۔“ ۲۲
 استدلال کا جو حق تھا، اسے ادا فرمایا، اور یہ میلہ ہندوؤں، عیسائیوں، مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا، بلکہ مختلف
 یرایوں میں ان کے کان میں یہ ڈالتے رہے، کہ

”آج کل نجات کا سامان بجز اتباع نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ
 نہیں۔“ ۲۳ مباہتہ شاہ جہاں پور

قطعا غیر مشتبہ دُروک الفاظ میں مناتے رہے کہ

”کوئی شخص اس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر اوروں کا اتباع کرے، تو
 بیشک اس کا یہ اصرار اور اس کا ارادہ قسم بقاوت خداوندی ہوگا، جس کا حاصل کفر والحداد
 ہے۔“ ۲۴ مباہتہ شاہ جہاں پور

اور یہ فرماتے ہوئے کہ اب دین محمدی ہی کا وقت ہے، سب کو منادیا گیا کہ

(گذشتہ صفحہ سے)، ایک دوسرے پر تہہ پر تہی تمثیل میں پاخانہ کا لفظ سن کر باری صاحب نے کہا تھا، میں جانوں
 پاخانہ کی مثال اچھی نہیں۔ ۲۵

”عذابِ آخرت اور غضبِ خداوندی سے نجات اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں نکل رہے۔“

جن براہین اور دلائل کی روشنی میں ان اعلانات کو دونوں میلوں میں آپ نے پیش کیا تھا، آج بھی اپنی دل آویزیوں میں شاید وہ اپنی آپ نظیر ہیں، جن کے لئے ان رد و دادوں کا مطالعہ کرنا چاہئے، یا انتظار کیا جائے، سیرتِ قاسمی کے دوسرے حصہ کا جس میں ان ہی باتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش انشاء اللہ تعالیٰ کی جائے گی، اس باب میں سیدنا امام الکبیر ایک مستقل فکری نظام کے بانی اور موجد ہیں، جدتِ طرائق کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس شدید بغضت کے جو انگریزوں اور انگریز حکومت کی طرف سے آپ کے قلبِ مبارک میں تھی، عرض ہی کر چکا ہوں کہ ساری عمر آپ نے بنیٰ صرف اسی نحو استعمال نہیں فرمایا کہ بنیٰ کو انگریزوں کی برآمد کی ہوئی چیزوں میں آپ شمار فرماتے تھے۔ لیکن رسالتِ محمدیہ کی مذکورہ بالا خصوصیتوں کو سمجھاتے ہوئے دوسرے وجوہ و اسباب کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے انگریزوں کے نام لے لے کر ایک سے زائد موقعوں پر مثیلاً فرماتے تھے کہ

”جیسے اس زمانے میں باوجود فقر و گور ز حال لارڈ لٹن، گورنر سائٹی لارڈ ناتھ بروک کے احکام کی تعمیل پر اگر کوئی شخص اصرار کرے اور لارڈ لٹن کے احکام کی تعمیل سے انکار کرے تو باوجود اس کے کہ لارڈ ناتھ بروک بھی سرکاری کی طرف سے گورنر تھا اس وقت یہ اصرار بیشک منجملہ بغاوت اور مقابلہ سرکاری سمجھا جائے گا“

کتنا دل چسپ لطیف ہے کہ بنیٰ کو جس نے کبھی اس لئے استعمال نہیں کیا، کہ انگریزوں کا آہرہ ہے، وہی دینی ضرورت کے لئے لٹن، انگریزوں کے نام کو بے تحاشہ دھڑکنے کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ماننے والوں کے ایسے مجمع میں جس میں مسلمان ہی مسلمان ہوں آدمی سب کچھ کہہ سکتا ہے، لیکن سوچنا چاہئے، کہ ماننے والوں کے ساتھ جس محفل میں نہ ماننے والوں کی بھی کافی تعداد ہو، اور کافی کیا معنی، اپنے عمل و وقوع کے لحاظ سے عرض کر چکا ہوں کہ اکثریت اس میلے میں نہ ماننے والوں ہی کی تھی، جو یہاں صرف سن لینے ہی کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ تنقید و اعتراض کا

حق بھی غیر اسلامی مذاہب کے نمائندوں کو حاصل تھا۔ مگر دیکھ رہے ہیں آپ کی تقریروں پر کسی قسم کے دباؤ کا ہلکا سا اثر بھی محسوس ہوتا ہے، یقیناً خالص مسلمانوں کے مجمع میں جو کچھ کہا جاسکتا تھا، وہی سب کچھ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کی اس بھیڑ میں بے دھڑک کسی رنگ آمیزی کے بغیر آپ فرماتے رہے، مدامت کی تو خیر گنجائش ہی کیا تھی، سچی بات تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں آپ نے اردو ادبی اور مساحت سے بھی کام نہ لیا، یہی نہیں، بلکہ جہاں ایک موقعہ پر آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

”دو مذاہبوں کو تو ہم یقیناً دین آسمانی سمجھتے ہیں، ایک دین یسوع اور دوسرے دین نصاریٰ“

اسی کے مقابلہ میں ہندوؤں کے سامنے ان کے ہندو دھرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”اس کی نسبت اگرچہ یقیناً ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین بھی آسمانی ہے۔“

گویا ہندو دھرم کے مقابلہ میں عیسائی دین کے ترجیحی پہلو کے اعتراف کی یہ ایک شکل تھی لیکن ایک دوسرے موقعہ پر جب توحید کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی اور افسانہ پور ہاتھ کر خالق کائنات کی وحدت کا عقیدہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے

”کسی ملت اور مذہب والوں کو اس سے انکار نہیں“

اپنے اسی عام دعوے کی تشریح میں ہندوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے جہاں یہ فرمایا تھا کہ

”وہ گوجیت پرست اور اوتاروں کے پر جنے والے ہیں، پر جوتی سروپ نہ نکال سکتا ہی کو کہتے ہیں۔“

وہیں عیسائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ

”رہے نصرانی، وہ اگرچہ مشرک میں سب سے اول نمبر ہیں، اور مشرک تو مشرک صفات

ہیں، پر نصرانی تو مشرک ذات ہیں، یعنی ذات کے مرتبہ میں تین خداؤں کے تائیل ہیں۔“

مطلب جس کا یہی ہوا کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں عیسائیوں کا جرم زیادہ سخت اور زیادہ شرمناک ہے حالانکہ جس زمانہ میں یہ فرمایا گیا تھا، یاد ہو گا اسی زمانہ میں ہندوؤں کے آریہ سماجی گروہ کے پیشوا

پنڈت دیانند کہتے پھرتے تھے کہ "دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑے بت پرست مسلمان ہیں"۔ لیکن سیدنا امام الکبیر کا مقام اس قسم کی محامضوں، یا بے جا جانب داریوں سے بلند اور بہت زیادہ بلند تھا، جس قوم یا مذہب میں آپ کے نزدیک واقعہ کی رو سے جو کچھ پایا جاتا تھا، صرف اس کا اظہار کر رہے تھے۔ نہ آپ عیسائیوں کو خوش کرنا چاہتے تھے، اور نہ ہندوؤں سے انتقام کا مسئلہ آپ کے سامنے تھا۔ اپنے عقیدے کی رو سے جو چیز جس رنگ میں آپ کے سامنے تھی، سننے والوں کے رجحانات سے آزاد ہو کر اسی کو پیش کر رہے تھے۔

تاہم دونوں سیلوں کی رودادوں میں آپ کے بیانات اور تقریروں کے اثر کو جن الفاظ میں پہنچانے والوں نے ہم تک پہنچایا ہے، آئیے اور دیکھئے، وہ کتنا حیرت انگیز اور سوچنے تو عجزت خیز ہونے کے ساتھ ساتھ آج بھی اسلامی ہندوؤں کے لئے کتنا سبق آموز ہے۔

ظاہر ہے کہ چاندپور کے اس میلے میں جو مذہب کے نام سے قائم کیا گیا تھا، اس میں شدید یک ہونے والے عواما ہندو مسلمان اور عیسائی تھے۔

مسلمان جس حد تک حضرت والا کی تقریروں سے متاثر ہوئے ہوں، ان کے متعلق تو خیر پوچھنے کی ضرورت نہیں، بقول صاحب روداد

"مسلمانوں کی جو کیفیت تھی سو تھی" ۱۱ ص ۳۱۱ میلہ خدا شناسی

غالباً اسی کیفیت کی یہ تفصیل کی گئی ہے کہ

"لوگوں پر کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیر) کی جانب تک رہا

تھا، کسی کی آنکھوں میں سننے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت" ۱۲ ص ۳۱۱

مسلمانوں کے دل کی باتیں تھیں جو کچھ وہ چاہتے تھے، وہی ان کو سنایا جا رہا تھا، ان کے عقائد و عقائدات دلائل و دبراہین کے زریعوں سے آراستہ پیراستہ ہو کر ان کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔ جو حلال ان پر طاری ہوتا، اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ جوش میں ایسے الفاظ اگر ان میں سے کسی کی زبان پر جاری ہو گئے ہوں، جیسے اس وقت میں ایک کالے پادری نے خواہ مخواہ اپنی غلط منطق دانی کا ثبوت پیش کیا، اور

سیدنا امام الکبیر نے اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا چاہا تو لکھا ہے کہ
 ”مولوی احمد علی صاحب ساکن ننگینہ نے رد کا اور یہ کہا کہ کس کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہو،
 حق واضح ہو گیا، پھر کہا ہے کہ اٹھتے ہو“ ۲۹ میلہ خدا شناسی
 اسی طرح بیسائیوں میں جو کالے پادری تھے، ان کے متعلق تو نہیں، لیکن نولس صاحب اور اسکاٹ صاحب
 جو یورپین نژاد پادری تھے، ان کے متعلق اس قسم کی باتیں خلاصہً یہ ہوتے ہوئے نولس صاحب نے
 حضرت دالائے کہا تھا

”آپ کے اخلاقی دوس بہت خوش ہوا، پھر نام و نشان مکان پوچھا“

یا بیان کیا ہے کہ

”تھوڑی دیر بعد موتی میاں صاحب نے آکر فرمایا پادری کہتے تھے کہ گو یہ صاحب یعنی مولوی
 محمد قاسم صاحب ہمارے خلاف کہتے تھے پر انصاف کی بات یہ ہے کہ ایسی تقریریں اور ایسے
 مضامین ہم نے نہ سنے تھے“ (میلہ)

یا ان ہی موتی میاں کے حوالہ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ انہوں نے

”مولوی محمد قاسم صاحب سے فرمایا کہ پادری اسکاٹ صاحب آپ کی تعریف کرتے تھے، اور
 کہتے تھے کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں، یہ مولوی نہیں یہ صوفی مولوی ہے“

ص ۱۰۰ مباحثہ شاہ جہاں پور

اس سے بھی زیادہ دل چسپ بیان ایک یورپین پادری ینگ نامی کا ہے۔ بریلی کے رہنے والے مولوی
 عبدالوہاب سے ایک دن اس نے اقرار کیا کہ خدا شناسی کے اس میلہ میں میں بھی شریک تھا کہتا تھا کہ
 بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو
 ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک چٹا دلا آدمی میلے کپڑے، یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ
 کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے۔ لیکن تقریر سننے کے بعد اپنے تاثر کا اظہار
 مولوی عبدالوہاب کے سامنے اسی نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

”ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔“ مسئلہ میلہ خدا شناسی

مگر اب اس ہمدانی ہی رد و ادا میں عام پادریوں (خواہ گورے ہوں یا کالے) کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت والا کی تقریر کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ

”پادریوں کی یہ حالت کہ ششدر و بے حس و حرکت۔“ مسئلہ میلہ

یا خاص پادری نولس صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”قصہ کوتاہ مولوی محمد قاسم صاحب کی خوش بیانی اور پادری صاحب کی افسردگی قابل دید تھی۔“ مسئلہ میلہ خدا شناسی

اور اس کا تجربہ تو عموماً کیا گیا کہ اختتامِ وقت کو یہاں نہ بنا کر عموماً اکثر تقریروں میں پادریوں نے کوشش کی کہ جس طرح ممکن ہو، سیدنا امام الکبیر کی تقریروں کو مکمل ہونے نہ دیا جائے۔ پادری نولس نے تو یہ حد کر دی کہ پہلے میلے کے پہلے اجلاس ہی میں آپ کے رنگ و ٹھٹنگ کو دیکھ کر وہ اس دیدہ دلیری پر اتر آیا کہ دوسرے دن کا اجلاس، جب شروع ہوا، ”سیدنا امام الکبیر نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ ”پادری صاحب کے ذمہ ہمارے کل کے اعتراض باقی ہیں، بغرض اتمامِ کلام ان کا جواب اول چاہئے۔“

تو اتہائی بے شری سے کام لیتے ہوئے، بغیر کسی حجاب کے لکھا ہے کہ پادری نولس نے جواب میں کہا کہ

”کل کی بات کل کے ساتھ گئی۔“ مسئلہ

پادری صاحب کی اس سینہ زدہ کہنے، یا منہ زدہ پر لکھا ہے کہ مسلمانوں میں کافی بوکی پیدا ہو گئی تھی،

اسی پادری نے یہ بھی اسی موقع پر کہا تھا کہ تقدیر کے مسئلے کو پادری چھڑتے ہیں جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں رہتی، پادری نولس نے لاچار ہو کر یہ باتیں شروع کی تھیں، کہتا تھا کہ پر اس شخص دینی سیدنا امام الکبیر سے ایسا ان سب کو اڑایا کہ پتہ نہ لگنے دیا۔ ۱۲

لیکن سیدنا امام اگبیر نے مجمع کو تھاما اور اعلان کیا کہ

”صاحبو! کل کے ہمارے اعتراضوں کا جواب پادری صاحب عنایت نہیں فرماتے ہم کو پادری صاحب کے انصاف سے یہ توقع دتھی مگر جب نہیں مانتے تو کیا کچھ برمجیری ہم صبر کرتے ہیں اور تازہ گفتگو کی اجازت دیتے ہیں“ ملا میلہ خدا شناسی

بجائے مباحثہ و مناظرہ کے میلہ کو حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا جائے سیدنا امام اگبیر کے اس نقطہ نظر کی تائید آپ کے اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے۔

اس طرح دوسرے میلے کے موقع پر بھی حالانکہ حضرت والا کی طرف سے کہتے والوں نے لاکھ

کہا کہ

”دچارمنٹ چار بجے میں باقی ہیں، ان ہی میں ہم کچھ کہہ لیں گے“

مگر بیان کیا ہے کہ

”پادریوں نے ایک نہ سنی“

اور جلسہ سے اٹھ کر جانے لگے اور اس بے ترتیبی سے اٹھ کر بھاگے کہ بقول صاحب ردوا۔

”سراسر اسکی اور پریشانی میں جو رنج پہنانی کے باعث پادریوں کو لاحق تھی، پادریوں

اپنی بعض کتابیں بھی دیں چھوڑ گئے، ان کے اٹھانے کا بھی ان کو ہوش نہ تھا“ مباحثہ

اسی موقع پر سیدنا امام اگبیر نے جب اعلان کیا کہ پادری نہیں ٹھہرے ہیں، تو نہ ٹھہرے ہیں۔ ہم اپنی

طرف سے بیان کئے دیتے ہیں، تو اپنی تہذیب کا یہ نمہ پادریوں نے پیش کیا کہ

”بغرض رہی جلسہ شد کرنا شروع کر دیا“

یہ حال عیسائیوں کا جو عنصر میلہ میں شدید تھا، اس پر تو سیدنا امام اگبیر کی تقریروں کا جو اثر مرتب

ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ مذکورہ بالا مثالی واقعات سے ہو سکتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں جیسے پادری تھے، ظاہر ہے کہ یہی حیثیت ہندوؤں کی بھی اس شہی

میلہ میں تھی، بلکہ آپ سن چکے کہ یہ ہندو مسلمانوں سے الگ ہوتے ہوئے ہندو دھرم کے نامزدوں کا

یہ طبقہ تقریباً عیسائیوں ہی میں مدغم و مندمج ہو چکا تھا۔ لیکن عام ہندوؤں کے تاثرات آپ کی تقریروں سے عیسائیوں کے تاثرات و احساسات سے اس درجہ مختلف ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی کمان سے جو ترسکل رہے تھے، وہ مخالف طبقات میں ان ہی کے تاثری نتائج میں اختلاف اور اتنا شدید اختلاف کیسے پیدا ہو گیا تھا۔

سیدنا امام الکبیر کی تقریروں کا جو رنگ تھا، اسے بھی دیکھ چکے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں عیسائیوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی دل دہی، یا جانب داری کی کوشش کی جاتی تھی، تقریروں کا خلاصہ ان مدد اوروں میں آج بھی موجود ہے، جو بھی ان کو پڑھے گا، وہ اس نتیجہ تک پہنچے گا، اور یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ اس قسم کی وقتی سخن ساز یوں سے سیدنا امام الکبیر کی تقریریں قطعاً منزہ اور پاک ہیں۔ اعتراضات آپ نے کئے، تو وہ دونوں ہی پر کئے، اور ترجیحی پہلوؤں کی طرف جواشائے آپ کی تقریروں میں کئے گئے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی کسی ایک فرقہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ جس مذہب میں اس نوعیت کی جو چیز پائی جاتی ہے۔ جہاں جہاں اس کے ذکر کا موقع ملا ہے، انتہائی فرائح چشمیوں کے ساتھ ان کا اقرار کیا گیا ہے۔ نمونہ کی مثالیں پیش بھی کر چکا ہوں۔

میں شریک ہونے والے عام ہندوؤں کے ان عجیب و غریب تاثرات کی تفصیل تو آگے آ رہی ہے، مگر ان کے ذکر سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ دو مختلف مذاہب کے ماننے والے فرقوں کے تاثرات کے اس اختلاف کی آخر توجیہ کیا کی جائے، خود ان تقریروں اور جو کچھ ان تقریروں میں بیان کیا جاتا تھا، اس میں تو اثر پذیروں کے اس اختلاف کا سراغ نہیں ملتا، پھر کیا سمجھا جائے؟

کیا حضرت والا کے باطنی تصرفات کا نتیجہ اس کو قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں جن معلومات کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی توجیہ بھی ناقابل لحاظ نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ اپنے وقت میں باطنی تصرفات و کرامات کی مرکزی ہستی حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت جس کے متعلق یہ ہوا کہ ولایت کی باطنی نعمت سے نوجوانی ہی میں

سرفراز ہو چکے تھے۔ اسی سے اس باطنی نعمت کے ثمرات و آثار کا نظور آخر محل تعجب کیوں ہوا صحیح طور پر تو یاد نہیں رہا کہ براہ راست حضرت شیخ الہند سے خاکسار نے سنا تھا یا بالواسطہ یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ ایک خاص موقع پر سیدنا امام الکبیر کو خدا شناسی کے مسئلے کی ان ہی تقریروں میں سے کسی تقریر میں اپنے قلب کے اس لاہوتی رخ سے کام لینا پڑا تھا۔ بلکہ ان ہی روز دادوں میں

۱۷ جہاں تک یاد پڑتا ہے، باتوں کی نوعیت یہ بیان کی گئی تھی، کہ بے بس ہو کر پادری نوٹس نے قہر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا اور کہنے لگے کہ تقدیر کی تعلیم دینے کی وجہ سے اسلام اپنی انانیت کو کھو چکا ہے، جو کچھ تقدیر میں لکھا یا چکا ہے۔ بندہ اسی کے کرنے پر جربہ مجہد میں، تو دین کی تبلیغ و تکلیف کا فائدہ ہی کیا باقی رہا، پہلے سال کی دسویں اس کا ذکر کیا بھی گیا ہو شاید کسی موقع پر خود میں نے بھی اس کی طرف کہیں اشارہ کیا ہے، لکھا ہے کہ نوٹس صاحب نے جب تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑا تو سیدنا امام الکبیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ پادری صاحبوں کا دستور ہے کہ جب کچھ میں نہیں ہوتی تو مسئلہ تقدیر کو لئے بیٹھتے ہیں یہ آخری چال اور آخری تدبیر ان صاحبوں کی ہوتی ہے، پادری صاحب کی منکریت کی پریشانی ہے جو اس مسئلہ کی قربت آئی۔ اسی کے بعد آپ نے کہا کہ مگر بنام خدا ہم بھی اشد انکار کا جواب شافی دیتے ہیں، علامہ صاحب مدد دینے آپ کی اس تقریر کو نقل بھی کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند سے جو روایت اس باب میں مجھ تک پہنچی ہے وہ یہی ہے کہ ہم جو آستانہ دیتے ہیں، ایسے کہتے ہوئے کہ جب حضرت الامستاد نے تقریر شروع کی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک گروہ مسئلہ کی کشتی چل جاتی ہے، ایک لارنچل عقدہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ خواص ہی نہیں، عوام میں عوام کا جو مجمع تھا، ہر ایک مطمئن نظر آتا تھا۔ اختتام جلسہ کے بعد میں نے اور مولوی احمد حسن امروہوی نے آپس میں کہا کہ آج حضرت نے عجیب و غریب تقریر کی ہے اس کو فوراً قلم بند کر لینا چاہئے، جب ہم دونوں قلم بند کرنے کے لئے بیٹھے، امداد آجس میں گفتگو ہوئے لگتی، تو پرستہ حیلہ کہ بعض یہ سہلو اس تقریر کے بعد بھی ہم لوگوں کی کچھ چیزیں گئے۔ حضرت الامستاد کو اس کا ذکر ہم لوگوں نے کیا، اور عرض کیا کہ جلسہ میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قسم کی کوئی تعجبیگی اس مسئلہ کے حقائق باقی نہ رہی، مگر بحث کے بعد بعض الجھنیں نظر آتی ہیں کہ ہنوز باقی ہیں۔ اس پر کہتے ہیں کہ سیدنا امام الکبیر نے فرمایا تھا کہ تقریر میں عام طور پر ہی کیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی کچھ پروہ منطبق ہو، لیکن بضرورت کبھی یہ بھی کر دیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی کچھ ہی کو تقریر کے مطابق بتایا جاتا ہے، گو یا اشارہ کیا گیا کہ جلسہ میں شاید یہی قسم کے تعریف سے کام لیا گیا تھا، اس مسئلہ میں دل چسپ طبع و صہ میں اس کا اسی روز ادب میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ اختتام جلسہ کے بعد ایک صاحب جو در نامہ وحد کے نام، بشہور تھے وہ پادری نوٹس کے جلسہ میں پہنچے، شاید پہلے سے دونوں میں جان پہچان تھی، کیونکہ مرزا صاحب رد نصاریٰ کی ہم کے حصد دلوں میں تھے۔ پھر حال پادری نوٹس سے مرزا صاحب نے کہا کہ تقدیر کو کثرت تو تو بات میں موجود ہے، پھر آپ نے اسلام ہی کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کر کے ایسا احسن کیا، نوٹس صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں دو فرقے ہیں، میرا تعلق عیسائیوں کے اس فرقہ سے ہے جو تقدیر کا منکر ہے مسئلہ فطریہ کے موافق ہر شے کو ہر کیا تھا، ایک تو بات کیا خدا کا اعتقاد جس مذہب میں بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

شاہ جہاں پر کے منصف صاحب کا جو قصہ نقل کیا گیا ہے۔۔۔ اور اعلیٰ منصف صاحب مسلمان تھے، یا ہندو۔۔۔ پہلے کے کسی جلسہ میں وہ بھی آکر شریک ہوئے۔ اتفاقاً اس وقت گفتگو انجیل کے اسی فقرے کے متعلق ہو رہی تھی، جس میں مسلمانوں کے مولوی تو دعویٰ تھے کہ یہ جعلی فقرہ ہے، بعد کو پڑھا دیا گیا ہے، یہ تو میں وہ خود انجیل کے اس مطبوعہ نسخہ کو پیش کر رہے تھے، جن کے حاشیہ میں چھاپنے والے پادریوں کی طرف سے لکھ دیا گیا تھا کہ

”یہ اتفاقاً کسی قدیم نسخہ میں نہیں پائے جاتے“

خود پادری نوٹس صاحب نے بھی اقرار کر لیا تھا کہ

”میشنگ یہ فقرہ نائیب ہے، اور جو کچھ پادریاں مرزا پورے نے حاشیہ پر لکھا، صحیح و درست

ہے۔“

اسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، ایسا دہشتہ جس میں جعلی فقرہ ثابت ہو جائے کہ باہر سے ملا دیا گیا ہے بطور مثال کے اسی کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر فرماتے تھے، مگر تمنا ہے کہ مقدمات دنیاوی ہیں تو ایسی دستاویزیں قابل اعتبار نہ رہیں، حالانکہ متاع دنیا اہل عقل کے نزدیک

”چندان قابل اہتمام نہیں، اور مقدمہ دینی میں ایسی دستاویز محدث لائق اعتبار ہو جائے۔“

لکھا ہے کہ یہ فقرہ زبان مبارک سے جس وقت نکل رہا تھا، تو دیکھا گیا کہ ہزاروں انسانوں کے اس مجمع میں منصف صاحب جو بیٹھے ہوئے تھے سیدنا الامام الکبیر ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، پادری نوٹس کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ

”اس مقدمہ میں ہمارے آپ کے حکم منصف صاحب ہی رہے، اور ان کے مقدمات اور جھگڑے بھی یہی فیصلہ کرتے ہیں۔“

صرف یہی نہیں بلکہ براہ راست منصف صاحب کی طرف رخ کر کے یہ بھی ارشاد فرمایا جا رہا تھا کہ

”اگر شہنشاہی پایا جاتا ہے کسی دیکھی رنگ میں مسئلہ فرمایا تا اس کے لئے ناگزیر ہے۔“

۱۲

”کیوں نصف صاحب آپ ہی فرمایا۔ اگر کوئی دستاویز جلی آپ کے یہاں آئے، اور اس کا جملہ اٹھل جائے، خود مدعی اقرار جمل کرے یا اللہ کسی طریقہ سے اس کا جملہ ہرانا بہت پر پائے تو قانون سرکاری اس کی نسبت کیا ہے اور آپ اس مقدمہ میں کیا فیصلہ فرمائیے؟“

غریب نصف جبران تھا کہ اس سارے مجمع میں کسی سابقہ معرفت کے بغیر میری منصفی اور میری شخصیت کا علم ان صاحب کو کیسے ہو گیا۔ لکھا ہے، کہ واپسی کے بعد شاہ جہاں پورہ پہنچ کر نصف صاحب لوگوں سے کہتے تھے کہ

”میں ان کو (سیدنا الامام الکبیر کو) نہیں جانتا تھا، اور وہ مجھ کو نہیں جانتے تھے۔ خدا جانے انہوں نے مجھ کو کاشے سے پہچان لیا جو بار بار میری طرف مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ نصف صاحب آپ ہمارے حکم رہے آپ امدوں کے مقدمے فیصلہ کرتے ہیں، ہمارا مقدمہ بھی آپ ہی فیصلہ کیجئے“ ۱۷

پھر ابوں والے مولانا محمد علی صاحب سے بھی نصف صاحب کی حب ملاقات ہوئی، تو ان سے بھی اپنے تعجب کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

”مجھ کو بڑا تعجب ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اور میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، پھر نہ معلوم انہوں نے کس طرح مجھ کو پہچان لیا“ ۱۸

بہر حال نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نصف صاحب ہندو تھے یا مسلمان، لیکن منقہ کی کتاب کے نصف پانچویں پر انعام پانے والے پادری اسکاٹ صاحب تو قلعہ مسلمان نہ تھے عیسائی، اور عیسائیوں کے پادری تھے، حضرت والا کی تقریروں سے مشافہ ہو کر ایک دفعہ نہیں، بلکہ روز دراز سے معلوم ہوتا ہے کہ بار بار مختلف برقعوں پر کہتے پھرتے تھے کہ

”مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) مولوی نہیں صرف مولوی ہیں“ ۱۹

کھجا جائے، تو ان الفاظ میں گویا حضرت والا کے اسی باطنی پہلو کا اعتراف پرشیدہ نظر آتا ہے، اور کھتا ہے ہے کہ مٹاتے ہوئے جس نے اپنے آپ کو اس حد تک مٹا دیا ہو کہ تقریر سے پہلے اپنے آپ کو ان

افغانا میں ردِ مشناس کر رہا ہو کہ

”میری خستہ حالی پر نظر کیجئے“ اس سے بھی کیا کم کہ مجھ کو بھی بمنزلہ ایک بھنگی سمجھئے“

ادھر کہ رہا ہو کہ

”مشادی کرنے والے کا بھنگی ہونا حکامِ دنیا کے احکام کے قبول کرنے اور تسلیم کرنے میں

مانع نہیں اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ مشانے والا بھنگی ہے، غریب ہے، یا امیر غلام لوگ ہوں“

یا نواب، بھنگی کی زبان سے احکامِ پادشاہی سن کر سر نیازِ خم کرتے ہیں“ مثلاً مباحثہ

ذاتِ وصفات کے افتاء میں جس کی کوشش اس نوبت تک پہنچ چکی ہو، کہ پادری نوٹس جو حضرت کے علم و

بیان سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا، مدلل تھا، اس نے جب آپ سے آپ کا نام و نشان دریافت کیا تو لکھا

ہے کہ اس وقت بھی یہی بتایا گیا کہ خورشید حسین نام ہے ضلع سہارنپور کا رہنے والا ہوں بلکہ میلہ خدا شناسی

جو نہیں جانتے ہیں ان سے کیا کہئے؟ لیکن راہ کے چلنے والے تو یہی کہتے چلے آ رہے ہیں کہ جو واقعی

”عبداللہ“ بن جاتا ہے، دیکھا جی گیا ہے کہ ”گفتہ“ اور ”گفتہ“ اس کے لئے اجر نقد بنا ہوا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ بد اعتقادی کے اس زمانہ میں اس کو خواہ مخواہ فراموش اعتقادی قرار دینے پر اگر اصرار

کیا جائے، تو یوں بھی ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو جو گویا تاریخ میں مسلمانوں کے مقابل میں ”غذہ“

مباحثہ کے لئے پہلی دفعہ خدا شناسی کے اس میلہ میں لا کر کھڑے کئے گئے تھے۔ پہلے سے ٹاسا، اغراض

اس میلے کے پیچھے ان بھی لیا جائے کہ خورشید وہ نہ ہوں۔ پھر بھی عام حالات میں ہندو مذہب، اور

ہندوؤں کے پیشواؤں کے متعلق جن خیالات کے اظہار کی توقع مسلمانوں کے عام مولویوں سے پانچویں

کا طبقہ کر سکتا تھا، اور واقعہ یہی ہے، کہ مسیدنا اللہ الام اکلیر کے رد کے لئے جانے میں اگر خدا خواستہ کامیابی

ہو جاتی، اور اس میلے میں مولانا دبیسیہ کالے پادری، وہی جس نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مشان

گراہی میں اپنی یاد گوئیوں، اور ہرزہ سر لہوں بے مسلمانوں کے قلوب کو خواہ مخواہ ازیت، پیچائی تھی کچھ اسی

طرح کے ہلکے پھلکے، خام کار، نا تجربہ کار مولوی اور حرادھر سے اکٹھے ہو جاتے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کے

پادریوں کو اس پیر پوری نہ ہوتی، خصوصاً ایک ایسے زمانے میں جب پنڈت دیا نند سرسوتی کے طرزِ عمل سے

زمین بھی تیار ہو چکی تھی اور عرض کر چکا ہوں کہ نئی قائم ہونے والی حکومت کے بعد کتابیں بھی ہندو مذہب کی تنقید و اعتراض کے متعلق شائع ہو چکی تھیں، اور شمال و جنوب دونوں علاقوں میں مسلمانوں میں بولی جانے والی زبانوں میں کسی شیخ سلیم نامی صاحب کی "کتھا سلونی" یعنی عکبویہ کون دھرم ہے، ترجیح بندہ والی نظم اور کئی زبان میں مسند تخلص رکھنے والے کسی گنام شاعر والی مسدس جس میں ٹیپ کا شعر ہے

یاد ہر دے گز تھیں ہم کو بتاؤ برہمن
کاپے کو بھرتے ہرانا حق پوچھتی تھر تھی

عام طور پر ملک کے طول و عرض میں پھیلائی جا چکی تھی، چاہے تو کہہ سکتے ہیں، کہ کافی ہتھیار مسلمانوں میں گویا تقسیم ہو چکے تھے۔ ان حالات میں کیسے کہا جاسکتا ہے، ان باتوں سے ہوتے ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت خدا شناسی کے اس میلے میں نہ آتی۔ آخر مولانا دہلوی مسلمانوں کو جب وہ سب کچھ سنا سکا تھا، جو اس نے سنایا، تو ان سوچوں کو بھی کون روک سکتا تھا، اگر ہندوؤں کو یہی سب کچھ سنانے لگتے، جس کے سننے کی توقع پادری کر سکتے تھے۔

اب یہ خدا کی طرف سے بات تھی، کہ رد کرنے کی تدبیروں کے باوجود سیدنا امام الکبیر رک نہ سکے، اور ایک ہی میلے میں نہیں، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں بھی عملاً آپ شریک ہوئے، شریک ہوئے کیا معنی، سچی بات تو یہ ہے، کہ اول سے آخر تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا میلہ ہوا، یاد دہرا، گویا بگھنا چاہئے، دونوں ہی میں آپ ہی آپ تھے، جو کچھ کہا، آپ ہی نے کہا، اور جو کچھ کیا، آپ ہی نے کیا، اس سلسلے میں اور تو جو کچھ آپ نے کہا، اس کو وہ تو خیر بجائے خود ہے، خاص کر ہندوؤں کے دین اور دینی پیشواؤں کے ذکر کے حوالہ قریب آئے، ان میں خود سوچنا چاہئے، اپنے اس کلی عقیدے کو پیش کرتے ہوئے کہ

"ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اور ادیان و مذاہب اصل سے غلط ہیں، دین آسمانی نہیں ہیں"

جو یہ اعلان کر رہا ہو کہ

"ہر ہندو اس کی نسبت اگرچہ ہم یقیناً نہیں کہہ سکتے، کہ اصل سے یہ دین بھی آسمانی ہے"

لیکن جیسے یقیناً نہیں کہہ سکتے، ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا، کہ

”مگر تھنای یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین اصل سے جعلی ہے۔ خدا کی طرف سے نہیں آیا ۛ

اسی کے بعد ان قرآنی شواہد کو پیش کرتے ہوئے، جن میں اطلاع دی گئی ہے، کہ خدائی نمائندوں کے کسی قوم و ملت کو ان کے پیدا کرنے والے نے محروم نہیں رکھا، پھر اے مجمع میں یہ کہہ رہا ہوں کہ
”پھر یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ اس ولایت ہندوستان میں جو ایک عزیز و طویل ولایت ہے کوئی
یاد ہی نہ پہنچا ۛ

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ اضافہ

”کیا عجیب ہے کہ جس کو ہندو صاحب ادوار کہتے ہیں، اپنے زمانہ کے نبی یا ولی یا نائب
نبی ہوں ۛ

اور اسی کے ساتھ قرآنی آیت جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن میں بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ایسے بھی
انبیاء اور رسل ہیں جن کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، یعنی منہم من قصصنا علیہم و منہم من لم نقصص علیہم کو تلاوت
کر کے اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ فرما رہا ہو کہ

”کیا عجیب ہے کہ انبیاء ہندوستان بھی ان ہی نبیوں میں سے ہوں، جنی کا تذکرہ آپ سے
(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) نہیں کیا گیا ۛ

پھر یہ بھی نہیں، بلکہ جیسے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقدیس و تنزیہ کی ذمہ داری مسلمانوں
کے سپرد کی گئی، غلط عیسائیت یا کشتیانی کی بدلت، یا غلط یہودیت کی راہ سے حضرت مسیح علیہ السلام کی
طرف ایسی باتیں جو منسوب ہو گئی ہیں جن کا اعتبار ان کی برگزیدہ ذات کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، ان
آلودگیوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کو پاک کر کے دنیا میں پیش کرنا، یہ مسلمانوں کا دینی فرض ہے،
تھیک، اسی طرح ہندو مذہب کے جن پیشواؤں کی طرف نامسزایاتیں منسوب ہو گئی ہیں، ان سے تزکیہ و تطہیر کے
فرض کو بھی خواہی اور احتیازی جذبات کے ساتھ ان الفاظ میں اٹا کر رہا ہو کہ

”جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دعویٰ خدائی تھا، اُسے نے منسوب کر دیا ہے، اور دلائل
عقلی و نقلی اس کے خلاف ہیں، اسی طرح یہ عجیب ہے کہ سری کرشن اور سری رام چندر کی طرف بھی یہ دعویٰ

(خدائی وغیرہ کا، بددروغ منسوب کر دیا گیا ہو۔“

اور جیسے بنی اسرائیل کے بعض انبیاء حضرت داؤد و حضرت لوط علیہما السلام کی طرف یہود نے ناگفتہ بہ باتیں منسوب کی ہیں لیکن ان سے ان بزرگوں کا تبریہ، و تنزیہ مسلمانوں کا دینی عقیدہ ہے، اسی طرح ہندو مذہب کے جی پیشواؤں کی طرف منسوب کئے گئے والوں نے کچھ اسی قسم کی نکو بیدہ، ناگفتہ بہ باتیں منسوب کر دی ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے ابو عیسیٰ پادریوں کو یہ سنا رہا ہو کہ

”کیا عجب ہے کہ سری کرشن، سری رام چندر بھی ان عیوب مذکورہ سے سیرا ہوں اور میں نے

ان کے ذمے یہ تہمت (زنا و سرقہ) لگا دی ہو؟“ ملا سباحہ

آج سننے والے سیدنا امام الکبیر کی ان تقریروں کے نہیں ہیں، اور نہیں کہا جاسکتا کہ کچھ ان مواقع پر آپ نے فرمایا تھا، مجسہ اس کے ظلم بند کرنے میں رد و اد کے مرتب کرتے والے کا یہاب بھی ہوئے ہیں لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ اس باب میں جو کچھ بھی فرمایا جا رہا تھا، کسی وقتی مصلحت کے زیر اثر نہیں کہا جا رہا تھا کیونکہ واقعاً اور جو کچھ ان میلوں میں گذرا ان کو ایک خاص نقطہ نظر سے مرتب و مربوط کرنے کے بعد آج خواہ جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہوں، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ ایسی کوئی شہادت میرے پاس نہیں جس کی بنیاد پر دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ پورے ظہر پر نہ بھی کسی نہ کسی حد تک سیدنا امام الکبیر کو بھی خدا شناسی کے ان میلوں کے عقیب حرکات کا جھکا سراغ آج مل رہا ہے اندازہ ہو گیا تھا، بلکہ جہاں تک قرآن و حالات کا اقتدار ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان سے آپ قطعاً خالی الذہن تھے، ماسوا اس کے کچھ اسی میلے کی تقریروں ہی کی حد تک آپ کے مذکورہ بالا خیالات محدود نہیں ہیں۔ آپ کی دوسری کتابوں میں بھی یہی باتیں مختلف تعبیروں میں ملتی ہیں۔ وہی کتاب جس کا نام جواب ترکی بر ترکی ہے، مختلف حوالے اس کتاب کے گذرے بھی ہیں۔ اس کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا تو یہی ہے کہ حضرت والا کے تلمیذ سید مولانا عبدالحی صاحب کی تصنیف ہے، لیکن عموماً مشہور یہی ہے کہ اور مصنف امام نے اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اظہار بھی دی ہے کہ

”مولانا سیدنا امام الکبیر نے کچھ بیان فرمایا، اور کچھ تحریر شروع کی، جس کو مولوی

عبدالعلی صاحب نے بطرز جواب لکھا، اور نام ”جواب ترکی بہ ترکی“ رکھا، ۲۷
 مطلب جس کا یہی ہے، کہ ترمیم نہ ہی، لیکن مضموناً یہ کتاب، درحقیقت خود حضرت دالائی کی ہے، خود ای کا
 میں یہ عبارت جریانی جاتی ہے، یعنی
 ”مزید تحقیق کہ مکتوب دوم نمبر اول قاسم العلوم پر حوالہ کر کے یہ عرض کرتا ہوں ۲۹ جواب
 ترکی بہ ترکی

جو جانتے ہیں کہ ”قاسم العلوم“ حضرت دالا کے چند خاص کتابیں اور مقالات کے مجموعہ کا نام ہے،
 وہ اگر یہ سمجھیں کہ قاسم العلوم ہی کے مصنف کے ظم یا زبان سے یہ نکلا ہوا فقرہ ہے، تو ایسا یاد کرانے کی
 یہ کافی وجہ ہے، کچھ بھی ہو، تاہم حال اب بھی کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا ہے، کہ
 ”بایا و حضرت حجۃ الاسلام دالسلیم جناب مولانا محمد قاسم صاحب یانی دالالعلوم دیوبند
 لکھے گئے۔“

نظر بوجہ بالا اتنی بات مسلم ہے، کہ کتاب کسی نے لکھی ہو، لیکن اصل مضامین کی حد تک، اس کتاب میں جو کچھ
 ہے، وہ سب حضرت دالائی کے براہ راست متعدد افکار و مسلمات ہیں۔ اسی کی تعبیر ان الفاظ میں فرماتے
 ہوئے کہ

”ہم نے اب تک نہ دیکھا کہ کوئی لکھا ہے، نہ پیشواؤں میں نہ ہندو کو لکھا ہے، اور برا کہیں تو کیوں کہیں“

آئے جو یہ ارشاد ہوا ہے، کہ ہندو دھرم کے

”پیشواؤں کو بر لکھنے تو ان کا کیا تصور؟“

یہ کتنی حقول ادا انصاف کی بات ہے۔ فرض کیجئے کہ موجودہ نسلوں سے ان کی مسلمانوں کو تکلیف و اذیت
 بھی پہنچے، لیکن اس میں ان کے گزشتہ پیشواؤں اور بزرگوں کا کیا تصور ہے، کہ موجودہ نسلوں کے اعمال
 کا بدلہ لگدڑے ہوئے بے تصور لوگوں سے لیا جائے۔ کاشیں اور سری تو میں بھی انصاف و عدل کے اس
 نظریہ کی رعایت کریں، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے ان کو کوئی شکایت پیدا ہو، تو وہ بھی اپنی تکذیبی
 کو غصوں کریں کہ مسلمانوں کے بزرگوں سے ان کی قبروں سے، ان کے آثار سے انتقام لینے کا بھلا کیا مطلب

ہو سکتا ہے، چوٹ آپ کو پیڑ سے اگر لگی ہے، تو گھر کی کل سوس کا بھڑکنا خود ہی سوچئے کہاں تک انصاف کا، عقل کا انسانیت کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ اسی مقام میں نہیں، بلکہ اسی کتاب کے ابتدائی اوراق میں بھی اسی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، منشی اندر لال کو جتنے جواب ہیں یہ کتاب لکھی گئی ہے، بچھایا گیا ہے کہ ”تمہارے بڑوں کو سنائیں، تو ان بے چاروں کا کیا قصور؟“

اور ٹھیک جیسے میلہ کے جلسوں میں سری کرشن، اور سری رام چندر جی کے متعلق آپ نے فرمایا تھا، اسی کتاب میں بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”پھر یہ بھی خیال کر شاید اپنے زمانہ کے بزرگ ہوں اور جو حرکات ناشائستہ ان کی طرف منسوب ہیں، عجب نہیں غلطی تاریخ کی ہو؟“

صرف پیشواؤں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ ہندو دھرم کی اس اسی کتاب وید کا تذکرہ کر کے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

”ویدوں کو برا کہئے، تو کیا ضرورت، اور پھر یہ احتمال کہ شاید کوئی مضمون الہامی ہو، اور شرک وغیرہ امور باطلہ کی تعلیم جو اس میں درج ہے، کیا عجب ہے، از قسم تحریف ہو؟“

بہر حال ہندوؤں کے دینی پیشواؤں اور ان کی دینی کتاب وید کے متعلق جس کے عام احساسات کی نوعیت یہ ہو، سوچا جاسکتا ہے کہ اسی لئے جس وقت پہلے میں اپنے ان احساسات کو جو کم از کم پارہیوں کی توقعات کو بھی قطعاً خلاف تھے، آخر جس زمانہ میں یہ پھیلا یا جا رہا تھا کہ ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ جس زبان میں ہندوؤں کا مذہب ہے، یعنی سنسکرت، مسلمانوں کو اس زبان سے ابدی نفرت رہی ہے، یہ اور اسی قسم کی غلط فہمیوں سے لب ریز و محدود ماحول میں اچانک مسلمانوں کے ایک مسلم الثبوت، عالم باعمل کی زبان مبارک سے مذکورہ فقرے نکل کر کانٹوں سے جس وقت ٹکرا رہے ہوں گے، تو وقتی مصلحت کو تقاضوں کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہی واقعی آپ کے خیالات و احساسات تھے، قدرتِ غالب و لہجہ کا جو رنگ اور بیان میں نہ صرف قوت کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،

ایسی صورت میں نہ پارہیوں کے چہروں کی افسردگی، خوشگئی ہی محلِ تعجب ہو سکتی ہے، بلکہ پہلے میں علم ہندو

جو شریک تھے ان میں اس کے برعکس آثار کا مشاہدہ اگر کیا گیا تھا تو بھی کیلیہ کوئی اچھے کی بات ہو سکتی ہے؟ بلکہ اسی کے ساتھ انصاف کی بات یہی ہے کہ گودا شناسی کے ان دونوں نیلوں میں ہندوؤں یا ہندو مذہب کے نمائندے ہندوؤں کی طرف سے بعض اشتعال انگیز اقدامات ضرور ہوئے۔ پادریوں کے ساتھ متفقہ ان کا مل جانا، ملجانا کیا سنی؟ ان ہی میں مدغم ہو کر کھپ جانا، ہندوؤں کے متعدد فرقوں کا نام لے کر ہر فرقہ کی طرف سے نمائندگی کا مطالبہ پیش کر کے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش، رائے دہی کے مواقع میں عموماً پادریوں ہی کے ساتھ ان کا ہاتھ اٹھانا، یہ اور اسی قسم کے کام تو ان کی طرف سے بھی ایسے کئے جا رہے تھے جس سے متقابل پارٹی کے نمائندے مشتعل ہو سکتے تھے۔ سینڈالام اکبیر نے نشی پیارے لال سے بطور شکایت کے کہا بھی تھا کہ پادریوں کی طرف آپ لوگ ڈھل جاتے ہیں، ہندوؤں کے نمائندے جو کچھ کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آخر جلیہ کے ہتم موتی میاں صاحب سے بھی زبردیا گیا تھا اور ترش رو ہو کر بول اٹھے تھے کہ

”پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ بات سارازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔“ مٹ

کوئی مشہد نہیں کہ تنگ نظری اور تنگ نظری چاہتی تو اسی ترش روئی کو بڑھاتے ہوئے، نفرت اور دشمنی و عداوت تک پہنچا سکتی تھی، لیکن پہلی بات تو یہی تھی کہ جو کچھ بھی ہوتا تھا، ہندو مذہب کے نمائندوں کی طرف سے ہو رہا تھا، لیکن میلے میں عام ہندو جو شریک تھے، ان بے چاروں کو اس سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، پھر ان ہندوؤں یعنی ہندو مذہب کے دکھار کی طرف سے کرنے کی حد تک جو کچھ کیا گیا ہو، لیکن انہوں نے جو کچھ کہا، تقریر کی، یا تحریر پڑھی، اس میں یہی بات شاید نہیں کہی گئی، جس سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہوتی، اب غم اس کی وجہ یہ ہو کہ واقع میں ان کی تقریروں اور تحریروں میں کسی کوئی چیز بھی ہی نہیں، یا مسکرت آئینہ بھاشا والی زبان جو وہ استعمال کر رہے تھے، وہ پردہ پوش بن گئی۔

مگر برخلاف اس کے عیسائیوں کی طرف سے اول سے آخر تک وہی کیا گیا، اور وہی کہا گیا، جس سے نفرت و عداوت کی آگ قدرتا مسلمانوں میں بھڑکتی رہی، ان کی سینہ زد دیاں ہر ہر قدم پر اپنی برتری کا

اظهار اپنے قابوچی بننے پر اصرار، اپنی منہ زوریوں میں مسلمانوں کے پیغمبر ختمی مآب علیہ السلام کے متعلق کے متعلق جب ان کی طرف سے گندگیاں اچھالی جا چکی تھیں، تو اس کے بعد بات ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سوچ دیکھ کر پکایا گیا تھا، لیکن حالات کے قدرتی نتائج کا ظہور اگر اس شکل میں ہوا کہ گو مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی طرح ہندو بھی اس پہلے میں کھڑے ہوئے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے سب کچھ کرنے والے اور سب کچھ کہنے والے سیدنا امام الکبیر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ عیسائیوں ہی کو اپنا مد مقابل بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے اساسی کلیات کی تشریح کرتے ہوئے جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے، وہاں آپ نے ہندو مذہب کے بعض عقائد کا بھی تشبیہ ذکر کیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ دونوں سالوں کے یوں میں حقیقی نشانہ آپ کی تقریروں کا عیسائی ہی نظر آتے ہیں۔ یاد ہو گا کہ پہلے سال کے پہلے کا پہلا دن جب ختم ہوا اور مولویوں کو آپ نے پہلے میں گھوم گھوم کر تبلیغ کا حکم دیا، تو لکھا ہے، میں نے شاید پہلے بھی نقل کیا ہے کہ ”چنانچہ داعین (اسلام) نے جا کر علی الاعلان منادی اسلام و ابطال عیسائیت کو مینا کرنا شروع کیا۔“

ابطال کے کام کو عیسائیت ہی کی حد تک کیوں محدود رکھا گیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ ہندوؤں کی طرف رخ مولویوں کی تقریروں کا نہ تھا۔ نیز اس قسم کے واقعات جن کا تذکرہ ان ردودوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً محی الدین پشادری نامی ایک کالے پادری نے کسی ریاض الدین نامی شخص کی کتاب کا حوالہ پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ حضرت مسیحؑ میں ابوہریرہ کی شان پائی جاتی تھی، یہی اسلامی عقیدہ ہے، ریاض الدین ردی نے یہی لکھا ہے، جو مسلمانوں کے معتبر پیشواؤں میں تھے، سیدنا امام الکبیر نے اس کے جواب میں دوسری باتوں کے ساتھ اسی کالے پادری کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

”آپ بھی تو محی الدین پشادری ہیں، آپ کی شکل و صورت مسلمانوں کی سی ہے، نیچی ڈاڑھی

کرتہ پہنے ہوئے ہیں، نام بھی مسلمانوں کا سا ہے۔“

جس سے اس صحیفہ ہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، جو سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں پادریوں کے اقوال و اعمال سے طبعاً پیدا ہو گئی تھی اور جیسا کہ کہتے ہیں، 'چودہ کی داری میں تنکے کی تلاش کرنا ہے' ہم ان عیسائی پادریوں ہی کو کہتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا نشانہ وہ بھی اپنے آپ ہی کو قرار دے رہے ہوئے تھے، ایک موقع پر اس کا تذکرہ فرماتے ہوئے، کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات پاک کو مخلوقات سے کیا نسبت؟ جب دو مخلوقوں، بلکہ دو آدمیوں کا حال یہ ہے کہ پادری صاحب کو کوئی اگر چہا کہہ دے تو آپ سے باہر ہو جائیں، حالانکہ پادری صاحب اور چار میں کیا فرق ہے۔ یہ بھی مخلوق، وہ بھی مخلوق، وہ بھی انسان یہ بھی انسان، ان کے پاس بھی دو آنکھیں ایک ناک اور دو کان تو اس کے پاس بھی یہی سب کچھ، حالانکہ یہ ایک باطل پرستہ تمثیلی بات تھی، لیکن لکھا ہے کہ یہی کالے پادری صاحب محی الدین شاہ پادری کھڑے ہو کر سیدنا الامام الکبیر کو براہ راست مخاطب بناتے ہوئے چلائے گئے کہ

”آپ نے کل بھی بعض کلمات سخت کہے تھے۔ آج بھی اب آپ نے بعض کلمات

سخت بیان کئے“ ملے مباحث

یعنی کل انجیل کے الحاقی فقرے کو نجاست سے تشبیہ دی، آج پادری کو چار سے تشبیہ دی گئی، لکھا ہے کہ حیرن چہیں ہو کر اس نے سیدنا الامام الکبیر کو خطاب کر کے یہ بھی کہا کہ

”ہم تمہارے سن و سال کا لحاظ کرتے ہیں“

بہر حال عیسائی جیسی کہتے تھے، ان دو دادوں سے سلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ویسی نہیں، تو کچھ نہ کچھ اس جیسی بات کہیں کہیں ان کو سنائی دی جاتی تھی، لیکن اسی میدان مباحثہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں حالانکہ ہندو بھی صرف آراء تھے، اور آپ دیکھ چکے کہ کرنے کی حد تک کافی اشتعال انگیز اقدامات ان کی طرف سے بھی سلسل ہوتے رہے، لیکن ان کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کا رویہ اول سے آخر تک دونوں ہی میلوں میں، میلوں کے ہر اجلاس میں، اجلاسوں کا اند بھی، اور ان سے باہر بھی کچھ ایسا رہا، کہ شاید صلح و غصہ، درگزر کے سوا، ہم آپ کے اس رویہ اور روش کو کو یا اور کچھ نہیں کہہ سکتے، کہنے والا ہے، تو کہہ سکتا ہے، کہ ان دونوں متقابل فرقوں میں سے ایک کے ساتھ یعنی عیسائیوں کے ساتھ

آپ کا جو طرز عمل تھا، جیسے وہ قرآنی حکم

جزاء سنۃ سنۃ مثلھا | برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔

کی تعین کی شکل بھی، اسی طرح قرآن میں اسی کے بعد قانون کے دوسرے پہلو کی طرف

ضمن عفو واصلح فلجرا علی اللہ | اور جو عفو وصلاح کی بات کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

کے الفاظ سے جو اشارہ کیا گیا ہے اس کا عملی تجربہ گویا اس سلوک سے کرایا جا رہا تھا جو ہندوؤں کے ساتھ

کر کے دکھایا جا رہا تھا، قرآنی قانون کے اسی دوسرے پہلو کا ثمرہ قرآن ہی میں جو یہ بتایا گیا ہے، یعنی

اسی پہلو کی تعبیر

ادفع بالتیھی احسن | سب سے زیادہ بھلے طریقہ سے جواب دو

سے فرماتے ہوئے، اطلاع دی گئی ہے کہ

فاذا الذی بینک و بینک عد اوقۃ | تو اپنا تک وہ کہ تم میں اور اس میں عداوت تھی مٹا لیں

کانہ ولی حمیم | دوست ہو جائے گا۔

گویا ذمہ داری لی گئی ہے کہ مدافعت بالحقنی، پر ہمہ سال ہی نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا، انسانی نفسیات کو

ڈھالنے والے نے اسی سانچہ میں ڈھالا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سیدنا امام الکبیر کے خطبات اور تقریروں کے تاخیری نتائج ان

دو دنوں قیوم پر قطعاً متخالف رنگ میں اگر نمایاں ہو رہے تھے، تو آپ خود ہی سوچئے، مگر اس کے سوا،

دیکھنے والے اور دیکھتے کیا، دوسرے غلطیوں میں چاہئے تو اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں، کہ خدا شناسی

کے ان سیلوں کو قائم کرنے والوں نے خواہ جس مقصد اور نیت سے قائم کیا ہو، لیکن سیدنا امام الکبیر نے

جیسا کہ اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا تھا۔ اسی طرح مذکورہ بالا قرآنی قانون کے ان دنوں

پہلوؤں کی عملی تجربہ گاہوں کا قالب بھی ان ہی سیلوں نے آپ کی بدولت اختیار کر لیا تھا۔ اب خواہ اسباب

کچھ ہی ہوں، باطنی تصرفات کا نتیجہ سمجھا جائے، یا خلاف توقع ہندو دھرم اور ہندو دھرم کے پیشواؤں

کے متعلق سیدنا امام الکبیر نے اپنے جن احساسات کا اظہار فرمایا، یا بجائے مجازاً بالمشکل کے

ہندوؤں کے ساتھ مدافعت بالحنیہ کے قرآنی حکم کے تجربہ کار یہ اثر تھا، یاد اللہ اعلم بالصواب ان کے سوا کوئی اور بات ہو، مگر آنکھوں نے جو دیکھا تھا، اور کانوں نے جو کچھ سنا تھا، ان رد و دادوں میں آپ پر چڑھ کر حیرت ہوتی ہے، مگر ایک طرف جیسا کہ گذر چکا عیسائیوں کے متعلق تو عموماً یہی لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کے بعد شد و جبران، سر اسیمہ و پریشان نظر آتے تھے، کالے پادری ہوں، یا گورے سب ہی پر انسردگی چھا جاتی تھی۔ عموماً غصہ میں بھرے ہوئے الفاظ ان کی زبانوں سے نکلتے تھے۔ چین بچیں ہو کر گفتگو کرتے، کہنا کچھ چاہتے تھے، اور نہ سے کچھ نکلتا تھا، بعض دفعہ تو ایسی صورتیں بھی پیش آئیں، جیسا کہ لکھا ہے کہ کالا پادری مئی الدین پٹا دسی جو کئی دفعہ اپنی بے عمل گفتگو سے پادریوں کو رسوا کر چکا تھا، جب تقریر کرنے کیلئے اٹھا، تو

”اور پادری ان کی طرف گھبرنے لگے۔“ ملاحظہ

اسی سلسلہ میں یہ ضمیمہ بھی پیش آیا، کہ امام فخری مناظرہ مولوی ابوالنصور نے باہم پادریوں کے اس رنگ کو دیکھ کر کہا کہ

”دیکھنا ان کو نہ کھڑا کرنا، نہیں تو پھر اسی طرح فصاحت کرائیں گے۔“ ملاحظہ

مرعوبیت کا حال یہ تھا کہ کالے تو کالے ایک یورپین نژاد گورے پادری جن کا نام جان ٹامسن صاحب تھا، لکھا ہے کہ بولنے کے لئے کھڑے ہوئے، مگر

”ایک دو لفظ کہنے پائے تھے، مگر جھڑ گئے۔“ ملاحظہ

اور آگے کچھ بول نہ سکے، اپنی منکوبیت کو محسوس کر کے شور اور ہنگامہ مچانے لگے، اور تو اس آخر میں تو پادری نوٹس نمک کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا آخری سرمایہ بھی یہی رہ گیا تھا کہ

”پھلا چلا کر اپنے مذہب کے فضائل بے دلیل بیان کرتے رہے۔“ ملاحظہ

یہ جو اسی میں اپنی کتابیں جلسہ میں چھوڑ کر بھاگے مسئلہ تقدیر یا ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے گستاخانہ اشارے، اس قسم کی باتوں کو مذہبی حرکات کے سوا اور کیا سمجھا جائے، مگر آئیے، اور دیکھئے ہندوؤں کا حال کیا تھا؟

ہندو مذہب کے نمائندے پنڈت دیانند یا منشی اندرمن کے ایسے اعترافات مثلاً رسالہ
مباحثہ شاہ جہاں پور میں نقل کیا ہے کہ جلسہ ریخاست ہونے کے بعد جب سیدنا الامام الکریم اپنی
فرد گلاب میں پہنچے، تو وہیں حاضر ہو کر

”سوتی میاں، مولوی قاسم صاحب سے فرمانے لگے، کہ پنڈت دیانند سرتی اور منشی
اندرمن آپ کی، اور مولوی منصور علی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے، اور دونوں
صاحبان کی تقریر اعلیٰ کے بہت مداح تھے۔“ ۱۱

اس کے متعلق تو کہا جاسکتا ہے، کہ اس قسم کی منہ دیکھی تعریف تو پادری نولس وغیرہ نے بھی کی تھی، مگر
نولس صاحب کی تعریف تو واقعی سیدنا الامام الکریم کے سامنے منہ پر کی گئی تھی، اور پنڈت جی یا منشی جی کی
تعریف منہ پر نہ تھی، بلکہ بیٹھے بیٹھے سوتی میاں کے آگے کی گئی تھی
اسی طرح ایک موقع پر جب پنڈت جی کے سوال کا جو صحیح مطلب تھا، پامی اسکاٹ نہ سمجھ سکے
اور پنڈت جی کے منشا کی وضاحت سیدنا الامام الکریم نے فرمائی، تو منشی پیارے لال کے ہم دم دم راز
لا لہ لکنا پر شاد کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ گل بڑا کہ

”ہاں مولوی صاحب یہی مطلب ہے جو آپ نے بیان کیا۔“ ۱۲

اسی طرح مقصد تخلیق پر سیدنا الامام الکریم نے جو تقریر فرمائی تھی، تو ختم تقریر پر لکھا ہے، کہ
یہی لالہ لکنا پر شاد تھے، یا منشی پیارے لال بانی میل، بہر حال ان دونوں میں سے کوئی ایک بے اختیار ہو کر
بول اٹھا تھا، کہ

”جواب اس کو کہتے ہیں،“ ۱۳ مباحثہ

یا کہا کہ ”جواب تو یہ ہوا۔“

کچھ پوچھئے، تو میرے تعجب کا تعلق اس قسم کی چیزوں سے نہیں ہے، جلسوں میں مقررین
اور خطیبوں کے ساتھ عموماً ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، بلکہ حیرت میں آجے جس چیز نے مثال
ہے، وہ ان عام ہندوؤں کا حال ہے، جو دونوں سال کے میلوں میں شریک تھے، اور قرآن کا اعتقاد

یہی ہے کہ ہر سال کے میلے میں اکثریت ان ہی کی تھی۔

ایسی صورت میں سیدنا امام الکبیر کی تقریروں کے متعلق جہاں جہاں ایسی خبریں دی گئی ہیں، مثلاً پہلے سال کی روداد کی وہی اطلاع جس کا شاید پہلے بھی کہیں ذکر گذرا ہے، یہی لکھا ہے، مگر ”یہی تقریر ہو رہی تھی“ اور لوگوں پر ایک کیفیت تھی، ”ہر کوئی ہمدنی گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو اور کسی کی آنکھوں میں حیرت“ ۲۷ میلہ

اسی طرح دوسرے سال کے میلے کی روداد میں بھی آپ کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے، کہ

”ایسا زور و شور کا وعظ ہوا، کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا ہے، اور ہر شخص پر سکتہ کا عالم تھا“

۲۸ واقعہ شاہ جہاں پور

اثر پذیر یوں کی یہ تصویریں الفاظ میں کھینچی گئی ہے، ان کا اقتضاد تو یہی ہے کہ حاضرین جلسہ کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ ان کو مخصوص نہ سمجھا جائے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ”ہر کوئی“ یا ”تمام جلسہ“ جیسے عام الفاظ سے ہندوؤں کو مستثنیٰ کر کے جلسہ کے ان ہی مشرکوں تک ان کو محدود کر دیں جو مسلمان تھے۔ خصوصاً جب یہ تسلیم کر لیا جائے، کہ اکثریت ان جلسوں میں ہندوؤں ہی پر مشتمل تھی، یوں بھی یہی خطابت کا جو تعلق عام انسانی احساسات کے ساتھ ہے، ان احساسات کو کسی خاص مذہب کے ماننے والوں ہی تک کیوں منحصر سمجھا جائے۔ مگر یہ حال تو اس وقت کا تھا، جب سیدنا امام الکبیر کی تقریر ہوتی تھی لیکن تقریر سے فارغ ہونے کے بعد جو تماشے دیکھے گئے۔ اچھٹا تو ان ہی پر ہوتا ہے، بیت ان کرنے والوں نے بجائے اجمال و دھوئیت کے صاف صاف واضح الفاظ میں ان کو بیان بھی کیا ہے، ”در حقیقت مقصود ان ہی کا تذکرہ ہے“ ذرا ملاحظہ فرمائیے، لکھا ہے، کہ جلسہ جس وقت برضا ہوا، تو

”باہر آتے ہی مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک محرم تھا، ہندو سلطان سب گھیر کر کھڑے تھے“

آگے اسی کے بعد ہے کہ

”مسلمانوں کی اس دقت جو کیفیت تھی، سو تھی، مگر ہندو بھی بہت خوش تھے، آپس میں کہتے تھے کہ نبیؐ کی دالے مولوی نے پادریوں کو خوب بات دی“۔ ملے مباحثہ

کیا عجیب بات ہے کہ پادریوں نے ہندو مذہب کے فرائض پندتوں کو جلسہ کی حد تک تویم نوا بنایا تھا۔ لیکن جلسہ سے باہر ہونے کے بعد ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ الٹ جاتا تھا، میلہ کے عام ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر پادریوں کی ہزیمت و شکست کا گریباں ادا کیا ہے۔

یاد ہو گا، پہلے سال کے میلے میں یہ صورت جو پیش آئی تھی، یعنی جلسہ کے برخاست ہونے کے بعد گھوم گھوم کر سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے مسلمانوں کے مولوی اسلام کی منادی اور عیسائیت کا ابطال کر رہے تھے، تو اس موقع پر بھی نقل کیا ہے، کہ پادری جب سامنے آجاتے، تو ان کو دیکھ کر

”عوام بھی کہتے تھے کہ پادری صاحب ہم کو ہی دھمکاتے تھے، اب تو کچھ بولے“

اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کہنے والے عوام میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو بھی تھے، اسی کے ہندو رواد میں تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ

”ادھر جگہ ہندو بھی خوش تھے“۔ ملے میلہ

اور اپنی خوشی کا اظہار پادریوں پر فقرے کس کس کر کرتے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ جلسہ سے باہر نکلنے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا مجمع سیدنا الامام الکبیر کو گھیر لیتا تھا۔ بلکہ دوسرے سال کی روداد کے مرتب کرنے والے مولانا غفر الحسن گنگوہی جو اس سال کے میلے میں خود بھی شریک تھے۔ اپنی چشم دید شہادت بھی مولانا نے صریح کی ہے کہ

”ما تم الحروف نے دیکھا کہ اس دقت بعض ہندوؤں نے کہا کہ ”واہ مولوی صاحب“ اور

بعض ہندو آتے تھے، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو سلام کرتے

تھے“۔ ملے مباحثہ

الغرض جلسہ کے اختتام کے بعد اسی قسم کے حیرت انگیز نظائے تمحی، جو میلے میں دیکھے جا رہے تھے، مغرب پادریوں کے لئے یہ سناں عجیب ہو گا۔ سوچا کیا گیا تھا، اور ہو کیا رہا ہے، لکھا ہے، مکہ میلہ اور سید کے میدان ہی تک نہیں، بلکہ لوگ میلہ کے منشر ہونے کے بعد بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف جس وقت لوٹ رہے تھے، تو جس راستہ سے سیدنا الامام الکبیر گذرتے،

”میلہ کے ہندو وغیرہ مناظران اسلام کی طرف اشارہ کر کے اردوں کو بتاتے کہ یہ

ہیں“۔ ملا سید

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر میلہ سے رخصت ہونے والوں کے کلام کا موضوع خاص سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک اور آپ کی تقریریں بنی ہوئی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب کسی ٹولی کے سامنے سے گذرتے، تو لوگ بتاتے کہ جس شخص کا ہم ذکر کر رہے تھے، وہ یہی ہیں۔

اور چاندپور کے مہرائی، میدان سے لوٹ کر شہر یعنی شاہ جہاں پور پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ میلہ میں شریک ہونے والوں میں یہی چرچا ہوتا رہتا تھا، لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور کے ”بازاروں میں مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) اداں کے رتھا کو نکلنے کا اتفاق ہوا“ تو ہندو کا تادیوں کی بھی انگلیاں اٹھتی تھیں۔ ملا سید

الغرض آپ کی تقریروں کی تاثیر کی کیفیات، جلسوں ہی تک محدود نہ تھیں، بلکہ جلسوں کے بعد بھی، میلہ کے اندر میلے سے روانہ ہونے کے بعد راستوں میں اور شہر پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ عام ہندوؤں میں تو تازہ تھیں، اور پادریوں کے مقابلہ میں جو کامیابیاں ہوئی تھیں، وہ مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ہندو ان کو اپنی کامیابی بھی یقین کرتے تھے، اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنی ان کامیابیوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

لطف تو یہ ہے کہ شہر یعنی شاہ جہاں پور کے سوا جو لوگ دوسرے شہروں تک پہنچے، ان میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو بھی، ملنے چلنے والوں سے اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کرتے تھے، وہ بھی سننے کے قابل ہیں، بریلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چند کھتری جو اس میلہ میں شریک ہونے

کے بعد یہاں پہنچے، وہ باہم ہندوؤں سے سنا گیا کہ کہہ رہے تھے کہ

”مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی، میلے کپڑے، نیلی سنگی نعل میں دینی ہوئی بیان

کرنے کھڑا ہوا، ایسی تقریر بیان کی کہ پاروں کو کچھ جواب نہ آیا۔“

صرف یہی نہیں، بلکہ یہی صاحب جنہوں نے کھتریوں کی یہ گفتگو سنی تھی، وہی کہتے تھے کہ آخر میں ان

ہی کھتریوں میں سنا کہ کوئی اپنے قلبی تاثر کا اظہار ان القاف میں کر رہا ہے، یعنی سیدنا الامام اکیبر کی طرف

اشارہ کر کے اس نے کہا کہ

”کوئی اوتار ہوں، تو ہوں لا مالا“

تقریر یہ اسی قسم کی بات ہے، جو یورپین نژاد پارسی اسکاٹ نے بھی سنی تھی

”یہ مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں۔“

اسی طرح سہارنپور میں بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ

اللہ علیہ جو ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات تھے، ان سے ایک اچھے صاحب ذوق ہندو لیکچر راج نامی کی ملاقات

ہوئی، جو میلے کے باقی منشی پیلے لال کے خاص آشناؤں میں تھے۔ میلے میں وہ بھی شریک تھے، بہرحال

لیکچر راج نے مولانا ذوالفقار علی صاحب سے کہا تھا کہ

”ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجئے؟“

پھر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، اس کی تعبیر اپنی خاص اصطلاح میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”ان کے (سیدنا الامام اکیبر کے) دل پر تو علم کی سرستی برل رہی تھی۔“ ۹۲

یہی سوچنے کی بات ہے، مسلمانوں کے مقابل میں یہی دُشمن ہندوؤں کو اس میلے میں لا کر کھڑا کیا تھا۔

مولانا اشتیاق احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ مجھے کرمسے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب دہلوی) نے بیان فرمایا کہ اسی

زمانہ میں جناب سید شاہ عیاض پورہ، شاہ عیاض پورہ کے کسی ہندو کا خط مولوی محمد نعم صاحب نظر لکھی دیکھی کے پاس آیا۔ اس میں اس

سید کا کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک مولوی جوں کا علیہ یہ تھا، ”دو پٹی ٹوپی، اک پٹا یا جامہ، نکلے گز کی چال و سنان

کی رفتار، اس نے پاروں کو اٹھا کر یہاں کی (ہندوستان کی) ساری قوموں کی وجہ رکھی۔ یہ خط مولوی محمد نعم صاحب

کے پاس سے لایا گیا، اور پڑھا گیا۔ ۹۳ محمد طیب خضر

کھڑا کرنے والوں کا جو مطلب بھی ہو، قرآن و قیاسات سے اس سلسلہ میں جن باتوں کا پتہ چل سکتا تھا۔
تفصیلاً نہیں پیش کر چکا ہوں، لیکن کچھ بھی ہو، اس کی بھلا کون توقع کر سکتا تھا، کہ مسلمانوں کے نمائندے
مولوی کو ادنا تک کے درجہ تک پہنچانے والے اسی سلسلہ میں پیدا ہو جائیں گے، اور سرستی یعنی
علم کی دیوی، یا کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ روح القدس کا تائید یافتہ وہی ہندوؤں کو نظر آنے لگے گا،
اسی سلسلہ میں ایک ہندو جوگی کی داستان کتنی دلچسپ ہے، پہلے سال کے میلہ کا قصہ ہے
میلہ جب اکھڑنے لگا، اور واسی کے دقت مسلمانوں کے اصرار سے بجائے پیادہ پا چلنے کے بجائے
جن پر شاہ جہاں پور سے لوگ آئے تھے ان ہی میں سے ایک پہلی پرسیدنا الامام الکبیر کو بھی سوار ہوتے
پر مجبور کیا گیا، اور قطار باندھ کر بیلیاں شہر کی طرف جا رہی تھیں۔ لکھا ہے، کہ میلے سے تھوڑی دُور بیلیدوں
کی یہ قطار پہنچی تھی، دیکھا گیا جیسا کہ لکھا ہے

”گاڑیوں کی قطار سے میں قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا، پاؤں میں کھڑاویں، سر پر لمبے

بال، برہمنہ سر، ہاتھ میں دست پٹا، دو چادر مٹھا اس کے ساتھ“

اسی خان سے جوگی جا رہا تھا، کہ اچانک اس پہلی پر اس کی نظر پڑی، جس پر سیدنا الامام الکبیر سوار تھے، بیان کیا
ہے کہ نظر پڑتے ہی

”مولوی محمد قاسم صفا کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا“

صاحب روداد نے اس کے بعد جوگی کے تلفظ خاص میں اس کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، یعنی اشارہ
کر کے کہہ رہا تھا کہ

”جی مونی ہے“

یعنی ”یہ مولوی ہے“ جوگی کی زبان سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے، لکھا ہے، کہ

”اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب کی نظر ادھر کو پڑی“

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، سامنا ہوتے ہی جوگی ہی نے پیش قدمی کی، اور سیدنا الامام الکبیر کو سلام
کیا، جوگی کے اس سلام کی نوعیت کیا تھی، اس کو تو صاحب روداد نے نہیں بیان کیا ہے، لیکن ہندو جوگی

کے سلام کا جواب دانا علوم دیوبند کے بانی سیدنا امام الکبیر کی طرف سے جس طریقہ سے دیا گیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، لکھا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات کے ساتھ، ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔“

اس سے پہلے پہلے میں جو کچھ کہا اور کیا جا رہا تھا، اگر سمجھا جانے کے لئے ہندوؤں کے مقابلہ میں مدافعت یا محسنی ”راے قزاقی قانون کی تعمیل کی وہ اجتماعی شکل تھی، یعنی اس کا رخ ان عام ہندوؤں کی طرف تھا، جو اس پہلے میں شریک تھے، تو قزاق کے اسی حکم کا ایک شخص اور جوئی تحسبہ حضرت دانا کے اس طریقہ و کار کو ہم شاید قرار دے سکتے ہیں جو اسی ہندو جوگی کے ساتھ اس وقت اختیار کیا گیا، نتیجہ بھی اسی وقت اس شکل میں سامنے آگیا، لکھا ہے کہ

”اس نے (جوگی نے) جو دیکھا کہ مولوی صاحب التفات سے جواب دیتا ہے، تو وہاں

سے (یعنی جہاں پر وہ کھڑا ہوا تھا) دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑیوں سے کہا، ”تھام ڈے۔“

کانٹہ والی حمید (گو یا وہ ایک گرم چوش درست ہے) نتیجہ کے ان قزاقی انما کی یہ کتنی واضح اور کھلی چوٹی تصویر ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کے معاملہ میں مقابلہ ہو گا، اسی خبر کو سن کر ظاہر ہے کہ اپنی قوم کی طرف سے گوند مقابل بن کر اس پہلے میں یہ جوگی پہنچا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ سے خاص دل چسپی بھی رکھتا تھا، آگے معلوم ہو گا کہ بجلے عام لوگوں کے اسی لئے نیمہ کے اندر اس جوگی کو جگہ دی گئی تھی،

بہر حال دوڑ کر جوگی نے گاڑی کے ڈنڈے کو پکڑا، اور ”تھام ڈے“ کی اصطلاحی آواز دے کر

بہلیوں کی ساری قطار کو رکوا دیا۔ قاعدہ ہے کہ قطار میں چلنے والی گاڑیوں کے مقدمہ انجینئر کو جب دیوتا دے کہتے ہیں کہ ”تھام ڈے“ تو وہ خود بھی تھم جاتا ہے، اور پیچھے لگی ہوئی گاڑیوں کو بھی تھم جائے گا

حکم دیتا ہے، یہی صورت یہاں پیش آئی، سب آگے کیا ہوا، یہ لکھ کر کہ

”انقصہ گاڑیاں تھم گئیں۔“

صاحب روداد نے بیان کیا ہے، کہ اس کے بعد سیدنا امام الکبیر کو مخاطب بنا کر جوگی نے کہا کہ

مصنف امام نے کہا تھا کہ

”وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتنے میں اسلام کی ایک منادی ہو جائے اور خدا کی حجت بندوں

پر پوری ہو جائے، سو وہ اس میلہ خدا شناسی میں ہو چکی ۱۱ خدا

اسی روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ

”چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وفات ہو گئی ۱۱

مطلب مصنف امام کے اس بیان کا اگر یہ سمجھا جائے کہ اسی تبلیغی نمونہ کا قائم کرنا بھی سیدنا امام

الکبیر کے وجود باوجود کا آخری نصب العین ان کے نزدیک تھا تو جو کچھ انہیں نے فرمایا ہے، خود ہی سرچر

کہ اس سے اہل کیا سمجھا جائے اور مجھ سے اگر پوچھتے ہیں، تو چاند اپریں جو کچھ سیدنا امام الکبیر نے کہا اور

کیا، اگر ایک طرف دین حق کی تبلیغی ذمہ داریوں میں اس سے جاگ پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اگر ہم

نکر مخلول سے کام لیتے ہوئے آپ کے طریقہ سے چاہیں تو یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بغیر کسی تلخی اور ناگواری

کے غیر قوموں کے درمیان بود و باش اختیار کر کے تبلیغ حق کے اس فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کا

حکیمانہ طریقہ کیا ہو سکتا ہے، آپ کے اس حکیمانہ طریقہ کار کی تفصیل واقعات و خواہد کی روشنی میں پیش ہو چکی

ہے، اس کو بار بار پڑھنے اور حقیقہ اس سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کو حاصل کیجئے، حق تو یہ ہے کہ

مسلمانوں کی بادشاہی کے زمانے میں

”ہندوئی مذہب شمسِ اسلام“

کا تاشا اگر دیکھا گیا تھا، تو شاید یہ اتنا تعجب انگیز نہ تھا، لیکن خدا شناسی کے اسی میلہ میں جب

مسلمانوں کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں کالے پارہی مولیٰ داد کی طرف سرگردگی

اچھائی جا رہی تھی، اہل سیدنا امام الکبیر اسی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کے بغیر حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ اعلان کر رہے تھے۔

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین بھی ہمارے نزدیک مثل توہین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ

علیہ وسلم موجب کفر و اعدا ہے ۱۱ مثلاً میلہ

اسی لئے آگے مکالمہ یوں ختم ہوا۔

”مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیر) نے فرمایا، آپ نے بڑی مہربانی کی جو آپ آئے“
جواب میں جانکی داس جوگی نے یہ عجیب و غریب الفاظ کہے۔

”ہم تو تمہارے بیٹا بیٹی میں“

یہ کہا اذر

”مسلم کر کے پہل دیا“

سچ پوچھئے تو ”انی لاث ولی حمید“ ہی کا اپنے الفاظ میں جوگی نے گویا ترجمہ کر دیا تھا، ”سبنا اللہ“
الکبیر کے برتاؤ اور جس سلوک نے جو اثر خود اس کے دل پر ڈالا تھا، اور کہا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اپنی تو
یکم از کم اس پہلے میں اس جوگی کے ہم مذہب لوگ جو مشرک تھے، سب ہی کو ”بیٹا بیٹی“ ٹھیراتے
ہوئے، اسی اثر کی عمومیت کا گویا جوگی اعتراف و اقرار کر رہا تھا، کیسا عجیب اور طراوت بخش نظارہ ہے کہ
دشمن بنانے کے لئے جو لائے گئے تھے، دوست یا جوگی کے الفاظ میں ”بیٹا بیٹی“ بن کر ہی واپس
ہو رہے تھے، اور جوگی بے چارہ تو خیر جوگی تھا، اسی روداد میں، ایک واقعہ یہ بھی نقل کیا ہے، مگر جن پنڈتوں کو
مقابلہ ہی کے لئے خاص طور پر بلا گیا تھا، ان میں ایک پنڈت صاحب جنہوں نے جلسہ میں عملی حصہ بھی
لیا تھا، اور مسکرت آمیز بھاشا دانی تقریر کی وجہ سے ان کی تقریر جلسہ کے عام حاضرین نہ سمجھ سکے
تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دیانندی تحریک سے وہ بھی کافی متاثر تھے۔ تاہم تقریر کے وقت بھی
ان کو دیکھا گیا تھا کہ کسی خاص مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا امام الکبیر کی طرف خاص اشارہ کر رہے ہیں اور اشارہ
کر کے کہہ رہے ہیں،

”خاص ان مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں“

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت والا کے علم و عمل سے وہ یوں ہی متاثر تھے، لیکن جلسہ جب برخواست
ہو گیا تو یہ بیان کیا ہے، کہ

”وہ پنڈت صاحب بھی اس وقت مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیر) کے پاس آ بیٹھے“

جنہوں نے جلسہ میں یہ کہا تھا میں سب سے پوچھتا ہوں اور مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف
اشعار کر کے کہا تھا، خاص کر ان سے ” صلیٰ

بہر کیف کہنا یہ ہے کہ یہی پنڈت جی جیسا کہ لکھا ہے، حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر کہہ رہے
تھے کہ

”میں سچے جی سے مذہب کے تقدیر میں پوچھنا چاہتا ہوں“

اور جلسہ میں حضرت والا کی تقریروں نے جو اثر ان کے اندر قائم کیا تھا، اس کا اظہار ان الفاظ میں کرنے
لگے کہ

”پر آدمی اس سے پوچھے جو دوسرے کو سمجھا سکے“

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ سمجھا سکنے کے اس جن سلیقہ کا تجربہ چونکہ سیدنا الامام الکبیر میں پنڈت
جی کو محسوس ہوا تھا، اسی لئے آپ کے پاس وہ حاضر ہوئے تھے۔ پنڈت جی کے اس معروضے
پر حضرت والا نے جو کچھ فرمایا تھا، اس سے آپ کی تقریروں کی خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے، کہا
گیا تھا کہ

”جو کچھ ہم کہیں گے، آپ بھی اس کو صداقت ہی صداقت پر محمول کریں گے، تعصب
اور سخن پروری نہ سمجھیں گے“

یہی تعصب اور سخن پروری سچ پوچھنے تو نہ ہی داخلوں کی تقریروں کو عموماً بے جان بنا دیتی ہے، اثر انداز
کا سب سے بڑا اگر یہی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ دین کا معاملہ اتنا ہلکا اور آسان تو نہیں ہے، کہ کسی جلسہ
کی چند تقریروں اور زبانی باتوں سے کام چل جائے، اسی لئے پنڈت جی کو آپ نے مشورہ دیا تھا، کہ
”مذہب کے باب میں اطمینان بے اس کے مقصود نہیں کہ مہینہ پندرہ روز آپ اور ہم ساتھ

رہیں اور باہم مذہب کی باتیں کرتے رہیں“ صلیٰ

”کہ گفتار کے ساتھ رفتار کو، قول کے ساتھ کردار کے تجربہ کا بھی موقع ملے۔ لکھا ہے کہ بے چارے
پنڈت جی نے ساتھ دینے کا اقرار بھی کر لیا تھا، پھر نہ معلوم کیا عوائق پیش آئے، کہ ایذا دہ

ذکر کے

بہر حال ہندوؤں پر عیسائیوں کے برعکس سیدنا امام الکبیرؒ کی تفریق کا اثر بڑھ رہا تھا، گویا
 وہی شال صادق آرہی تھی، کہ کپڑے کو سکھانے کے لئے دھوپ میں دھوبی کھڑا ہوتا ہے، ایک
 ہی آفتاب ہوتا ہے، جس کی شعاعوں سے دھوبی غریب کا چہرہ تو کالا پڑتا جاتا ہے، اور ٹھیک
 اسی وقت یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ کپڑا جسے دھوبی سکھا رہا تھا، سفید سے سفید تر بن چلا جاتا
 ہے۔ آثار کے اس اختلاف کا جو دعویٰ میں نے کیا تھا۔ کیا اب بھی اس میں شک کی گنجائش
 باقی ہے؟ حد تو یہ ہے کہ چاند پور، اور سارنگپور، نیران کے گرد و نواح کے دیہاتوں کی طرف سے سڑ
 کے پر بعض لوگ گذرے، وہی بیان کرتے تھے۔ کہ

”راہ میں جو ہندو گنوار ملے، ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ پٹھان جیتے۔“

پٹھان شاہ جہاں پور کے علاقہ میں مسلمانوں کی تعمیر ہے۔ جیسے عام طور پر ترک بھی مسلمانوں کو
 ہندوستان میں کہتے ہیں۔ مطلب یہی ہے، کہ مسلمانوں کے ساتھ اس علاقہ کے ہندو گنوار بھی
 مسلمانوں کی کامیابی، اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ان کی جیت کا ذکر کر کے خوشیاں منا رہے
 تھے، گویا صحرائی علاقہ کا انتخاب اگر واقعی فاسد افروض کے تحت کیا گیا تھا، جن کی غمخیزی قرآن و
 قیامت کریمہ میں تو سمجھنا چاہئے، کہ معاملہ الٹ گیا، عسی ان تکو ہوا شیشا و ہوخیر لکھ کے قرآنی
 اصول کی تفسیر پہلے بھی ان ہی شکلوں میں ہوتی رہی ہے، ادا آئندہ بھی ہوگی۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ حکمرانی، اور بادشاہی کو اپنا مورد ثنیٰ حق یا پیشہ قرار دینے والے مسلمانوں نے
 ہندوستان پہنچ کر تبلیغ اسلام کے دینی فرض کے ساتھ جو رویہ بھی اختیار کیا ہو، لیکن ہندوستان
 ہی کیا، شاید بادشاہی اور ملوکیت کے اس ذوق کی نسلیں کی گنجائش دنیا کے کسی گوشہ میں باقی نہیں
 رہی ہے، مصر جو تقریباً خالص اسلامی ملک ہے، وہاں کے معزول شاہ فاروق نے خواہ مخواہی کہا ہو
 کہ انگلستان کے سوا شاید کسی ملک میں بادشاہت اب باقی نہ رہے گی۔

چاہا جائے یا نہ چاہا جائے، مگر حالات کا بظاہر قدرتی اقتضار بھی جو چکا ہے، ایسی صورت میں

مسلم و غیر مسلم باشند ان کی ملی جلی آبادیوں کو رہنے والے مسلمانوں کیلئے پہلے نہیں تو اب جب بادشاہی کا خواب صرف خواب بن چکا ہے کیا یہ سوچنے کا وقت نہیں آگیا ہے کہ جس دینی فرض کی حکومت کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ان کے انکادوں نے لاپرواہی برتی تھی اس فرض کی ذمہ داری کو وہ محسوس کر رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ اس بات کو بغیر اسلامی آبادیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ایسا صحیح راستہ کیا ہو سکتا ہے جس پر مل کر دین کا فرض بھی ادا ہو نہ رہے اور دنیا میں دوسری قوموں سے ان کے فوائد خوش گوار رہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بہر حال اس باب میں مسلمانوں کو فیصلہ تک پہنچنا ہی پڑے گا، میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ دوسری باتوں کے ساتھ چاہا جائے تو روشنی کا مینار سیدنا امام الکبیر کے ان نمونوں کو بھی بنایا جاسکتا ہے جنہیں خدا شہنشاہی کے ان میلوں میں آپ کی رفتار و گفتار سیرت و کردار نے پچھلی نسلیں کے لئے چھوڑا ہے۔

آپ دیکھ چکے کہ دہریہ میلہ جس میں ادھ کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اسلام اللہ مسلمانوں کی دینی تحفہ تو ہیں کلام اللہ کر کے عیسائی مذہب اور ہندو دھرم کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ لیکن میلے میں پہنچنے کے بعد سیدنا امام الکبیر نے اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ ان ہی میلوں کو جو بنایا تھا اس باب میں آپ کی سعی و کوشش جن حدود تک پہنچی تھی اس کی داستان سنا چکا ہوں۔

بلکہ ادراج نمشہ میں مولانا طیب صاحب کے حوالہ سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے کہ ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ

”جب مباحثہ شاہ جہاں پر ہو چکا اور حضرت مولانا نانو قوی مظفر و منصور مدظلہ تشریف لائے تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔

کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا۔“

”کام جو لینا تھا“ اپنے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب مدظلہ تشریف فرما

”تم نے بڑا کام کیا“

اس سے یہ سن کر لکھا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا میں نے کیا کیا؟“

مخاطب چوتھوں تک ایک ہندو جوگی تھا، اس نے آگے فرمایا گیا، کیا فرمایا گیا؟ مسلم اعلیٰ اور کی زبان مبارک کے اس فقرے کو سننے میں نے کیا کیا؟ یہ کہنے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ

”پریشہ نے کیا“

”سچ کہتے ہو“ ان تصدیقی الفاظ کے بعد بیان کیا ہے کہ

”پھر جوگی نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کر کے کہا کہ جب تم نے ”ہوئی

ماری“ (یعنی تقریر کی) تو ہم نے دیکھا کہ اس کا یعنی پادری کا اتنا سریر سوکھ گیا تھا، یا یوں کہا

کہ گھٹ گیا تھا“

دیکھ رہے ہیں۔ آپ ایک ہی تقریر کے ان دو مختلف اعتراضی آثار کو ’پادری کا سریر (جسم) سوکھ یا

گھٹ رہا تھا‘ اور جوگی جس کی حقیقت ہندوؤں میں گویا وہی تھی، جو پادریوں کی عیسائیوں میں ہوتی ہے، اس

کے دل کی مسرت، ان الفاظ کی شکل میں جھلک رہی تھی،

اس کے بعد کسی ”ولی جسم“ سے میل ملاپ جیسی گفتگو ہوتی ہے، یہی گفتگو دونوں میں جس طریقہ سے

ہوئی، مرد اور میں وہ بھی نقاب کر دی گئی ہے، لکھا ہے کہ جوگی سے

”مولوی محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ تم کہاں تھے خیمہ کے باہر تھے“

جواب میں جوگی نے کہا کہ

”میں بھی خیمہ کے اندر تھے“

حضرت والا نے دریافت کیا کہ

”آپ کا نام کیا ہے؟“

جوگی نے کہا مہا کی داس، شاید یہ گفتگو دیر تک ہوتی، لیکن زردادی میں تھے، بہیلیوں کی قطار کی ہوئی تھی۔

جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوا، مسلمان تو مسلمان لکھا ہے مگر مولانا بد بخت کو

”ہندو بھی برا بھلا کہہ رہے تھے“

صرف یہی نہیں بلکہ جوش میں دیکھا گیا، اسی رد و داد میں لکھا ہے کہ

”ایک ڈپٹی صاحب ہندو مذہب، جن کا نام غالباً اجودھیا پرشاد ہے، کھڑے ہوئے،

انہیں مضمون کو دیر تک بیان کرتے رہے کہ کسی کے پیشواؤں کو برا نہ کہنا چاہئے“

اس کا مطلب یہی تو ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و عزت کی حفاظت کے لئے ایک

ہندو ڈپٹی کلکٹر کھڑا ہو گیا، اسی ہندو ہی مذہب پر اسلام کا جال پروردار روح افزا و نظارہ مسلمانوں کے عہد

حکومت میں اس وقت سامنے آگیا تھا، جب چاندپور کے اس میلے میں عیسائیوں اور ہندوؤں کے

نمائندوں کو اسلامی دین پر اعتراض پیش کرنے کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا اس تمام رد و داد میں ادھر یہاں لکھی

اسی معنی ممانعت بالحق کے قرآنی حکم کے قرآنی نتیجہ کو مشاہدہ بنا کر اس میلے میں جس طریقہ سے

دکھایا گیا تھا، چاہئے کہ کافی توبہ سے اس کو پڑ جائے اور آج جن مشکلات سے نکلنے کی راہیں

مسلمان اس ملک میں اپنے اوپر بندھا رہے ہیں، نیز خیال تو یہی ہے کہ ان مشکلات کے حل کی

ایک واضح راہ انشاء اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آجائے گی، پیدا کرنے والے نے ہی آدم کو جن نفسیاتی

قوانین کا پابند بنا کر پیدا کیا ہے۔ ان سے اور ان کے اقتدار سے کوئی جدا ہونا بھی چاہئے تو چہ اینہیں

ہو سکتا۔ ایرانی کا بد لہ بھلائی کے ساتھ جب دیا جاتا ہے تو دشمن خواہ کامل و درست نہ بن جائے لیکن

گو یا کہ وہ ایک گرم جوش دوست یعنی کانہ ولی حمید بنا ہوا ہے۔ قرآن کی یہ اطلاع نظر اہر

غیر منتفی ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن کیا کہئے، کہ تجربہ سے ہمیشہ اس کی تصدیق ہوتی ہے، بنی آدم

تو بنی آدم تجربہ کرنے والوں نے تو حیوانی نفسیات تک کے اور اسی قانون کو محیط پایا ہے۔

لیکن ہر تجربہ اپنے ساتھ کچھ مشرطہ نظر رکھتا ہے۔ اس قانون کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں جو یہ

فرمایا گیا ہے یعنی۔

اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل

وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا

وما یلقاها الا ذو حظ

خطیم

مزاج ہیں، اور یہ بات ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے۔

میرے نزدیک تو اس تجربہ کے عملی نتائج کے مشواظ ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کافی صبر بڑے طرف اور وسیع حوصلہ کی ضرورت اسی لئے ہے کہ برائی کرنے والوں کے مقابلہ میں بھلائی پر اپنے دل کو آمادہ کرتا ہر کس و تا کس کے لئے آسان نہیں ہے، اور اس راہ میں دل ہی کی آزادی و استقلال ہے۔ دل میں نفرت و عداوت کی آگ بھری ہو، اور زبان یا قلم سے خوبصورت، خوش کن الفاظ نکل بھی رہے ہوں، تو جس نتیجہ کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کے ظہور کا انتظار بڑی خطرناک غلطی ہوگی۔ اس طریقہ سے وہ کہہ دینے والے مکان ہے کہ خود دھوکہ کا شکار ہو جائیں، اس میں شک نہیں کہ بچائے غیر کے اپنے دل پر قابو نہ بٹا ہر آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگوں کے لئے ہی آسان بات عموماً دشوار ہو گئی، عملاً اسی لئے نفرت کا جواب نفرت ہی سے لوگ دیتے رہتے ہیں، شیطان کا یہی وہ چرچہ ہے، جس کا چکر کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ شاید "مدافعت باحسنی" والی آیتوں کے بعد

واما یفرعونک من الشیطان

نزع فاستعین باللہ انہ

ہو السمیع العلیم

اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو (خود) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا ہے خوب جانتے والا ہے۔

برکلام کو جو ختم کیا گیا ہے، اس سے یہی سمجھنا مقصود ہے، کہ "شیطان" "مدافعت باحسنی" والی راہ یعنی برائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنا، برآمد کی ادوار کو چلنے نہیں دیتا، برائی کے مقابلہ میں برائی ہی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ علاج اس کا یہی بتایا گیا ہے، کہ سارے شیطان کی خطرات جو بظاہر عقلی مشوروں کے رنگ میں سامنے آتے ہیں، ان سے خدا کی پناہ ڈھونڈ ہی جائے، برائی کے مقابلہ میں دافعی دل سے ہم اگر بھلائی کریں گے، تو خدا جو ہمارے دلوں کے حال سے آگاہ ہے وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق نتیجہ کو ہر حال سامنے لائے گا۔

میں اپنے موضوع بحث سے اس مسئلہ میں شاید ذرا زیادہ دور ہٹ گیا، زندگی کے ایک ہم قرآنی دستور کا ذکر چونکہ چھڑ گیا، سب کچھ کہنا تو دشوار تھا، لیکن کچھ نہ کہا جائے یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا، نیز گفتگو تو مسجدِ نالامام الکبیر کے ان قرآنی و عملی نمونوں کے متعلق ہو رہی تھی، جو خدا شناسی کے ان سیلے میں آپ کی طرف سے پیش ہوئے، جن کے متعلق زیادہ ذاتی احساس پیش کر چکا ہوں، ان نمونوں کو آپ کے احسانی حکم و علم کے آثار میں شمار کرتا ہوں۔

تاریخ کے جس عہد میں یہ نو مسلماناں ہند کے درمیان پیش ہو رہے تھے، یہ وہی زمانہ تھا، جب مسلمانوں کی حالت نادر سے متاثر ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں مصلحتیں اس لئے کھڑے ہو رہے تھے، کہ جو کچھ ہونا تھا، وہ تو خیر ہو چکا، لیکن ان ہی حالات میں اس قسم رسیدہ قوم کے جینے کا جو سامان بھی ممکن ہو، اسے فراہم کرنا چاہئے۔

ان کی کوششیں بھی جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، اخلاص اور سچی یہی خواہیوں، دلی ہمدردیوں ہی پر مبنی تھیں، لیکن وہ جو کچھ سوچتے تھے، عقل سے سوچتے تھے، عقل جن مشوروں کو پیش کرتی تھی ان پر عمل پیرا تھے، اور اس کے سوا وہ بے چارے آخر کرتے کیا، احسانی علم و حکم کی دولت ہر ایک کو از دانی نہیں ہوتی،

سچ پوچھئے تو مسجدِ نالامام الکبیر کی خدمات کی صحیح قدر و قیمت سے اسی لئے مسلمانوں کی حکومت جیسا کہ چاہئے واقف نہ ہو سکی، اس کے مقابلہ میں عقلی علم و حکم والوں ہی کی باتیں زیادہ مشہور اور زیادہ پسند کی گئیں، ان ہی کے مشوروں کے مطابق پروگرام بنتے رہے، اور جو نتیجے ان پر مرتب ہو سکتے تھے، وہ مرتب ہوتے رہے اور آج تک ہو رہے ہیں۔

خصوصاً خدا شناسی کے یہ سیلے جو قیدِ مصنفِ لام سیدِ نالامام الکبیر کی پیدائش کے منصبِ اعلیٰ کی تکمیل و ظہور کے آخری جلوہ گاہ تھے، وفات کی پیش گوئی تک اپنے اسی باطنی مکاشفہ کی روشنی میں انہوں نے کر دی تھی، لیکن اب اسے کیا کہئے، پتہ ہی چلتا ہے، کہ اس زمانہ میں بھی جس میں یہ سیلے منعقد ہوئے، اور اس کے بعد بھی یہ سیلے اور ان سیلوں میں جو کچھ ہوا، سب ہی کے متعلق زیادہ ذکر زیادہ

عمومی تاثر یہی رہا کہ ان میلوں میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے باہم مذہبی مسائل پر کچھ بحث ہوئی ہوئی، اور دن کا حال تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن مسلمانوں میں یہی مشہور ہوا کہ مولانا محمد قاسم کی بدولت ان ہی کی جیت ہوئی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ چند خاص لطیفوں کا چرچا بھی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق مسلمانوں کی مجلسوں میں ہوتا رہا، جن کی یاد اب بھی کبھی کبھی بے غور گری نرم تازہ کر لی جاتی ہے۔

باقی مسلمانوں کے سوا عیسائیوں اور ہندوؤں میں چاندپور کے ان میلوں اور ان کے نتائج کو کن نظروں سے دیکھا گیا، اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے سال کے میلہ کی روداد مطبع ہاشمی کے مہتمم مولوی محمد ہاشم، اور مطبع ضیائی کے، مہتمم مولوی محمد حیات صاحبان، دونوں نے مل کر اور دوسرے سال کی مولانا فخر الحسن گنگوہی مرحوم نے مرتب کی تھی۔ کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے، کہ مسلمانوں کی طرف سے جو روداد چاندپور کے میلوں کی مرتب ہوئی ہے، اسی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

”کیسٹ میلہ چاندپور بھی جس میں پنڈت جی (دیانتہ سہوتی) بھی روٹی افرزتھے، نہ چھپنے پائی“

آگے بیان کیا ہے کہ

”پنڈت جی نے کیفیت مذکورہ چھوڑ، رڑکی دیرٹھ وغیرہ مقامات کے تمام واقعات، دل خواہ گھر گھر کر چھپوا دیں“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کی طرف سے بھی چاندپور کی سرگرداشت مرتب ہو کر شائع ہوئی تھی، مگر مجھے یہ تحریر نہیں مل سکی، اور اس کا تو پتہ بھی نہ چلا کہ عیسائیوں کی طرف سے بھی کوئی رپورٹ چھاپی گئی تھی یا نہیں چھاپی گئی تھی۔

قرینہ کا اقتضا، تو یہی ہے کہ عیسائی شریعوں کی طرف سے اس زمانہ میں جو اخبار اور رسائل نکلتے تھے کم از کم ان میں ان میلوں کی کارروائیوں کا تذکرہ ضرور ہوتا ہوگا، لیکن کیا کیجئے کہ اس قسم کی کوئی چیز مجھے نہ مل سکی۔ ”توڑی مروڑی ہی“ لیکن اس کا تو اندازہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے سواد سے

فرقوں میں خدا شناسی کے ان سیلوں اور ان کی کارروائیوں کو کن بچھا ہوں سے دیکھا گیا تھا۔

زمانہ بھی کافی گزر چکا ہے، 'صدی نہیں تو پون صدی میں تو کوئی مشبہ ہی نہیں، اس زمانہ میں ہندوستان کا اسلامی پریس ہو، یا غیر اسلامی، دونوں بالکل ابتدائی منزلوں میں تھے، گنتی کے چند ہفتہ دار اخبار بعض مقامات سے نکلتے تھے، ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو میرے بعد شاید کوئی جدید مواد مل جائے، لیکن عام حال یہیہ کہ میں نے عرض کیا، بظاہر ایک وقتی بحث و مباحثہ سے زیادہ اہمیت شاید کسی فرقہ میں ان سیلوں اور ان کی کارروائیوں کو نہیں دی گئی، یہ بات کہ آئندہ نسلوں کی راہ نمائی کا کام بھی ان عملی نمونوں سے لیا جاسکتا ہے جو سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ان سیلوں میں پیش ہوئے، شاید فطر عقیدت یا میری خیالی آرائی، بلکہ ممکن ہے اس پر شک بندی تک کا مشبہ، مشبہ کرنے والوں کو ہو، لیکن یہ اپنا اپنا خیال ہے، میں دوسروں کو ان نتیجوں تک پہنچنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا، ایک بات میری تجویز آئی، وہ پیش کر دی گئی۔ اور دنیا خواہ اس روشنی کو قبول کرے یا نہ کرے، مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جن نفوس قدسیہ نے زندگی کی دوسری شاخوں میں سیدنا الامام الکبیر کی خدمات کو آگے بڑھایا، آپ کے نصیب کئے ہوئے پردوں کو پر دان چڑھایا، ان بزرگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اول سے آخر تک اس باب میں بھی جو عملی مثالیں پیش کیں، اور آج تک جس راہ پر وہ چل رہے ہیں، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، قویٰ ہی کہا جاسکتا ہے، کہ چاند پور کے نمونوں سے جو عملی درس مل سکتا تھا، اس پر وہ عمل پیرا ہیں۔

دوسرے نقطوں میں یوں سمجھئے، کہ پادریوں کا طبقہ جسے ان سیلوں میں اس غیر ملکی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی، جو ہندوستان پر مسلط ہو گئی تھی اور براہ راست نہ ہی، لیکن بالواسطہ درحقیقت اسی حکومت مسلطہ کی ان سیلوں میں نمائندگی کر رہے تھے، اور کچھ پوچھتے تو اسی حکومت کے بیچوں کو مضبوط کرنے کی دوسری تدبیروں میں ہی ایک تدبیر وہ بھی تھی، جسے پادری انجام دیتے تھے، الغرض اس طبقہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر نے جو تعلق قائم کیا تھا، یا آپ کے طرز عمل سے

جو تعلق حکومت کے ان نمائندوں سے چاندپور میں قائم ہو گیا تھا، بجائے اسی تعلق کو سیدنا الامام الکبیر کے ان جانشینوں نے اس غیر ملکی اقتدار کے ساتھ مسلسل قائم رکھا، اور گوبندوں کو بھی ان سیلوں میں پہلی دفعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا گیا تھا، لیکن آپ دیکھ چکے کہ بجائے دہ ہونے کے ان سیلوں میں ہندوؤں کی غزویت سیدنا الامام الکبیر سے جیسے قریب ہی ہوتی چلی گئی، کچھ ہی رنگ آپ کے جانشینوں کا بھی اس ملک کی غیر مسلم آبادی خصوصاً ہندوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ چاندپور کے ان سیلوں کے بعد تاریخ کا ایک طویل سلسلہ ہے جس سے ملک گزرتا ہوا موجودہ حالات تک پہنچا ہے اس طویل عرصہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات نشیب و فراز کی گھاٹیوں سے گزرتے رہے، سلجھاؤ کے ساتھ الجھاؤ، سیدہ کے ساتھ شیرازہ کی بیسیوں شکلیں سامنے آئیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں نے ان تمام حالات میں اپنی حد تک کوئی ایسی صورت اختیار نہیں کی جس کی بنیاد پر یہ سمجھا جائے کہ ان کے کسی خاص طریقہ کار سے ملک کے ان دونوں طبقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی، یا منافرت پیدا ہوئی۔

بلکہ پہلے سال کے میلے میں یاد ہو گا، مباحثہ و تقریر وغیرہ کی مجلسوں کے اختتام کے بعد ایک پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں تحقیق حق کے لئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ

”میں سچے جی سے مذہب کے مقدمہ میں پوچھنا چاہتا ہوں“

پنڈت جی کی دل دہی کرتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے سیدنا الامام الکبیر نے آخر میں ان سے فرمایا تھا کہ

”مذہب کے باب میں اطمینان ہے اس کے متصور نہیں کہ مہینہ چندہ روز آپ اہم ساتھ رہیں اور مذہب کی باتیں کرتے رہیں“

ایک جزئی واقعہ یا شخصی مکالمہ سے زیادہ بظاہر اس فقرے کا وزن محسوس نہ کیا جائے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ ایک انفرادی شخصیت تک دین حق کی تبلیغ کا جو فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، جب اس فرض سے سبکدوشی کے لئے سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک مہینہ چندہ روز کی رفاقت کی ضرورت تھی، تو

سیدنا امام الکبیر کے جانشینوں کا یہ فیصلہ کہ کردہ ہاکر وڑ انسانوں تک حق کی تبلیغ کا موقعہ قدرت کی طرف سے مسلمانان ہند کے لئے جو آسان کر دیا گیا ہے، اس میں دشواری نہ پیدا کی جائے، بتایا جائے کہ اس فیصلہ کو بے جا فیصلہ ٹھہرانے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے، سیدنا امام الکبیر کے جواب کا یہ جزو بعضی

”یہ مذہب کی باتیں کرتے رہیں“

یقیناً ملے جلے رہتے ہی کی صورت میں یہ زیادہ آسان ہے۔

بہر حال ختم نبوت کے بنیہاد کہ معلوم ہے، شاہ دلی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا بھی ہے کہ ”خود امت مسلمہ نبوت کی گئی ہے“

کنتم خیر امة اخرجت للناس | تم بہتر امت ہو جو لوگوں (کے نفع و ہدایت) کیلئے بھیجے گئے ہو۔

اس کا مطلب شارح صاحب کے نزدیک یہی ہے، ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے کہ دنیا کے جس حصہ میں مسلمانوں کو خدا نے پہنچایا اور پہنچا کر آباد کر دیا ہے، وہاں کے غیر مسلم یا شہنشاہوں کی طرف آباد کاروں کا اسلامی طبقہ نبوت ہے، اور اسی بنیاد پر مسلمانان ہند میں جو لوگ اپنے تبلیغی فرض کو محسوس کر کے سیدنا امام الکبیر کے جانشینوں کے مشورے کے مطابق وطنی تبدیلیوں پر راضی نہ ہوئے، بلکہ جہاں تھے، وہیں پڑے ہوئے ہیں، تو بتایا جائے کہ تبلیغ کے کفائی فرض سے سبکدوشی کی آخر دوسری شکل مسلمانان ہند کے لئے ادا کیا ہو سکتی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ اس تبلیغی فرض کا ڈنڈہ در آنکھی نہیں پڑا گیا، لیکن سیدنا امام الکبیر کے جانشینوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً اس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے ہیں، وقتاً فوقتاً ان بزرگوں کے ذریعہ مشرف باسلام ہونے کی سعادت جن خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی رہی ہے، یوں بھی مختلف اسباب و وجوہ کو تحت اس ملک کے غیر اسلامی طبقات کے لیڈروں اور زعموں سے ان کے ایسے خوش گوار تعلقات قائم رہے، جن کو دوسروں کیلئے اسلامی تعلیمات سے مانوس ہونے کی زمین قدر تا مہوار ہوتی رہی،

گویا مذہب کی باتیں کرنے کی ایک صورت یہ بھی تھی۔ اور گویا عام طور پر لوگوں کو اس کا شاید علم نہ ہو، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ”دارالعلوم دیوبند“ میں جب کبھی موقع ہوسکتا تھا، ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت اور بھاشا کے سکھائے کا نظم بھی مدرسہ میں کیا گیا، یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سیکھنے کے لئے بھیجا گیا۔

لیکن باریک بینی سے غیب بات ہے، مگر خود مسلمانوں کے مختلف احزاب اور جماعتوں کی طرف سے دارالعلوم دیوبند اور دیوبندیت پر جتنی بھی نکتہ چینیوں کی گئیں ہوں، بسا اوقات خود قصیدہ دیوبند میں بھی دارالعلوم کے متعلق مسلمان باشندوں کے اندر کش مکش کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، قیام دارالعلوم سے اس وقت تک جو زمانہ گزرا ہے، ”قریب قریب صدی ہی پوری ہو رہی ہے۔ اس طویل مدت میں ہندوستان کی خیر اسلامی آبادی کو مسلمانوں کے اس خالص دینی مرکز سے

۱۹۷۵ء مدرسہ کی زردادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، مگر بھاشا اور سنسکرت زبانوں کے سکھانے کے لئے دینی وقتاً مولنا اور جرت حسن میرٹھی اور مولانا غلام محمد سیٹیا پوری، ”ڈاکٹر غلام محمد وغیرہ کی تدریسی خدمات دارالعلوم نے حال کیں“ اسی طرح مولانا شہید احمد صاحب (مشرقی بنگال کے) مشہور قاضی سنسکرت کی خدمت میں تعلیمی وظائف دے کر طلبہ دارالعلوم سنسکرت زبان کے سیکھنے کے لئے بھیجے گئے، ”دیکھئے رد ادراہ ۱۹۷۵ء یا کتاب فرنگیوں کا جال ۱۹۷۵ء۔ اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے مروجہ مذہب و ادیان کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرنے کی ممکنہ حد میں اختیار کی جائیں، بلکہ ہندی زبان ناگری خط کے ساتھ جب اس ملک کی دفتری زبان مانی جا چکی ہے تو قدرتا اس کی وجہ سے اس زبان کی تسلیم کا انتظام زیادہ آسان ہو چکا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اسلامیت کا جو ضمیمہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی زبان میں منتقل کر دیا جائے، بار بار ایک تبلیغی فرض ہے، ”ادراشا، ایشا، ایشا، ایشا“ یہ جواب پورا ہو کر رہے گا۔

از بندہ محمد طیب غفرلہ عرض ہے کہ انقلاب ۱۹۷۵ء کے بعد اسی سال احرار کی طرف سے دارالعلوم کے درجہ فارسی میں ہندی اور دہلی ناگری جاری کر دیئے جانے کی ہدایت بھیج دی گئی، اور ایک مستقل مدرسہ ہندی کے لئے مامور کیا گیا، جو آج تک جاری ہے، بعد میں اسے تمام بزرگان دارالعلوم نے پسندیدہ لگا ہوں سے دیکھا، ”ادراہ“ یہ ہندی کی تعلیم ضابطہ سے جزو نصاب درجہ فارسی بنا دی گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہ

تصادف و تراحم تو خیر و در کی بات ہے، شاید کسی قسم کی کوئی قابل ذکر شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی، نیز بائبل والوں کی طرف سے کبھی ایسی کوئی آواز بلند ہوئی اور نہ خود تھبہ میں باوجودیکہ ہندوؤں کی کافی آبادی ہے، ان ہی کو شکایت کا موقعہ سیری دانست میں کبھی ملا ہے۔

بہر حال یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ چاندپور کے سیلوں میں جو کچھ دیکھا گیا تھا، اگر سوچا جائے تو یہ نظارہ ان ہی سیلوں کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا، بلکہ ”دارالعلوم دیوبند“ کی پوری تاریخ میں اس باغ کی باغبان کی وہ روش اب تک نظر آتی ہے، جسے دیکھنے والوں نے ضلع شاہ جہاں پور کی مقامی ندی گراتا می کے ساحل پر دیکھا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی ہند کی موجودہ مشکلات کے حل میں چاہا جائے تو اس روش سے آج بھی استفادہ کا امکان باقی ہے، واللہ یہی منیشاء الی صراط مستقیم

اور عمل کے لئے خدا شناسی کے ان سیلوں سے جہاں یہ روشنی ملتی ہے، وہیں عجیب بات ہے کہ علم کے دائرہ میں ہم جن ”نظریات فائقہ“ کی تعبیر ”حکمت قاسمی“ سے کر سکتے ہیں، یا چاہئے، کہ کریں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی سیلوں کی بدولت پہلی دفعہ وہ قلم بند ہوئے، میرا اشارہ سیدنا امام الکبیر کی مشہور کتاب ”حجۃ الاسلام“ کی طرف ہے، اس کتاب میں کیا ہے، ظاہر ہے اس پر بحث کا سوزن ترین مقام تو سیرت طیبہ کی بعد کی جلد ہی ہو سکتی ہے، میں میں آپ کے خصوصی نظریات کی ترتیب و تجویب کا کام کیا جائے گا، مختصر فقراتوں میں سر دست اس سلسلہ میں بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کتاب کا خاص ادیشن جب شائع ہوا تھا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا کہ

۱۔ ہاں افراتفری کے ان مہیلہ کلمات کو تو میں جب ”مکملہ میں غیر ملکی حکومت اچانک اپنے سیاسی اقتدار سے دست بردار ہو کر اس ملک سے رخصت ہو رہی تھی، جہاں دست و خیز کے اس ہنگام میں سب کچھ دیکھا گیا، اور دارالعلوم کو بھی بعض ناگوار حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن تحقیق نے اس وقت بھی یہی ثابت کیا، کہ شکایت کا سختی دارالعلوم نہیں، بلکہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے گمنی کے ساتھ گہروں کے پیسے دینے کا غلط اقدام کیا تھا ۱۳

”اس تحریر کی نسبت حضرت مولانا سیدنا الامام الکبیرؒ کی زبان مبارک سے یہ بھی مناسبت کہ جو مضامین تقریر و دل پذیر میں بیان کرنے کا ارادہ ہے، دوسرے اس تحریر میں آگئے، اس قدر تفصیل سے نہ بھی، یا لا جالہ ہی یہی ص ۱۱

جیسا کہ معلوم ہے ”تقریر و دل پذیر“ نامی کتاب میں اسلام کے علمی و عقلی نظام کو تفسیر و استدلال کے نثر پہلو میں دھالنے کا ارادہ سیدنا الامام الکبیرؒ نے فرمایا تھا، لیکن چند ابتدائی ابواب سے زیادہ یہ کتاب لکھی نہ جاسکی، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگئے لکھا تھا، کہ ”تقریر و دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قلع شائقان اسلام علیہ کو ہے، اس کی مکانات کی صورت بھی اس رسالہ (حجۃ الاسلام) سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی۔“

پھر اسی کتاب حجۃ الاسلام کے متعلق اپنے ذاتی احساس کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ارتقا فرمایا تھا، کہ

”تمائید احکام اسلام، اور مباحث فلسفہ قدیر و جدید کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں، ان کو بچانے خود رکھ کر حضرت قاتم العلماء (سیدنا الامام الکبیرؒ) کے رسائل کے مطالعہ میں کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں، اور پورے غور سے کام لیں، اور انصاف سے دیکھیں، کہ ضروریات موجودہ زمانہ، حال کے لئے وہ سب تدابیر سے قانع اور مختصر اور بہتر و مفید تر ہیں، یا نہیں۔“ ص ۱۱

بتلا ہر ان الفاظ کا تعلق اگرچہ عام رسائل سے معلوم ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر ”حجۃ الاسلام“ ہی کے اندر پہلوؤں کی طرف حضرت شیخ الہندؒ نے ان جامع و مانع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، آپ کے اس دعوے کی توثیق تجربہ سے ہوتی ہے،

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چاندپور کے یہ سید خداداد کس نیت اور ارادے سے جمائے گئے ہوں، لیکن منہلہ دوسرے فوائد کے ایک بڑا علمی و دینی فائدہ ان سیلوں کا یہ بھی ہوا، جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسی دیباچہ میں لکھا ہے کہ

”بندہ محمود“ حمد و صلوة کے بعد طالبان معارف الیہ اور دل دادگان اسرار ملت صوفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ششہ ۱۳۶۹ء میں پادری نوٹس صاحب اور غنشی پیاسے لال صاحب ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شاہ جہاں پور نے جب ایک میلہ بنام ”میلہ خدا شناسی“ موضع چاندا پور میں منعقد کیا اور اطراف و جوانب میں اس مضمون کے اشتہار بکجوائے کہ ہر مذہب کے علماء آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل مثنائیں تو اس وقت معدن الحقائق، مخزن الدقائق، مجمع المعارف، منظر لطائف، جامع النیوض والبرکات، قاسم العلوم و النجرات سیدی مولائی حضرت لانا محمد قاسم متنا اللہ علوہ و معارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلہ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت میں مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ، رمی سربراہ گئی، چونکہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ مذاہب اور بیان دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی، اعتراضات و جوابات کی نوبت آئے گی، یا زبانی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت بیان، یا میاناستہ تحریری ہر کسی کو پیش کرنے پڑیں گے، تو اس لئے یہ نظر احتیاط حضرت مولانا قدس اللہ سرہ کے خیال مبارک میں یہ آیا کہ ہر ایک تحریر جو اصول اسلام اور فروع ضروریہ بالخصوص جو اس مقام کے مناسب ہوں، سب کو شامل ہو، حسب قواعد عقلیہ منضبط ہوتی چاہئے، جس کے تسلیم میں عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے۔“

اسی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے یہ اطلاع دی ہے کہ

”چونکہ وقت بہت تنگ تھا، اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ غالباً ایک دفعہ کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔“

لیکن جیسا کہ گذر چکا تحریری مقالے کے سنائے کا موقعہ سیدنا الامام الکبیرؒ کو نہ ملا، بلکہ بقول شیخ الہندؒ

”جلسہ مذکور میں تو مضامین متعدد تحریر مذکور کو زبانی ہی بیان فرمایا، اور دوبارہ حقانیت اسلام

جو کچھ بھی فرمایا، زبانی ہی بیان فرمایا۔“

مگر میلے کے بہانے سے "قاسمی معارف" کا ایک قیمتی حصہ اور صدیوں کام آنے والا سرمایہ جو تیار ہو گیا تھا اس نے تو تحریک کا قالب اختیار کر لیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سلسلے میں یہ خبر بھی دی ہے کہ

"مولانا مولوی فخر الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے (یعنی قلم بند شدہ تحریر کے) مضامین کے لحاظ سے اس کا نام "حجۃ الاسلام" تجویز فرما کر اوّل بار شائع فرمایا تھا۔"

"خدا شناسی کے میلہ" کی سرگزشت کو ختم کرتے ہوئے، سیدنا الامام الکیبیر کی کتاب "حجۃ الاسلام" کے ذکر کی تقریب سے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے اکثر حصہ کو میں نے اس لئے بھی نقل کر دیا ہے، مگر براہ راست اس میلہ میں اپنے حضرت الاستاذ سیدنا الامام الکیبیر کی ہر کتابی میں شیخ الہند "بھی شریک تھے" اسی لئے جو کچھ آپ نے لکھا ہے شنیہ نہیں دیدہ ہے، آپ کے قلم مبارک کی لکھی ہوئی اجالی روداد کو مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب میں بھی تبرکاً درج کیا جائے۔ اور ضمایر اشارہ

ملہ تعارف کے اسی مضمون میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"صاحبان مطالع اس عملاً مقبول (حجۃ الاسلام) اور نیز دیگر تصانیف حضرت مولانا سیدنا الامام الکیبیر، رحمۃ اللہ علیہ کی اشاعت دیکھ کر 'صرف بغرض تجارت' معصوم فی ظہر اللہ کو چھاپتے رہے کسی زمانہ اہتمام کی حاجت ان کو محسوس نہ ہوئی، اس لئے فقط کاغذ اور لکھائی چھپائی ہی میں کوتاہی نہیں ہوئی، بلکہ فصیح عبارت میں نمایاں غلط پیدا ہو گئے۔"

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے "حکمت قاسمیہ" کی نشر و اشاعت کی تجویز کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔
"اس حالت کو دیکھ کر کفّش برداران قاسمی دولی داد گاہ اسرار علمی کو بے اختیار اس امر پر کرہتہ ہونا پڑا کہ صحت و خوش خطی وغیرہ تمام امور کا اہتمام کر کے اس عملاً مقدمہ کو چھاپا جائے اور بغرض تو فصیح حاشیہ پر ایسے نشانات کر دیئے جائیں جن سے تفصیل مطالب ہر کسی کو بے تکلف معلوم ہو جائے، اور

جلد تصانیف حضرت مولانا نفع اللہ السلیحین بغیرہ

کو اسی کوشش اور اہتمام کے ساتھ چھاپ کر ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے، واللہ ولی التوفیق"

لیکن شاید حجۃ الاسلام کے سوا سیدنا الامام الکیبیر کی دوسری کتابوں کے متعلق اس تجویز کے مطابق عمل کرایا نہ ہو

بھی کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے واقعات تاریخ میں ایسے گزر رہے ہیں جن کے دور میں نتائج کا اندازہ ان کے وقوع کے زمانہ میں نہیں کیا جاسکتا تھا، جو بعد کو لوگوں کے سامنے آئے، یہی حجت الاسلام کتاب ہے، انکھی تو گئی ہے کل ایک دن اور سات کے کچھ حصہ میں، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے مضامین سے دنیا کب تک کن کن حالات میں کس حد تک مستفید ہوتی رہے گی، اور کتنوں کی دینی راتیں اس کتاب کی روشنی سے دن بنی چلی جائیں گی، مجھے تو یہی رنگ ان عملی نمونوں کا ہی معلوم ہوتا ہے، جہاں سیلوں میں سیدنا امام الکبیر کی طرف سے خواہ جتنے مختصر زمانہ میں بھی پیش ہوئے ہوں، مگر قائد اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو ہندوستان کی اسلامی آبادی اپنے بددہاش کے الجھے ہوئے مسائل کو چاہے تو ان نمونوں کی مدد سے آج بھی سلجھا سکتی ہے۔ وما یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الا ذو حظ عظیم۔

بہر حال خدا شناسی کا یہ میلہ تو ختم ہو گیا، معلوم نہیں کہ اس کا سلسلہ آئندہ سالوں میں جاری رہا یا ان ہی دو سیلوں تک قصہ ختم ہو گیا، جو بقول ہمارے مصنف امام درحقیقت قائم ہی اس لئے ہوا تھا، اور قدر کی غرض ہی یہ تھی کہ

راغب صفحہ ۱۷۱، مودودہ مل مکان میں نے اس تجویز کے الفاظ کو تجلیہ اس لئے نقل کر دیا ہے، مگر دارالعلوم دیوبند اس کے ادب بہت دشادہ بلکہ شاید تمام دہستوں پر ایک قرض ہے، جو چڑھا چلا آ رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ بقرض کب اور ہوگا، دل چاہے لطیف یہ ہے کہ دیوبند کے اس منوی سرایہ کو جب اس کے شایان شان لباس پہنا دے گا، اور کیا گیا، تو یہ عجب اتفاق ہے، مگر نظر انتخاب علی گڑھ پریس کی، اور حجت الاسلام کا یہ خصوصی ادیشن مطبع احمادی علی گڑھ میں چھاپا گیا، اسلام کی منوی و صدی یا طلب و طالب کی خدمت کے سلسلہ میں تقسیم عمل کا یہ حسن اتفاق، باہمی وفاق کا کتنا اچھا اشارہ ہے۔ ۲۔

۱۵۔ اس قرضہ کی ادائیگی الحمد للہ شروع کر دی گئی ہے، حضرات کارکنان دارالعلوم نے یہ بذلتی طبع پر اپنے سر لے لیا ہے، ایک مستقل ادارہ بنام ادارہ نشر و اشاعت قائم کر کے اس میں ایک مستقل فنڈ اسی لئے کھول دیا گیا ہے کہ اس میں اسلاف دارالعلوم بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم کے علوم اور تصانیف کو اچھے لباس کے ساتھ منظر نام پر لایا جائے، کام شروع کر دیا گیا ہے، ادا امید ہے کہ عنقریب بیرونیات قاسمہ اور حکمت قاسمہ کے منظر پر تصانیف قاسمہ سامنے آتی شروع ہو جائیں گی۔ ۱۶۔ انشور ذی التوفیق ۱۲ محمد طیب غفرلہ

”ان دو سال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص یعنی سیدنا امام الکبیر کس پایہ کا ہے، اور فضل الہی کی کیا صورت ہو کر تھی ہے۔“ جز بہ تائید آسانی نیست ” کا نقشہ ظاہر ہو گیا، ملک سوانح قدیم

اور گرام طور پر علمی حلقوں میں سیدنا امام الکبیر کی علمی و عملی عظمت کا سکہ پہنے ہی سے بیٹھا ہوا تھا لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں آپ کی شہرت کا ذریعہ نفاہراں ہی سیلوں کی غیر معمولی کامیابیاں بن گئیں ان سیلوں سے فارغ ہو کر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اقا میں جب

”محمد اللہ نصرت اسلام کا پھر برا اڑا تے ہوئے حضرت مولانا المعظم واپس تشریف لائے“ (تعارف حجۃ الاسلام)

عرض کر چکا ہوں کہ دوسرے سال کے میلے کے بعد چند دن آپ کا قیام شہر شاہ جہاں پور رہا، یہاں بڑی کا فرض مولوی طاہر صاحب آنریری مجسٹریٹ یعنی ملا دن والے موتی میاں نے ادا کیا، اسی زمانہ میں جب موتی میاں کے یہاں دوسرے علماء ج میلے میں شریک ہوئے تھے، ان کے ساتھ تقیم تھے، یہ تحریک کی گئی تھی کہ منشی اندر میں اندر پٹت دیا نند سر موتی دونوں صاحبوں کو چاند پور سے جہاں منشی پیارے لال بانی جلسہ کے یہاں یہ دونوں یہاں تھے، شاہ جہاں پور بلا یا جائے خط لیکر آدی چاند پور گیا، بتا چکا ہوں کہ جواب میں دونوں صاحبوں نے آنے سے معذرت کی، اور لکھا کہ آپ ہی لوگ چاند پور آئیں، مزداد میں ہے، کہ اس کے بعد

”مولوی محمد طاہر صاحب (موتی میاں) نے باشارہ مولوی محمد قاسم و حسب صلاح مولوی محمد علی صاحب (مصنف سوط اللہ الحبار) ہم کو لکھا کہ جیل میں مورتا پنا کس نے دیکھا، اور کا دینی چاند پور کلاں جمع برقا ست ہو گیا، اب وہاں کون ہے ہر مباحثہ کا لطف اٹھا کر لگا“

مش مباحثہ شاہ جہاں پور

لیکن باوجود دوبارہ تقاضے کے نہ منشی اندر میں ہی شاہ جہاں پور آنے پر راضی ہوئے، اور نہ پٹت جی ہی آئے۔ لکھ بیجا تھا کہ

”آپ کے (یعنی سوتی میاں کے) مکان پر تہیں آنا، ہاں! اگر خوشی گنگا پر شاد ہوتے، جن کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مقام شاہ جہاں پر ہو گئی ہے، تو ان کے مکان پر میں آسکتا تھا۔“ مشہور شاہ جہاں پر

اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام و لکھنؤ کی یہ کوشش تھی کہ منشی اندر من، یا پنڈت یا مندر سوتی جیسے لوگوں سے جو اس زمانہ میں اچانک مسلمانوں اور مسلمانوں کے دین پر اعتراض و تنقید کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، براہ راست ملیں۔ لیکن حشدا ہی جانتا ہے کہ براہ راست ملاقات اور مکالمہ سے گریز کی راہ وہ کیوں اختیار کرتے رہے۔

شاہ جہاں پر کا یہ قصد تو خیر شاہ جہاں پر ہی برقم ہو گیا، اس کے بعد سیدنا الامام و لکھنؤ گھر واپس ہوئے، چنڈی میں گئے۔ رے تھے کہ اچانک میسر جج کے سفر کا ارادہ کر کے آپ جہاز روانہ ہو گئے آپ کے اس جج کا جو آپ کی زندگی کا آخری جج تھا، اس کی تفصیل تو آگے آ رہی ہے، آمد و رفت میں تقریباً چھ مہینے صرف ہوئے، یعنی دوسرا میلہ تو شہداء کے ماہ مارچ میں منعقد ہوا تھا، اسی سال کے ماہ اکتوبر میں آپ واپس حجاز ہوئے، اور جیسا کہ مصنف امام نے فیردی ہے، اس حساب سے دوسرے سال شہداء ماہ مارچ میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔ گویا جج دربارت کا یہ سفر چھ مہینے میں پورا ہوا تھا۔

مارچ کے بعد صرف اپریل و مئی و جون کے تین ہی مہینے گزرے تھے، واپسی بھی اتنے طول و طویل سفر سے ہوئی تھی، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، کہ منظر سے واپس جوتے ہوئے، کہ اور جتہ کی مددیں آپ پر اس مرض کا حملہ ہوا، جو آپ کی ناسوتی زندگی کی گویا آخری علامت تھی۔ کسی نہ کسی طرح ہندوستان آنے والے جہاز پر آپ کو سوار کر دیا گیا تھا، لیکن جہاز ہی میں مصنف امام نے لکھا ہے کہ ”ایک دن یہ فوت ہوئی، کہ ہم سب ملے ہوئے ہو گئے۔“

گویہ مایوسی واقعی مایوسی اس وقت ثابت نہ ہوئی، لیکن مرض کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وطن پہنچنے کے بعد بھی زیر علاج رہے، کئی صحت تو پھر بھی حاصل نہ ہو پائی تھی، لیکن بقول مصنف امام

”مرض دفع ہوا، گو نہ طاقت آئی، مگر کھانسی ٹھیر گئی، اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا۔

زیادہ بولنا، دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا، پھر اس میں بھی کچھ تخفیف ہوئی، ۱۱ مئی

کچھ تخفیف ہوئی، کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ تکلیف کا کلی ازالہ نہیں ہوا تھا، آپ ان ہی حالات میں تھے، کہ مری پنڈت دیانند مسروتی جی نے ہندوستان کے طویل و عریض رقبہ میں خدا ہی جانتا ہے کہ کن مصلحتوں کے زرا اثر اپنی کہ دکاوش کامر کر خلع سہارنپور کے قصبہ رڈکی کو بنالیا، سیدنا الامام اکبر نے اپنی کتاب قبلہ نما کو دیا، یہ میں خود ہی ارقام فرمایا ہے کہ

”بعد حمد و صلوة بندہ بیچدان، سراپا گناہ محمد قاسم ناظر بن اوراق کی خدمت میں عرض پرداز

سہے کہ سن بارہ سو پچانوے، بھری رجب (مطابق شمسہ ۱۰۸۷، ماہ جولائی)، میں پنڈت دیانند

صاحب نے رڈکی میں آکر سریا زار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کئے، ۱۱ مئی

نہیں کہا جاسکتا کہ رجب کے جس مہینہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس مہینہ کی کس تاریخ سے پنڈت جی کی گل افشائیاں کہنے، یا شرریا دیوں کا یہ قصہ رڈکی میں شروع ہوا تھا، بظاہر قیاس کا اقتضا ہے کہ آخری رجب میں پنڈت جی نے رڈکی پہنچ کر پادریوں کے طریقہ سے برسرِ یادار اسلام کو اپنے تیروں کافرانہ بنالیا، رڈکی کے مسلمان بے چین ہو گئے، شاہ جہاں پور کے میلوں کی سرگزشت عام طور پر مشہور بھی ہو چکی تھی، نیز قرب مکانی کی وجہ سے قدو تارڈکی کے مسلمانوں کی نظر سیدنا الامام اکبر ہی پر پڑ سکتی تھی، دانشہ اعلم آدمی رڈکی سے آئے، یا ڈاک سے اطلاع دی گئی، مصنف نام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اختتام رجب کے بعد شعبان میں یہ خبر سیدنا الامام اکبر تک پہنچی، انہوں نے لکھا ہے کہ

”اسی سال (۱۰۸۷) جس میں حجاز سے واپسی ہوئی تھی، شعبان میں رڈکی سے خبر ملی کہ

پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض شتہو کئے

ہیں، اہل رڈکی بھبر ہوئے، کہ آپ تشریف لائیں۔“

شہر کرنے کا مطلب وہی ہے کہ پادریوں کی ریس میں پنڈت جی نے بھی برسرِ یادار اپنی گل افشائیاں کہنے

یاسر رباریوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، پنڈت جی اپنی ذہانت کے زور سے اس دعوے کا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑی بت پرست قوم مسلمانوں کی ہے۔ بظاہر رڈ کی میں بھی اپنی اسی اچھوتی اور انوکھی آنکھ سے مسلمانوں کے دل و دماغ کو مجروح کر رہے تھے۔ پنڈت جی کے اعتراضوں میں گل سرسبد کی حیثیت اسی اعتراض کو حاصل تھی، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے، کہ رڈ کی کے اسی قصے کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیرؒ نے قلم نہا، نامی اپنی کتاب اسی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے، بہر حال شعبان میں پنڈت جی کی آمد کی خبر سہیلی، رڈ کی کے مسلمانوں نے تو خیر طلب ہی کیا تھا، لیکن اس بیرونی کشش کے سوا کچھ پوچھئے تو خود سیدنا الامام الکبیرؒ بھی رڈ کی کی آئی ہوئی خبروں سے تمللا اٹھے تھے، اسی کتاب قبلہ نما کے نیلے پیر میں ارقام فرماتے ہیں کہ

”حسب الطلب بعض احباب (رڈ کی) اور بہتھانہ کے غیرت اسلام یہ ننگ اسلام بھی شروع شعبان میں دیاں (رڈ کی) مینچا“ ص ۷

اس میں شک نہیں کہ رڈ کی کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، لیکن ذرا سوچئے تو یہی ان باتوں کو کہ حجاز کے طویل طویل سفر سے ابھی آپ واپس ہوئے ہیں، اور دواپی بھی ایسی شدید علالت کے ساتھ ہوئی ہے، مگر عرض میں وقتی طبع پر گو نہ افادہ کی صورت ظاہر ہو چکی تھی، لیکن ضعف ہی نہیں، بلکہ معصفت امامؒ نے جبرہ اطلاع دی ہے، کہ

”مولانا (سیدنا الامام الکبیرؒ) باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرض کا لگاؤ بھی باقی تھا۔ مولانا حکیم منصورؒ نے صاحب نے اپنی کتاب مذہب منصور میں رڈ کی کے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے جس کا آگے ذکر آ رہا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رڈ کی کا یہ سفر پہلی میں کیا گیا تھا۔ بیل کی اس گاڑی کے ہچکوں کی اچھے اچھے تھندستوں کے بھی انجریہ بخرد خیلے بڑھ جاتے ہیں، پھر مرض اور مرض کی قناعت کے ساتھ یہ سفر جس حد تک تکلیف دہ ہو سکتا ہے، خصوصاً راستہ بھی جب ہموار نہ ہو، قبلہ نما کے

دیا چہیں "راہ کی خرابی کا ذکر بھی کیا گیا ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ "غیرتِ اسلام" کے تھاٹھنے نے ہر تھاٹھنے کو سامنے سے ہٹا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی توہین کا خیال، ہر خیال پر غالب ہے جس حال میں تھے، کھینچے ہوئے رڈ کی پہنچ گئے، اور عجیب شان کے ساتھ پہنچے، مصطفیٰ امام نے لکھا ہے کہ رڈ کی کے اس سفر میں بھی نہیں کہ

"بہت سے خادم ساتھ ہوئے" ص ۱۷۷

بلکہ شاہ جہاں پور کے تھے مسلمانوں میں جو پیچھے ہوئے تھے، بقا ہراں ہی کا اثر تھا، کہ لوگوں کو جب خبر ہوئی، کہ سیدنا الامام الکبیر اور پنڈت دیانند جی میں مباحثہ دستِ نظرہ بہ مقام رڈ کی ہونے والا ہے، تو

"اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولانا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہو گئی، ص ۱۷۸

خلاف دستور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ رڈ کی کے اس سفر میں تعصبات اپنے خاص خاص شاگردوں کو جو دوسرے مقامات میں تھے، آپ نے طلب کر لیا تھا، مولانا حکیم منصور علی صاحب جو اس زمانہ میں منگلور نامی قصبہ میں کسی مدرسہ میں مدرس تھے جو دیرینہ دار و درڈ کی کے درمیان راستہ میں ملتا تھا، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"ایک تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہی، کو منگلور بھیجا، کہ اس کو (یعنی حکیم صاحب کی ملنے کے لئے بلا لاؤ۔ میں یہ شردہ سنتے ہی مولوی فخر الحسن گنگوہی کے ہمراہ چلا گیا، شریک پر پہلی کو ٹھہرا کر فرمایا، تم بھی ضرور رڈ کی آ جانا۔ حسب اللہ شاد و تین روز بعد میں بھی رڈ کی پہنچا" ص ۱۷۹ مذہب منصور

بہر حال خدام خاص (تلامذہ وغیرہ) کے سوا عام مسلمانوں کا بھی کافی مجمع معلوم ہوتا ہے، کہ رڈ کی میں اکٹھا ہو گیا تھا، گویا ایک برات ہی اتر پڑی تھی۔ اسی کے ساتھ جب ہم حضرت والا ہی کی براہِ راست دی ہوئی اس اطلاع کو پڑھتے ہیں یعنی رڈ کی پہنچنے کے بعد اقام فرمایا گیا ہے، کہ

"آرزدے مناظرہ میں سو گر سترہ دن وہاں (رڈ کی) ٹھہرا رہا" قبلہ نامہ ص ۲

تو کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، نصف ماہ سے زیادہ دن تک باہر سے آئے ہوئے اتنے بڑے مجمع کے رہنے ہننے، کھانے پینے کا نظم، اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ ہر شخص اپنے کھانے پینے کا خرچ خود برداشت کرے، یہی حکم سیدنا الامام الکبیر کا تھا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے، اور مہینہ بھی جراثی آغازِ موسم بڑھ گئی۔

”علاوہ برین برسات کا موسم“

ان الفاظ سے قبلہ نما کے اسی دریاچہ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

لیکن اپنے ذاتی ضعف مرض، اور اتنے بڑے مجمع کے قیام و طعام کی دشواریوں سے بے پروا ہو کر تین چار دن نہیں لگے سولہ سترہ دن تک آپ رڑکی میں کیوں مقیم رہے؟

بظاہر جیسا کہ خود آپ کے ذاتی بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے، اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی سے آپ براہِ راست دو بدو ہو کر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ قبلہ نما کے دریاچہ میں آپ کے الفاظ میں کہ

”ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہہ بنایت خداوندی

اسی وقت ان کے جواب عرض کروں“

لیکن جیسا کہ مصنف امام نے اجمالاً یہ خبر دی ہے، کہ

”وہ اللہ کا بندہ (پنڈت دیانند سرسوتی) گنگو پر پکانہ ہوا۔ اینڈی بینڈی مشہرہ میں

کرتا تھا۔“

ان اینڈی بینڈی شرطوں کی تفصیل تو آپ خود سیدنا الامام الکبیر ہی کے حوالہ سے آگے نہیں گئے

لیکن ان سے زیادہ دل چسپ حصہ مصنف امام کی خبر کا یہ ہے کہ

”وہ اللہ کا بندہ گنگو پر پکانہ ہوا“

آپ بھری سے سن چکے ہیں کہ گنگو یعنی بخت و مباحثہ، مناظرہ و مجادلہ کے میدان کے پنڈت جی اپنے وقت میں دہلی تھے، بے پور پہنچ کر ابراہام سنگھ دانی بے پور کے دربار کے فاضل پنڈت

دنگا پارہ کو چلیج پر چلیج دے رہے تھے، اگرہ، اجمیر، لشکر جہاں پہنچے شیو ست کا جس کی پنڈت جی شریو دے میں پابند تھے۔ منڈن یعنی تائید اور دشمنو ست کا کھنڈن یعنی تردید اسی کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ پنڈتوں کے قدیم دارے سے باہر نکلنے کے بعد جب عیسائیوں، مسلمانوں وغیرہ ہندوستان کے مختلف مذہبی گروہ کے دین پر ان کے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا تھا، سہارنپور سے دانا پور تک پنڈت جی نے ہندو بھارتی تھی، اپنی تقریروں اور مباحثوں میں پنڈت جی جن بھگنڈوں سے کام لیتے تھے، مدداس کے ڈاکٹر مرڈک ایم۔ اے ایل ایل ڈی کی شہادت ان کے متعلق گزر چکی کہ پنڈت جی کے ساتھ ان کی تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی رہتی تھی، اور جب پنڈت جی مباحثہ میں اپنے مخالف فریق کی

”ہنسی اڑاتے، قہقہہ لگاتے، تو یہ لوگ (منڈلی والے)، اس کام میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔“

اور یہی گواہی ڈاکٹر فارکوہار کی بھی نقل کر چکا ہوں جس میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی ”مباحثہ میں تند و ترش، بہت پیچھے والے اور مخالف پر ناجائز دباؤ ڈالنے والے تھے۔“

”سوامی دیانند اور ان کی تعلیم“ نامی کتاب سے ان شہادتوں کو پہلے اپنے موقع پر پیش کر چکا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے، کہ سیدنا الامام الکیسر کے مقابلہ میں آنے کے بعد خدا ہی جانتا ہے کہ پنڈت جی پر کیا حال طاری ہوا، کہ خدا شناسی کے میلے میں منکرت آمیز بھاشا یعنی اسی زبان میں تقریر کی جن کے سمجھنے والے میلے میں دس پانچ آدمی بھی نہ تھے، نہیں کہا جاسکتا کہ پنڈت جی کے دل کا جو ارمانی پڑا تھا دل ہی کے اندر رہ گیا تھا، اسی ارمان کو کھاننے کے لئے رڑکی پہنچے تھے اور رڑکی کے انتخاب کرنے کی وجہ یہی تھی کہ سیدنا الامام الکیسر کا وطن ان کو معلوم ہو گیا تھا، کہ اسی علاقے میں ہے، مگر اب اسے کیا کہنے، جب حضرت والا بابرہ دہرہ ضعیف اور مرض کے رڑکی پہنچ گئے تو وہی پنڈت جی جنہوں نے رڑکی کے مسلمانوں کو بیٹھے بٹھائے بیٹھے میں کر دیا تھا، اور تنہا پیش کش قاضی رومی راضی آئی، دانی شال کے مطابق حضرت کی تشریف آوری سے پہلے سب کچھ

کہہ رہے تھے، وہی بجائے آگے بڑھنے کے گریز اور فرار کی راہ ڈھونڈنے لگے، اور ان کے سارے پینٹرے، 'داؤنچ' جو مباحثوں میں خرچ ہوتے تھے، 'رڈکی' میں بالکل اس کے برعکس مباحثہ اور گفتگو کے دو کتے میں استعمال ہوتے رہے، کوئی دوسرا کہتا تو شاید شک و شبہ کی کچھ گنجائش بھی ہو سکتی تھی، لیکن اس سے زیادہ معتبر ذریعہ اندر کیا ہو سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی براہ راست یہ شہادت ہے، قبلہ نما کے دیرباہر میں فرماتے ہیں

”مگر پنڈت جی ایسے کا ہے کہ تمہے کو میدان مناظرہ میں آتے، جان چرانے کے لئے وہ وہ
داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سو جھتے ہیں۔“

”داؤ کھیلنا“ تو پنڈت جی کا عام دستور تھا، فرق یہی تھا کہ پہلے کبھی کھیل وہ مباحثہ اور گفتگو کرنے میں کیلتے تھے
اصحاب اسی داؤ کو وہ مباحثہ اور گفتگو کو ملتوی کرنے کے لئے کھیل رہے تھے۔ اس طرف پنڈت جی تو
اپنے سارے کرتب اسی کوشش میں صرف فرما رہے تھے کہ کسی طرح سیدنا الامام الکبیر کا سامنا نہ
ہو، اور دوسری طرف ٹھیک اس کے توڑ پر سیدنا الامام الکبیر کو دکھایا جا رہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو،
پنڈت جی کو میدان میں اتارنے پر مجبور کر رہے ہیں، خود ہی ارقام فرماتے ہیں، کہ برسر عام مباحثہ پر آمادہ
کرنے کے لئے

”منتیں کیں، غیرتیں دلائیں، جھتیں کیں، سحین کرائیں، مگر وہاں (یعنی پنڈت جی کے یہاں)،
وہی نہیں کی نہیں رہی۔“

افسوس ہے کہ ان منتوں، غیرتوں، جھتوں، سحیوں کی پوری تفصیل کا علم نہ ہو سکا۔ منصف امام نے
یہی حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا ہے۔ ”اینڈی سینڈی شڈیں“ بس ان ہی الفاظ میں سب کو
لبیٹ کر انہوں نے رکھ دیا، اور دوسرے ذرائع سے بھی ان تفصیلات کا جیسا کہ چاہئے پورا پورا پتہ چل
سکا۔ چونکہ سولہ سترہ دن تک رد و بدل سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری رہا ہے، اس لئے بظاہر
یہی خیال گذرنا ہے کہ باتیں کافی دل چسپ ہوں گی۔ حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے تفصیل الاکار
میں ایک لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ پنڈت جی نے ایک دفعہ یہ عند پیش کیا کہ۔

”میں اس ارادہ (یعنی مناظرہ و مباحثہ کے ارادہ) سے نہیں آیا ہوں“

تو سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جواب میں کہا گیا کہ

”ارادہ تو فعل اختیاری ہے اب کر لیجئے“

”جیتیں کہیں“ کے اجمال کی یہ ایک مثالی تفصیل ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً نصف ماہ کے اس طویل عرصے میں کتنے نشاۃ انگیز، روح پرور لطائف پیش آئے ہوں گے، لیکن انہیں اس کی ذکر کرنے والوں نے غموں و خاموشی سے کام لیا، تاہم ادھر ادھر سے جن معلومات تک رسائی ہو سکی ہے، انہیں پیش کر دیتا ہوں، زیادہ تر یہ معلومات خود حضرت کی کتاب قبلاً نامہ کے دیباچہ ہی سے فراہم کی گئی ہیں۔ اسی کتاب میں ہے کہ رذکی کی عام آبادی سے جہاں آپ مقیم تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر وہ جگہ تھی، جہاں پنڈت جی فردکش تھے۔ غالباً پنڈت جی کے کسی متعلقہ کا باغ تھا، سیدنا الامام الکبیر نے اطلاع دی ہے کہ

”ہماری فردگاہ سے بلکہ شہر سے ان کا پنڈت جی کا مکان ڈیڑھ میل پر تھا،“ قبلاً نامہ

پنڈت جی کی یہی وہ قیام گاہ تھی، جہاں ان کے کھانے کا وہ تراش دیکھا گیا تھا جس کا ذکر غالباً پہلے بھی کہیں گذرا ہے، امیر شاہ خان صاحب کے حوالے سے ارداع ثلاثہ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر اور پنڈت جی کے درمیان نامہ و پیام کے لانے اور لے جانے کا فرض اس زمانہ میں منشی نہال احمد مرحوم انجام دیتے تھے، خان صاحب روایت کرتے تھے کہ

”منشی نہال احمد کو جو نہایت ذکی تھے، دیانند کے پاس مشرطن مناظرہ طے کرنے کے

لئے بھیجا گیا،“ منشا ارداع

ایک دفعہ جب منشی نہال احمد صاحب پنڈت جی کے پاس موجود تھے۔ پنڈت جی کی رسوائی کا وقت آگیا، بقول خان صاحب مرحوم انہوں نے دیکھا کہ

”کئی بڑی بڑی تھالیں پوریوں کی تھیں، اور سیروں مٹھائی تھی جس کی وہ منشی نہال احمد

کئی آدمیوں کا کھانا کھجے، مگر وہ اکیلے کے لئے آیا تھا، اور اسی تمہانے وہ تھالیں

صاف کر دیں

اسی سلسلہ میں وہ لطیفہ پیش آیا تھا، حبیب سیدنا امام الکیسرتک اس کی خیر پہنچی کر نشی نہال احمد پنڈت جی کے کھانے کی یہ رپورٹ لائے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کھانے میں مقابلہ کی پنڈت جی سے بولنے کی اگر ٹھن گئی تو مجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گا؟ نشی نہال احمد مرحوم جو خود بھی پُرخوری میں کافی نیک نام تھے ان کو ملا کر حضرت والا نے فرمایا تھا کہ اس کے لئے آپ تو ہمارے ساتھ ہیں، تم ہی کو پنڈت جی سے بھڑا دوں گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے، اور زیادہ کھانا زیادہ احتیاج کی دلیل ہے اور احتیاج کمال نہیں نقص ہے، نقص میں بھلا کیا مقابلہ کیا جائے گا؟ خاں صاحب کے بیان میں یہ بھی ہے کہ آخر میں فرمایا گیا تھا کہ کھانے میں مقابلہ کی ٹھہر جائے تو

”کسی بھینسے یا ہاتھی کو لا کر کھڑا کر دینا“

لے پنڈت جی کے کھانے پینے کے قصبے جیسا کہ ان کی سوانح عمریوں سے معلوم ہوتا ہے، کافی دلچسپ ہیں، انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح غری میں لکھا ہے کہ برہم جاری ہو چکی وجہ سے اپنا کھانا خود بچا ناظرنا تھا جس کی وجہ سے میری خواندگی میں ٹوٹاؤ واقع ہوتا تھا، بنا بریں اس کیلئے چھوٹے کیلئے ہیں نے ارادہ کیا کہ جتنی الامکان کوشش کر کے سنیاس آشرم کے جو تھے حور میں داخل ہو جاؤں، سو ہی دیا، مگر اند ان کی تعلیم ۱۹۲۹ء خود نوشت سوانح عمری، یوں گویا بے چارے پیٹ ہی کی بجویا سے سنیا ہی بنے، لہذا دکھانوں کا خاص شوق تھا جس کے لئے سوئیٹا کبار وغیرہ رکھنے کی ضرورت ہوئی۔ پڑھنا حسب مشاء کھانا تیار کرانے کیلئے لکھا ہے کہ میرانوں سے عموماً نقد دیر سوا ہی جی لے لیا کرتے تھے۔ لاہور پہلی دفعہ جب پہنچے تو ارزانی کے اس زمانہ میں بارہ روپیہ فی ہفتہ میرانوں سے وصول کیا کرتے تھے۔ آخر میں ایک رسوئیاں بارہ روپیہ لے کر آئی کہ اس کی سوانح عمریوں میں لکھا ہے زہر کھلا دیا۔ اور ای زہر لے کھانے سے وفات ہوئی۔ تفصیل کے لئے پنڈت جی کی سوانح عمریوں کو پڑھئے۔ نیز کتاب ”سوا ہی دیا“ متاثر ان کی تعلیم ”کاملا نو بھی کافی ہو سکتا ہے، خوش خوراک ہونے کو ساتھ پنڈت جی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کافی خوش پوشاک بھی ہو گئے تھے۔ مرنے کے بعد جیسا کہ میرٹھ کے اخبار آریہ سماج میں چھپا تھا۔ متعدد سرخ زرد کا مدار دوشلے، بیٹھنے کی چادر میں، بیٹھنے کے چنے، ریشمی دوشلے، دھوپ چھاؤں کے ریشمی دوپٹے، لٹری چنے، ریشمی کرٹ، سرخ پٹا، ریشمی کاسے کی دھوئیل، کلا، تون کا دوپٹہ وغیرہ وغیرہ لٹکے تھے۔ پنڈت جی کو تباہی نہیں بلکہ بھنگ وغیرہ چیزوں کے استعمال کی بھی عام عادت تھی ۱۲

لے اس واقعہ میں یہ جزر بھی میں نے اکابر سے سنا ہے کہ حضرت والا نے فرمایا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے نہ کہ نقص میں اور میں بھیجیں جو کر نشی نہال احمد سے فرمایا کہ تم اتنے دنوں صحبت میں رہے تمہارے ذہن میں (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال پنڈت جی شہر سے ڈیڑھ میل دور والے اسی مکان میں بیٹھے بیٹھے 'سوال و جواب' کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھے حضرت دالا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جیسے برسر بازار آپ نے اعتراضات کئے ہیں 'ان کے جواب سننے کیلئے چاہئے کہ آپ برسر بازار آئیں، اپنے اعتراضات کی بیان کریں، اور سب کے سامنے مجھ سے ان کے جوابات سنیں۔ لیکن بجائے شہر آکر کے پنڈت جی کا اصرار تھا کہ گھنگو کے لئے آپ ہی میری قیام گاہ پر آئیے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ دوسری شرط پنڈت جی کی طرف سے یہ پیش ہوئی، کہ آنا ہو، تو مجمع عام کے ساتھ آئیے۔ زیادہ سے زیادہ پچاس آدمیوں کے سامنے گھنگو کا موقعہ دیا جاسکتا ہے، دانشور اعظم ان پچاس آدمیوں میں پنڈت جی کے طرفداروں کا طبقہ بھی شریک تھا، یا حضرت دالا کو پچاس آدمی کی حد تک اپنے ساتھ لانے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے قبلہ نما میں ارقام فرمایا ہے کہ

”اعتراض تو مجمع عام میں کئے۔ پر مناظرہ میں اپنی قطعی کھلے کا وقت آیا تو پچاس

آدمیوں سے زیادہ پر راضی نہ ہوئے“

لکھا ہے کہ دس آدمیوں کی تحدید کی جب پڑھی گئی، تو

”اندیشہ فساد زریب زبان تھا“

”اندیشہ فساد“ کی جو آڑ پنڈت جی نے لی تھی۔ غالباً اسی سلسلہ میں حجت کو تمام کرنے کیلئے اپنی فطرت

بغیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

یہ سوال پیدا کیوں ہوا کہ اگر کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ یہ حال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کون جیتو گا؟ یہ کہہ کر فرمایا کہ میں بھی احمدی پنڈت جی کو کسی بندہ کو ٹھٹھری میں بند کر دیا جائے، اسی طرح پیٹنے تک بلاخود ورزش بند رکھا جائے، اور چھ ماہ بند کھول جائے تو جو تروتازہ نکلے اس سے حق دلائل کا فیصلہ کیا جائے۔ محطیب خنجر

۱۵۔ ”جواب ترکی بر ترکی“ میں یہ لکھ کر کہ ”چاند اور سے پہلے کبھی مولوی محمد قاسم صاحب سے ان کو پنڈت جی کو، پالا نہ پڑا تھا۔ اس لئے دہان ندیس آدمیوں کی قید تھی، مجمع عام ہو، کھلم کھلا اندیشہ دہل کا کھٹکا، نہ تھوڑی حد تک تھی نہ گوشہ تنہائی کی حاجت، جس سے مسلم ہونے کے شروع میں پنڈت جی نے کل دس آدمیوں کو ساتھ لانے کی اجازت دی تھی، پچاس تک رد و رک کے بعد ماضی ہوئے تھے ۱۶

عام دوش کے برخلاف حضرت، دالاس اقدام پر مجبور ہوئے جس کا ذکر قصص الکابرین حکیم الامت
تھانویؒ کے والد سے بایں الفاظ کیا گیا ہے

”مولنا محمد قاسم صاحب رٹ کی دیانند سے مناظرہ کرنے کے لئے گئے اور بھی چند آدمی
ساتھ ہو گئے۔ سنا ہے کہ مولنا ایک جگہ ٹھہرے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا تھا کہ کھانا
بازار میں کھائیں، مجسٹریٹ کو خبر پہنچی، تو اہل وہ بچھا کر دعوت خورے آئے ہوں گے،
مگر جب واقعی بات کی خبر ہوئی، کہ نہ اس طرح کے لوگ ہیں، تو اس کے دمجسٹریٹ
کے ہل میں بڑی قدر ہوئی، اور اس نے مولنا کو بلایا، اور اشتیاق ظاہر کیا۔“

حضرت حکیم الامت نے اس کے بعد بطور جملہ مترضہ کے یہ بیان کرتے ہوئے کہ
مولنا کی عادت تھی کہ کبھی کسی بڑے آدمی سے نہ ملتے تھے۔ ایک دفعہ راجپوت (ریاست) گئے
نواب صاحب کو خبر ہوئی، تو مولنا کو بلایا۔ مگر مولنا نہیں گئے، اور یہ جیلہ کیا کہ ہم دیہاتی
لوگ آداب شاہی سے واقف نہیں ہیں۔ خدا جانے کیا بے ادبی ہو جاوے۔ نواب
صاحب نے کہا کہ آپ کو آداب وغیرہ سب معاف ہیں۔ آپ تشریف لائیں۔ ہمیں
آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ مولنا نے جواب دیا کہ کیا تعجب کی بات ہے کہ اشتیاق
تو آپ کو ہو ملنے کا، اور آؤں میں۔ غرض نہ گئے۔“

مگر پنڈت جی کو جس طرح بھی ہوا، راہ پر لایا جائے۔ محض اس نصب العین کے تحت مجسٹریٹ کے
بلانے پر حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

”ملنے سے انکار نہ کیا۔ کیونکہ اس سے ملنے میں دینی مصلحت تھی۔“

مجسٹریٹ سے ملاقات ہوئی، اور اسی سلسلہ میں پنڈت جی کے طرز عمل کی شکایت کی کہ اعتراض
تو انہوں نے برسرِ اذار کیا، اور اب جواب سننے کے لئے مجمع عام میں اس لئے آنا نہیں چاہتے، کہ
ان کو فساد کا اندیشہ ہے۔ مجسٹریٹ سے بڑھ کر فساد کے اس بے بنیاد اندیشہ کے متعلق اور کوئی اہل
دلا سکتا تھا۔ حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ

”بھٹریٹ نے کہا کہ شاد کے ہم ذمہ دار ہیں۔“

اسی پر کہتے ہیں کہ پنڈت جی نے فرمایا تھا کہ میں نے مناظرہ کا ارادہ نہیں کیا۔ حضرت دالانے جس کے جواب میں کہا تھا کہ اب ارادہ کر لیجئے مگر اس اختیاری فعل پر یہی وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

جیسا کہ قبلہ نما کے حوالہ سے براہ راست حضرت دالانے کے الفاظ نقل کر چکا ہوں کہ ”پنڈت جی نے رٹ کی میں سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراضات کئے“ اسی لئے آپ نے چاہا کہ مجمع عام میں

پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہہ بنائیت خاوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں۔“

الغرض مجمع عام میں جو اعتراضات اسلام پر کئے گئے تھے، آپ کا مقصد تھا کہ جواب بھی ان کا مجمع عام

ہی میں دیا جائے، اسی بنیاد پر سوال ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جب جواب سننے سے پنڈت جی گریز کرتے

رہے، اور اس حد تک اپنے گریز پر ان کا اصرار قائم رہا کہ علامہ کے بھٹریٹ کی نہانت دہانی بھی اس اصرار

سے ان کو ہٹانہ سکی۔ ایسی صورت میں چاہئے تو یہی تھا کہ قصہ کو ختم کر دیا جاتا کہ اصل مقصد یعنی مجمع عام میں

جواب سنانے کا موقع باقی نہ رہا تھا۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے پنڈت جی کا تعاقب جاری

رکھا اور کس حد تک جاری رکھا، قبلہ نما کے دیباچہ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جواب سننے کے

لئے پنڈت جی جب آمادہ نہ ہوئے، بلکہ حضرت دالانے ارقام فرمایا ہے،

”مجمع عام کی جا بدشواری دوسو تک آئے۔“

یعنی بجائے مجمع عام کے پنڈت جی نے کہا بلکہ سمجھا کہ زیادہ سے زیادہ دوسو آدمیوں کے درمیان آپ کے

جوابوں کو سننے کے لئے جہن تیار نہ ہو سکتا ہوں۔ بظاہر جس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ و مباحثہ

کے دونوں فریقوں کے آدمیوں کی تعداد دوسو سے متجاوز نہیں ہو سکتی، اور پنڈت جی کی ضد کہنے، یا ہٹ چوڑا

اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو گئی، بلکہ اسی کے ساتھ یہ فرمائش بھی پیش ہوئی کہ جس جگہ میں ٹھہرا ہوا ہوں وہیں آپ

آئیں، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آگے حضرت دالانے قبلہ نما میں جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”مگر اپنے مکانی تنگ کے سوا اور کہیں راضی نہ ہوئے۔“

اس کا یہی مطلب ہے کہ اپنی فرد گاہ ہی پر سیدنا الامام الکبیر کو آنے پر پنڈت جی نے مجبور کیا، جیسا کہ عرض

کر چکا ہوں کہ پنڈت جی کی یہ قیام گاہ اس جگہ سے جہاں حضرت والا ٹھہرے ہوئے تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھی، یہی نہیں بلکہ شہر جہاں عام مسلمانوں کی آبادی تھی۔ اس سے بھی بھی فاصلہ تھا۔ فساد کا اندیشہ جیسے پنڈت جی کو تھا، یہی اندیشہ دوسری طرف سے بھی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن پنڈت جی کی پشہر طبعی مان لی جاتی ہے، فاصلہ کی درازی کی وجہ سے وقت بچائے شام کے چاہا گیا کہ صبح کو دکھا جائے، تاکہ آمد و رفت میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو، لیکن پنڈت جی نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا، اور بجائے اس کے اپنی طرف سے شام کا وقت پیش کیا اور شام کو بھی چھ بجے کا وقت دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ چھ بجے کے بعد دن ہی کتنا باقی رہتا ہے۔ وقت کی تنگی کی شکایت کی گئی تو کہلا بھیجا کہ چھ بجے سے نو بجے تک میں وقت دے سکتا ہوں۔ ان ہی باتوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ

”وقت صبح کے بدلے چھ بجے شام کے ٹھیرائی۔ کسی وقت کی شکایت کی تو بجے تک اجازت آئی“

قید و بند کے ان سارے قصوں سے مطلب کیا تھا، حضرت والا نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

”نوبے فارغ ہو کر (ڈیڑھ میل کی مسافت کو طے کر کے)، دس بجے (شہر پہنچے، ایک گھنٹہ میں نماز سے فارغ ہوئے۔ اس وقت نہ بازار کھلا ہوا جو کھانا مول لیجئے، نہ خود کھانے کی ہمت جو یوں انتظام کیجئے۔ علاوہ بریں برسات کا موسم، سینہ برس گیا، تو اور بھی اللہ کی رحمت ہو گئی“

تہ کی بات ہے جیسا کہ حضرت ہی نے لکھا ہے کہ

”ان کی (پنڈت جی کی)، یہ غرض تھی کہ یہ لوگ (یعنی سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء، تنگ ہو کر چلے جائیں اور ہم غفلتیں بجائیں“

کچھ تحریری، تقریری مناظر کی بحث بھی معلوم ہوتا ہے پنڈت جی کی طرف سے چھیڑی گئی حضرت کے الفاظ ”پھر اس پر عہد و تقریر کی شاخ ادر لگی ہوئی“

سے ہی سمجھ میں آتا ہے۔

بہر حال جہاں تک واقعات کا اقتضاد ہے۔ ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی سیدنا امام اکبیر سے سامنا کرنے کے لئے حقیقت کسی شرط پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن ٹھیک اس کے مقابلہ میں سیدنا امام اکبیر کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو آپ چاہتے تھے کہ دودھ و گھٹ کر کے کامو قہ پنڈت جی سے مل جائے۔ اسی لئے جو شرط اور قید و بند کی جو صورتیں بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی رہیں، سیدنا امام اکبیر ہر ایک کو تسلیم کرتے چلے جاتے تھے، خود ہی کھا ہے کہ

بنام خدا ہم نے سب باتوں کو سر رکھا۔

گر یا مان لیا گیا کہ آپ نہیں آتے، ہم ہی آتے ہیں۔ صبح کو نہیں شام ہی کو آئیں گے۔ کھانے پینے کا نظم ہو یا نہ ہو بہر حال برسات کی کالی سیلی راتوں میں دس بجے ہی بھی ہم واپس ہوں گے۔ لیکن پنڈت جی نے اپنی فرد و گاہ والی شرط جو پیش کی تھی، اسی میں ایک قانونی راز بھنک کر رکھ رکھا۔ رٹ کی میں فوجی چھاؤنی اس وقت تک قائم ہو چکی تھی۔ اور باغ جس میں پنڈت جی ٹھہرے ہوئے تھے، کنسٹنٹ ہی کی۔ حدود کے اندر راقع تھا۔ فوجی قانون کی رو سے کنسٹنٹ کی حدود میں مذہبی بحث و مباحثہ کے جلسوں کی قانوناً اجازت نہیں ہوتی، پنڈت جی اس فوجی دستور سے غالباً واقف تھے۔ کنسٹنٹ والوں کو جب اس کا علم ہوا کہ چھاؤنی کی حدود میں اس قسم کا قہہ پیش آنے والا ہے، تو جیسا کہ حضرت والا نے لکھا ہے

”حکام وقت نے قطعاً ممانعت کر دی کہ سرحد چھاؤنی رٹ کی میں مناظرہ نہ ہونے پائے ہو“

اس سے خارج ہو، تو کچھ ممانعت نہیں۔“

یوں پنڈت جی کی قیام گاہ کا قہہ ختم ہو گیا، اور یہی پنڈت جی کی غرض بھی تھی مگر اس کے بعد بھی سیدنا امام اکبیر نے چاہا کہ قہہ ختم نہ ہو، کنسٹنٹ کی حدود کے باہر بعض مخصوص مقامات تھے۔ انتہایہ ہے کہ عید گاہ جس کی حیثیت گونہ مسجد جیسی تھی اس کے میدان تک میں حضرت والا ماضی ہو گئے کہ پنڈت جی

آنا چاہیں تو ہم ان کا استقبال کریں گے، خود ان کے الفاظ ہیں کہ

”ہم نے میدانِ عید گاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماس قدم رنجہ فرمائی کیا۔“

مگر خدا ہی جانتا ہے کہ ذہنی پنڈت دیا تندرستی جو دنیا بھر کو مناظرہ اور مباحثہ کا چیلنج دیتے پھرتے تھے ان پر کیا حاصل طاری تھا، کہ کسی طرح وہ رد و رد ہونے پر آمادہ نہ ہوئے اور اس سے بھی حیرت انگیز بنا الامام اکبر کا طرزِ عمل ہے، کہ روزِ دور و روزِ نہیں، نصف ماہ سے زیادہ مدت تک تمام مشاغل سے الگ ہو کر رز کی ہی میں صرف اس لئے خیمہ زن ہو گئے، کہ جس طرح بھی ممکن ہو پنڈت جی سے براہِ راست مکالمہ اور گفتگو کا موقع پیدا کیا جائے۔ پنڈت جی کی طرف سے شہرہ ط پر شر و ط کے اضافے ہوتے چلے جاتے تھے، اور آپ ہیں کہ ان کی ایک ایک شرط کے سامنے تسلیم خم کئے چلے جاتے ہیں گویا طے کئے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن ایک دفعہ تو اپنی بات ان کے کانوں تک پہنچا کر رہوں، آخر میں تو جد ہو گئی، یعنی جب آپ کو معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے قربانی مکالمہ پر پنڈت جی تیار نہ ہوں گے تو آپ کی طرف سے پنڈت جی کے پاس یہ پیغام پہنچا کر

”مرضی ہو، تو آؤ، مناظرہ تحریری بھی“

حضرت والا نے اپنے اس پیغام کو نقل کرنے کے بعد اطلاع دی ہے کہ

”مگر جواب تو درکنار پنڈت جی نے اپنی راہ لی۔ شکر میں بیٹھ، یہ جاوہ جا“ ص ۱۷

حقیقت تو یہ ہے، کہ پنڈت جی کا ناقابلِ فہم گریز، اور سیدنا الامام اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا اس کے مقابلہ میں تعاقب حیرت انگیز، دونوں ہی کی حقیقت ایک حتمہ کی سی معلوم ہوتی ہے۔ پنڈت جی کو سیدنا الامام اکبر کی ملاقات خدا شناسی کے سلسلے میں ہو چکی تھی، بیان کر چکا ہوں کہ دونوں میں انفرادی طور پر گفتگو بھی ہوئی تھی، آپ نے پنڈت جی کو روک کر کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن پنڈت جی یہ کہتے ہوئے کہ ”اب بھوجن کا وقت آگیا ہے اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا“ مثلاً مباحثہ شاہ جہاں پور

کچھ بھی ہو، دونوں میں گونہ شناسائی بھی پیدا ہو چکی تھی، پھر میلے کے جلسوں میں حضرت دالاک کی تقریر کے سننے کا کافی موقع بھی پنڈت جی کو مل چکا تھا، آپ کی علمی قابلیت کا اعتراف بھی جیسا کہ نقس

کر چکا ہوں۔ پنڈت جی کرچکے تھے، آپ کی انکلاطج، نظری نرم مزاجی، صلح پسندی وغیرہ کے اندازہ کرنے کے لئے جی باتوں کی ضرورت تھی، جہاں تک میرا خیال ہے، ان کا مشاہدہ، کہنے، یا تجربہ بھی پنڈت جی کرچکے تھے، 'بائیں ہمدردی میں سامنے آنے سے پنڈت جی کیوں گیز کرتے رہے، جیسے سرے لئے سوال کچھ ناقابل عمل سامعہم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت والا کے طرز عمل کی صحیح توجیہ سے اپنی آپ کو عاجز پاتا ہوں۔ صرف اعتراضوں کا جواب ہی دینا تھا تو اس میں شک نہیں، بہتر صورت تو یہ ضرورت تھی کہ جیسے مجمع عام میں پنڈت جی نے اعتراضات کئے تھے، جوابات بھی اسی مجمع عام میں ان کو ادرجع والوں کو سنا دیے جاتے، لیکن جب اندازہ ہو گیا تھا کہ پنڈت جی اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں، تو امتیاز جن کے سامنے مجمع کے سامنے جوابوں کی تقریر کافی ہو سکتی تھی، جیسا کہ بعد کو یہی کیا بھی گیا، خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

”مجبور ہو کر یہ ٹھہرائی، کہ جو ان کے اعتراض سامنے والوں سے سامنے ہیں، ان کے جواب مجمع عام میں مستند دیں، مگر چونکہ یہ بات ایک جلسہ میں ممکن نہ تھی، اور ہم کو دربارہ توحید رسالت وغیرہ ضروریات دین (اسلام)، بھی کچھ عرض کرنا تھا، اور بوجہ هجوم پائش و خرابی راہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی (اس لئے) ایک جلسہ میں تو ان تین اعتراضوں کے جواب سنائے جو سب میں شکلی تھے اور دو جلسوں میں توحید و رسالت کا ذکر کر کے خوب بہت دسوم ماہ شعبان کو درڑکی سے روانہ ہوا، اور ایک دن چھوٹا اور تین دن دلو بتھیر کر تائیسویں کو ہی قصیرانہ میں جس کو نانوہ کہتے ہیں، اور اس خاکسار کا دل بھی یہی ہے پہنچا“

حاصل جس کا یہی ہے کہ ”یہ جا دو جا“ کا نایوس کن نظارہ پنڈت جی کی طرف سے جب پیش ہوا، اور یقین ہو گیا کہ شافقتہ ان سے مکالمہ کی کوئی صورت باقی نہ رہی، تو تین جلسوں میں درڑکی والوں کو مخاطب بنا کر تقریریں کی گئیں جس میں پنڈت جی کے اعتراضوں کے جوابات بھی دیئے گئے، جو دوسریں نے حضرت والا تک پہنچائے تھے۔ چونکہ پنڈت جی کے ان اعتراضوں کا چرچا درڑکی کے سیاد دوسری جگہوں میں بھی

پھیلا ہوا تھا۔ خصوصاً جہاں جہاں پنڈت جی نے تقریریں کی تھیں۔ ان لوگوں تک جوابوں کو پہنچانے کے لئے، اور شاید اس لئے بھی کہ کتابی صورت میں ممکن ہے کسی نہ کسی شکل میں پنڈت جی تک بھی ان کے اعتراضوں کے جوابات پہنچ جائیں۔ آپ نے اپنی کتاب قبلہ نما مرتب فرمائی جیسا کہ دیباچہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

میں ان (ناتوث) اگر یہ چاہا کہ بنام خدا اور بارہ اعتراض پنڈت جی صاحب اپنے ارادہ مکملوں کو پورا کر دیں، یعنی ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کر دیں، تاکہ اس نامریاہ کے حق میں دغا کا ایک بہانہ ہاتھ آئے، اور خدا تعالیٰ کی عنایت اور رحمت و مغفرت کو اپنی کارگزاری کا موقع ملے، الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرا ارادہ پورا کیا، اور میری فہم نارسا کے اندازے کے موافق اعتراضات مذکورہ کے جوابات مجھ کو بھیجائے۔

اسی کے بعد پنڈت جی کے اعتراضات میں سے پہلے اعتراض کو بایں الفاظ نقل فرما کر یعنی، "مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں، اور خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں، جو مسلمان جواب دیتے ہیں، بعینہ بت پرست کہہ سکتے ہیں، اس لئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں۔"

مسجد نالام اکبیر نور اللہ قلوبنا انوار علومہ و معارفہ نے جواب میں حقائق و اسرار کے سرلمبر گنجینوں کو دو قف عام فرما دیا ہے، صرف اسی اعتراض کا جواب "قبلہ نما" کے نام سے شائع ہوا، جس کے مضامین پر بحث کرنے کا موقعہ یہاں نہیں ہے، کتاب اردو زبان میں ہے پڑھنے والے چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔ پنڈت جی کے باقی اعتراضات کیا تھے، ان اعتراضوں کے جوابوں کو قلم بند کرنے کا موقعہ حضرت دالاکو ملایا نہ ملا اس کا پتہ نہ چل سکا۔ قبلہ نما کے دیباچہ کی مذکورہ بالا عبارت خصوصاً یہ ارقام فرما کر "ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کر دیں" آگے یہ اطلاع جو دی گئی ہے، کہ "الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرے ارادہ کو پورا کیا۔"

نظاہر اس سے تو یہی کچھ میں آتا ہے کہ اس اعتراض کے سوا پنڈت جی کے دوسرے اعتراضوں کا

جواب بھی زیر تحریر آچکا تھا، لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہ ہو سکا۔

مگر سچ یہ ہے کہ اسی ایک اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے۔ وہی بیسیوں اعتراضوں کے جواب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اسی سے آغازہ کیجئے کہ اعتراض جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، کل تین سطروں میں ختم ہو گیا، لیکن متوسط قطع کے ایک سو سو صفحات صرف اسی ایک اعتراض کے جواب میں اس لئے کافی ہوئے ہیں، مگر سطر میں حد سے زیادہ گنجان اند گھنی ہیں، در نہ عام کتابت کے لحاظ سے جہاں تک سیر تخمینہ ہے کم از کم تین سو صفحات سے کم میں یہ کتاب ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

بہر حال پنڈت جی کا مسلمانوں پر کعبہ پرستی، اور کعبہ کی دیواروں کے پتھروں کی پرستش و عبادت کا الزام بجائے خود اس کی نوعیت جو کچھ بھی ہو، ان کے علم و فضل، فکر و نظر کے متعلق جو رائے بھی اس اعتراض کے سننے والے قائم کریں، لیکن ہم تو پھر بھی سپاس گزار ہی ہیں، کہ ان ہی کے بھڑکائے ہوئے شر سے خیر کا دروازہ ہم پر کھل گیا۔ سیدنا الامام اکبر نے ان کی اسی مضحکہ خیز احتجاج کے جواب میں حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قلمبند فرمایا، وقف عام فرمادیا، پس محرک اور باعث تو اس خیر کے پنڈت جی ہی ہوئے، در نہ سچ یہ ہے کہ الکعبہ دیا اول المساجد کی طرف رخ کر کے خانی کائنات کی عبادت

لے جیسا کہ مسلم ہے، مگر عطاقت نہیں، بلکہ خانی کائنات کی عبادت و پرستش کے لئے قرآن نے اطلاع دی ہے، کہ سب سے پہلا گھروہی ہے جو کہ اپنی دادی کو میں تعمیر ہوا، اسی لئے الکعبہ کو ہم اپنی سب سے پرانی مسجد سمجھتے ہیں، اس کی قدامت ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں البیت العتیق ویرانا گھر کے نام سے بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ الغرض اپنی سب سے پہلی تاریخی مسجد کو مرکز بنا کر دنیا کے جس حصہ میں مسلمان پائے جاتے ہیں، اسی کی طرف رخ کر کے نماز میں پڑھا کرتے ہیں۔ اسی لئے حدیثوں میں آیا ہے کہ جعلت لی الارض مساجد و زمین کا مساجد ہی میری مسجد گاہ ہے، یعنی الکعبہ کی مرکزی مسجد کا صحن بیطارض کو قرار دے کر نماز کا جہاں وقت آجاتا ہے ہم اپنی اس پرانی مسجد کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتے ہیں، یا زمین کے کرے پر جہاں کہیں مقامی مسجد بنانے ہیں اس کو مرکز سے مربوط کرنے کے لئے رخ اس مسجد کا الکعبہ ہی کی طرف کرتے ہیں، اپنی عبادت میں مسلمان اسی لئے مشرق و مغرب و شمال و جنوب وغیرہ سمت کے پابند نہیں ہیں۔ ہندوستان والے مغرب کی طرف رخ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے حساب سے یہ پرانی مسجد مغربی سمت میں واقع ہوئی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جہاں کے مسلمانوں کے لحاظ سے جس سمت پر بھی یہ پرانی مسجد واقع ہوئی ہے اسی طرف نماز میں ان کا رخ ہوتا ہے خود الکعبہ کی رہائی دلاؤ صغیر

جو مسلمان کرتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اگر واقعی پنڈت جی اس مخالط میں مبتلا ہو گئے، کہ مسلمان کعبہ اور کعبہ کی دیواروں کو پر جتے ہیں، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ اسلامی تعلیمات کو ابتدائی اور عام بنیادی معلومات سے واقفیت حاصل کئے بغیر اسلام پر تنقید کرنے کے لئے ذہ آمادہ ہو گئے تھے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ مسجدوں میں مسلمانوں کو نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھ کر آج تک کسی عامی سر عامی ناخواندہ ہندو کو بھی اس کا شبہ نہیں ہوتا کہ مسجد کی دیوار یا دیوار کی اینٹوں کو مسلمان پر جتے ہیں، یا کھیتوں، میدانوں میں ان کی نمازوں کو دیکھ کر آج تک کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی کہ سامنے کی ہوا، یا درخت پہاڑ وغیرہ جو نظر آتے ہیں، ان کی مسلمان عبادت کرتے ہیں، سیرت بہ تہی بہ کہ پنڈت سبھی یہودی آدمی کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آئی۔ سیدنا امام الکبیر نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

”اگر خود پنڈت جی کو ایسی باتوں میں فرق کرنا نہیں آتا، تو یہ شہرہ کمال کس خیال پر مبنی ہے؟“

حق تو یہ ہے کہ اسلامی دین سے اتنی ناواقفیت کا اقتساب بھی پنڈت جی کی طرف مشکل ہے، اور نہ اتنی سبک مغزی، خوابیدہ دماغی، کی ان سے توقع ہو سکتی ہے، جسے ایک جاہل اندنا خواندہ آدمی کی طرف منسوب کرنے کی بھی ہم جرات نہیں کر سکتے۔

بلکہ پنڈت جی کی ذہانت مشابہشی اور داد کی سستی ہے کہ جاہلیت و شرک، دبت پرستی کے تاریک ایام میں بھی سب کچھ پوچ ڈالنے کے باوجود عرب کے جاہلوں کے دلوں میں بھی کعبہ اور ان پتھروں کی عبادت کا خطرہ نہ پیدا ہوا، جن سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی۔ ان اصنام اور بتوں یا مورتیوں کو تو وہ ضرور پر جتے تھے، جنہیں جہالت کے ان ایام میں کعبہ کے اندر انہوں نے داخل کر دیا تھا، لیکن جس عمارت میں ان کے یہ بت رکھے ہوئے تھے، اس کو قطعاً انہوں نے نہ کبھی پوجا اور نہ اپنا معبود سمجھا، اور وہی کیا کو نیا کی بت پرست قوموں نے شاید ان مندروں اور شوالوں یا بتخانوں کی

درجہ صفحہ گذشتہ عمارت کا براہ راست سامنے چونا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ تعمیری ضرورت یا کسی اور وجہ سے کعبہ کی یہ پرانی مسجد خیمہ بھی ہو جائے جب بھی نمازوں میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل کے لئے قبل نما

عمار توں کو کبھی نہیں پوچھا، اور نہ معبود بنایا، جن میں اپنے بتوں کو وہ بٹھاتے تھے، یا آج تک بٹھا
ہیں۔ گویا انسانی تاریخ میں پنڈت جی پہلے آدی ہیں، جن کے سینے میں کسی معبد کی عمارت کی موجودیت
کا انوکھا خیال جلوہ گر ہوا، اور اپنے دل کے اسی خود آفریدہ خیال کو غریب مسلمانوں کے سرانہوں نے
منٹھ دیا، جیسے ان کا یہ ذہنی اشتغال بے نظیر ہے، اسی طرح بلکہ شاید اس ہی بھی کچھ زائد ہی ان کی یہ دیدہ
دلیری اپنی آپ شال ہے کہ منٹھ منٹھ کے لئے کسی اور قوم کا نہیں، بلکہ مسلمانوں ہی کا سران کو موزوں نظر
آیا، کچھ بھی ہو، پنڈت جی کو اتنا بھولا بھالا، سیدھا سادھا، انجان یا طفل نادان کیسے مان لیا جائے کہ
واقع میں کوہ کو وہ مسلمانوں کا معبود سمجھتے تھے، پس صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے سیدنا امام اکبیر نے ارقام فرمایا ہے کہ

”اگر دین و دانستہ یہ حال ہے، تو پھر کچھ اور احتمال ہے، میں کیا عرض کروں، عاقلان
خودی دانند؟“

میں تو حضرت دلا کے ان الفاظ میں حد سے زیادہ اجمال دیکھتا تھا کہ وہ ان کل الفاظ میں کچھ کہنا چاہتے تھے،
مگر مصلحتاً قلم روک لیا گیا، تاہم آخر میں

”عاقلان خودی دانند“

کا جو فقرہ بے ساختہ قلم مبارک سے نکل گیا ہے، سمجھئے تو اس میں کچھ الہام کا رنگ نظر آتا ہے، جس
احتمال کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، قطعاً اپنے اصلی رنگ روپ میں اس وقت تک سامنے نہیں
آ سکتا، جب تک عقل انسانی ابھارے ہوئے جذبات کے بھیاروں کے نیچے دب کر رہے گی۔

ہاں، چھوڑے جذبات کے بھیاروں کی گندگی سے ملک کے باشندوں کی عقلیت جب
پاک ہو کر آباد ہوگی، اور کبھی نہ کبھی تو بہر حال یہ ہو کر رہے گا، آج ہو، یا کل، تب صحیح تہذیبی قیمت
حضرت دلا کے الفاظ

”عاقلان خودی دانند“

کی پہچانی جائے گی، ورنہ اس وقت ہم جس حال میں ہیں، ملک کے اچھے اچھوں کو سعدی کے اس

چراغے کہ بیوہ نے برفروخت

بے دیدہ باشی کہ عالم بسوخت

کامطلب کچھانا آسانی نہیں ہے، مگر تاریخ گواہ ہے کہ کسی بیوہ عورت کے جلانے ہوئے

لے ہائے بے چارے برعکس لال رخت کا وہ فوج کئے یا بین اجڑیں روئے دلے نے یہ کہہ کہہ کر خود دوا اور
دوسروں کو دیا ہے۔

ہوئے پنجاب کے ٹکڑے ہوئے مگال کے ٹکڑے
گرے کٹ کر کہیں مار کے کہیں اطفال کے ٹکڑے
سحر آئی وطن میں ظلمتیں لے کر مگر آئی

یہی وہی ہے 'ہوئے پنجاب' ملک خستہ حال کے ٹکڑے
اڑنے تہذیب آدم کے گھرے جال کے ٹکڑے
پچا دہ دن ہے جب اغیار کی اسید رآئی

اور اسی کے بعد بے چارے کی یہ کراہ

دیوں میں جاگ اٹھی نفرت بھی دیرینہ عداوت بھی
وہ حشر اٹھا کہ اب تک رہی ہے آدمیت بھی
جو اپنے وقت کے قاتل تھے بے زہر گز سہلے

یہی وہ دن ہے جس کے ساتھ ہی آئی قیامت بھی
یہ کام آئی ہزاروں سال کی آپس میں الفت بھی
جواں اولادیں رہتے تھے وہ بے گھر ہو گئے سارے

ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ جب خالص عقلی تنقید کی روشنی میں کیا جائے گا تب عقل داغے جانیں گے ان
باتوں کو جنہیں آج ہم شاید سن بھی نہیں سکتے، یہ مسئلہ کافی طویل و تفصیل طلب ہے۔ ہندوستان کی سیاسی
تاریخ سے پنڈت جی کا بھی کچھ تعلق ہے، پہلے تو اسی کا سراغ لگانا پڑے گا۔ پھر پنڈت جی کی خود نوشتہ
اور دوسروں کی لکھی ہوئی انگریزی ہندی اردو زبانوں کی سوانح عمریوں سے پنڈت جی کے نظریہ رجحانات
کا پتہ چلائے گا، جب شیومت اور دشنومت کے جکر میں تھے اس وقت جے پور پہنچ کر ادھم چھانا، دشنومت
کی توہین و تمجیر میں اتنا غلو کر راجہ صاحب جے پور کے اعطیل کے گھوڑوں کے گلے میں بھی شہیدیت کی
نشانی پر مداکش کی مالائیں ڈھواتے پھرتے تھے۔ اس سلسلہ میں پنڈت جی کا انگریزوں کے بڑے بڑے
عہدہ داروں مثلاً گورنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ سے ملاقات کر کے اس خیال میں امداد طلب کرنا کہ جو لڑے تنوں
درجی دشنومت کے سوا سارے ستریں اور پتھروں کو مٹانا چاہئے، یہ حال تو ابتداء میں تھا، پھر جب
ہندو مذہب کے مختلف فرقوں کے دائرے سے باہر نکل کر میدان میں آئے انھیں کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا وہ
بوسے اس کا حاصل یہی تھا کہ جس مدت کو پنڈت جی نے آدی سماج کے نام سے قائم کیا ہے اس کے سوا کسی مدت یا
مذہب کے ماننے والے کو جینے کا حق نہیں ہے، خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی ہو، سکھ ہو، یہی عام باتیں ہیں
جو پنڈت جی کی سوانح عمریوں، بلکہ خود نوشتہ تصنیفوں میں بھری ہوئی ہیں ۱۲

مٹی کے دیا سے شہر کا شہر خاک سیاہ ہو کر رہ گیا۔

بہر حال جس "احتمال" کے سمجھنے کے لئے عاقلوں کی ضرورت سیدنا امام البکیر نے محسوس کی ہے، یہ ایسی ضرورت ہے کہ جب تک صحیح معنوں میں عقل رہی جگہ واپس نہیں ہوتی، لاکھ سمجھانے کی کوشش کی جائے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے اور تو اور ایسے سنجیدہ دل و دماغ والے لوگ جیسے لالہ لاجپت رائے تھے ان تک کا خیال یہ ہو کر

"سودیشی اور نان کوآپریشن کے اصول بہانہ گاندھی کے میدانِ عمل میں آنے سے بہت پہلے سرمایہ دیا نند سے لیکھے تھے" دیا نند اور ان کی تعلیم ۱۳۱۱ بھولا اخبار بندے مارم

مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۱ء

گویا گاندھی جی کی تحریک کا رشتہ لالہ جی کے نزدیک پنڈت جی کے دل و دماغ سے ملا ہوا تھا اسی طرح گردل کانگریسی کے ساتھی پرنسپل پروفیسر رام دیو بی۔ اے جن سے ملاقات کا موقعہ خیر کو بھی ملا تھا وہ بھی صاف صاف لفظوں میں لکھتے ہوں کہ

"بہانہ گاندھی تو سرمایہ جی کی پرنسپل خلافتی کو صرف عملی صورت دے رہے ہیں"

(اخبار جیون تو مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۲۱ء)

اور حالیکہ گاندھی جی اپنے بعض مضامین میں یہ لکھ کر چھاپ چکے ہیں کہ ستیاگرہ پر کاش میں گندگی اچھالنے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ وہی مثل ہوئی کہ مدنی سست گواہ جیت۔ محمد طیب غفرلہ، جہاں یہ اور اسی قسم کی باتیں سمجھی اور سمجھائی جاتی ہوں، وہاں غریب عقل کے لئے راہ پانے کی امید ہی کیا کی جاسکتی ہے۔

پس مناسب یہی ہے کہ آلے والے مالکوں کا انتخاب کرتے ہوئے ہم بھی اس داستانی کو سرسبز چھوڑ کر دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پنڈت جی سے براہِ راست مکالمہ اور مخاطبہ کے مواقع کی تلاش میں سیدنا امام البکیر کے حد سے گزرے ہوئے اصرار کی یہ توجیہ کہ مسلمان کعبہ کے معبود اور مسجد کو

نہیں پوچھتے پنڈت جی کے ذہن نشین اندسائل کے ساتھ خصوصیت سے اسی مسئلہ کو کرنا چاہتے تھے اور صرف اتنی سی بات سمجھانے کے لئے مرض و ضعف کی حالت میں چند روز سولہ دن تک رٹکی میں آپ ٹھہرے رہے اس ماہ میں پنڈت جی کی اینڈی بینڈی مشہد طوں کو سلسل تسلیم کرتے چلے گئے تا آنکہ آپ کی فطرت کے لحاظ سے آج بھی ہم جس کا تصور نہیں کر سکتے۔ یعنی اسی سلسلہ میں انگریز حاکم کی کوٹھی تک پہنچے اور قیام امن کے سلسلہ میں امداد کے طالب ہوئے، خود سوچنا چاہئے کہ کس حد تک قرین عقل و قیاس توجیہ ہو سکتی ہے، یہی نہیں بلکہ پنڈت جی کی طرف سے یہ جادو جال کا تراشا جب پیش آیا، یعنی شکر میں بیٹھ کر رٹکی سے روانہ ہو گئے۔ اور اس کے بعد آپ کو بھی مجبوراً رٹکی چھوڑنی پڑی۔ اسی کا ذکر فرماتے ہوئے یہ جو ارقام فرمایا گیا ہے۔

”بوجہ نجوم بارش، و خرابی ماہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔“
 بظاہر ان الفاظ سے ہم بھی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ وقتی رکاوٹیں اگر پیش نہ آجائیں، تو آپ کے قیام کی مدت شاید اور بھی زیادہ دراز ہو جاتی۔ قبلہ نماہی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ ابتداء ماہ شعبان میں آپ رٹکی پہنچے تھے، اسی کتاب میں یہ اطلاع آپ نے دی ہے کہ

”بست و سوم ماہ شعبان کو رٹکی سے روانہ ہوا۔“

گویا کم و بیش یہی سمجھنا چاہئے کہ ماہ شعبان کا اکثر بیشتر حصہ رٹکی ہی میں گزرا، امد موانع نہ پیش آجائے خصوصاً قیام و سیام کا مہینہ رمضان سر پر نہ ہوتا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ پنڈت جی کے قاقب کا یہ سلسلہ کہاں تک پہنچتا، اور پہنچتا کیا معنی؟ ”جو اسب ترکی بہ ترکی“ میں جن واقعات کی طرف اجمالی اشارے کئے گئے ہیں، افسوس ہے کہ تفصیلات کا تہ ان کے علم نہ ہو سکا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد مقامات میں اس قسم کے فترتوں کے ساتھ مثلاً

”پنڈت جی بجائے پھرتے ہیں، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کے

پیچھے پیچھے ہیں۔“ ۵۱

یاد دسرے موقع پر اس مشہد شعر کو درج کرتے ہوئے، یعنی

ہم وہ نہیں کرتے ہو کہیں اُنہ کہیں ہوں میں

میں ہوں تمہاں ماسایہ جیاں ہم وہیں ہوں میں

حضرت والا کی طرف سے پنڈت جی کو خطاب کر کے لکھا ہے کہ

”غرض جس چال آپ چلتے ہیں، ہم بھی ساتھ ہی پیچھے چلے آتے ہیں۔“

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عام ہتھکنڈا زیادہ تر مسلسل تعاقب کے ان مواقع میں پنڈت جی کی طرف سے جو استعمال ہوتا تھا، وہ وہی فساد اور ہنگامہ کے اندیشہ کا تھا، اسی کتاب جواب ترکی بر ترکی میں جس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”فساد کا وقت تو وہ تھا کہ پنڈت جی مجمع عام میں جی کھول کر مسلمانوں پر اعتراض کرتے

تھے۔“

اور زیادہ تر یہی صورت پنڈت جی نے اختیار کر رکھی تھی، لیکن سیدنا الامام البکیر جب ان سے براہ راست گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے، رڑکی میں آپ سن چکے کہ علاقہ کا انگریز مجسٹریٹ اسن دمان کی حسانت دے رہا تھا، پھر رڑکی میں بھی انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی، یہی حال میرٹھ کا بھی تھا، ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

”گو تو ایساں کنسٹبل بکثرت سالہ ٹیٹن، بھیمنٹ لال کرتی موجود، اس پر بھی پنڈت جی کو خوف ہو۔“

انگریزوں کے جلال و جبروت کی قوتوں سے اس زمانہ میں سارا ہندوستان کانپ رہا تھا بقول مصنف کتاب کے

”فرمان رواے لاچور، اور بادشاہ لکھنؤ، راجا جاکے بڑودہ، اور کابل تو سرکار (انگریزی) سے منع ملا ہی نہ سکیں۔“

آگے اسی کے بعد ان ہی کے الفاظ ہیں

”فساد کرینگے تو کوئی؛ مولوی محمد قاسم صاحب جو طبعوں کی مزوریوں کر کر اپنا پیٹ پالیں۔“

اسی کے ساتھ ان ہی کی یہ بات کتنی صحیح ہے کہ

”علامہ وریں اگر فساد ہوتا تو اول مولوی محمد قاسم اور ان کے ہوا خواہ گرفتار ہوتے پنڈت جی کو اتنا ہی کافی تھا کہ ہم تو پہلے کہیں تھے“

حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کو جب ہم سوچتے ہیں، تو قسمت کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے مل کر گھٹاواہ بات چیت کرنے سے کیوں کتراتے رہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ملنے کے بعد دونوں کے درمیان کن کن مسائل کا ذکر آسکتا تھا۔ آخر ڈکی ہی میں دیکھنے والوں نے اسی زمانہ میں جب دیکھا تھا، حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اس روایت کے رادی ہیں کہ ڈکی کا وہی انگریز مجسٹریٹ جس نے حضرت دالاکو بلا کر ملاقات کی تھی، اور اس دامان کی ضمانت لی تھی، انیسویں صدی کی وہی انگریز نے اسی وقت جو انگریزی قوم کے اتحاد دے دیں کا گویا عہد شباب تھا، اسی نے باتوں باتوں میں سیدنا الامام الکبیر سے

”بارش کی کمی کی وجہ پوچھی“

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ جواب میں

”مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کر دیا کہ گناہ سبب ہیں کی بارش کے“

یہاں تک تو غیر کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تعجب ہو، لیکن آگے حضرت تھانوی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”وہ (یعنی انگریز مجسٹریٹ) بہت ہی محظوظ ہوا اور مولانا کے علم کا قائل ہو گیا، اور بہت

اچھی طرح پیش آیا۔“ قصص الاکابر الہادی مشہور ماہ جمادی الاولیٰ

ہم جب اس خبر کو پڑھتے ہیں، تو خیال گذرتا ہے کہ انیسویں صدی میں جب ایک انگریز کو سیدنا الامام الکبیر سے بھجھا سکتے تھے، کہ بارش کی قلت اور قحط خدا کی نافرمانیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے علمی احترام کی وجہ آپ کی ہی تقریریں سکتی تھی، تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ پنڈت جی سے براہ راست گفتگو کرنے کی کوشش میں سیدنا الامام الکبیر اگر کامیاب ہو جاتے تو آپ کے خیالات و احساسات پر پنڈت جی

بھی متاثر نہ ہوتے، اور جو رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، یا چڑھایا گیا تھا، ازالہ نہ ہی، شدت اندیزی میں اس کے کچھ کمی نہ ہو جاتی،

لیکن جو واقعہ پیش ہی نہ آیا، اب اس کے کثرات و نتائج کے متعلق کیا سوچا جائے، رنظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آئندہ ہندوستانی تاریخ میں ثریا تک جو دیوار اس لئے کج ہوتی چلی گئی، کہ پہلی اینٹ ہی اس کی کج رکھی گئی، شاید اس کی کجی اس حد تک نہ پہنچتی، کہ بالآخر اپنے اوپر وہ خود گر پڑی گھر کے چراغ ہی سے گھوٹیں آگ لگ گئی، پیرانا قدیم تجربہ ہے کہ سلائی سے جس جھرنے کے منہ کو بند کرنا ممکن تھا، جب جاری رہنے کیلئے وہی کھلا چھوڑ دیا گیا تو

”جو پر شد نشاء گدشتن بہ پیل“

ہاتھیوں سے بھی دکھا گیا ہے کہ اس کی رو کو روکنا نامکن نظر آ رہا ہے۔

آخر یہی انگریز مجسٹریٹ تو تھا، عرض کر چکا ہوں، کہ حضرت والا اور آپ کے رفقاء کی طرف سے ابتدائی احساس اسی کے دل میں بقول حضرت تھانویؒ پیدا ہوا تھا کہ

۱۔ پہلے بھی کچھ اشارے کر چکا ہوں کہ ایک ٹیوٹور کا جس میں ہندوستان کے اچھے لکھے پڑھے تعلیم یافتہ لوگ مشرک ہیں۔ خیال تھا کہ ہندوستان میں سیاسی جدوجہد کی ابتدا پنڈت دیانند سرسوتی جی نے کی، پروفیسر رام دیوبی۔ ۱۰۔ اے تو ہندوستان کی پولیٹیکل بیداری کا جنم داتا اور بانی مہاتما پنڈت جی کو کہا کرتے تھے، ”دیکھو اخبار جیونی تو مورخہ، فروری ۱۹۲۳ء، ڈاکٹر ستیہ پال کی تقریر لاہور کے انگریزی اخبار ٹریبون میں چھپی تھی۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ جو مہمان وطن اس سرزمین (ہند) میں کبھی پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑے محب وطن رشی دیانند تھے (اخبار مذکور مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۲۵ء) ایسے کلنڈر بھی شائع ہوتے رہے جن میں ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے بانی اول کی حیثیت سے پنڈت جی ہی کی تصویر کو سب سے اونچی جگہ دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ فرط عقیدت کو بھی دخل ہو۔ لیکن بعض وجوہ سے کلیتہً اس قسم کے دعوؤں کو بے بنیاد ٹھہرانا بھی شاید درست ہو گا۔ جس کی تفصیل کا موقعہ میری اس کتاب میں نہیں ہے۔ مناسب ہو گا کہ اس کے لئے دہی کتاب سوامی دیانند الہی کی تعلیم کا مطالعہ کیا جائے۔ مندرجہ بالا اقتباسات اسی کتاب سے نقل کئے گئے ہیں۔ ۱۲۔

۱۵ خشت اول چوں ہند سمار کج

تاثر یا می رود دیوار کج

”دعوت خورے آئے ہوں گے“

لیکن ملنے اور باہم بات چیت کرنے کے بعد ان ہی سے آپ سن چکے کہ

”مولانا کے علم کا قائل ہوا اور بہت اچھی طرح پیش آیا“

جب ایک انگریز جو غیر ملک، غیر قوم کا رہنے والا تھا، ہندوستان کی زبان بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا جب اس میں اس انقلاب کا مشاہدہ کیا گیا تھا تو پنڈت جی بہر حال اپنے گھر کے آدمی تھے۔ سیدنا الامام الکبیر سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ان کے احساسات میں کسی تبدیلی کی توقع نہ مانی تھی کیوں قرار دی جاسکتی ہے ولکن ما قلد الله فسوف يكون

سچ تو یہ ہے کہ اپنی حد تک سیدنا الامام الکبیر جو کچھ کر سکتے تھے، کوشش کا کوئی دقیقہ آپ نے اٹھا نہیں رکھا، بلکہ کہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا آخری حصہ شاید اسی کوشش میں صرف ہوا۔

دعا سوچئے تو یہی، رٹ کی کاروائی تو خیر وفات سے تقریباً دو سال پہلے کا ہے، لیکن رٹ کی بعد پنڈت جی کے تعاقب کے سلسلہ میں میرٹھ کی جس سرگذشت کی طرف کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں بایں الفاظ اشارہ کیا گیا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے پنڈت جی کو میرٹھ سے بھگا کر کہیں کا کہیں

پہنچایا“ ۳۹

اسی کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہوئے کہ

”پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھر آکر میرٹھ پہنچے، اور وہاں بھی ان کے وہی

دعوے تھے“

مصنف امام نے آگے یہ خبر دی ہے کہ

”ہر چند مرض کے بقیہ، اور ضعف کے سبب فوت نہ تھی، مگر بہت کر کے

دیسرٹھ (پہنچے“

اور حسب دستور براہ راست مکالمہ اور گفتگو کے لئے آپ جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے
لیکن بقول مصنف امام

”وہ پنڈت جی، بہانہ دیکھ کر کے وہاں سے کافر ہو گیا۔“

اگرچہ صحیح طور پر سینئر ٹھہ کے اس واقعہ کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا، لیکن مصنف امام نے
اسی کے بعد بیان کیا ہے کہ اسی زمانہ میں کتاب ”جواب ترکی بہ ترکی“ خاص لکھنؤ میں اس
لئے لکھی گئی، کہ

”پنڈت کے بعض معتمدوں نے کچھ تحریریں بحواب برلٹنا

(نانوتوی) بے سسر دیا لکھی تھی، اور کچھ ادب پٹانگ مسلمانوں

کے مذہب پر اعتراض کئے تھے، یہ رسالہ اسی کے

جواب میں ہے۔“

پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام اکبیر کے تلمیذ سید مولانا عبدالعلی
صاحب مرحوم کی طرف کتاب کی تالیف منسوب ہے۔ اگرچہ علمی افادات اس کے خود
حضرت والا کے ہیں۔

بہتر حال اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب جواب ترکی بہ ترکی ”تقریباً اسی زمانہ میں
لکھی گئی کہ دیب سینئر ٹھہ میں پنڈت جی سے گفتگو کرنے کی کوشش سیدنا الامام اکبیر
کی طرف سے جاری تھی، اب ہم دیکھتے ہیں جیسا کہ اسی کتاب کے آخر میں لکھا ہے۔

”نویں رمضان شریف ۱۲۹۶ھ کو مکنا مشرورع کیا تھا اور

بھدات ۲۱ مارچ ۱۲۹۶ھ کو بروز شنبہ ختم کیا۔“ ۵۹

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سیدنا الامام اکبیر کی وفات کی تاریخ ۱۲ جمادی الاول ۱۲۹۶ھ
سے کم و بیش چھ سات مہینے پہلے یہ کتاب ختم ہوئی، گو یا اس بستیاد پر سمجھنا چاہئے کہ
سینئر ٹھہ میں پنڈت جی کے تعاقب میں آپ کی تشریف آوری بحالت مرض و قہامت تقریباً

اسی زمانہ میں ہوئی۔ پھر اسی کتاب میں پنڈت جی کے نام پہ پہنچ بھی نہیں ملتا ہے، یعنی لالہ اسدلال جن کے مضمون کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ان ہی کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا کہ

”آپ پنڈت جی سے کہہ دیجئے، ہزار منتیں کر دے، تب بھی مباحثہ کی طرح مباحثہ پر مولوی محمد قاسم صاحب کے مقابلہ میں آمادہ ہو جائیں تو ہم جھوٹے تم سچے“ ۱۱

جیسا کہ معلوم ہے، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کتاب ”جواب ترکی بہ ترکی“ لفظی حیثیت سے سیدنا الامام الکبیر کی تصنیف نہ ہو، لیکن معاً آپ ہی کی تصنیفات میں یہ کتاب شمار ہوتی ہے، کم از کم اتنی بات تو بہر حال مسلم ہے، خود لوح کتاب پر بھی لکھا ہوا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے ایسا، سے یہ کتاب لکھی گئی، ایسی صحت میں نہ کورہ بالا۔ حیلج کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ پنڈت جی کے نام سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے یہ حیلج تھا تو اس کے سوا آخر اد کیا سمجھا لے۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سچے کے قاتل کا قصہ اگر وفات سے چند سات مہینے پہلے پیش آیا تھا تو اس پر قطعاً ختم کہاں ہوا تھا، بلکہ اسکے بعد بھی پنڈت جی سے ملا واسطہ برقرار رہا، راست مباحثہ و مکالمہ کی کوششوں کا سلسلہ جاری رہا، تاہم نیکر دل کی حسرت سیدنا الامام الکبیر نور اللہ مرقدہ کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

حق تو یہ ہے کہ عاقلانہ انداز کے الفاظ سے پنڈت جی کے طرز عمل کے جس پہلو کی طرف حضرت والا نے اشارہ کیا ہے، اگر کسی کی سمجھ میں آیا ہو، یا نہ آیا ہو، لیکن خدان کی عقل و دانش سے پنڈت جی کے طریقہ کار کا یہ پہلو کیسے مخفی رہ سکتا تھا، اور اس سے واقف ہونے کے بعد حساس دلوں میں قلق اور بے چینی، اضطراب اور بے کلی کی جو کیفیت بھی پیدا ہو، تو اسے پیدا ہی ہونا چاہیے۔

۱۱ اور اگر اور اور حاجت مانے جیسے لوگوں نے لکھا ہے کہ لاہور میں دیناند ایٹلو ویک کے نام سے جو کالج قائم کیا گیا تھا، گو ویک کا انتقال اس کے آخر میں ہوا ہو گیا تھا۔ جس سے لکھا ہر محام پر یہ اثر ڈالا جاتا تھا کہ ویک دھرم کی تعلیم کا خاص اہتمام اس کالج میں کیا گیا ہے، لیکن یہ بیان کرتے ہوئے کہ اگر بیالڈی ایئر نی وغیرہ یورپ کے مشہور سیاسی خطیبوں کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہنے والوں سے میں نے جو یہ سنا ہے، کہ بالآخر یہی قصہ عالم اسباب میں سیدنا
الامام الکبیر کے لئے جان لیوا ثابت ہوا تو اس پر کم از کم مجھے تو تعجب نہ ہوا۔

بہر حال ہم تو مؤمن ہیں۔ ظاہر اسباب خود کچھ ہی ہو سکتے ہیں ہم سے متوایا گیا ہے، اور
اسی کو ہم مانتے ہیں کہ

ما کان لنفس ان تموت الا باذن | نہیں ہے کسی جیتی جان کیلئے کہ وہ مرے مگر اللہ ہی کے
اللہ کتاباً صوّجلاً | حکم سے لکھے ہوئے تقررہ وقت کے مطابق۔

ایک کم پچاس یعنی (۴۹) سال کی فرشتہ عمر کے ساتھ زمین کے اس خاکی گمے پر سیدنا الامام الکبیر بھیجے گئے تھے
اور اسی کتاب برجل کے مطابق جس کے حکم سے آئے تھے اسی کے اذن سے "الحیۃ الدنیا (پست زندگی)"
کو چھڑ کر خیر و باقی دانی زندگی سے سرفراز ہوئے، بلکہ جس ظاہری سبب کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اس
کے ماننے کی گنجائش بھی ایمان ہی کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے، لیکن صحیح طور پر تفصیلات ہی کا علم نہ ہو سکتا اور نہ
کوئی کتابی شہادت ہی اس سلسلے میں مجھے مل سکی۔ مگر ذکر کرنے والے جو نکتہ کبھی کبھی اس کا ذکر کرتے ہیں،

ادگشتہ صغیر سے اسلخ عمریوں اور کارناموں سے طلب میں سیاسی ذہنیت کو اجما جاتا تھا۔ لا وجی کہتے ہیں کہ
دیانت دیدک کا لک کے حسابات کی جانچ پڑتال اگر کی جائے تو یہ بات معلوم ہوگی
کہ اس کے کل اخراجات کا سوال جس بھی مذہبی تعلیم یا دیدک تعلیم کی اشاعت کے لئے
خراج نہیں ہوتا۔ (اخبار ہند سے لازم مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۱ء)

جس کا مطلب یہی ہے، کہ سیاسی کامیابیوں کے لئے مذہب کے نام کو استعمال کیا جاتا تھا، اور جس قسم
کی سیاست پنڈت جی کے پیش نظر تھی۔ علاوہ ان کی کتابوں اور ان کے پیروکاروں کی شہادتوں
کے اس کا تماشا تمہارا میں خود اس ملک کے ان ہندوؤں نے کیا جو آریہ سماج خبیلات نہیں رکھتے
تھے۔ مشتاہدی کے نام سے پنڈت جی کی صد سالہ برسی تمہارا میں ۱۹۲۷ء میں منائی گئی تھی۔ اخباروں
میں شائع ہوا تھا کہ پنڈت جی کے ماننے والے تمہارا پہنچ کر گل بجاتے تھے۔ لاشعیاں لے کر
سندوں میں نہر کستی گھستے تھے، اور اردن پر دیانت جی کی جے گھستے تھے، مگر شن کی سورتی پرتاج رکھا ہوا تھا،
جیسے لاشعی سے ڈھکیل دیا گیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سوای دیانت جی اور ان کی تعلیم مکمل) باوجود ہندو نام کر
موسم ہونے کے جب ان کی درگت یہ بنائی گئی، تو اس ملک کے جو باشندے ہندو نہیں ہیں ان بچاروں
کی خود ہی سوچئے اس قسم کی سنگ ذہنیت میں کتنی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ ۱۲

اس لئے اجنبی اشارہ اس کتاب میں بھی اس کی طرف مناسب معلوم ہوا۔

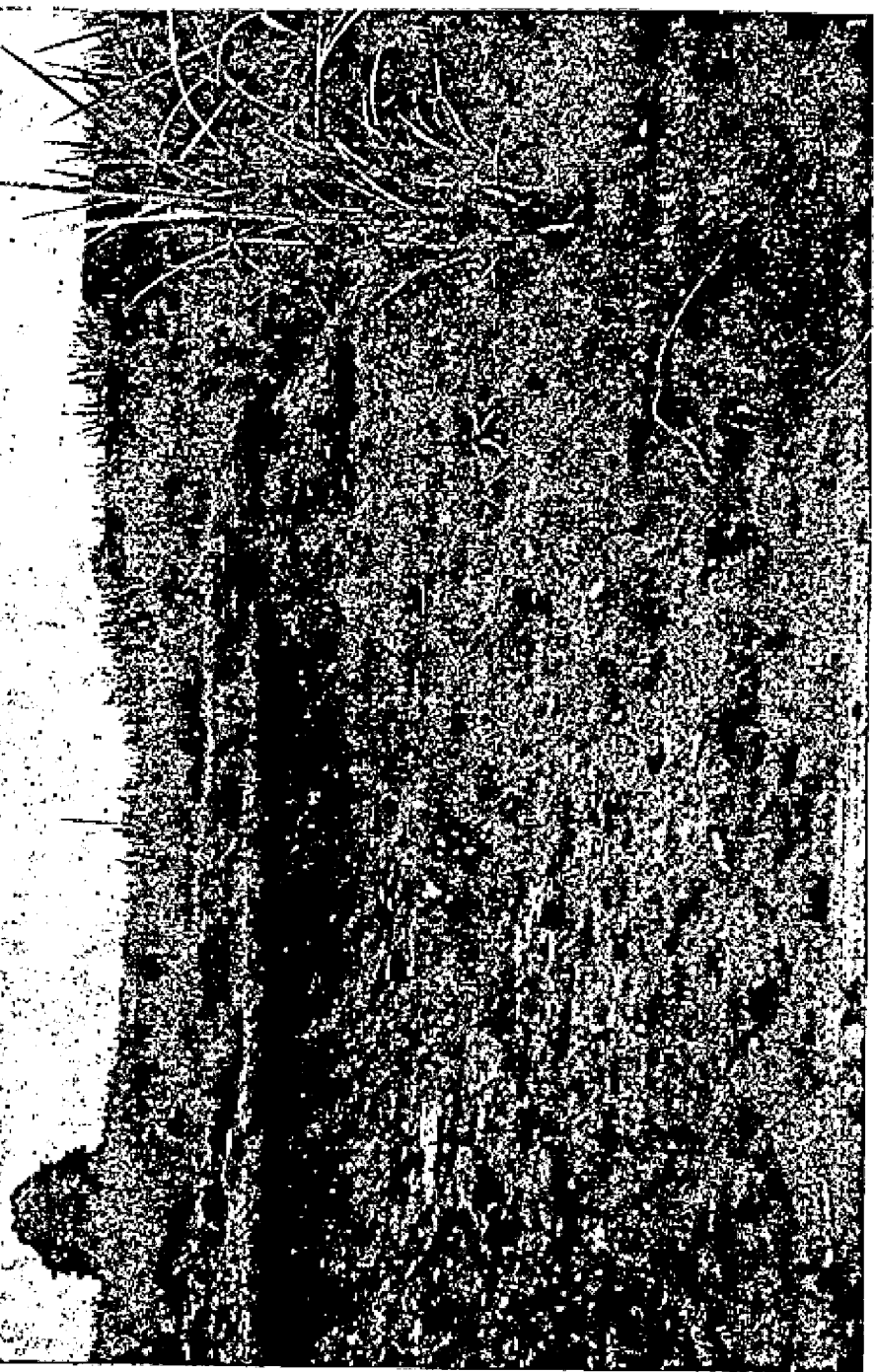
اب ہم اس قصہ کو ختم کرتے ہیں، اور اُدھر اُدھر سے معلومات جو کچھ بھی اس سلسلہ میں فراہم ہو سکیں وہ پیش کر دی گئیں، کچھ طویل بیانی سے کام ضرور لینا پڑا، جس کی ضرورت اس لئے تھی کہ عام طور پر اس قصہ کو سیدنا الامام اکیبرؑ کی زندگی اور زندگی کے کلماتوں میں دوا، ہیبت نہیں دی گئی، جس کا یہ واقعی مستحق تھا، میں خیال کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں انشاء اللہ واقعی اصل حقیقت سامنے آجائیگی اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں آپ کی حیات طیبہ کی آخری منزل سچ پوچھنے تو اسی قصہ پر ختم ہوئی، اور میں ان ہی دنوں میں جب اس ماہ میں آپ کی جدو جہد کا سلسلہ جاری تھا، ”کتاب موحل“ کی دوسرے آب کا وقت مرعہ آگیا، نقداً اب دروکی اسی داستان میں ہم مشغول ہوتے ہیں جس کے ذکر کا دودھ ذاتی جلالت کو ختم کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔

ربیع الاول سوانح قاضی جلد ثانی تمام ہوئی

لے براہ راست حضرت دالاکے نعمت فرزند سید مولانا قاضی احمد صاحب مرحوم سے خاکسار نے یہ دعوت کی ہے کہ عرض الموت عالی بیانی کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ سیدنا الامام اکیبرؑ کی کیا ہے، سحر اُدھر سے متاثر ہوئے کا عقیدہ اسلامی روایات کا نام اقتضائے ہے، خود ختمی آب رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلق میح بخاری میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، ابھر کبھی بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ صمد صاحبہ دستار کے خواجگانِ جنت میں حضرت بابا فرید احمد سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہا کے متعلق مستند کتبوں میں ہم یہ پاتے ہیں، تھر دونوں بزرگوں پر عسکر کیا گیا۔ جس سے کافی تکلیف اٹھانی پڑی۔ کرمانی کی سیر الاولیاء میں جس کی تحصیل آپ پڑھ سکتے ہیں، خاکسار نے بھی اپنی کتاب مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت میں ان قصوں کا ذکر کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو مصنوعی روحانیت جس کا ترجمہ آج کل اسپر پیویرازم کیا جاتا ہے، اور نفسیاتی ورزش کے جو قدرتی نتائج ہیں، روحانیت کی اس مصنوعی اور جعلی شکل میں اللہ روحانیت، جبراً راہ راست تعلق باللہ سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں میں دوسری استیلائی و جبر کے ساتھ بڑی مدد اس قسم کے واقعات سے ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو آسان و سادہ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے اپنے سرچشمہ کے لحاظ سے روحانیت کی یہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے قطعاً الگ ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مصنوعی روحانیت والے اپنے نفسیاتی کوششوں کو تعلق باللہ والی روحانیت رکھنا، دونوں کو متاثر کریں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جس کو کوئی پہچان نہ کر سکی ہو، اگر کسی خدا پرست آدمی کو گراں آئے، لیکن پہچانی کے فن کو دہرستی پر اس لئے ترجیح تو حاصل نہیں ہوتی ۱۲

شمالی کاسپین کے علاقے میں

1972-73
1974-75



تھانہ مہول میں لکھن کا درخت جس کے نیچے حضرت حافظ محمد ناس صاحب شہید داماد امام جہاد شامی کی کشت رنجی تھی



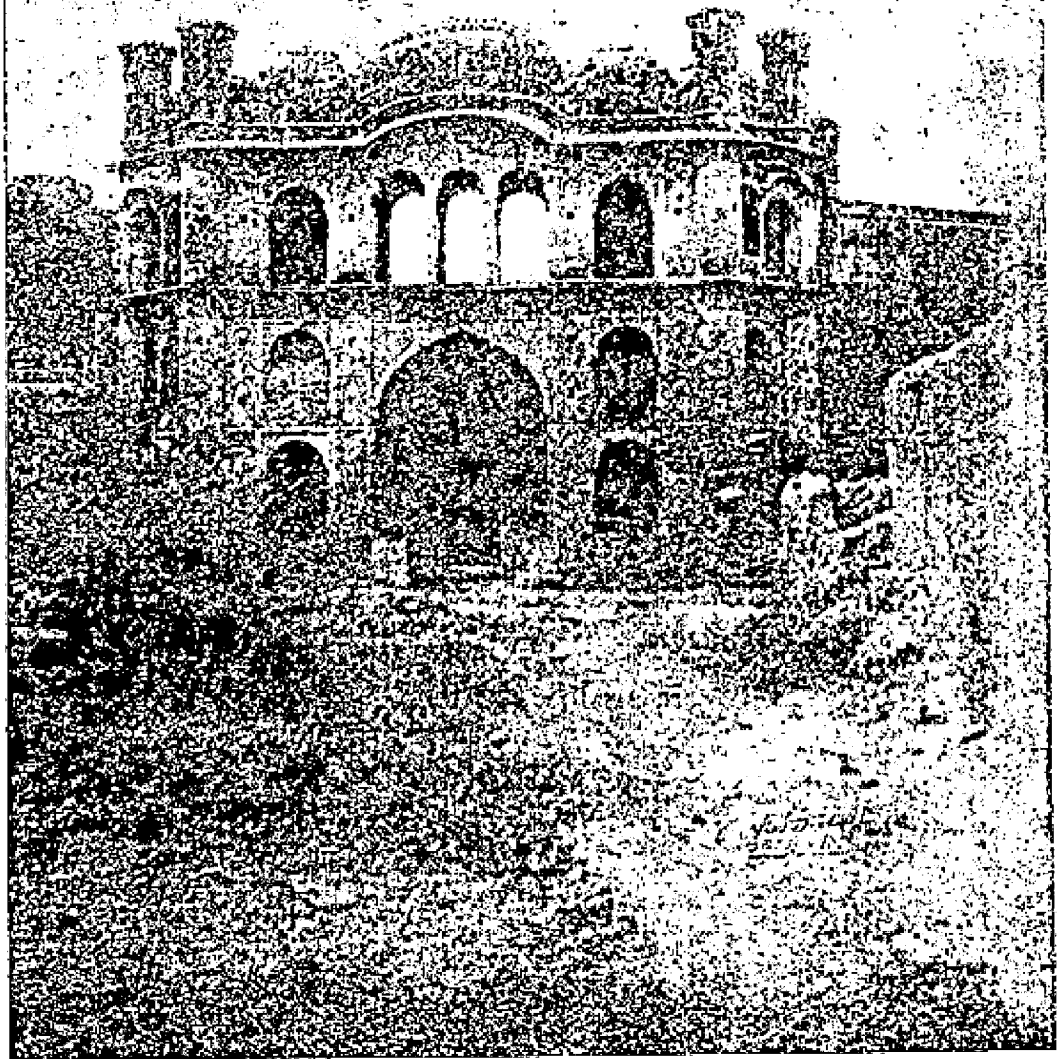
بھتشی مسجد (روہتاس) میں اندکادخت جس کے نیچے مدرسہ روہتاس کا افتتاح ہوا



چھتہ کی مسجد، اولیہ بند میں حضرت نواز قوی قدس سرہ کا حجرہ مبارک تین میں اب طلباء کے دوا العلوم رہتے ہیں



تختابندوں میں خاصیت علی خاں کا اعلیٰ ہے۔ صحن کے چوک میں جو سائے سے ظلم و جبر کا گواہ تھا۔



صفت لازمی که شرط برای ادعای اصل

در اصول من بر سر مدرسه و در بنر ادو مدرسه

چند مبنی معلوم برقی بن

حق در ادعای اصل و بنی انضامی بنیاد کمالی

(۱) اصل اولی صبی که تا مقدر کارکنان مدرسه کو همیشه تشریفه بر نظر ری آپ بخشش کرن

اد و بنی که این خیر اندیش مدرسه کو به بات همیشه موطوری

(۲) ابقاء طعام طبه مکر افزایش طعام طبه من صلح برقی خیر اندیش مدرسه همیشه علی بن

(۳) مسیران مدرسه کو همیشه به بات موطوری که مدرسه کی خوی و در اسلوبی جو- اینی بات

کی پنج کیجائی خدا خور سینه حب استی فونه انگلی که اهل مشوره کو اینی مخالفه رای از در کمالی رای

کی لافق برنا ناگوار هو تیر کی مدرسه کی بنا برین سر نزل با تکیا اخصه ته دل کی بردقت مشوره

اد و بنر ادو مدرسه کی پیش می اصولی مدرسه موطوری سخی بروری بنو ادو استی خردی که اهل مشوره

اد و بنر رای من کی سوره سی متا بن نزن ادو ساعین به بنه نمک ادو کو سنی منی به جالی بی که اگر در سحر

بات سحر من اجاتگی تو اگر چه جایی مخالفی کو بی بدل رجا بن قبول کرنی کی از بنر ز سوره سی

خردی که ستم امور مشوره طاعت اهل مشوره سی خرد مشوره کیا لری خواه ده لوگ من بخوبی

سیر مدرسه منی منی بالوئی دارد خدا در جوعم عقل رکتنا برادر مدرسه بن کا خیر اندیش بنو اد و بنر

کی سوره سی خردی که اگر اتفاقا کی سوره سی کی اهل مشوره کی فونه ته کی از بنر خردی

کی سوره سی خردی که اگر اتفاقا کی سوره سی کی اهل مشوره کی فونه ته کی از بنر خردی

کی سوره سی خردی که اگر اتفاقا کی سوره سی کی اهل مشوره کی فونه ته کی از بنر خردی

این سوله ای مقدار غنای بی شوره کلبا یا بر تو بدیده شخصی بود پس این کلبا را که در کلبا کلبا
اگر سوله ای که سوله بی شوره تو بدیده بر این سوله سوله سوله ای

(۴) نیت است بهت فردی ای که نیت است در رسم بهم منفق الشرب چون در سوله سوله سوله

خودین در در سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

(۵) خزانگی سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله
سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

(۶) اس در رسم سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

توصلی الیه سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

تجارة یا سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

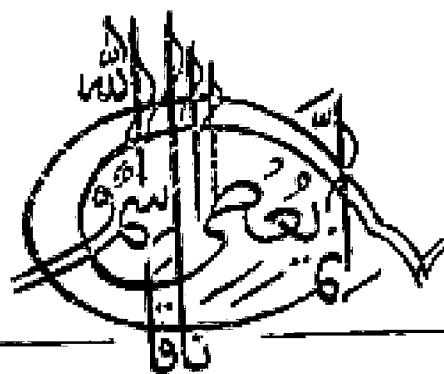
بوجه الی الیه سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

باجم سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

(۷) سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

(۸) سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله

سوله ای ای تو بدیده سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله سوله



سوانح مختصر

یعنی

سیر سیدنا الامام الکبیرؑ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم الناولو

قدس سرہ اللہ سرور العزیز

جلد دوم

مؤلفہ

حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانی عم فیضہ

سیدہ بایمہ

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترتیب ہو کر

دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی

(میشنا پرنٹنگ پریس دیوبند)

فہرست مضامین سوانح قائمی جیلد دوم

۱	داخلی اصلاحات	۱
۲	احیاء عقیدہ پیوگان	۲
۱۲	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا عقیدہ ثانی	۳
۱۴	لوگوں کے حق دراشت کا احیاء	۴
۲۳	مولانا محمد حسین شادوی الطحیث سے تقلید وغیرہ پر بحث	۵
۲۶	عشری مطالبات کی دوام میں اور بدعت کی تعریف	۶
۲۹	سارع موتی اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ	۷
۳۲	بزرگوں کے قریب مدفن ہونا موجب برکت ہے	۸
۳۹	اختلافی مسائل میں نرم اور مستدل روشیں	۹
۴۵	بدعت کی حکیمانہ تشریح	۱۰
۵۱	مکہ بدعات پر اہل دیوبند سے عہد لیتا	۱۱
۶۰	اہل تشیع کے بارے میں اصلاحی اقدامات	۱۲
۶۶	پورتاخصی کے مشیعوں کا واقعہ	۱۳
۷۰	الہامی طور پر مجتہدین کے اعتراضات کاظم اور ان کے مسکوت جوابات (حاشیہ)	۱۴
۷۵	تقریب ہدی کو ختم کرنے میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے سر کی بازی لگادی	۱۵
۷۷	دیوبند میں تقریب ہادی کا خاکہ	۱۶
۷۹	دفاعی اقدامات	۱۷
۸۳	انگریز اور انگریزیت سے نفرت	۱۸
۸۴	انگریزیت سے نفرت کا اثر تلامذہ پر (حاشیہ)	۱۹
۸۶	انقلاب مشہد کا پس منظر	۲۰
۹۰	چشتیہ اور چشتیہ مائیکوٹریہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے تاخیرات	۲۱
۹۳	مدرسہ دیوبند مشہد کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا	۲۲
۹۷	انقلاب مشہد میں شرکت کا راز	۲۳
۱۰۰	انقلاب مشہد کے بعض اجمالی پہلو	۲۴
۱۰۰	بارک پور کی سات پلٹنوں کی موتوقتی	۲۵
۱۰۱	مسیر تھ جھادی میں ہونٹاک انقلاب	۲۶
۱۰۱	لال قلعہ پر ہندوستانیوں کا قبضہ	۲۷
۱۱۱	مشہد کے بدلگاہ میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی مشہدیت کا اصل منشاء	۲۸
۱۱۵	ضلع سیارہ پور میں انقلاب مشہد کی آگ بھڑکنے کی وجہ	۲۹
۱۲۱	قاضی عبدالرحیم ادرانی کے رخصت کے بھانسی ہانے کے بعد تھانہ بھون میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے اکابر و رفقاء میں باہم مشورہ	۳۰
۱۲۲	مشہد کی جنگ میں مشہدیت پر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قوی دلائل	۳۱

۱۲۵	حضرت حاجی احمد لائندہ رح کا امیر جہاد منتخب ہونا اور سب کا بیعت جہاد کرنا	۳۲
۱۲۷	اکابر کے درمیان جہادی خدمات کی تقسیم	۳۳
۱۲۹	حضرت نانوتوی رح کا اپنی والدہ ماجدہ سے شرکت جہاد کیلئے اجازت طلب کرنا اور ان کا بخوشی اجازت مرحمت فرمانا	۳۴
۱۳۴	تھانہ بھون کے مستقر سے پہلا حملہ باغ شیر علی کی مشرک پر	۳۵
۱۳۵	جنگ شالی	۳۶
۱۳۷	حضرت نانوتوی رح کا نواب شیر علی خاں مراد آبادی کی معرفت بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کو جہاد میں شرکت پر آمادہ کرنا	۳۷
۱۴۰	شہر کا جنگ شالی	۳۸
۱۴۱	حضرت نانوتوی رح کی جرأت اور بے جگری	۳۹
۱۴۳	حضرت نانوتوی رح اور انگریزی فوج کے ایک سپاہی میں مقابلہ اور حضرت نانوتوی رح کی کامیابی	۴۰
۱۴۵	شالی کی گڑھی کا محاصرہ اور تھانہ بھون کی جہادی تحریک کا خاتمہ	۴۱
۱۴۸	حضرت نانوتوی رح کا ایک چتر کے ذریعہ تحصیل کے کوڑا چلانا	۴۲
۱۵۱	حضرت حافظہ ضامن خبید رح کی شہادت	۴۳
۱۶۰	حضرت نانوتوی رح کی کینٹھ پر رگولی لگن اور پھر کسی نشان کا نہ پایا جانا	۴۴
۱۶۳	دلی کے آخری بادشاہ کی گرفتاری	۴۵
۱۷۰	انگریزوں کے ہاتھوں تھانہ بھون کی بربادی	۴۶
۱۷۱	حضرت نانوتوی رح کے نام دارنٹ گرفتاری اور توسلین کے اصرار پر صرف تین یوم تک آپ کی روپوشی	۴۷
۱۷۶	حضرت نانوتوی رح کی منجانب اللہ حفاظت	۴۸
۱۹۱	نہالہ میں حضرت نانوتوی رح کا پہلے جج کے لئے روانہ ہونا	۴۹
۱۹۴	حفظ قرآن کی نعمت عظمیٰ	۵۰
۱۹۸	نہالہ میں پہلے جج سے داپسی	۵۱
۲۰۴	حضرت گلگامی رح پر مقدمہ اور ان کی رہائی	۵۲
۲۰۹	خدمات جلیلہ کا شاہکار	۵۳
۲۱۴	دارالعلوم دیوبند اور اس کے آغاز و تاسیس کی داستان	۵۴
۲۱۵	انار و عمود	۵۵
۲۱۵	سب سے پہلے معلم عمود اور معلم عمود	۵۶
۲۲۰	قدیم شخصی و انفرادی طریق تعلیم کی جگہ اجتماعی طریق تعلیم	۵۷
۲۲۱	دارالعلوم کا تعلق عام مسلمانوں سے نہ اندازہ نہ ہونے کی تاکید	۵۸
۲۲۳	بقول حاجی احمد لائندہ رح دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں بقاعد اسلام اور	۵۹
۲۲۸	تحفہ علم کا ذریعہ ہے	۶۰
۲۲۸	دارالعلوم کے قیام کے ذریعہ شہر کی ناکامی کی تلافی	۶۰

۲۴۲	قیام مدرسہ دیوبند کی تجویز	۶۱
۲۴۴	شش ماہ میں مدرسہ عربی "دارالعلوم دیوبند" کا قیام	۶۲
۲۴۶	ابتدائی اسکول شوریٰ دارالعلوم دیوبند	۶۳
۲۶۰	مجلس انیس مسجد چھتہ کے تین اساطین	۶۴
۲۸۱	حضرت نانوتوی رحمہ کے نزدیک دارالعلوم سے خارج التحصیل ہونے کے بعد طلبہ کے لئے حصول علوم جدیدہ کی ضرورت	۶۵
۲۸۲	دارالعلوم کا نصاب	۶۶
۲۹۳	حضرت نانوتوی رحمہ کے نصب العین کے خلاف علوم جدیدہ کا اثر کے کردارالعلوم میں آنے کے تلخ نتائج	۶۷
۳۱۳	غشی نوکشر صاحب مالک اخبار اور دیگر حضرات کا بدیعہ درسی کتب دارالعلوم دیوبند کے لئے ارسال کرنا۔	۶۸
۳۱۶	غشی نوکشر صاحب لکھنؤ اور امیر سنگھ صاحب مالک اخبار "مسفر نوڈھانہ" کے اخبارات اور کارخانہ جات کی ترقی کے لئے دھار	۶۹
۳۱۷	بعض غیر مسلم حضرات کے اسما جو دارالعلوم دیوبند کو چندہ دیتے تھے۔	۷۰
۳۱۸	پہلے سال میں دارالعلوم دیوبند کی آمدنی چھ سو اسی روپے چار آنہ ہوئی	۷۱
۳۲۵	عمارت دارالعلوم کا سنگ بنیاد	۷۲
۳۲۸	دارالعلوم دیوبند میں علم طب کی تعلیم کا اجراء	۷۳
۳۴۳	غیر مسلم طلبہ کا دارالعلوم دیوبند میں پڑھنا	۷۴
۳۵۸	یاد ہی تارا چند سے حضرت نانوتوی رحمہ کا مناظرہ	۷۵
۳۶۴	واقعات میلہ خدا شناسی سال اول	۷۶
۴۲۶	واقعات میلہ خدا شناسی سال دوم	۷۷
۴۳۲	پادری ٹوس کوکٹوس سے دعا کرنے کا مشورہ تاکہ حق و باطل واضح ہو جائے	۷۸
۴۵۰	حضرت نانوتوی رحمہ کا نظریہ کہ چند حضرات جنہیں اوتار کہتے ہیں ممکن ہے کہ وہ اپنے شانہ کے نبی یا ولی یا نائب ہی رہے ہوں	۷۹
۴۶۳	حضرت نانوتوی رحمہ کے بارے میں چند حکام کا خیال کہ "وہ کوئی اوتار ہوں تو ہوں"	۸۰
۴۶۳	حضرت نانوتوی رحمہ کے دل پر علم کی سرسبزی بولی نہی تھی	۸۱
۴۸۴	اسلاف دارالعلوم کی کتب خانہ کے لئے دارالعلوم دیوبند میں اور نشر و اشاعت کا اجراء جنوری ۱۸۸۷ء میں رشکی کے جلسہ عام میں اسلام پر بحث دیا نند سرسوتی کے (مناظرہ)	۸۲
۴۸۷	اعتراضات اور حضرت نانوتوی رحمہ کا باوجود شدید علالت کے رشکی جانا اور پینڈت جی کا مناظرہ سے فرار	۸۳
۵۰۲	پینڈت دیا نند سرسوتی کے اعتراضات کا تحریری جواب شاخ فرمانا	۸۴
۵۱۲	پینڈت دیا نند سرسوتی کا میرٹھ میں ورود حضرت نانوتوی رحمہ کا باوجود ضعف کے میرٹھ پہنچنا اور پینڈت جی کا میرٹھ سے فرار	۸۵

سَوَاحِقِ قَامِی

یعنی

سیرت
شمس الاسلام

یٰۤاَیُّهَا اَیُّهَا الْکَبِیْرُ حَضْرَتِ مَوْلَانَا مُحَمَّدِ قَامِی اَنَا نُوْتُوْیْ قَدْرًا
حِصَّہٗ دُوْم

رَیْسِ اَقْلَمِ حَضْرَتِ مَوْلَانَا سَیِّدِ مَنَاطِرِ اَحْسَنِ جَمَلِ اِنِّیْ رَضِیْتُ عَنْکَ

مکتبہ رحمانیہ
اقرائش غزنی سٹریٹ لاہور
اُردو بازار